معاشرت
سراب
166
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان
الہن دریافت
161
طارق عزیز خان
دوسری سچ بیانی
ہوشیار
219
تیسری سچ بیانی
مکافات
229
اختر شہاب
اس نے غلطی کی تھی
اور سزا کا منتظر تھا
تعلیم و تربیت
198
سونیا ایان
چھٹی سچ بیانی
ہیں لوگ کچھ
255
طارق عثمان
ملمع چڑھے چہرے
صرف دھوکا دیتے ہیں
252
زھیب علی
چوتھی سچ بیانی
دوسری شادی
237
شازیہ
کچھ لوگ جو زندگی کو کھیل
سمجھ کر برباد کر دیتے ہیں
نویں سچ بیانی
عزت دینے والا
283
اطہر علی
آٹھویں سچ بیانی
بد خصلت
273
تفسیر عباس بابر
ساتویں سچ بیانی
انتقام
264
دانیہ صدیقی
وہ عورت نہیں ڈائن تھی،
انتقام میں اندھی ہو گئی تھی
قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔
READING
Section

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 26 ❖ شمارہ 03 ❖ اپریل 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کہا جاتا ہے کہ جمہوریت عوام کے مسائل کا حل ہے کیونکہ عوام کے منتخب نمائندے اسمبلی میں پہنچ کر ذمے داری سے قانون سازی کرتے ہیں تاکہ عوامی مسائل ختم، حل یا کم ہو جائیں۔ ہم سب یہی سوچ کر ہر بار انتخابی عمل میں شریک ہو رہے ہیں لیکن ہر بار ہمارے خوابوں کو توڑا جا رہا ہے۔ کرپشن کی گرم بازاری، مہنگائی کا طوفان، اُمید کا ہر چراغ بجھانے پر تلا ہوا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ عوامی سرمائے سے ادا کیے جانے والے ان کے ماہانہ مشاہروں میں متفقہ طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ عوامی نمائندوں کا ہم سے مذاق نہیں ہے؟ آخر ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ ہمارے نمائندے کب تک ایسا کھیل کھیلتے رہیں گے۔ ان نمائندوں کو اس پر غور کرنا ہوگا ورنہ آنے والی نسل بھی انہیں معاف نہیں کرے گی بقول شاعر

عذابِ دید میں آنکھیں لہو لہو کر کے
ملا نہ کچھ بھی خزانوں کی جستجو کر کے

معراج رسول

شعبۂ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا محمد جمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور افراز علی تارش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com
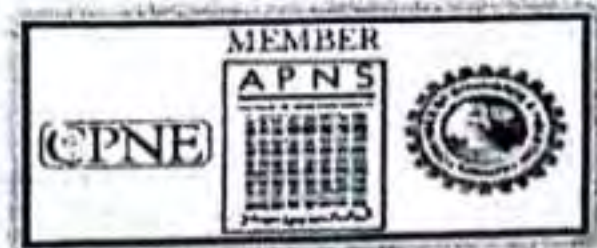
چور شاعر

اس نے زمیندار باڑی میں جنم لیا تھا۔ اسے ہر قسم کی آسائش مہیا تھی مگر دماغ میں سوطرح کے خیالات مچلتے رہتے تھے۔ وہ عمر سے بڑھ کر سوچا کرتا تھا۔ اس دور کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ آج کل کے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان دنوں چھکڑا گاڑیاں چلا کرتی تھیں۔ سڑکوں پر دھول ہی دھول ہوا کرتی کیونکہ پختہ سڑکیں بہت کم تھیں اور جہاں تھیں وہاں آس پاس بڑے بڑے میدان تھے جن سے اڑنے والی دھول مٹی سڑکوں پر آ کر رقص کیا کرتی۔ جیسے ہی کوئی چھکڑا گزرتا دھول مٹی کا بگولہ سا اٹھنے لگتا۔ انگریزوں کی عملداری تھی مگر چھوٹے چھوٹے عہدوں پر مقامی افراد فائز تھے جو صبح صبح نہا دھو کر سفید کرتے اور سفید دھوتی میں ملبوس ہو کر پان چباتے ہوئے یا انگریزوں کی نقالی میں سگریٹوں کا دھواں اڑاتے ہوئے دفتر جاتے۔ جو زیادہ بڑے عہدے پر ہوتا وہ تو پالکی یا گاڑی جسے گھوڑے کھینچتے اس پر سوار ہوتا مگر اہم عہدے والے پیدل چلتے ہوئے جاتے جو صاحبِ توفیق تھے ان کی گاڑیوں پر تمغے بھی لگے ہوتے۔ چمڑے کے آدھے گھونگٹ والے کوچ بکس پر کوچوان بیٹھا ہوتا جس کے سر پر بانکی پگڑی لہراتی رہتی۔ گاڑی کے پیچھے دو سائیس کھڑے رہتے جن کی کمر میں چنور جھولتے رہتے۔ شرفا کی عورتوں کا باہر آنا بالکل منع تھا اگر نکلتیں تو بند دروازے کی پالکی میں جس کے اندھیرے میں دم گھٹتا مگر مجبوری تھی کہ تیج تہوار شادی بیاہ میں جانا بھی ضروری تھا۔ ان دنوں شہر میں نہ گیس تھی اور نہ بجلی۔ ارنڈ کے تیل کا دیا جلا کر روشنی کی جاتی جو خاصی مہنگی چیز تھی۔ پھر مٹی کا تیل دریافت ہوا اور انگریز اسے کلکتہ لائے تو اس کی تیز روشنی دیکھ کر دوسروں کی طرح وہ بھی حیران رہ گیا۔ گھنٹوں بیٹھا وہ شیشے لگے ڈبے میں جلتی روشنی کو دیکھا کرتا۔ اس کا یہ کھویا کھویا انداز دیکھ کر گھر والے آوازہ کستے کہ یہ تو شاعر ہے۔ اسے پڑھانے ایک پنڈت جی آتے جو درگا پوجا کے دنوں میں بہت مصروف رہتے کیونکہ آس پاس جہاں جہاں بھی پوجا ہوتی پنڈت کی ذمے داری یہی نبھاتے۔ استاد کو پوجا کرتے دیکھ کر اس کے دل میں بھی پنڈت بننے کا خیال آیا۔ گھر میں نوکر چاکروں کی ایک فوج تھی جو حویلی کے آس پاس رہتے تھے۔ اس نے ان کے بچوں کو جمع کر کے پوجا کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ پوجا کے لیے منتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے قافیہ سے قافیہ ملا کر منتر بنا لیا۔ گویا یہ اس کی پہلی شاعری تھی۔ اس گھرانے میں ایک مربی دوست بھی رہا کرتے تھے۔ سری کنٹھ بابو جو دن رات گانے سے شوق فرماتے نوجوان ان سے گانا سیکھنے کے لیے انہیں گھیرے رہتے۔ ان سے یہ بھی مستفیض ہوتا رہا۔ اب کچھ بڑا ہو چکا تھا۔ اسے منجھلے دادا کے ذمے لگایا گیا کہ وہ کھیتی باڑی سیکھے مگر اسے ناکامی ملی کھیتی باڑی میں اس کا دل نہیں لگا تب وہ شوقیہ اکھاڑے میں کشتی کھیلنے لگا۔ اسے تعلیم دینے کے لیے نیل کمل ماسٹر کو رکھا گیا۔ وہ اسے حروف تہجی کے ساتھ حساب کتاب بھی سکھانے لگے۔ پھر اسے نزدیکی پاٹھ شالہ میں داخل کرایا گیا جہاں اسے انگریزی بھی سیکھنی پڑتی۔

آہستہ آہستہ وہ تعلیمی مدارج طے کرتا رہا۔ جب وہ مڈل میں پہنچا تو اسکول سپرنٹنڈنٹ گوند بابو تک بات پہنچی کہ وہ شاعری کرتا ہے۔ انہوں نے فرمائش کی کہ کچھ سناؤ۔ جب اس نے اپنی نظمیں سنائیں تو الزام لگ گیا کہ یہ چوری کی ہوں گی۔ اتنا سا لڑکا اور ایسی نظمیں یہ ناممکن بات ہے۔ ضرور اس نے کسی کی نظم چرائی ہے۔ کچھ اور بڑا ہوا تو خاندان کی جانب سے شائع ہونے والا رسالہ ”بھارتی“ کی ادارتی بورڈ میں اسے بھی شامل کر لیا گیا۔ اس نے رسالے میں ایک کہانی لکھ کر دی جسے پڑھ کر سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ چوری کی کہانی ہے۔ جب سترہ سال کا ہوا تو اسے ادارتی بورڈ سے علیحدہ ہونا پڑا کیونکہ اسے تعلیم کے لیے ولایت جانا تھا۔ لندن کی یونیورسٹی میں اس نے تین ماہ تک تعلیم حاصل کی مگر بیرسٹری کی پڑھائی میں دل نہ لگا سکا۔ اس کا دل تو ڈرامے، کھیل تماشے، کہانیوں اور شعر و شاعری میں لگا کرتا تھا۔ وہ متواتر شاعری کرتا رہا۔ کہانیاں لکھتا رہا۔ پھر اس نے شاعری کو یکجا کیا اور مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس پر 1913ء میں اسے ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔ دولت تو پہلے ہی اس کے پاس تھی۔ اب جو اسے انعامی رقم ملی تو اس نے یہ رقم بھی اس تعلیم گاہ میں لگا دی جسے شانتی نکیتن کا نام دیا گیا تھا۔ 1913ء میں اسے سر کا خطاب ملا یہ بھی ایک بڑا اعزاز تھا لیکن جب جلیاں والا باغ کا سانحہ رونما ہوا تو اس نے یہ خطاب واپس کر دیا۔ برصغیر میں پہلا نوبیل انعام حاصل کرنے والی اس شخصیت کو رابندر ناتھ ٹیگور کے نام سے پہچانا جاتا ہے جسے بچپن میں چور شاعر کہا جاتا تھا۔

☆☆☆

☆صداقت حسین ساجد نے شورکوٹ سے لکھا ہے۔ ''مارچ کا شمارہ بہت خوب صورت سرورق کا حامل تھا۔ لیکن صفحہ کھولنے کو دل نہ چاہا۔ ہر ماہ سرگزشت کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے اس ماہ بھی لیکن جب پرچہ سامنے آیا تو دل نوحہ کناں بن گیا۔ سرگزشت کو دیکھتے ہی محی الدین نواب اور کاشف زبیر کا غم تازہ ہوگیا۔ اسی لیے سب سے پہلے ''سراب'' کی طرف چھلانگ لگائی۔ آہ، سراب کا اصل ہیرو کاشف زبیر اپنے حصے کی زندگی گزار گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے غریق رحمت کرے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے، ان کی یادیں ہمارے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔ ان کی تحریروں کی صورت میں سراب تیزی سے اپنے اختتام کی طرف گامزن ہے۔ بہت زبردست تحریر ثابت ہو رہی ہے۔ شروع سے اب تک اس نے اپنی دلچسپی برقرار رکھی ہے۔ آہ! محی الدین نواب اتنے بڑے رائٹر کے لیے صرف دو صفحات! بہرحال سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا قلم ہمیشہ کی طرح باراں دیدہ میں اپنے عروج پر دکھائی دیا۔ ''راہنما'' میں مریم خان نے ڈاکٹر مہاتیر محمد کے بارے میں زبردست معلومات دیں۔ کاش! ایک مہاتیر محمد ہمارے ملک کو بھی نصیب ہو جائے۔ سید زین مہدی کا ''شاعر بنگال'' بہت خوب مضمون تھا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' کی آخری قسط؟ ندیم اقبال صاحب نے اس سفر میں آخر تک دلچسپی کا عنصر برقرار رکھا۔ اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ تھا۔ ان کے دوسرے سفرنامے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ منظر امام اپنے مخصوص انداز میں تاریخ عالم سے روشناس کرا رہے ہیں۔ مختصر مگر جامع سیلف میڈ میں پریتی زنٹا کی جدوجہد زندگی کے بارے میں پڑھنے کو بہت کچھ ملا محنت اور لگن سے انسان آسمان کو چھو سکتا ہے۔ سچ بیانیوں میں سب سے پہلے ''حوصلہ'' پڑھی۔ بہت زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ ''روپ بہروپ'' ایک عمدہ اور زبردست تحریر تھی۔ کچھ لوگ گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ باہر سے روشن لیکن اندر سے کالے ہوتے ہیں۔ پھر ان کا انجام بھی تو ان کے اندر کی طرح کا ہوتا ہے۔ مریم مراد کی بے غیرت اچھی تحریر تھی۔ ناظم بخاری کی انداز محبت بھی بہترین تحریر رہی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ باقی رسالہ ابھی پڑھنا باقی ہے۔''

☆فیروز علی عاجز کی آمد گل آباد جنگی ضلع چارسدہ سے۔ ''سرگزشت کا شمارہ 27 تاریخ کو فیض نیوز ایجنسی سے ملا۔ فروری کا مہینا بہت تکلیف میں گزرا کیونکہ 2 فروری کو میرے بڑے بھائی عمیر کا انتقال ہوگیا۔ گیارہ بجے مقامی جنازہ گاہ میں جنازہ ہوا اور میرا پیارا بھائی سپرد خاک ہوگیا۔ سب سے دعا کی درخواست ہے کہ میرے اور میرے بھائی کے حق میں دعا فرمائیں۔ عظیم رائٹر محی الدین نواب کے انتقال کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اب آتے ہیں ''شہر خیال'' کی طرف۔ کرسی صدارت پر ناصر حسین رند کو براجمان پایا۔ کرسی صدارت مبارک ہو۔ بہت سے دوست موجود تھے۔ نجمی رحمن، وحید ریاست بھٹی۔ ایم عمران جونانی، فلک شیر ملک، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین، سدرہ بانو ناگوری، طاہرہ گلزار، قیصر خان، شاہد جہانگیر شاہد، عبدالجبار رومی، انور عباس شاہ سب کو میری طرف سے سلام کیونکہ ہم تو کسی کو یاد ہی نہیں۔ طاہرہ گلزار باجی آپ بھی چھوٹے بھائی کو بھول گئیں۔ کہانیوں میں ''سراب'' سب سے پہلے پڑھی۔ ''قلم نگری'' سے انور فرہاد ''سیلف میڈ'' کے ساتھ آئے اور پریتی زنٹا کے بارے میں بہت کچھ بتا گئے۔ ''مارچ کی شخصیات'' بہت اچھی تحریر تھی۔ ''پُراسرار ہائی جیکر'' ابھی تک گم ہے یا اسے کسی نے پکڑ لیا؟ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''حوصلہ'' بھی ٹھیک تھی۔ ''بے غیرت'' میں شعیب بہت ہی بزدل اور بے غیرت نکلا۔ نیکی کر دریا میں ڈال والا محاورہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ نیکی کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ اس لیے تو شائستہ کو شاہد مل گیا۔''

☆رانا محمد شاہد بورے والا کا تجزیہ۔ ''معراج رسول صاحب کا اداریہ آنکھوں سے ہی نہیں دل سے بھی پڑھا کہ ایسے تلخ حقائق

پر کم کم ہی لکھا جاتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم سب اپنی اپنی جگہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایک فروٹ والا یہ بات بڑے دھڑلے سے کہتا ہے کہ زرداری و نواز شریف نے ملک تباہ و برباد کر دیا ہے حالانکہ وہ خود اکثر گاہکوں کی نظر بچا کر گلا سڑا پھل دینے سے گریز نہیں کرتا۔ گویا وہ بھی جو کر سکتا ہے کرتا ہے تو پھر دوسروں سے گلہ کیوں؟ موقع دیکھ کر ہر شخص ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے؟ معاشرتی بگاڑ کی ایک بنیادی اور باریک وجہ یہ بھی ہے۔ "معبر خیال" پر مختصر تبصرہ ہی کریں گے۔ عبدالجبار رومی انصاری کا تبصرہ پُراسرار نمبر کی مناسبت سے اچھا لگا۔ سدرہ بانو ناگوری کی تجویز سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔ واصف علی واصف پر تفصیلی سرگزشت ضرور دیں۔ صائمہ نور آپ نے صحیح لکھا مگر اب تو بے حیائی و بے پردگی کو آرٹ کہا جانے لگا ہے۔ نہ جانے آنے والے وقت میں کیا کیا کچھ ہمارا منتظر ہے؟ الحمد خلیل چوہدری! خوش آمدید۔ آپ کے پاس سرگزشت کی صورت میں جو ذخیرہ موجود ہے، وہ یقیناً لکھنے کے حوالے سے آپ کے کام آئے گا۔ کشمالہ حسن نے دنیا بھر میں پھیلنے والے انوکھے امراض سے خوب آگاہی دی۔ آج کل دنیا سوائن فلو اور اس طرز کی متعدد بیماریوں سے نبرد آزما ہے۔ جب میں سرگزشت پر یہ تبصرہ مکمل کر رہا تھا تو خبر آئی کہ معروف قلمکار محی الدین نواب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نواب صاحب کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ محی الدین نواب اپنی تحریروں کی صورت قارئین کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ہو سکے تو ان کی روداد حیات دوبارہ سے شائع کر دیں اور ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پھر کاشف زبیر بھی ساتھ چھوڑ گئے۔"

☆ رانا محمد سجاد کی شاہ جمال مظفر گڑھ سے آمد۔ "کافی عرصے کے بعد حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اتنے عرصہ غیر حاضری کی وجہ تاخیر سے رسالہ ملنا ہے۔ اب کی بار جلد مل گیا تو حاضر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (یاد رہے کہ اب 15 تاریخ تک موصول خطوط کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے)۔ کچھ کہانیوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر رسالہ اچھا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو معراج رسول نے کہانی سنا کر ہمیں اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی ترغیب دی ہے، جس نظام کو ہدف تنقید کرتے ہیں پھر اسی کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انتظار حسین صاحب کی انتقال کی خبر آ گئی۔ افسوس اردو افسانہ نگاری کا ایک باب بند ہوا۔ عبدالجبار رومی صاحب سے ملاقات ہوئی خوب صورت تبصرہ تھا۔ اعجاز حسین سٹھار، محمد سلیم قیصر کا خوب صورت تبصرہ لیے ہوئے تھے۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ اب کراچی کے حالات کیسے ہیں؟ صائمہ نور ہمارے قریبی شہر سے حاضر ہوئیں۔ اویس شیخ نے بڑی خوب صورت بات کی اسلام کے حوالے سے سکھ رہنما کا حوالہ دیا۔ "بینا نابینا نمبر" کی بات آپ نے بالکل درست کی۔ یہ شمارہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بہت خوب بشریٰ افضل بھی آئی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار حاضری دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ احسان سحر کا طویل تبصرہ بھی خوب صورتی لیے ہوئے تھا۔ محمد خلیل چودھری آپ خوش نصیب ہیں جو کہ سرگزشت کے پرانے شمارے حاصل کر رہے ہیں ورنہ ہمارے ہاں تو یہ بھی نہیں ملتے۔ تجزیاتی جائزہ میں وحید ریاست بھٹی صاحب کی محبت جابجا بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اعزاز بھی صرف اور صرف سرگزشت کو حاصل ہے۔ باقی تمام رسالوں میں سے ہمیں تو خود بھی یاد نہیں کہ ہم نے کب شرکت کی تھی۔"

☆ اویس شیخ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھتے ہیں۔ "معبر خیال" میں سدرہ کے خط نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ جھاڑو اور چھتے کی بات بہت اچھی لگی۔ ناصر حسین کافی معلوماتی خط لے کے آئے۔ خطوط ہونے ہی ایسے چاہئیں۔ وحید ریاست سالانہ رپورٹ پر شکریہ ادا کرنا فرض تھا۔ وحید آپ کی محبت کو سلام۔ محفل کے روح رواں جونانی صاحب آپ نے کافی اچھی باتیں شیئر کیں۔ فلک شیر دل چھوٹا مت کریں کیونکہ سرگزشت میں اپنے آپ کو منوانا پی ایچ ڈی کرنے سے کم نہیں، اس کا معیار بھی نظر میں رکھیں۔ قیصر "احتساب" پاکستان میں کس چڑیا کا نام ہے۔ صائمہ نور اچھا لکھ رہی ہیں۔ انور عباس اگر کوئی مرض ہے تو اس کا علاج بھی ضرور ہے۔ صوبی شاہ! میری اسٹڈی روم بھی اتفاق سے چھت پر ہے۔ پُراسرار نمبر پڑھ کے میری کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ محی الدین نواب اور کاشف زبیر بھی رحلت فرما گئے، فروری کا ماہ اردو ادب کے لیے خاصا بھاری رہا۔ خدا ان سب کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ "باراں دیدہ" کے لیے کون سے ستائشی الفاظ لکھوں۔ "رہنما" کے سحر میں کھویا تو لی کی یو آن، ماؤزے تنگ، مارگریٹ تھیچر اور مرسی اور ان جیسے کتنے نام ذہن میں آئے۔ "شاعر بنگال" شعر کہنا واقعتاً خداداد صلاحیت ہے، اچھی سوچ بھی خدا کسی کسی کو عطا کرتا ہے۔ "نانگا پربت کا عقاب" کے بعد انہی کی تحریر شامل کریں، کسی اور کا سفرنامہ نہیں۔ منظر امام تاریخ کے مختلف ادوار کی خوب سیر کروا رہے ہیں۔ "بیت بازی" میں شاعر کا نام شامل کرنے کی شرط ضرور رکھیں۔ سلسلے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ سچ بیانیاں پڑھیں۔ سچ بیانیوں کے عنوان کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔ افسانہ، ناول، نثری نظم تو عنوانوں کے محتاج ہوتے ہی ہیں مگر انسانی زندگی پر گزرنے والے لمحات، بیتیاں عنوانوں کی محتاج نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہر بنی نوع انسان کی زندگی خود ایک بہت بڑا عنوان ہے (عنوان صرف ایک پہچان ہے)۔ خیر عنوان "حوصلہ" نہیں "وہ ایک لفٹ" ہونا چاہیے تھا۔ نوجوان کی حاضر دماغی ہی اس کا حامی و مددگار ثابت ہوئی۔ "بے غیرت" پڑھی انسان مرد ہو یا عورت اس کا اپنا دامن صاف ہو تو قدرت اپنی رحمت اور کرم نوازی کے معجزے خود اسے دکھاتی ہے۔ مریم مراد کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ "نیکی" پڑھی۔ جذبے سچے ہوں تو منزلیں مل کے ہی رہتی ہیں، وہ جس انداز میں بھی ملے۔ "انداز محبت" کے دو جملے بہت پسند آئے۔ "مجھے اس کی الّو جیسی آنکھیں اور بے

وقوفوں والی صورت پسند نہیں''، ''میں تمہاری اُلو جیسی شکل سے نہیں تم سے پیار کرتی ہوں؟ تم کوئی شہزادہ گلفام ہو کہ جو تمہیں دیکھے گا تم پر مر مٹے گا آئینے میں کبھی اپنی شکل دیکھی ہے۔ بے وقوف انسان! ان دو جملوں کو کتنی ہی دیر تک گنگنانے کے انداز میں پڑھتا رہا۔ ''قاتل'' تحریر نہیں، اندوہناک سانحہ تھا۔ سانحہ پشاور کے ہم پلہ، خدا ان بچوں کے والدین کو صبر دے، آمین۔ ''نکاح نامہ'' کوئی تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ''کرب'' صرف عورتوں کی زندگیوں میں کیوں لکھ دیئے گئے، کبھی کبھی سوچتا ہوں خدا سے روزِ محشر پوچھوں گا۔ ''روپ بہروپ'' معاشرے اور سماج کی تلخ حقیقت ہے اگر یہ طبقہ اپنا مائنڈ سیٹ درست سمت میں کرلے تو میں دعوے سے یہ بات کہہ سکتا ہوں روئے زمین عاملوں، پیروں، فقیروں اور نجومیوں سے پاک ہو جائے۔''

☆ **احمد خان توحیدی کراچی سے لکھتے ہیں۔** ''شمارہ مارچ 29 فروری کو ملا۔ برادر معراج رسول صاحب، قائداعظم اور قائد ملت کے بعد محمد خان جونیجو واحد وزیراعظم تھے جن پر کوئی الزام نہ آیا۔ موجودہ سیاسی لیڈران اعلانیہ کہتے ہیں ہم نے کروڑ روپیا خرچ کیا ہے تو ہزار گنا زیادہ حاصل کرنا ہمارا حق بنتا ہے۔ نیب نے مگرمچھوں پر ہاتھ ڈالا تو ذاتی مفاد میں آرڈیننس جاری کردیا۔ اس مسئلے کا واحد حل سرعام کوڑے اور پھانسی کا پھندا ہے۔ ''کتھا کار'' راجندر سنگھ کے بارے میں پہلے بھی مفصل پڑھا تھا واقعی وہ عظیم قلمکار تھے۔ محفل ''عبیرِ خیال'' میں پہنچے۔ میں نے 4 یا 5 فروری کو خط حوالہ ڈاک کیا تھا۔ محفل میں تو کیا رہ جانے والوں میں بھی میرا نام نہیں ہے کیا وجہ ہے (موصول نہ ہونا)۔ بھائی ناصر حسین رند اچھے تبصرہ کے ساتھ کرسی صدارت مبارک ہو۔ وحید ریاست بھٹی صاحب اچھا تبصرہ واقعی عظیم رائٹر محی الدین نواب سسپنس، سرگزشت، جاسوسی کو یتیم کر گئے۔ اللہ رحمت برسائیں (آمین ثم آمین)۔ سسٹر طاہرہ گلزار! اتنے عظیم صحافی کا روٹھ جانا کا کیا غم نہیں ہے جو آپ کی نانی اماں خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ باچا خان یونیورسٹی کا المناک سانحہ سمجھ میں نہیں آتا، بے ضمیر بے دین دہشت گردوں کی معصوم کلیوں سے کیا دشمنی ہے؟ (یہ معصوم پھول ہی ہمارا مستقبل تھے۔ ان کا خون بہا کر دہشت گردوں نے ہمارے مستقبل کو تاریک کرنا چاہا ہے)۔ سعید احمد چاند، انور عباس شاہ، سدرہ بانو ناگوری، اعجاز سہار، فہد خان، فلک شیر، عمران جونانی نے اچھے تبصرے لکھے۔ محی الدین نواب کے حالات تفصیل سے لکھیں (نواب بیتی ملاحظہ کرلیں، بھرپور انداز میں زندگی کا احاطہ ہے)۔ ڈاکٹر ساجد کی ''باران دید'' پسند آئی۔ پلیز رائٹر حضرات مدیر تکبیر صلاح الدین مرحوم اور شہید پاکستان حکیم محمد سعید مرحوم، مہاتیر محمد قوم و ملک کے واقعی عظیم رہنما تھے جو صرف قومی مفاد چاہتے ہیں۔ ''شاعر بنگال'' بچوں نے اپنے مضمون بنانے کے لیے قبضہ کرلیا میں نے تاحال پڑھا نہیں ہے۔ انور فرہاد صاحب کی ''سیلف میڈ'' حقیقی فلمی واقعات پر آفاقی صاحب کی یاد تازہ کرنے پر شکریہ، اسے جاری رکھیں۔ ''اثاثہ'' صحرا میں ایسی کہانیاں روزانہ جنم لیتی ہیں۔ کیونکہ مفاد پرست ڈیم بنانے نہیں دیتے نتیجہ کہ پانی جمع نہیں ہوتا۔ اب جنگ پانی پر ہوگی۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں صائمہ اقبال نے جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے والے حبیب جالب پر مختصراً لکھا، تفصیل سے مکمل حالات لکھیں۔ ''پراسرار ہائی جیکر'' واقعی عجیب اسٹوری ہے۔ جب رقم اپنے استعمال میں لانی نہ تھی تو ڈاکا سے کیا حاصل ہوا؟ ایسے ہوا میں غائب ہو جانا جیسے انسان کی بجائے جن بھوت ہو۔ سچ بیانیاں میں ستون سے گاڑی ٹکرانا واقعی عمران کی حوصلہ مندی ہے۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ لفٹ دے کر ایسی وارداتیں عام ہیں۔ ''بے غیرت'' منگنی کے بعد لڑکیوں کو منگیتر کے ساتھ ایسے مقام پر بالکل نہیں جانا چاہیے۔ ہمارے وقتوں میں منگنی کے بعد شادی سے پہلے منگیتر کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا یقیناً شعیب مریم کو ارادہ بد سے ساحل پر لے گیا تھا۔ والدین کو آگاہ کر کے مریم نے بہت اچھا کیا۔ تبھی تو مراد جیسا فرض شناس رفیقِ حیات مل گیا۔''

☆ **طاہرہ گلزار کی اداس آمد پشاور سے۔** ''دوستوں مارچ کا سرگزشت 2 مارچ کی شام 5 بجے ملا۔ کانپتے ہاتھوں سے فہرست کھولی تو فہرست میں کاشف زبیر کا نام دیکھ کے دل خون کے آنسو رویا۔ آہ! کاشف زبیر نہ رہے۔ یہ عمر تو اس کے جانے کی نہیں تھی۔ ابھی 3 جنوری کو تو میں نے Birth day کا میسج کیا تھا اور جواب میں اس کا میسج Thanks کے ساتھ آیا۔ ایک بھائی کے جانے سے جو خلاء میرے دل میں بنا ہے وہ صرف میرا اللہ جانتا ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے بھائی کاشف زبیر کو جنت الفردوس میں سب سے اعلیٰ مقام عطا کرے اور اس کے گھر والوں کو صبر عطا کریں، آمین ثم آمین۔ معراج رسول انکل کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے یک صفحی کی طرف سفر کیا۔ اس باریک صفحی میں راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں پڑھا۔ راجندر سنگھ بیدی ان چند مشہور لکھنے والوں میں شامل ہیں جو شاہکار تحریریں لکھتے رہے ہیں۔ ادارے والوں نے مجھے جواب دیا ہے کہ مختصر اور جامع خط لکھیں تو پہلے نمبر پر بھی شائع ہو جائے گا۔ میں جامع لکھنے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتی ہاں اگر آپ کی نظر میں سرگزشت کا پورے صفحے کا خط مختصر ہوتا ہے تو پھر یقیناً میرا خط ان خطوط کا بچہ ہے (ایسے خط میں کتنے اہم نکتے شامل ہوتے ہیں ان پر غور کیا؟)۔ پہلے نمبر پر بھائی ناصر حسین رند اپنے جاندار اور جامع تبصرہ لے کر حاضر تھے، مبارکاں بھائی۔ تجمی رحمٰن مختصر خط کے ساتھ شامل تھی۔ واقعی پاکستان تو نام کا اسلامی ملک ہے کون سا ظلم ہے، جو یہاں نہیں ہوتا لیکن کیا کریں! وحید ریاست بھٹی بھی اپنی شاندار تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ بھٹی بھائی میرا بی پی ہمیشہ کم ہی رہتا ہے۔ مجھے لوگوں کی منافقت اور ریاکاری اور چاپلوسی پر غصہ آتا ہے۔ جونانی بھائی بھی حاضر تھے۔ بہت خوب صورت لکھتے ہیں۔ فلک شیر ملک اپنے منفرد طرزِ تحریر میں تبصرہ

لے کر حاضر تھے۔ مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔ اعجاز حسین سخار بہت خوب صورت تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ واہ دل خوش ہو گیا۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ حاضر تھی۔ مبارک ہو۔ سدرہ بانو ڈیئر میرا نام طاہرہ گلزار ہے۔ گلزار میری امی کا نام ہے۔ شکر ہے کہ مجھے کوئی احساس کمتری نہیں ہے اور میرا حوصلہ بھی چٹان سے زیادہ مضبوط ہے۔ میں بہت جلد اپنی سرگزشت بھیجوں گی پڑھ کے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھے انسانوں سے اور خاص کر مردوں سے کیوں نفرت ہے۔ باقی تبصرہ آپ کا بہت جاندار ہے آپ کے جھاڑو اور چمٹے والی بات پر بہت ہنسی آئی۔ باقی میرا بچپن بہت شاہانہ اور لاڈ و پیار سے گزرا ہے۔ صائمہ نور بھی خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھیں۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب کراچی سے۔'' خط لکھنے کی تیاری تھی کہ جاسوسی ڈائجسٹ کے ذریعے کاشف زبیر کی رخصتی کی اطلاع ملی۔ یہ آج کل ادب پر کیا عجب زوال آیا ہے کہ آسمان ادب کے بڑے روشن ستارے یکے بعد دیگرے بجھتے جا رہے ہیں۔ علی سفیان آفاقی سے شروع ہونے والا مرثیہ اب تک خاموش نہیں ہوا۔ علی سفیان آفاقی کے بعد حمید اختر، انتظار حسین، فاطمہ ثریا بجیا، محی الدین نواب، فلمی دنیا سے روبن گھوش اور اب ادبی دنیا کا نامور نام تہہ خاک جا چھپا ہے۔ کاشف زبیر ایک ایسا نام جن کی کہانیاں بلا کھٹکے کھلے بندوں پڑھ لیں والدین اور بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر تبصرہ کر لیں کہیں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ ان کے ہیرو اخلاقیات اور اچھائیوں کی ریشم سے بنے ہوتے ہیں۔ عورت کا منفی تذکرہ کر کے انہوں نے کبھی اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ان کے ولن بھی ان کے ہیرو کی ٹکر کے ہوتے تھے۔ کاشف چلے گئے لیکن ان کے کردار جمیل راجا جمی، تیمور، شامی، شمی، ڈیوڈ شا، راجا صاحب، سویرا، فولاد خان ہمیشہ یادوں کی دریچے پر دستک دیتے رہیں گے۔ ندیم اقبال نے '' نانگا پربت کا عقاب'' دلچسپ یادوں اور اچھی باتوں کے ساتھ اختتام پذیر کیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' بھی یقیناً خوب ہوگا۔ ''شاعر بنگال'' کی شاعری اور حالات زندگی خوب رہی۔ انور فرہاد نے ''قلم نگری'' اچھے انداز میں تحریر کی۔ پریتی زنتا اپنے نام کی طرح بہت خوب صورت ہیں مگر ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنے خوب صورت اور نازک جذبات کی مالک ہوں گی۔ ''اثاثہ'' حساس موضوع پر لکھی گئی ہے پانی کی بوندوں کے لیے تڑپتے، سسکتے اور بلکتے زندہ لاشوں نے رلا دیا۔ پہلی سچ بیانی پڑھ کر حیران رہ گئے کہ لوٹ مار کرنے کے کیا کیا گر اپنائے جا رہے ہیں۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر غنڈہ گردی کرنے والے ان کم عقلوں کو خدا سمجھے۔ ''قاتل'' پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ اس ماں کا تصور کرتے ہوئے بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ یہ ایک ماں کا حد سے بڑھا ہوا کرب ہی تو ہے کہ وہ اپنی کوکھ کے اجڑنے کا قصوروار اپنے جیون ساتھی کو سمجھ رہی ہے۔ خدا ایسا غم کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ ''نکاح نامہ'' ہنستی مسکراتی تحریر ہے۔ اب ''روپ بہروپ'' پر تبصرہ۔ آج کل کچھ حضرات ایسی کہانیاں لکھ رہے ہیں جو کہ دین اسلام سے تعلق رکھنے والوں سے لوگوں کو دور کر دے یا بیزار کر دے۔ اس میں مولانا آفاق پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی بیوی نے جب آپ کو بتایا کہ باہر دیوانی کے چیخنے چلانے کی آواز آ رہی ہے تو اس وقت آپ اپنی نیند کو رو رہے تھے اگر آپ باہر جا کر اسے بچا لیتے تو کیا تھا مگر آپ نے تو مولانا آفاق کا ہمشکل لڑکا دکھانے اور اسلام کو بدنام کرنا تھا تو آپ بھلا باہر کیوں نکلتے۔ آخری سچ بیانی میں نورین کو اپنی نادانی کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی۔''

☆ محمد سلیم قیصر نے سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔ ''محترمہ سدرہ بانو ناگوری حوصلہ دینے پر آپ کا دل سے مشکور ہوں۔ آج پھر لکھنے بیٹھا ہوں تو اس کے پیچھے آپ ہی کا حوصلہ ہے۔ نیک تمناؤں کے اظہار پر میں دل کی گہرائیوں سے محترمہ صائمہ نور اور محترمہ طاہرہ گلزار کا شکر گزار ہوں۔ جناب عبدالجبار رومی انصاری خوب صورت لکھتے ہیں۔ اعجاز حسین سخار، فلک شیر ملک، انور عباس شاہ، اویس شیخ، خالد محمود، احسان سحر، سعید احمد چاند، محمد خلیل چودھری، عبداللہ شجاع، محترمہ سدرہ بانو ناگوری، محترمہ صائمہ نور، محترمہ بشریٰ افضل، محترمہ فرزانہ نگہت اور طاہرہ گلزار آپ سب نے بہت خوب صورت لکھا۔ آپ موجود رہیں میری ہمیشہ خواہش رہے گی۔ آخر میں یہی اپیل کروں گا کہ میری زندگی کو آپ کی خوب صورت دعاؤں کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔''

☆ فلک شیر ملک شاہ گڑھ رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ ''مارچ کا شمارہ پڑھا اور اچھا لگا۔ میرے خط میں کچھ کانٹ چھانٹ کی گئی تھی۔ (اگر کانٹ چھانٹ نہ کی جائے تو دیگر احباب کو موقع ہی نہ ملے۔ مختصر اور بھرپور لکھنا فن ہے۔ مختصر لکھنے کی کوشش کریں) سرورق رسالے کی خوب صورتی کا باعث تھی۔ راجندر سنگھ بیدی کا مختصر اور معلوماتی تعارف بہترین انداز میں پیش کیا گیا۔ ''معبر خیال'' میں نئے آنے والے قارئین کرام کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ خصوصاً عامر زمان عامر کی آمد خوش آیند بات ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کا تبصرہ کافی حد تک درست تھا۔ پیاری بہن میں گرجنے برسنے والا انسان نہیں ہوں۔ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں اور میرا کام لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے، نا کہ نشتر چبھونا۔ 27 سال فوج کی خدمت میں گزرے۔ ایک بات سیکھی ہے جس کا کوئی مول نہیں اور وہ ہے اچھے اخلاق۔ اچھا لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں بس دل میں ایک کسک سی ہے کہ میری کوئی تحریر سرگزشت کی زینت بنے۔ انشاء اللہ جلد ہی میری کوششیں رنگ لائیں گی اور میری تحریریں سرگزشت میں ضرور لگیں گی۔ کلینک پر مریضوں کا رش ہونے سے مطالعہ کا ٹائم تھوڑا رہ جاتا ہے۔ پھر بھی اپنا شوق ضرور پورا کرتا ہوں۔ احسان سحر کے مشورے کا مشکور ہوں۔ بھیا سحر صاحب ٹینشن میرے نزدیک سے بھی نہیں گزرتی۔ شاہد جہانگیر شاہد

کے لیے دعا گو ہوں اللہ آپ کو صحت کاملہ سے نوازے۔ نواب محی الدین، فاطمہ ثریا بجیا اور کاشف زبیر کے لیے بھی مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ سرگزشت دراصل اجڑے اور بکھرے لوگوں کے قصے، سچے جذبات، آپ جگ بیتیاں اور معاشرے کی الجھی سلجھی الٹی ٹیڑھی گھر کے اندر اٹھنے والی فریادوں کا حال دل ہے۔''

☆ صائمہ نور نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''ماہ مارچ کا سرگزشت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلد اور بروقت مل گیا۔ ٹائیٹل بہت خوب صورت بنایا گیا اور یہ سرگزشت کا خاصا رہا ہے کہ ہر بار بہتر سے بہترین سرورق ٹائیٹل بناتا ہے۔ بہت خوب اداریہ میں معراج رسول سیاسی مجرموں کو سزا دلوانے کی اپیل کررہے تھے۔ سیاسی مجرموں کو فوری سزا دی جاتی تو آج میرے پیارے وطن کا یہ حال نہ ہوتا۔ ماہ فروری رخصت ہوا چاہتا ہے۔ ظالم فروری نے کلیجہ چھلنی چھلنی کردیا ہے۔ ادب کے افق پر جگمگاتے ستارے ادب کو یتیم کر گئے۔ چھ فروری کو محترم انتظار حسین چل بسے۔ اگلے دن محی الدین نواب پھر ندا فاضلی اور مشہور و معروف ڈراما نگار، افسانہ نگار فاطمہ ثریا بجیا ہمیں تنہا چھوڑ گئیں اور پھر دل گیر خبر یہ آئی کہ کاشف زبیر یہ جہاں چھوڑ گئے۔ آہ......! ہم سب نے چلے جانا ہے کہ مگر ان عظیم ہستیوں کا یوں یکے بعد دیگرے چلے جانا غمگین کر گیا۔ ''سراب'' نجانے آگے چل پائے گی یا نہیں۔ کاشف زبیر تو ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' بہترین سفرنامہ رہا۔ اُمید کرتی ہوں کہ ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' بھی کامیابی کی سند پائے گا۔ شدت سے انتظار ہے۔ ''تاریخ عالم'' ہمیشہ کی طرح خوب رہی۔ ''سیلف میڈ'' اور ''اثاثہ'' بھی خاصے کی تحریریں تھیں۔ ''مارچ کی شخصیات'' خوب رہی۔ ''پراسرار ہائی جیکر'' نے حیران کردیا۔ ''شاعر بنگال'' کا تذکرہ شاندار رہا۔ ''رہنما'' مریم کے خان نے خوب صورت حروف کے ساتھ پیش کیا۔ برصغیر کو غلام بنانے والے کی داستان ''باران دیدہ'' نے حیرت میں مبتلا کردیا۔ اس کے ساتھ ''بیت بازی'' اور ''علمی آزمائش'' زبردست رہے۔''

☆ قیصر خان کا کچھی کلاں بکھر سے اظہاریہ۔ ''ڈاکٹر قرۃ العین کی واپسی بہت اچھی لگی۔ ہم پریشان تھے کہ کہاں گم ہوگئی ہیں۔ پرچہ اس بار بھی شاندار تھا۔ سب کہانیاں اچھی تھیں ان سچ بیانیوں میں ''حوصلہ'' واقعی وہ حوصلے والا تھا اس مشکل حالات میں بھی دماغ کو قابو میں رکھا۔ ''بے غیرت'' شعیب صاحب تو بہت ہی بے حس اور بزدل بے حیا ٹائپ کے تھے۔ ''اندازِ محبت'' کا محبت کے انداز ایسا بھی ہوتا ہے اچھا لگا۔ ''روپ بہروپ'' بہت نیکی کی باتیں کرنے والے اندر سے شیطان ہوں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ استغفار کا زمانہ ہے۔ ''بددعا'' یا بدنظر جو بھی کہیں لیکن محتاط نہ رہنا یا لڑکیوں کو آزاد کرنا پرواہ نہ کرنا تو نتائج ایسے ہی آئیں گے۔ ''نیکی'' اس کو محبت کہوں، جنون کہوں یا خدا کی ذات پر بھروسا لکھوں۔ کچھ لوگ واقعی اللہ کے بہت قریب ہوتے ہیں چھوٹی چھوٹی نیکیاں کر کے۔''

☆ بشریٰ افضل بہاولپور سے۔ ''کتھارکار'' یک علمی سرگزشت نے ہماری معلومات میں خاصا اضافہ کیا۔ اپنی محفل دوڑ کر پہنچے ویسے چھلانگ چھوٹی سی ہی تھی۔ ناصر حسین رند کو کرسی صدارت پر بڑے اسٹائل سے بیٹھے پایا۔ دیکھیں خوشی تو ہوتی ہے نا اتنی پذیرائی پر جاندار اور خوب صورت تبصرہ تھا، مبارکاں۔ وحید ریاست بھٹی ہمیں یاد رکھا شکریہ۔ آپ کا تجزیہ خوب تھا۔ عارف صاحب واقعی ہمارے ملک میں بڑا ٹیلنٹ ہے کسی بھی شعبے کو دیکھ لیں بغیر ٹریننگ کے کامیابی سے آگے بڑھتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں۔ تسنیم آپ کی آپ بیتی کا انتظار رہے گا۔ صائمہ نور ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ۔ احسان سحر آپ کی یادآوری کا شکریہ۔ وکیل الرحمٰن کی کھری کھری باتیں سنیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین وعلیکم السلام۔ سعید احمد نے سب لوگوں کو یاد رکھا ہمارا خط تو تاخیر سے بھی نہ پہنچا۔ ''مارچ کی شخصیات'' پڑھا ان میں سے کچھ شخصیات ہم میں موجود نہیں ہیں معلومات میں اضافہ تو ہوا۔ ''سیر پاکستان'' پسند آیا۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار کا خلوص نامہ نور پور تھل سے۔ ''محی الدین نواب اور کاشف زبیر کی وفات کی افسوس ناک خبر نے افسردہ کردیا۔ تعریف و توصیف کے محتاج نہیں تھے ان کا فن ہر دور میں زندہ رہے گا۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ بھکر والے چھائے ہوئے ہیں۔ تمام مضامین، سلسلوں اور کہانیوں پر سرسری نظر ڈالی اور ''مارچ کی شخصیات'' نے توجہ کھینچ لی۔ اب کی بار محمد علی۔ تارڑ، شاہد آفریدی، عاطف اسلم، حبیب جالب، انضمام الحق اور عابد علی کے حالات اور جدوجہد مزے دار رہی۔ واقعی یہ سلسلہ ہر طبقے کے افراد کے لیے معلومات کے خزانے سے کم نہیں ہے بلکہ میں اس کو وسعت دینے کی فرمائش کروں گا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' نے دل موہ لیا۔ صفحات الٹتے پلٹتے غیر ارادی طور پر سچ بیانیوں کی طرف آنکلا ہوں۔ ''حوصلہ'' کافی سنسنی خیز اور دل کی دھڑکن بے ترتیب کرنے والی کہانی ثابت ہوئی۔ ''بے غیرت'' میں مریم کے موقف کی تائید کے سوا چارہ نہیں ہے لیکن ہر مرد کو پورے انصاف سے شعیب کی جگہ دے کر فیصلہ کرنا ہو گا۔ بزدلی اور بہادری وقت اور حالات کی مرہونِ منت ہے ایسی افتاد پڑنے پر کون سے جذبات جاگتے ہیں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ''نیکی'' میں کئی ڈرامائی موڑ آئے اختتام بھی فلمی انداز میں ہے۔ ''اندازِ محبت'' میں ایک بات قابلِ غور ہے کہ زندگی کے ساتھی کا انتخاب کرتے وقت خوب صورتی کے ساتھ کردار کی پختگی اور گھر چلانے کی صلاحیتوں کو بھی نظر میں رکھیں۔ ورنہ زندگی خوابوں کے ٹوٹنے اور جذبوں کے قتل کا ماتم کرتے گزر جاتی ہے۔ ''قاتل'' کے واقعات سے جن کا سامنا ہے اس کی اذیت قریبی عزیز اور والدین ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

ملنے ملانے والے چند دن کی ہمدردی کے بعد اپنے مسائل میں الجھ کر دوسرے کے دکھ اور پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔ ''نکاح نامہ'' نے واقعی ذہنی کوفت سے آزاد کر کے فریش کر دیا۔ ''کرب'' کے واقعات الجھے ہوئے نظر آئے۔ سیٹھ شہروز خان کے انکشاف نے دھما کا جیسا ماحول بنا دیا۔ ''روپ بہروپ'' میں ایک مولوی کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن خود ہمارے کتنے روپ ہیں۔ کہتے کچھ ہیں اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ دوسروں کو نیکی، ایمانداری اور غریب پروری کا سبق دیتے ہیں لیکن اپنے اندر ہر طرح کی خباثتیں بھرے بیٹھے ہیں۔ ظلم کرتے ہیں غریبوں کا حق مارتے ہیں۔ پہلی فرصت میں اپنا احتساب ضروری ہے۔ ''بددعا'' میں دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ عرفان کے جال سے بچا جا سکتا تھا لیکن فطری کمزوری مات دے گئی اور محبت کی کمزوری لے ڈوبی۔''

☆ انور عباس شاہ کا خلوص نامہ دریا خان بھکر سے۔ ''مارچ کا شمارہ وقت پر ملا۔ اس بار بھی آپ کی بچی اور کھری باتیں دل میں اتر گئیں۔ سیاستدان بہت ہی طاقت ور اور اثر رسوخ والے ہوتے ہیں ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چاہے وہ کچھ بھی کر لیں کتنے ہی بندے کیوں نہ مروا دیں۔ آپی طاہرہ گلزار کو ہم بھائی کی شادی کی مبارک باد دیتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی نانی اماں کے انتقال پر تعزیت بھی پیش کرتے ہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد کے لیے بھی دعا گو ہیں کہ خداوند کریم ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ محی الدین نواب، کاشف زبیر اور تمام معزز ہستیاں جو ہم سے بچھڑ گئیں خداوند کریم ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ فریدہ جاوید فری اور علی حسنین تابش کو تہہ دل سے خوش آمدید۔ قیصر خان بھی کافی عرصہ بعد ''شہرِ خیال'' کی زینت بنے۔ ''حوصلہ'' بالکل کسی فلمی سچویشن کی طرح ایک تحریر تھی۔ ویسے آج کل کے ماحول کو مدِنظر رکھتے ہوئے موصوف کو بغیر سوچے سمجھے اجنبی افراد سے لفٹ نہیں لینی چاہیے تھی۔ ''مارچ کی شخصیات'' کا مضمون بھی بے حد دلکش تھا۔ خاص طور پر اس میں شامل اداکار محمد علی اور موسیقار نثار بزمی کا ذکر ہمیں بہت ہی بھلا لگا۔ ''پراسرار ہائی جیکر'' کے بارے میں تفصیلاً پڑھا بہت مزہ آیا۔ بے حد دلچسپ اور معلومات سے بھرپور مضمون ''نانگا پربت کا عقاب'' خیر سے اختتام پذیر ہوا۔ ساتھ ہی ندیم اقبال صاحب نے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنا دوسرا سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' بھی بھیج رہے ہیں اگر اسی مضمون کے ساتھ مختلف مناظر کی تصاویر بھی شائع ہو جائیں تو سونے پر سہاگا ہو جائے گا کیونکہ ان کا اندازِ تحریر بہت اچھا ہے۔ ''قاتل'' ایک بے حد دکھی اور دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

☆ مرزا طاہر الدین بیگ کا اظہاریہ میرپور خاص سے۔ ''خطوط میں رند صاحب کا نمبر اوّل تھا۔ ظاہر ہے تبصرہ بھی اچھا تھا۔ سدرہ بانو ناگوری اور طاہرہ گلزار کے ساتھ ساتھ وحید صاحب کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ آپ بیتیوں میں ''قاتل'' اور ''نکاح نامہ'' اچھی تحریریں تھیں۔ ''بے غیرت'' سبق آموز تحریر تھی۔ سرگزشت ہاتھ میں آتے ہی محترم آفاقی صاحب مرحوم کی یاد آتی ہے کیا بات تھی فلمی الف لیلہ کی۔ دعا ہے رب کریم آفاقی صاحب کو جنت فردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ نشرِ مکرر کے طور پر آفاقی صاحب کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور شامل اشاعت کریں۔ مارچ کی شخصیات، پراسرار ہائی جیکر، نانگا پربت کا عقاب بہت خوب رہیں۔ ''تاریخ عالم'' منظر امام زبردست معلوماتی تحریر لے کر آئے، بہت زبردست تھی۔''

☆ فرزانہ نگہت نے راولپنڈی سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کے فروری و مارچ کے شماروں کا پرشوق موقع ملا۔ دونوں اپنی جگہ ایک سے ایک بڑھ کر خوب تر پائے۔ ڈاکٹر ساجد امجد اور عبدالرب بھٹی میرے پسندیدہ قلمکار ہیں۔ اس کے بعد کاشف زبیر صاحب، سنا ہے وہ کچھ علیل ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ (آہ! ہم انہیں کھو بیٹھے ہیں)۔ ''یاراں دیدہ''، ''شاعر بنگال'' اور ''سیلف میڈ'' خاص طور پر پسند آئیں۔ سچ بیانیوں میں ''اندازِ محبت'' ''منفرد لگی۔ آپ کی خدمت میں پہلے دو تحریریں بھیجی تھیں۔ شاید معیار میں پوری نہیں اتریں۔ اب یہ تین مزید تحریریں حاضر خدمت ہیں۔ رائے سے نوازیے۔ (پہلی ہی تحریر منتخب ہو گئی ہے۔ باقی بھی اچھی ہوں گی)۔''

☆ عبدالوحید مزاج کی میانوالی سے آمد۔ ''جیسا کہ آپ کو علم ہو گا کہ 4 اپریل کو ذوالفقار علی بھٹو کی برسی ہے اس حوالے سے میں تحریر ارسال کر رہا ہوں شائع کر کے ممنون فرمائیں یہی تحریر آج تیسل بھی کر رہا ہوں (ذوالفقار علی بھٹو پر مفصل تحریر شائع ہو چکی ہے)''

☆ غلام سرور کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''قارئین کی دینی معلومات کے لیے منسلک قرآنی آیات پر مبنی مواد برائے اشاعت ارسال خدمت ہے۔ (ڈائجسٹ پڑھ لینے کے بعد لوگ ردی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس لیے ہم قرآنی آیات شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں تاکہ بے حرمتی کے گناہ سے بچا جا سکے)۔''

☆ سیف احمد چاند نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''راجندر سنگھ بیدی کے متعلق معلوم تو پہلے بھی تھا مگر سرگزشت میں تفصیل پڑھ کر پوری معلومات ہو گئیں۔ پھر ''شہرِ خیال'' میں داخل ہوئے۔ محی الدین نواب، روبن گھوش، فاطمہ ثریا بجیا اور کاشف زبیر کی الم ناک جدائی کا بڑا صدمہ پہنچا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ناصر حسین رند، وحید ریاست بھٹی، طاہرہ گلزار کا شکر گزار ہوں انہوں نے میری غیر حاضری کو

محسوس کیا۔ میں جان بوجھ کر غیر حاضر نہیں رہا بلکہ محکمہ ڈاک کی ستم ظریفی کا شکار رہا۔ میں تو کوشش کرتا ہوں کہ ہر مہینا حاضر ہوتا رہوں اپنے بہن بھائیوں کے درمیان مگر نہ جانے محکمہ ڈاک مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے جو مجھے حاضر ہونے سے روک دیتا ہے۔ کچھ عرصہ سے میری فیورٹ تنقید نگار روبینہ انصاری بھی غائب ہیں خدا کرے وہ خیریت سے ہوں۔ میں غیر حاضر رہا مگر سرگزشت پابندی سے خریدتا ہوں۔ روبینہ انصاری کچھ عرصے سے بہت پریشان تھیں اللہ ان کی مشکلیں آسان کرے۔ پ ب نے محی الدین نواب کے انتقال پر لکھا ہے مگر تفصیل سے نہیں لکھا پڑھ کر تشنگی سی رہتی ہے (محی الدین نواب پر نواب بیتی کے عنوان سے اتنا بھرپور چھپا ہے کہ اگر کچھ دیا جاتا تو تحریر مکرر ہوتی)۔ ناصر حسین رند، وحید ریاست بھٹی، ایم عمران جونانی، فلک شیر ملک، اعجاز حسین سٹھار، سدرہ بانو ناگوری، طاہرہ گلزار، صائمہ نور، قیصر خان، انور عباس، احسان سحر، محمد عمران کے تبصرے اچھے لگے۔ بھکر سے بہن بھائیوں کی آمد میں ماشاء اللہ خاصا اضافہ ہو رہا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ڈاکٹر ساجد امجد کا ''باراں دیدہ'' مریم کے خان کا ''رہنما'' سید زین مہدی کا ''شاعر بنگال'' منظر امام کا ''تاریخ عالم'' انور فرہاد کا ''سیلف میڈ'' صائمہ اقبال کا ''مارچ کی شخصیات'' کاشف زبیر کی ''سراب''۔ سچ بیانیوں میں عمران کا ''حوصلہ'' مریم مراد ''بے غیرت'' شائستہ جاوید کی ''نیکی'' ناظم بخاری کا ''اندازِ محبت'' انور زیب کا ''نکاح نامہ'' ظہیر مرزا کا ''کرب'' اعجاز احمد راحیل کا ''روپ بہروپ'' شمائلہ احمد کی ''بددعا'' بہت پسند آئیں۔ ''بیت بازی'' میں عقیل احمد اور فلک شیر ملک سرفہرست رہے۔ باقی آیندہ فقط انور فرہاد صاحب سے گزارش ہے منور سلطانہ، ممتاز شانتی، نوتن کی سوانح حیات پر بھی روشنی ڈالیں۔''

☆ شاہد جہانگیر کا پیغام پشاور سے۔ ''بستر مرض نے جکڑ رکھا ہے۔ مرض کی وجہ سے بینائی پر بھی اثر پڑا ہے۔ تمام احباب سے گزارش ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ پورا رسالہ پڑھ نہیں سکا ہوں۔ چشمہ لگا کر میگنی فائنگ گلاس سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جن دوستوں نے یاد رکھا سب کا شکریہ۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا تبصرہ لاہور سے۔ ''سر کاشف زبیر کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اپنی خوبصورت تحریروں کے ذریعے وہ قارئین کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کا خلا کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ادب کی دنیا میں ان کی کاوشیں لائق تحسین ہیں انہیں کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ قوم کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اب یہ تحقیقاتی اداروں کی مضبوطی اور طاقت پر منحصر ہے کہ وہ ایسے کرپٹ عناصر کو کس طرح قانون کی گرفت میں لاتے ہیں۔ ورنہ تو اوپر سے نیب کے لیے آواز آ گئی کہ ''معصوم'' لوگوں کو تنگ نہ کیا جائے۔ ''معبرِ خیال'' کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ۔ ناصر حسین رند کی تبصرہ نگاری بہترین رہی۔ جاندار خط لکھنے پر مبارک ہو۔ نجمی رحمٰن کے تبصرہ نے بھی توجہ کھینچ لی۔ بہت اچھا لکھا ہے۔ وحید ریاست بھٹی کا اندازِ تحریر دلکش رہا۔ فریدہ جاوید فری، عارف پیرس، عامر زمان، علی حسنین تابش، تسنیم زہرا، رضا احمد، آصف ضیاء، صوبی شاہ، محمد احمد رضا انصاری، محمد عمران، سجاد سرور اور احسان سحر کے تبصرے مختصر مگر بہت عمدہ رہے۔ عمران جونانی بھرپور تبصرہ زبردست رہا۔ فلک شیر ملک بھی تنقید و تعریف میں بہترین رہے۔ وکیل الرحمٰن اور اعجاز حسین کی بے تابی بھی لگتا ہے ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر قرۃ العین کا خلوص نامہ بھی عمدہ رہا۔ سدرہ بانو ناگوری کی اداسی میں طاہرہ گلزار کو مشورہ ٹھیک ہے اور طاہرہ اپنے تبصرے میں تو سویٹ سویٹ ہی رہتی ہیں مگر...... صائمہ نور' آمین' آپ کا اندازِ تحریر بے حد عمدہ ہے۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ ''نانگا پربت کا عقاب'' لاجواب ہے۔ شاہد جہانگیر، اللہ آپ کو جلد صحت دے۔''

☆ حکیم سید محمد رضا نقوی ضلع میانوالی سے لکھتے ہیں۔ ''پچھلے سال علی سفیان آفاقی صاحب رحلت فرما گئے اور اس مرتبہ یکے بعد دیگرے محی الدین نواب صاحب اور کاشف زبیر صاحب اس فانی دنیا سے چلے گئے ہیں۔ ادارہ اور قارئین کے لیے یہ صدمات ہیں مگر اس جہاں رنگ و بو سے ہر ایک کو جانا ہے۔ تینوں حضرات ادارہ کے رسائل کی جان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ''کتھا رکار'' میں راجندر سنگھ بیدی کے حالات بتائے گئے ہیں۔ بیدی ایک عظیم لکھاری تھے۔ ''معبرِ خیال'' میں داخل ہوئے۔ ناصر حسین رند کا جاندار تبصرہ پڑھا۔ اس کے علاوہ وحید ریاست بھٹی، ایم عمران جونانی، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین، طاہرہ گلزار، قیصر خان، انور عباس شاہ، شاہد جہانگیر شاہد اور احسان سحر کے تبصرے اور محبت نامے زیرِ نظر آئے۔ نوے سالہ مہاتیر محمد جو ملائیشیا کے مردِ آہن ہیں کی حالاتِ زندگی پسند آئی۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' کی قسطیں مزہ دے گئیں۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں مختصر ابڑے لوگوں کے حالات پڑھے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ کاشف صاحب کی ''سراب'' میرے خیال میں اب اختتام کی طرف جا رہی ہے۔ مار دھاڑ سے مزین سلسلہ ہے۔ ''بیت بازی'' کا سلسلہ بھی بہتر ہے۔ سچ آپ بیتیاں بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ''حوصلہ'' میں عمران صاحب نے واقعی حوصلے کا اور جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ ''بے غیرت'' ایک سبق آموز کہانی ہے۔ شعیب نے اپنی منگیتر کو چھوڑ کر فرار کا راستہ اختیار کر کے بے غیرتی کا ثبوت دیا ہے۔ نیکی میں شائستہ صاحبہ کو اپنے صبر اور نیکی کا صلہ ملا ہے۔ ''اندازِ محبت'' ایک اپنے انداز کی اچھوتی کہانی ہے اور اب اپنے بہترین دوست اعجاز احمد راحیل ساہیوال کی ''روپ بہروپ'' پڑھی۔ واقعی بعض لوگوں کے چہرے دیکھنے میں جتنے مخلص نظر آتے ہیں

ویسے ہوتے نہیں۔ راحیل صاحب نے ایک نازک مسئلے کو چھیڑا ہے۔ آفاق صاحب جو عالم دین تھے نے ایک غلط روش اختیار کی۔ گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوئے اور بعد میں بے نقاب ہو گئے۔ آخر میں ایک اور بات کہ سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کے پرانے لکھاری، تفسیر عباس، بابر عباس، راجا ثاقب نواز، ہمایوں سعید صاحب، ماہا ایمان صاحبہ غائب ہیں اور ان کے تبصرے شائع نہیں ہو رہے۔ وہ کیوں غائب ہیں۔''

☆ رضا احمد اعوان دریا خان بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ''باجی طاہرہ گلزار کی فائن لگانے کی دھمکی اور ضلع بھکر کے بھائی قیصر خان کے خلوص نے مجبور کیا کہ ''مشہرِ خیال'' میں انٹری دوں۔ دراصل امی کے انتقال کے بعد بہت پریشان رہتا ہوں۔ جب کوئی دکھ ملتا ہے تو قبرستان جا کر ماں کی قبر کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں ان سے باتیں کرتا ہوں۔ میری بدقسمتی کہ سگے بھائی، میری جان کے دشمن بن گئے۔ میرا وراثتی مکان مجھ سے چھین لیا۔ آج دربدر ٹھوکریں کھا رہا ہوں کوئی سایہ نہیں، کوئی منزل نہیں۔ ماں کی بیماریوں نے ہمیشہ پریشان کیے رکھا کوئی علاج معالجے میں کمی نہ چھوڑی۔ دن رات خدمت کی، انہی مسائل میں الجھا رہا۔ عمرِ عزیز کے 30 سال گزار چکا ہوں۔ اپنا نشان منزل کھو چکا ہوں۔ جاؤں تو جاؤں کہاں؟ ''مشہرِ خیال'' میں اپنا دکھ اس لیے بیان کیا ہے کہ ایک تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ''مشہرِ خیال'' کے بھی بہن بھائی سلجھے ہوئے، ہمدرد، حساس اور اچھے ذہن و دل کے مالک ہیں۔ اب آیئے مارچ کے سرگزشت کی طرف۔ یک مکی میں ''کتھا رکار'' راجندر سنگھ بیدی کے متعلق پڑھ کر ان کے اردو ادب میں ادبی مقام کی حیثیت کا پتا چلا۔ بے شک وہ اپنے وقت کے عظیم فنکار تھے۔ مسندِ صدارت پر براجمان ناصر حسین رند صاحب کو مبارک باد۔ فروری میں رخصت ہونے والی شخصیات انتظار حسین، عظیم رائٹر محی الدین نواب، کاشف زبیر اور محترمہ آپا فاطمہ ثریا بجیا کی رحلت پر دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی دوران ایک نیوز چینل پر خبر سنی کہ اداکار حبیب بھی چل بسے ہیں۔ فلم نگری میں ''سیلف میڈ'' کے عنوان سے پریتی زنٹا کے متعلق پڑھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی باتوں اور تجربات سے فائدہ اٹھا کر ناکامیوں کو کامیابیوں میں بدلا جا سکتا ہے۔ ''شاعر بنگال'' وحشت کلکتوی کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ سید زین مہدی کی یہ کامیاب کوشش تھی۔ ''مارچ کی شخصیات میں اداکار محمد علی، مستنصر حسین تارڑ، حبیب جالب، افتخار عارف، موسیقار نثار بزمی، کرشن چندر اور شوکت عزیز جیسی شخصیات جلوہ گر تھیں۔'' ''پراسرار ہائی جیکر'' نے حیرت زدہ کر دیا۔ سچ بیانیوں میں ''حوصلہ'' شائستہ شاہد کی ''نیکی'' ناظم بخاری کی ''انداز محبت'' بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ اس کے علاوہ شمائلہ احمد کی ''بددعا'' اور انور زیب کی نکاح نامہ بھی اچھے انداز کی کہانیاں تھیں۔ احسان سحر سے گزارش ہے کہ اگر موسیقار خواجہ خورشید انور کے بارے میں آپ کے پاس کچھ معلومات ہوں تو ضرور لکھیں۔ میں نے کتاب ''مشاہیر بھکر / میانوالی'' میں پڑھا ہے کہ خواجہ خورشید انور کا تعلق میانوالی سے رہا ہے جو کبھی ہمارا بھی ضلع رہا ہے۔ شاہد جہانگیر شاہد کی علالت کا پڑھ کر تشویش میں مبتلا ہوئے خدا ان کو جلد صحت کاملہ عطا کرے، آمین۔ بھکر دریا خان سے انور عباس شاہ کا تبصرہ خوب تھا۔ شوکت خنک آج کل کہاں ہیں؟ ''مشہرِ خیال'' میں کیوں نہیں آ رہے اور روبینہ نفیس انصاری بھی اسکرین سے غائب ہیں۔ خدا کرے کہ خیریت سے ہوں۔ صائمہ نور ملتان کا تبصرہ شاید مجھے اس لیے اچھا لگا ہے کہ یہ میرا بھی فیورٹ شہر ہے۔ ملتان سے میری خوب صورت یادیں وابستہ ہیں۔ ''مشہرِ خیال'' میں آپ ضرور آیا کریں۔ باقی وحید ریاست بھٹی، فریدہ جاوید فری، ایم عمران جونانی، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین کے تبصرے خوب تھے۔''

☆ محمد علی کا اظہاریہ پاراچنار سے۔ ''اس ماہ کے سرگزشت میں جو بات تھی وہ کافی اہم تھی۔ ایسا اداریہ صرف معراج رسول ہی لکھ سکتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں دل ہلا دیا۔ کاش کوئی مہاتیر محمد ہمارے ہاں آ جائے یا پھر ایسا لیڈر جو آج کے ان لٹیروں کو جو ملک و قوم کو کھا رہے ہیں ان سے عوام کا بدلہ لے سکے۔ میرا پسندیدہ سلسلہ ''اس ماہ کی شخصیت'' ہے۔ مختصر مختصر معلومات کے ذریعے مکمل حالات مل رہے ہیں۔ الفاظ کے جادوگر ندیم اقبال کو سلام۔ ان کی اگلی تحریر کا شدت سے انتظار ہے۔ سچ بیانیوں میں حوصلہ بہت پسند آئی۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔''

☆ نیاز ملکانی کا خط جدہ سعودی عرب سے۔ ''یہاں سرگزشت اتنی دیر میں پہنچتا ہے کہ تبصرہ لکھا نہیں جا سکتا۔ ایک دوست آتے وقت نیا شمارہ لے آئے تھے۔ جلدی جلدی ای میل سے تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ ''رہنما'' قابلِ تقلید کردار پر مبنی تحریر ہے۔ ''سیلف میڈ'' بھی پسند آئی۔ ''شاعر بنگال'' پڑھ کر وحشت کلکتوی کا مشہور شعر یاد آ گیا۔ ''رنگ لاتی ہے حنا پتھر پر گھس جانے کے بعد، سرخرو ہوتا ہے۔ انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد'' ''مارچ کی شخصیت'' اور ''پراسرار ہائی جیکر'' بھی پسند آئی۔ سچ بیانیوں میں حوصلہ، انداز محبت، بددعا اور روپ بہروپ بہت پسند آئی۔''

تاخیر سے موصول خطوط: زاہد حسن، نازش علی، زرینہ بٹ، شائستہ جبیں، نوخیز حسن انصاری (کراچی)۔ فاطرہ احمد (حیدر آباد)۔ زہیب علی (ملتان)۔ نثار علی (شاہ پور)۔ آنندل جاکھرانی (جیکب آباد)۔ زین علی (لاہور)۔ فصاحت خان (پشاور)۔ آصفہ بتول (کوئٹہ)۔ نیاز علی (سوکی)۔ عباس مھکری (فیصل آباد)۔ عارف چودھری (چوکی)۔ زبیر رضوی (مظفر گڑھ)۔ حبیب محمد (سیالکوٹ)۔ انیس احمد (مانچسٹر یوکے)۔

آہ......کاشف زبیر

پ ب

یہ کیسا اداس موسم اترا ہے کہ قلم سے رشتہ رکھنے والوں پر اجل کے سائے اترے چلے آرہے ہیں اور ہمارا ایک جواں سال رفیقِ سفر اور قارئین کا مقبول قلم کار، کاشف زبیر بھی اسی سائے کی آغوش میں جا سویا ہے۔ اس کی تحریریں لوگ دل و جان سے پڑھتے تھے مگر اب وہ ایک گزرا ہوا نام ہے...... جو کچھ ہوا چند دنوں میں ہوا...... چند دنوں میں ہوا......کسے خبر تھی کہ اس کے پسماندگان کو ایسے وقت میں اس کی موت کا غم اٹھانا پڑے گا جب انہیں اس کی سخت ضرورت تھی۔

ہم سب کے چہیتے قلم کار کو خراجِ تحسین

محی الدین نواب کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ 22 فروری کا منحوس دن آگیا۔ سرگزشت، سسپنس اور پاکیزہ مارکیٹ میں آچکے تھے، جاسوسی ڈائجسٹ پیسٹنگ کے مراحل میں تھا کہ ایس آئی یو ٹی سے اطلاع آگئی اور سب سکتے میں رہ گئے۔ ہر روز کی طرح اس دن بھی دفتر آتے ہی کاشف کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا گیا تھا اور ان کی بہن سے بات ہوئی تھی کہ ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر ایسی اطلاع وہ بھی باہر سے؟ گھبرا کر اسی وقت فون کیا تو بہن نے جواب دیا ''سب کچھ ختم ہوگیا۔'' واقعی سب کچھ ختم ہوگیا۔ جس نے بڑی ہمت سے بہت تھوڑے عرصے میں قلم کے زور پر اپنا مقام بنایا تھا وہ اب نہیں رہا۔ کاشف زبیر ایک نام نہیں حوصلے کا پہاڑ تھا۔ بہت سوں کو شاید اس بات کی خبر نہ ہو کہ 3 جنوری 1971 کو راولپنڈی میں محمد زبیر کے گھر پیدا ہونے والا یہ باہمت نوجوان چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ بچپن میں اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ معذوری کے شکنجے میں آگیا تھا۔ لیکن تعریف ہے اس کے حوصلے کی، اس نے خود کو کبھی معذور نہیں سمجھا اور پڑھائی میں بھرپور دلچسپی لی۔ ابتدائی تعلیم مونٹی کارلو اسکول (کراچی) سے لی اور ہائی اسکول سے کراچی یونیورسٹی تک نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اسے کرکٹ سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس نے 1996 میں کرکٹ پر ایک مضمون لکھا اور اسے ڈاک سے جاسوسی ڈائجسٹ کے دفتر بھیج دیا۔ ادارتی ارکان کو اس کی تحریر میں گہرائی نظر آئی اور اسے خط لکھا گیا کہ تحریر میں کچھ خامیاں ہیں اگر انہیں درست کرلیں تو آپ بہت اچھا لکھ سکیں گے۔ اگلی تحریر آئی تو جملوں کی ساخت اسی طرح کی تھی جس کا مشورہ دیا گیا تھا۔ واقعی اس نے تحریر میں

خوبصورتی لانے کے لیے مشوروں پر عمل کیا تھا۔ مطالعہ کا دورانیہ بڑھا دیا تھا۔ دوسروں کی تحریروں میں جملوں کا استعمال کیسے ہوا ہے اس پر غور کیا تھا۔ ''کھلاڑی اور جواری'' کے ساتھ ہی دوسری کہانی ''بائی چانس'' بھی شائع ہوگئی۔ اعزازیہ ملتے ہی اس نے شکریہ کا خط لکھا۔ اردو ادب کی یہ روایت رہی ہے کہ قلم کار کو صرف واہ واہ ملتی ہے۔ منٹو سے دو دو روپے میں کہانی لکھوائی گئی۔ منشی دل سے ساغر صدیقی تک سب ''شعر کہہ اور بھوکا مر، اس خدمت کو جاری رکھ'' کی تصویر بنے رہیں۔ یعنی قلم سے روٹی کمانا جوئے شیر لانا تھا۔ یہ تو ڈائجسٹ آنے کے بعد انقلاب آیا کہ لکھنے والوں کو بہت زیادہ نہ صحیح لیکن پیسے ملنے لگے (بھارت اور دیگر ممالک میں تو آج بھی کہانیاں صرف شوق کے لیے لکھی جا رہی ہیں) پاکستان میں ادبی پرچے تو آج بھی اعزازی پرچے دے کر دامن چھڑا لیتے ہیں۔ اس کی کہانی چھپی اور اعزازیہ پہنچا تو اسے ایک نیا حوصلہ ملا۔ یہ بات بھی کو معلوم ہوگی کہ معراج رسول صاحب ہر مصنف کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے تھے۔ انہوں نے دفتر سے گاڑی بھیج کر کاشف کو بلایا اور ملاقات کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ چند ابتدائی کہانیوں کے بعد کاشف کو خصوصی اعزازیہ دیا جانے لگا۔ اسی بات سے کاشف زبیر کو حوصلہ ملا اور وہ ایک کے بعد ایک کہانیاں بھیجتا چلا گیا۔ گھر میں بیٹھے ہوئے ایک معقول ماہانہ رقم حاصل ہونے لگی تھی۔ اس نے اس شوق کو بطور پیشہ اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ گو کہ ابھی اس کی تحریر میں کچا پن تھا لیکن ایڈیٹروں نے بھی ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جملوں کی خرابی، کہانی کا اختتام یا ابتدائیہ خود ہی تبدیل کر کے دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کرتے۔ کاشف زبیر ان تبدیلیوں کو دیکھ کر سمجھ جاتے کہ کہاں کہاں ان سے چوک ہوئی ہے اور اگلی کہانی میں وہ غلطی نظر نہ آتی یعنی کہ اس میں ایک اچھے شاگرد کے مکمل اوصاف تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کاشف کی تحریر میں نکھار آگیا اور اسی کے ساتھ اعزازیہ بھی مزید بڑھا دیا گیا۔ جب کہ اب بھی اس کی کہانیوں کو ایڈیٹنگ کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن ادارتی عملہ خوشی خوشی اس کی کہانیوں کو سنبھال لیتا۔ خود جب میں نے اس کی کہانیوں کو دیکھنا شروع کیا تو حیرت ہوئی۔ سرگزشت میں سچے واقعات یا سچ پر مبنی کہانیاں ہی دی جاتی تھیں لیکن سراب فنتاسی پر پہنچ گئی تھی۔ اس کہانی کا ون لائین آئیڈیا دیکھا تو اس میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ پرانے شمارے نکلوائے تو پتا چلا کہ دس بارہ قسط پہلے کہانی کو پھیلانے کے لیے اس نہج پر موڑا گیا تھا۔ اب اسے سنبھالنا بھی تھا۔ اس سلسلے میں فون پر باتیں ہوئیں اور یہ طے ہوا کہ فنتاسی کو کم کر کے حقیقت سے قریب لایا جائے اور کاشف نے حقیقت کو تسلیم کر کے وعدہ کرلیا کہ ایسا ہی ہوگا جو غلطی ہوگئی ہے فنتاسی کی طرف مڑگئی ہے اسے اختتام میں نمٹا دیا جائے گا اور پھر کہانی اسی انداز میں چلنے لگی۔ یہ کاشف کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ اپنی غلطی کو فوراً مان لیتا جو اس کے بڑے پن کی نشانی تھی۔ یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے اور ایسے ہی لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ اسی لیے وہ دوڑنے کی حد تک تیز بڑھ رہا تھا۔ اس نے لکھنے کی رفتار بہت تیز کردی تھی۔ عام شخص یقین بھی نہیں کرسکتا کہ وہ ڈائجسٹ کے ڈیڑھ سو صفحہ سے ایک سو ساٹھ صفحہ ہر ماہ لکھنے لگا تھا۔ اس پر ٹوکا بھی گیا کہ خود پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔ لکھنے کے لیے صرف انگلیاں ہی نہیں تھکتیں ذہن بھی تھکتا ہے لیکن کاشف کے اپنے کچھ خواب تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ انتھک محنت کرتا رہا تھا اور ادارے نے بھی پیشگی ادائیگی کی صورت میں اس کے ساتھ بھرپور تعاون جاری رکھا۔ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کاشف کو مزید مالی وسائل کی تلاش تھی۔ اس جستجو میں اس نے ادارے کے علاوہ بھی کچھ کام کرنے شروع کردیے لیکن حیف...... تقدیر کی تحریر کے آگے انسان کی ہر تدبیر ناکام ہوجاتی ہے۔

کاشف کی کہانیوں میں وہ درد وہ روانی تھی جو کہنہ مشق مصنفین ہی کے حصے میں آتی ہے۔ اس نے زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جس کی طرف عام آدمی کی نظر ہی نہیں جاتی۔ اس کی کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ پڑھنے والا اس میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ کاشف زبیر کی موت ادارے اور قارئین کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ نواب محی الدین جیسے الفاظ کے جادوگر کے بعد کاشف کو بھی کھو دینا ایک سانحہ سے کم نہیں لیکن کیا کریں کہ ''ہر شے کو فنا ہونا ہے'' خدا کی مصلحت کو خدا ہی جانے، کیوں اس نے ہم سے ایک اتنے اچھے فنکار کو چھین لیا۔

☆☆☆

صاحبِ دل

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نے عیش و آرام میں زندگی گزاری، بہت بڑی جاگیر کا مالک کہلایا لیکن اس کی سوچ جاگیردارانہ نہیں تھی۔ وہ عام نوابین سے مختلف تھا کیونکہ اس کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا تھا جو خوشبو کی طرح ہوتے ہیں۔ محسوس تو ہوتے ہیں، دکھائی نہیں دیتے۔ یعنی مفادِ عامہ کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں مگر تشہیر کی حاجت نہیں رکھتے، اس نے یہ ثابت بھی کیا۔ مسلمانانِ ہند کے لیے کچھ کرتے ہیں مگر تشہیر کی حاجت نہیں رکھتے، اس نے یہ ثابت بھی کیا۔ مسلمانانِ ہند کے لیے بے لوث ہو کر کام کیا جب کہ اس وقت لوگ صرف زبانی جمع خرچ کررہے تھے اور یہ انہیں سمجھاتا کہ مزدور کو دیکھا ہے تو دیکھا ہے عمل میں، اس کو تو کبھی سوچ میں غلطاں نہیں دیکھا۔ اس لیے اپنی راحتوں سے جب بھی فرصت ملے تو دوسروں کا دکھ درد اپنے دل میں جگا کر دیکھو اس سے خدا اور بندئہ خدا خوش رہتے ہیں۔ اپنے قول کو عملی جامہ پہنانے جب میدانِ عمل میں اترا تو دنیا دیکھتی رہ گئی۔

فروغِ تعلیم میں ناقابل فراموش کردار ادا کرنے والے شخص کا زندگی نامہ

بچہ ماں کے قریب لیٹا کروٹوں پر کروٹیں لے رہا تھا۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ سونے کی کوشش کررہا ہے لیکن سو نہیں پارہا ہے۔ کچھ ہے جو اسے بے چین کیے ہوئے ہے۔ بچہ اتنا چھوٹا بھی نہیں۔ تین چار سال کا اچھا بڑا بچہ ہے۔ بولنا جانتا ہے۔ کوئی تکلیف ہوتی تو بتا بھی سکتا تھا بالآخراس کی ماں نے خود اس سے پوچھ لیا۔

''حبیب الرحمٰن کیا بات ہے۔ کہیں درد ہے کیا؟ کیوں نہیں سو رہے ہو؟''

''چراغ تو بجھایئے۔ میں اجالے میں کیسے سو سکتا ہوں۔''

''آپ کو معلوم ہے شمع دان میں شمعیں بلاوجہ نہیں جل رہی ہیں۔''

''اگر ابا جان کتابیں پڑھ رہے ہیں تو انہیں پڑھنے دیجیے۔ مجھے ان کا پڑھنا برا نہیں لگتا۔ بس یہ روشنی...... چلیے میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ ابا جان تو کھانے سے پہلے مطالعہ کرتے تھے آج اتنی دیر تک۔'' بچے نے کہا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔

بچہ سونے کی کوشش کررہا تھا لیکن ماں نے پھر بھی ضروری سمجھا کہ روشنی کو زنجیر کردے۔ وہ خاموشی سے اپنے بستر سے اٹھیں اور کچھ فاصلے پر بیٹھے اپنے شوہر کے پاس آئیں۔

''کل ہی آپ بخار سے اٹھے ہیں۔ آپ کو اتنی دیر تک نہیں جاگنا چاہیے۔''

''کل مطالعہ میں ناغہ آگیا تھا۔ بس اسی کمی کو پورا کررہے ہیں۔''

''کتب خانے میں بیٹھ جاتے۔ یہاں روشنی کی وجہ سے عبدالرحمٰن پریشان ہورہا ہے۔ کروٹیں بدل رہا ہے۔''

''آپ سفارش لے کر آئی ہیں تو ہم روشنی لپیٹے دیتے ہیں لیکن صبح ہوتے ہی پوچھیں گے ضرور کہ ہمارے صاحب زادے ہوتے ہوئے مطالعہ پر اعتراض ہے۔ ہم صاحبزادے کی عمر کے تھے تو آمدنامہ ختم کرلیا تھا۔''

''جانے بھی دیجیے۔ ابھی وہ پورے چار کا تو ہوا نہیں

بسم اللہ تک ہوئی نہیں آمدنامہ کہاں سے پڑھ سکے گا۔''
''ارے ہاں، بسم اللہ پر یاد آیا۔ حبیب الرحمٰن بسم اللہ کی عمر کو کب پہنچ رہے ہیں۔''
''پانچ ماہ دس دن باقی ہیں۔'' بیوی نے انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بتایا۔
''میرے ایک دوست ہیں سید محمد حسن شاہ رام پوری۔ بڑے ولی آدمی ہیں۔ میں نے ان سے ابھی سے کہہ دیا ہے کہ حبیب الرحمٰن خان کی بسم اللہ آپ کو پڑھانی ہو گی۔''

وہ اپنے بستر پر آئیں تو بچہ بے خبر سو رہا تھا۔ انہوں نے سوئے ہوئے حبیب الرحمٰن کے کئی بوسے ایک ساتھ لے ڈالے اور اس کے برابر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئیں۔

حبیب الرحمٰن پر ابھی نماز فرض نہیں ہوئی تھی لیکن وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھتی تھیں تو اسے بھی اٹھا لیتی تھیں محض اس لیے کہ جب اس پر نماز فرض ہو تو اس وقت تک اسے صبح اٹھنے کی عادت پڑ چکی ہو۔ یہ ان کی تربیت کا ایک انداز تھا۔ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ وہ اٹھتا ضرور تھا لیکن جتنی دیر میں ماں بستر چھوڑتیں وہ پھر سو جاتا لیکن آج وہ بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں بھی نماز پڑھوں گا۔''
''نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں۔'' انہوں نے ایک ملازمہ سے کہا کہ وہ اسے وضو کرا دے۔ ملازمہ لوٹے میں پانی لے آئی۔

وہ ماں کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد ماں تو تلاوت کلام پاک کے لیے چوکی پر چلی گئیں۔ وہ بچہ تو تھا اس نے پھر بستر پکڑ لیا۔

محمد تقی خان مسجد سے واپس آئے تو وہ سو رہا تھا بہر حال انہیں یہ خوش خبری مل گئی کہ وہ بھی ماں کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

بچوں کو زیادہ دیر تک سونے کی عادت نہیں تھی لہٰذا اسے بھی جب روشنی اچھی طرح نمودار ہو گئی تو اٹھا دیا گیا۔ وہ سب سے پہلے مردانے میں والد کو سلام کرنے حاضر ہوا۔ اس دن خلافِ معمول انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔
''کیوں جی، آپ کو ہمارا مطالعہ کرنا بھی برا لگتا ہے۔''
''وہ نہیں تو۔''

''پھر کیوں رات کو احتجاج کر رہے تھے کہ ابا جان کے پڑھنے کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''
''میں نے تو روشنی کم کرنے کے لیے کہا تھا۔''
''اچھا ہم سمجھے ہمارا مطالعہ برا لگ رہا تھا۔''
''مجھے تو کتابیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں پڑھ نہیں سکتا۔ ورنہ میں آپ سے زیادہ کتابیں پڑھتا۔ میں بڑا ہو جاؤں پھر دیکھنا آپ سے بھی زیادہ جمع کروں گا۔''
''شاباش! میں یہی جاننا چاہتا تھا کہ تمہیں کتابوں سے شغف ہے یا نہیں کچھ دن اور کھیل کود لو۔ تمہاری بسم اللہ ہو جائے پھر ہم تمہاری تعلیم کا بھی بندوبست کریں گے۔ پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤ تو ہماری پڑھی ہوئی تمام کتابیں تم پڑھنا۔''
''انشاء اللہ۔''
''اب جاؤ، تمہاری والدہ ناشتے کے لیے تمہارا انتظام کر رہی ہوں گی۔''

☆......☆

حاجی عبدالشکور خان اپنے ایک رفیق ماسٹر عبدالرشید کے ہمراہ الٰہ آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ بھیکن پور کے رئیس اعظم ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو محتاج اور فقیر ہوٹل کے سامنے جمع ہو گئے۔ ان کی سیر چشمی اور فیاضی کے قصے الہ آباد تک پہنچے ہوئے تھے۔ اسی لیے خیرات کی آرزو میں فقراء دوڑے چلے آئے تھے۔ شور ہوا تو شکور خان نے نیچے جھانک کر بھی دیکھا اور اپنے رفیق سے پوچھا۔
''کون ہیں یہ لوگ۔ کیوں جمع ہوئے ہیں۔''
''حضور کی شہرت سن کر آ گئے ہیں۔ حضور کی غرباء پروری انہیں کھینچ لائی ہے۔''
''جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس قابل بنایا کہ لوگ اس سے اُمید باندھ لیں، اس انسان کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی اُمیدیں پوری کرے۔ جاؤ اور ان لوگوں کو ایک ایک کر کے ہمارے پاس بھیجو تا کہ ہم ان کی ضرورتیں سن کر انہیں پوری کرنے کی کوشش کریں۔''
''حضور، یہ لوگ بقول شخصے گھر دیکھ لیں گے۔ ابھی تو ہمیں یہاں کئی دن ٹھہرنا ہو گا۔ یہ لوگ تو کل پھر آ جائیں گے۔''

''عبدالرشید جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔ نیچے جاؤ اور ان لوگوں کو ایک ایک کر کے میرے پاس بھیجو۔''

ماسٹر کیا کرتے۔ اس نے ہر ضرورت مند کو ایک ایک کر کے ان کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ عبدالشکور خان جس کی جو حاجت ہوتی اسے پورا کرتے رہے۔ جب دوپہر ہو گئی تو اعلان کرادیا کہ جو باقی رہ گئے ہیں وہ کل آجائیں۔

دوسرا دن ہوا تو ماسٹر عبدالرشید نے دیکھا کہ وہی چہرے پھر آگئے ہیں جو ایک دن پہلے بہت سارا روپیا لے جا چکے تھے۔ انہوں نے عبدالشکور خان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی لیکن دریا کب دیکھتا ہے کہ کس کے پاؤں ڈوبے تھے کون خشک رہا تھا۔ عبدالشکور خان نے کوئی توجہ نہیں دی اور جو آیا اسے بانٹتے رہے۔

تیسرے دن یہ حال ہوا کہ تمام رقم جو پاس تھی فقرا پر خرچ ہو گئی۔ بادل کے پاس جو تھا وہ برسا دیا تھا۔ اب اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ ہوٹل کا بل ادا کر سکیں اور واپسی کے لیے ریل کا ٹکٹ خرید سکیں۔ ماسٹر عبدالرشید نے اپنے طور پر انتظام کیا اور بھیکن پور پہنچ کر حساب پیش کیا۔

یہ کوئی آج کی کہانی نہیں تھی۔ داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ ریاست کو فلاحی ادارہ بنا دیا تھا۔ لوگ ملازمت کے لیے آتے جواب ملتا کہ ٹھہرو، مہینوں ہو جاتے اور امیدوار اس طرح ریاست کے مہمان بنے رہتے۔ ضروری خرچا ماہ بہ ماہ ان کے گھر پہنچتا رہتا۔ ایک صاحب سالہا سال تک ملازمت کی امیدواری میں ٹھہرائے گئے چنانچہ اپنی وفات تک مقیم رہے۔ حتیٰ کہ جن لوگوں سے مقدمہ بازی رہتی تھی ان کو اپنے ہی خلاف مقدمہ بازی کے اخراجات کے لیے روپیا دیتے اور اپنے دسترخوان پر کھانا کھلاتے تھے۔ اس شاہ خرچی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی وفات کے بعد ریاست پر تین لاکھ کا قرض چھوڑا۔ یہ محمد تقی خان کے بڑے بھائی تھے۔

☆......☆

پٹھانوں کی ایک شاخ ''شروانی'' کا وطن افغانستان کے جنوب مغربی گوشہ میں کوہ سلیمان کے دامن میں تھا اور ایک ندی کے کنارے آباد تھے۔ 1506ء کے درمیان سوریوں نے انہیں ایک لڑائی میں جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ ہندوستان کی طرف آگئے۔ یہ ہمایوں کا عہد حکومت تھا۔ اس سے پہلے شہاب الدین غوری نے قندھار سے ملتان تک پٹھانوں کو خاص طور پر بسایا تھا۔ شروانی بھی ان میں گھل مل گئے۔ بہلول لودھی کے عہد میں راپڑی ضلع مین پوری میں کچھ شروانی امراء آباد ہوئے۔ اس قوم نے بہلول لودھی کے بعد سکندر لودھی کو برسر اقتدار لانے میں اہم کردار ادا کیا لہٰذا اس قوم کو بھی عروج ملا اور شروانیوں کو کئی علاقوں کا حاکم بنایا گیا۔

ہمایوں نے ان پٹھانوں کو زیر کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کی زندگی نے اسے یہ موقع نہیں دیا البتہ اکبر نے بہار، بنگال اور دوسرے علاقوں کے پٹھانوں کو اس طرح زیر کیا کہ ان کا شیرازہ بکھر گیا لیکن تلوار کے دھنی تھے۔ مختلف علاقوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے اور لڑتے بھڑتے رہے۔

اکبر کے خلاف بغاوتوں میں اللہ داد خاں شروانی پیش پیش تھے ان کے ساتھ سلیمان خاں شروانی بھی تھے۔ سلیمان خاں عہد شاہجہانی میں کول علی گڑھ کی طرف آئے۔

جہانگیر کے ملازمین میں ابدال خاں شروانی کا نام آتا ہے۔ کچھ لوگ بھیکن پور کے شروانیوں کا مورث اعلیٰ انہی کو کہتے ہیں۔

عالم گیر ثانی کی تخت نشینی کے وقت مرہٹوں اور بھوت پور کے راجا سورج مل جاٹ نے بغاوت کی اور کول پر قبضہ کر لیا۔ چھرہ اور بھموری سے شروانیوں کو بے دخل کر دیا۔ خاندان بھیکن پور کے مورث سرفراز خاں اور ان کے چچا دلیل خاں کو بھموری سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح اور کئی دیہات سے بھی شروانیوں کو نکال دیا گیا۔ چنانچہ شروانی ترک وطن کر کے گنگا پار چلے گئے۔ 28 سال کی جلاوطنی کے بعد باز خاں سرفراز خاں نے بھیکن پور میں رہنا شروع کیا اور مختلف جنگوں میں فتح یاب ہو کر اپنی حیثیت مضبوط کر لی۔

1793ء میں انگریزوں نے انہیں اس علاقے کا زمیندار تسلیم کر لیا۔

باز خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے داؤد خاں بھیکن پور کے زمیندار ہوئے اور پھر ان کے چھوٹے بھائی خان زمان خاں نے تین بیٹے چھوڑے۔ ہدایت اللہ خاں، حاجی عبدالشکور خاں اور تقی خاں۔

حاجی عبدالشکور خاں کو ریاست کا انتظام سونپا گیا۔

جب چھوٹے بھائی محمد تقی خاں کے گھر حبیب الرحمٰن پیدا ہوا تو اپنے بیٹوں کی موجودگی کے باوجود بچے کے حسن صورت کو دیکھتے ہوئے اسے متبنٰی بنالیا۔ وہ تقی خاں کے گھر میں پل رہا تھا لیکن نوازشات عبدالشکور خاں کی طرف سے ہو رہی تھیں۔ وہ بچپن میں بھی اسے بڑے لاڈ سے پورے نام کے ساتھ پکارتے تھے۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔

عبدالشکور خاں کی فیاضی ضرب المثل تھی لیکن یہ فیاضی

دوسروں کے لیے تھی خود اپنا حال یہ تھا کہ پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے۔ گھر داری بھی نہایت سادگی سے چلاتے تھے لیکن رفاہی کاموں میں دولت پانی کی طرح لٹاتے تھے اس لیے ہمیشہ قرضدار رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں یعنی تقی خاں اور عبدالشکور خاں میں بے حد اتفاق تھا۔ دونوں بھائی مل کر ریاست کا کام کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان صرف دو سال کا فرق تھا لیکن تقی خاں بڑے بھائی کا مثل والد احترام کرتے تھے۔ کبھی یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ ریاست کا پیسا اس بے دردی سے کیوں خرچ کر رہے ہیں۔

☆......☆

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ولادت 5 جنوری 1867ء کو صبح کے وقت ان کے آبائی قلعہ بھیکن پور میں ہوئی۔

جب حبیب الرحمٰن نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو دستور کے مطابق بسم اللہ ہوئی۔ تقی خاں پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ بسم اللہ ان کے دوست مولوی سید حسن شاہ صاحب رام پوری پڑھائیں گے۔ وہ تشریف لائے اور نہایت سادگی سے بسم اللہ کی رسم ادا ہوئی۔

ارادہ یہی تھا کہ ننھے حبیب الرحمٰن کی ابتدائی تعلیم بھی مولوی صاحب کے ہاتھوں ہوگی۔

بسم اللہ کی تقریب کو کئی دن ہو گئے تھے۔ محمد تقی خاں ریاست کے کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو حبیب الرحمٰن کو اپنے کتب خانے میں ایک کتاب کھولے بیٹھے دیکھا۔

''آپ یہاں کیا فرما رہے ہیں۔''

''آپ کی طرح کتاب پڑھ رہا ہوں۔''

''برخوردار پہلے پڑھنا تو سیکھیے۔''

''وہی تو کر رہا ہوں۔''

''صاحبزادے کتاب پڑھنا کسی استاد سے سیکھا جاتا ہے۔''

''آپ ہمارے لیے کوئی استاد منگوا دیں۔''

''ارے ہاں، ہمیں تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ یہ ریاست کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں ہم کل ہی بندوبست کرتے ہیں۔''

حبیب الرحمٰن کے پاس سے اٹھ کر وہ زوجہ کے پاس تشریف لے گئے۔ ''ہم تو یہ بھول ہی گئے تھے کہ حبیب الرحمٰن کے لیے کسی مولوی صاحب کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔''

''آپ کہہ تو رہے تھے کہ جن مولوی صاحب نے بسم اللہ پڑھائی تھی وہی اسے تعلیم بھی دیں گے۔''

''ہاں کہا تو تھا۔ اس کے بعد ہی تو مجھے باہر جانا پڑ گیا۔''

''اب بات کرلو۔''

''بات کیا کرنی، ان سے کہہ دوں گا وہ دوسرے دن سے آنا شروع کر دیں گے۔''

انہوں نے بات ضرور کی۔ مولوی صاحب خوش بھی ہوئے تھے کہ یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ آب و دانہ اٹھ گیا ہے۔ انہیں رام پور جانا پڑ رہا ہے۔

بھیکن پور کہنے کو ایک بے حقیقت موضع تھا مگر اس کی خاک میں کشش تھی۔ علی گڑھ سے قریب ہونے کی وجہ سے مشاہیر کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ عبدالشکور خاں اور خود تقی خاں عالم بھی تھے اور علماء نواز بھی۔ کہنے کو زمینداری تھی لیکن نوابوں جیسا طرز رہن تھا۔ مولوی ہوتے یا طبیب یا کسی اور ہنر کے حامل، ان کا دل ان ہی کے جلسے میں رہتا۔ مہینوں رہتے اور مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے۔ اس لیے حبیب الرحمٰن کی تعلیم کے لیے مولوی کا بندوبست کرنا مشکل نہیں تھا۔ علماء سے ذاتی مراسم تھے۔ اس خانوادے کے افراد کا حال دوسرے رئیسوں کی طرح نہیں تھا کہ شب و روز سیر و شکار کی مشغولیات میں صرف کر دیں، پڑھنے لکھنے کا عام دستور تھا۔ محمد تقی خاں نے مارہرہ کے میر فرزند علی بلگرامی کو ملازم رکھ لیا۔ انہوں نے پوری دل جمعی سے پڑھانا شروع کیا۔ وہ فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے گردانوں سے شروع کیا اور بہار دانش تک پہنچا دیا۔ ان کے بعد حکیم سلیم اللہ صاحب (کول) نے فارسی کے درس کو جاری رکھا اور سہ نثر ظہوری تک پڑھایا۔ اس کے بعد ایک نابغۂ روزگار ہستی سے تعارف ہوا۔ یہ تھے مولوی سید اکبر شاہ پشاوری۔ مولانا نہایت نکتہ رس، معنی آفرین طبیعت لے کر اس عالم میں آئے تھے۔ فارسی سے مناسبت طبعی تھی۔ مطالعہ وسیع و عمیق تھا۔ نثر فارسی کا ایسا ہی ذوق تھا جیسا نظم کا۔ یہ وصف کمیاب ہے۔ وہ جس وقت بھیکن پور تشریف لائے اس وقت حبیب الرحمٰن شرح جامی، شرح تہذیب اور فقہ کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا۔ انہوں نے منطق پڑھانی شروع کی پھر ''مختصر المعانی'' یہ دونوں کتابیں پورے اہتمام سے پڑھائیں۔ جو کچھ پڑھاتے اس کا ترجمہ فارسی میں بھی

کراتے جاتے تھے۔ اس طرح حبیب الرحمٰن کو فارسی اور عربی میں یکساں اہلیت حاصل ہوتی چلی گئی۔

اسی وقت دنیائے تعلیم میں دو تحریکوں کا غلبہ تھا۔ ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل و فطرت کی مطابقت کی کوشش اور دوسری تحریک علماء کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کر کے پرانی عربی تعلیم کی از سر نو تنظیم کی تحریک جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے تھے اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڑھ تھا۔ یہیں وہ درس گاہ تھی جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔ گویا وہ روشن خیال علماء کے سرخیل تھے۔

حبیب الرحمٰن کی عمر اب ایسی ہو گئی تھی کہ "پر" پھیلانے کی اجازت ملنے لگی تھی۔ اس نے پرواز کی اور علی گڑھ پہنچ گیا۔ مولوی لطف اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ طے کیا۔ ان سے اسباق کے حصول کا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کی انتہاپسندی کا شائبہ تک مزاج سے نکل گیا۔

کوئی علی گڑھ آئے اور سرسید سے نہ ملے یا کم از کم اس تعلیمی درس گاہ کو دیکھنے نہ جائے جو سرسید نے قائم کی تھی حبیب الرحمٰن سرسید کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں تھا اور جس نہج پر اس کی تعلیم رواں دواں تھی ایسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا لیکن سرسید کی جو خدمات ادبی اور تعلیمی میدان میں تھیں وہ اس کی عظمت کا قائل تھا۔ اس کے چچا عبدالشکور خاں بھی سرسید کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں تھے لیکن مدرستہ العلوم کے ٹرسٹی رہے اور ہزاروں روپے سے سرسید کی مدد کی۔

وہ بھی اپنے چچا اور والد کے حوالے سے سرسید سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔

اپنے دور کی اس عظیم درس گاہ میں قدم رکھتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگا۔ عمارت کی ظاہری خوبی نے قدم رکھتے ہی قدم پکڑ لیے۔ رہی سہی کسر سرسید سے مل کر پوری ہو گئی۔ وہ ایک شاندار کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے جیسے کوئی شیر بیٹھا ہو۔ چہرے پر رعب اور نور کی آمیزش ایسی تھی کہ نظر جمانا مشکل تھا۔ ادھر بھی عالم کچھ کم نہیں تھا۔ بھرا شباب مردانہ حسن، سپید رنگ، سیاہ خوب صورت داڑھی، سر پر زلفیں، بلند و بالا قامت، ترکی ٹوپی سر پر۔ سرسید اس نوجوان کو دیکھ کر حیران ہوئے لیکن اس نے یہ حیرانی جلد دور کر دی۔

"بھیکن پور میں رہتا ہوں۔ محمد خان زبان خاں کا پوتا ہوں جنہوں نے مسائل اربعین کے جواب لکھوائے تھے۔ عبدالشکور خاں میرے عم محترم اور والد محمد تقی خاں ہیں اور میرا نام حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہے۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میری آنکھیں خیرہ کرنے کا سامان ساتھ لائے ہو۔ عبدالشکور خاں کے بھتیجے ہو۔ کیا یہ نسبت اس لائق نہیں کہ میں تمہیں اپنے سامنے بٹھاؤں اور بہت دیر تک باتیں کروں۔

گفتگو کے دوران یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئے کہ وہ مولانا لطف اللہ سے تحصیل علم کے لیے علی گڑھ آیا ہوا ہے۔

یہ اچھا ہوا کہ کسی انتہا پسند مولوی کے ہتھے چڑھنے سے پہلے مولانا لطف اللہ کا شکار ہو گئے، یہ ایک روشن خیال مولوی ہیں جو تمہیں نئے خیالات اور فلسفے سے آشنا کریں گے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم انگریزی بھی سیکھ لیتے۔ آنے والے وقت میں انگریزی کے سوا چارہ نہیں ہو گا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ سرسید نے ضد کر کے اسے کھانے پر روک لیا۔ اس نے اپنے گھر میں سرسید سے متعلق جو باتیں سنی تھیں ان کا خلاصہ تو یہ تھا کہ سرسید نہایت اکل کھرے ہیں۔ اپنے معاملات میں نہایت سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ ملاقاتیوں پر زیادہ وقت صرف نہیں کرتے بس کام سے کام رکھتے ہیں لیکن سرسید اس وقت سراپا شفقت بنے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ حبیب الرحمٰن سے زیادہ اس کے بزرگوں کی خدمات کا خیال کر رہے ہیں۔

کھانے کی میز پر چھری کانٹے ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ ملازم ہاتھ باندھے سرسید کے بیٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی حبیب الرحمٰن نے بھی نشست سنبھالی لیکن میز پر سجے ہوئے کانٹے چمچے اس کے لیے بالکل نئے تھے۔ وہ پریشان تھا کہ ان چیزوں کا استعمال کیسے کرے گا۔ اس کے باوجود اس نے کانٹے چمچے سنبھال لیے اور اپنی پلیٹ میں ایسی چیزیں ڈال لیں جنہیں چمچے سے بہ آسانی کھایا جا سکتا تھا۔

"حبیب الرحمٰن صاحب، آپ نے ضرور اپنے گھر میں یہ سنا ہو گا کہ کھانے کے دوران باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"جی ہاں، بچپن میں ہمیں بھی تاکید کی جاتی تھی۔"

"آپ تو اب بھی اس کے قائل ہوں گے۔"

"اس میں حرج کیا ہے۔"

"لیکن میں چونکہ وقت کے ہر حصے کو استعمال کرنے کے حق میں ہوں اس لیے کھانے کی میز پر بھی باتیں کرتا ہوں۔ آپ کو یقیناً اعتراض ہوگا۔"

"بزرگ جو تلقین کرتے ہیں اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے لیکن یہ کوئی ایسا شرعی مسئلہ نہیں کہ آدمی گناہ گار ہو جائے۔ کھانے کی میز پر باتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔"

"بہت خوب! میں تم سے اسی روشن خیالی کی اُمید کر رہا تھا۔"

اب سرسید اسے اپنا ہم خیال دیکھ کر کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ زیادہ تر باتیں انگریزی تعلیم اور اس کے فروغ کے لیے ہر چھوٹے بڑے شہر میں مدارس کھولنے سے متعلق تھیں۔

حبیب الرحمٰن ان کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں تھا لیکن ان کی تعلیمی خدمات سے متاثر تھا لہٰذا اس وقت بھی وہ نہایت دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور اپنی تجاویز دیتا جا رہا تھا۔

یہ سرسید سے اس کی پہلی ملاقات تھی لیکن وہ یہاں سے دو خیالات لے کر اٹھا ایک تو یہ کہ سرسید سے ملتا رہے گا دوسرا ارادہ یہ کیا کہ وہ انگریزی بھی پڑھے گا۔

اس نے ماسٹر عبدالرشید علی گڑھ سے انگریزی پڑھنی شروع کر دی اور پھر آگرہ جا کر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخلہ لے لیا۔ اسکول کی تعلیم کے علاوہ مسٹر ورنن ہیڈ ماسٹر اور مسٹر گا کی سیکنڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا اور وہاں سے علی گڑھ آ کر مسٹر ہورسٹ (ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول) سے انگریزی ادب پڑھنے اور لکھنے کی کوشش کی۔

انگریزی کے ساتھ ساتھ تعلیم عربی بھی پوری توجہ کے ساتھ جاری رہی اس وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔

وہ حصولِ علم کے لیے کسی سیاح کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کر رہا تھا۔ دہلی گیا اور پھر دہلی سے پانی پت پہنچا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کا پتا معلوم کیا۔ کسی نے بتایا وہ محلہ انصار کی مسجد میں درس دیتے ہیں۔ پیاسا، کنویں کی تلاش میں اس مسجد میں حاضر ہو گیا۔ قاری صاحب وہاں موجود تھے۔ اپنا تعارف کرایا۔ خاندانی پس منظر تھا ہی ایسا کہ قاری صاحب کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ نہایت شفقت سے پیش آئے اور اس کی خواہش کے مطابق حدیث کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ چہل حدیث، شاہ ولی اللہ کی قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے پڑھی۔

صحیح بخاری کے نو پارے شیخ حسین عرب بھوپالی سے پڑھے۔ ایک عرب استاد شیخ حسین بن محسن الیمانی سے بھی تعلیم حاصل کی۔

حسین بن محسن الیمانی ہندوستان آئے تو علماء و فضلاء نے پروانہ وار ہجوم کیا۔ حبیب الرحمٰن نے انہیں بھیکن پور بلا کر اپنے ہاں ٹھہرایا اور ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

یہ سلسلہ چار ماہ جاری رہا اور پھر وہ بھوپال چلے گئے۔

ظاہری تعلیم کے بعد بزرگانِ دین سے ملاقاتوں کا شوق ہوا۔ اس نے سوچا کہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے ملاقات کی جائے۔ حبیب الرحمٰن نے اپنے استاد مولانا عبدالغنی کو ساتھ لیا جو شاہ فضل الرحمٰن کے مرید تھے اور مراد آباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت درس حدیث میں مشغول ہیں۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا جو مسجد سے کچھ فاصلے پر تھا۔ مولانا مسجد کے اندر تشریف فرما تھے لیکن باہر تک وہ رعب طاری تھا کہ کوئی فرد بشر بہ آواز بلند بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زبردست حاکم کے باہر آنے کے منتظر ہیں۔

ایک گھنٹے بعد شرف حضوری حاصل ہوا۔ حضرت چارپائی پر تشریف رکھتے تھے حبیب الرحمٰن زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ تھوڑے سے دریافت حال کے بعد نعتیہ اشعار بہ کمال شوق پڑھنے لگے۔ چند منٹ کے بعد حجرے میں تشریف لے گئے، حبیب الرحمٰن کو بھی اندر آنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ بزرگوں کے حالات بیان فرمائے۔ مثنوی شریف کے شعر پڑھے جن میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

صحبت مرداں اگر یک ساعت است
بہتر از صد خلوت و صد طاعت است

(بزرگوں کی صحبت ایک ساعت کے لیے بھی نصیب ہو جائے تو ہزار خلوتوں اور عبادتوں سے بہتر ہے)

حضرت کا حجرہ نہایت پرانا اور تنگ تھا۔ ایک طرف چارپائی تھی جس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک چوکی تھی اس پر کچھ مٹی کے برتن اور قلم دان رکھا تھا۔

ظہر کے بعد مسجد میں تشریف لا کر حدیث شریف کا درس فرمایا۔ یہ درس تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ حبیب الرحمٰن کو بھی اس میں شرکت کی سعادت مل رہی تھی۔

درس ختم ہوا تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر حبیب الرحمٰن کو حجرے میں طلب کیا اور دعائے خیر کے بعد اجازت فرمائی۔

حجرے سے نکلتے ہی حبیب الرحمٰن کو اپنی دنیا بدلی ہوئی نظر آئی۔ دو خیال ایک ساتھ ذہن میں آئے۔ ایک خیال تو یہ تھا کہ ہم میں اور حضرت میں ظاہری مشابہت کے سوا کوئی مشابہت نہیں۔ ہمارے خیالات سے ان کے خیال الگ اور ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا۔ ہمارے مشاغل سے ان کے مشاغل الگ۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ میری کوئی وقعت نہیں۔ اس نے اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت کبھی نہیں پایا تھا جتنا ان سے ملنے کے بعد پا رہا تھا۔

اس کے بعد وہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوا۔ ان سے بیعت بھی ہوا اور ایک بار کی حاضری میں بعض حدیثوں کی سند بھی عطا ہوئی۔

☆......☆

سرسید کے آخری زمانہ حیات میں یہ تحریک ہوئی تھی کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نمونے پر مسلمانوں کے اور مدارس بھی جاری ہونے چاہئیں۔ حبیب الرحمٰن سے جب سرسید کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اس وقت بھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اب جو تعلیم سے ذرا فراغت ہوئی تو اسے سرسید کی نصیحت یاد آئی۔ اس کی تربیت بھی ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جس میں ملک وملت کی خدمت اور رفاہ عام کے کاموں کا جذبہ کارفرما رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے خاندان کے چند افراد کے ساتھ مل کر ایک مدرسہ قائم کرنے کی ٹھانی۔ اس وقت کسی ایسے مدرسے کی بنیاد رکھنا آسان نہیں تھا جس میں انگریزی تعلیم بھی دی جائے لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ جگہ جگہ تقریریں کر کے لوگوں کو اس طرف راغب کیا۔

موضع بر ہرہ ضلع ایٹہ میں برادری کی ایک شادی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اپنے عزائم کا ذکر کیا اور صرف انگریزی تعلیم کا ذکر کرنے کی بجائے مذہبی تعلیم کا ذکر کیا تاکہ برادری والوں کو وحشت نہ ہو یعنی یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس زمانے میں صرف مذہبی تعلیم سے کام نہیں چلے گا اسی طرح صرف انگریزی سے بھی بچے اپنی تہذیب سے دور چلے جائیں گے۔ ضروری ہے کہ ہم اول اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوائیں اس کے بعد انگریزی پڑھائیں اور اس واسطے ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔ ہم نے اسی خیال سے ''قلعہ چھرہ'' میں مدرسہ بنانا شروع کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مدرسے کے ارکان اس وقت بہت سرگرمی سے تعمیر مدرسہ میں مصروف ہیں۔''

شروانی اسکول کا افتتاح ایک چھوٹی سی مگر خوب صورت عمارت میں قصبہ چھرہ رفعت پور میں جاٹوں کے بنائے ہوئے ایک پرانے قلعے میں ہوا جو شروانی وغیرہ شروانی مسلم اور غیر مسلم کو تعلیم دیتا تھا۔ غیر مسلم طلبہ کو صرف انگریزی اور مسلمان طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم کا بندوبست تھا۔

دیگر علاقوں میں جو چھوٹے چھوٹے مدارس قائم ہوئے تھے ''شروانی اسکول'' ان سب میں ممتاز تھا۔ انگریزی کی مڈل جماعت کے ساتھ فارسی میں بوستان اور عربی میں نصاب کے علاوہ ترجمہ کلام مجید کی تعلیم ہوتی تھی۔

اس کے جلسوں میں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی پرنسپل اور پروفیسر شریک ہوتے تھے۔ اس کے سالانہ جلسوں میں خود حبیب الرحمٰن خاں شروانی تقاریر فرماتے تھے۔

انتظام مدرسہ کے متعلق آپس کے نزاع کی وجہ سے چند سال یہ مدرسہ زندہ رہ کر اور مفید کام کر کے ختم ہو گیا۔

☆......☆

عبدالشکور خاں نے اپنے بیٹوں کی موجودگی کے باوجود حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی جا رہی تھی انہیں یہ فکر ہونے لگی تھی کہ اگر حبیب الرحمٰن اسی طرح تعلیم کے حصول میں مگن رہا تو ریاست کے کاموں سے آگاہی حاصل نہیں کر سکے گا۔ ان کے مرنے سے پہلے اگر وہ ضروری تربیت حاصل کر لے تو اچھا ہے وہ جب بھی کسی سفر سے واپس آتا اور وہ اسے کسی کتاب کے مطالعہ میں مگن دیکھتے تو اس سے تقاضا کرتے۔

''تم اپنے شوق کے لیے علم حاصل کر رہے ہو۔ تمہیں کوئی پیشہ ور مولوی تو بننا نہیں ہے۔ تمہیں چاہیے کہ گھر پر رہو اور میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

''عم محترم، آپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ابا جان ہیں تو سہی۔''

''محمد تقی واقعی میرا بہت خیال رکھتا ہے لیکن مجھے تو تم سے سروکار ہے۔ میرے بعد تمہیں ریاست کا کاروبار چلانا ہے۔''

''اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔''

''ہمیشہ رہنے کے لیے یہاں کوئی نہیں آیا۔ تمہیں اب ریاست کے کاموں کے لیے سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔'' جب یہ تقاضے بہت بڑھ گئے تو انہوں نے گھر آ کر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا۔ یہ تمام کام وہ اپنے چچا عبدالشکور خان کی نگرانی میں کر رہا تھا۔ ہردوئی میں اکثر قیام رہا۔ وہاں کاشت کاروں کی اراضی اور پیداوار کے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں نیل کا کاروبار عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی۔ مال تیار کرایا اور بھروا کر کلکتہ بھیجا۔ اسی سلسلے میں کلکتہ کا سفر بھی کیا اور پٹنہ میں قیام رہا۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ زمیندار حضرات دنیاوی مشاغل میں مصروف رہتے ہیں لیکن حبیب الرحمٰن کا مزاج ہی دوسرا تھا۔ زمینداری کرتے ہوئے بھی وہ علمی مشاغل کو اختیار کیے رہے۔ شوق ہوا کہ ایک ایسا کتب خانہ مہیا کیا جائے جو ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہو۔ بیرونی دنیا تک سے لوگ اسے دیکھنے آئیں۔ اپنے شوق کی بھی تسکین ہو اور دوسرے بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس کے والد نے بھیکن پور سے متصل موضع کھولا ڈلی میں ایک گڑھی اور کوٹھی تعمیر کرائی۔ سدابہار پائیں باغ لگایا۔ خوب صورت بارہ دری بنائی اور اس آبادی کا نام اپنے بیٹے کے نام پر ''حبیب گنج'' رکھا اور مع اہل و عیال وہاں سکونت اختیار کی۔ حبیب الرحمٰن نے اپنے کتب خانے کے لیے حبیب گنج کو منتخب کیا۔ کتابیں جمع شروع ہوئیں۔ عزم یہ تھا کہ اس کتب خانے میں ایسی نایاب کتابیں جمع ہوں جو کہیں اور نہ ہوں۔ علامہ شبلی سے ملاقات ہوئی تو بیرونی ممالک کی کتابوں کو خریدنے کا شوق ہوا۔ ایک مرتبہ کانپور جانا ہوا تو مولوی سلیمان تاجر کتب مصریہ کی فہرست ملاحظہ کی اور اس کے مطابق کتابیں خریدیں۔ پھر یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ قدم اور آگے بڑھا تو بمبئی، مصر، شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں۔ جو نادر کتاب ہاتھ آتی وہ علامہ شبلی کو مطلع کرتے۔ وہاں سے تحسین آتی اور کتاب داخل کتب خانہ ہو جاتی۔ ایک مرتبہ قرآن مجید کا قلمی نسخہ ہاتھ آیا۔ انہوں نے فوراً علامہ شبلی کو مطلع کیا جواب آیا۔ ''گاؤں میں بیٹھے ہوئے بغداد تک چھاپے مارتے ہو۔ یہ اپنے بزرگوں کے کتاب خانوں کے سرمائے سے بھی اضافہ ہوا۔ من جملہ ان کے بعض نادر نسخے مثلاً تفسیر جلالین کا ایک نسخہ عہد قطب شاہی کا نفیس لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ شبلی کے مشورے سے لکھنو کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا اور لاتعداد قلمی نسخے ہاتھ آئے۔

اس کتب خانے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں موجود ایک نسخہ بھی ناجائز طریقے سے حاصل نہیں کیا گیا بلکہ بیشتر تو ایسا ہوا کہ فروشندہ نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی، حبیب الرحمٰن نے زیادہ قیمت دی۔

حبیب الرحمٰن کی تلاش انہیں شاہی کتب خانوں کی کتابوں تک لے گئی مثلاً مثنوی مولانا روم کا ایک نسخہ ان کے کتب خانے میں داخل ہوا جو کبھی عالم گیر بادشاہ کے کتب خانے میں رہ چکا تھا۔ اس پر بادشاہ کی چار مہریں گواہی دے رہی تھیں کہ یہ نسخہ کبھی عالمگیر کے مطالعے میں رہ چکا ہے۔ اسی طرح ''منہاج العابدین (امام غزالی) کا نسخہ عالم گیر کے کتب خانے سے سفر کرتا ہوا حبیب گنج تک پہنچا۔

مثنوی مجمع البحرین پر تین سلاطین قطب شاہی کی مہریں تھیں۔ دیوان شاہی پر آصف الدولہ، نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ کی مہریں ثبت تھیں۔ بوستان پر نصیرالدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

جب نایاب کتابیں جمع ہو چکیں تو انہوں نے ان کتابوں کو مختلف عنوانات میں تقسیم کر کے الماریوں میں سجایا۔ ''الذہیاق'' کا عنوان مذہبی کتابوں کے لیے تھا۔ ''الخطاطیات'' مشہور خطاطوں کی کتابوں کے لیے۔ المجلدات میں قدیم جلد سازی کے نمونے رکھے گئے تھے۔

السلطانیات کا عنوان ان کتابوں کے لیے تھا جن کا تعلق سلاطین سے تھا۔ اس طرح دیگر کتابوں کے لیے مختلف عنوانات تجویز کیے تاکہ بوقت ضرورت کسی موضوع کی کتاب بہ آسانی تلاش کی جا سکے۔

حبیب الرحمٰن شروانی ایک ایسا کارنامہ انجام دے رہے تھے جو صرف ان کے شوق کی تکمیل نہیں کر رہا تھا بلکہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی میراث کی حفاظت کر رہا تھا۔ اسے دربدر ہونے سے بچا رہا تھا۔ اگر انہوں نے بروقت یہ سرگرمی نہ دکھائی ہوتی تو معلوم نہیں مسلمانوں کے اس علمی و ثقافتی سرمائے کا کیا انجام ہوتا۔ انہوں نے اوراق قدیم کو ہوا کے سپرد ہونے سے بچا لیا۔

ہندوستان میں اگر کسی فردِ واحد کے ایسے شوق کی مثال ملتی ہے تو وہ صرف پٹنہ کے خدا بخش ہیں اور کوئی نہیں۔ کتب خانے میں کتابوں کی فراہمی جاری تھی کہ ان کے استاد مولانا لطف اللہ کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا کے وطن پلکھنہ میں ہوئی۔ حبیب الرحمٰن شروانی بھی اس شادی میں شریک تھے۔ تلامذہ کا کثیر مجمع تھا جن میں نامور علماء بھی شامل تھے۔

ان کے کتاب خانے کی شہرت اس وقت تک خوشبو بن کر پھیلنے لگی تھی۔ اس شادی میں جب اہلِ علم کا مجمع ہوا تو اس کتب خانے کا ذکر بھی نکل آیا۔ ہر لفظ میں تبریک ہر زبان پر تحسین تھی۔ بعض نے اشتیاق ظاہر کیا کہ کتب خانہ دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ حبیب الرحمٰن خان شروانی تو خود یہ چاہتے تھے کہ اہلِ نظر ان کے کارنامے کو دیکھیں اور صائب مشوروں سے نوازیں انہوں نے بعض علماء کو حبیب گنج آنے کی دعوت دی۔

یہ حضرات حبیب گنج تشریف لائے اور کتب خانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کتابوں کی ترتیب اور عنوانات دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان میں بعض کتابیں تو ایسی تھیں کہ ان اہلِ نظر کی نظروں سے بھی گزری ہی نہیں تھیں۔ اس وقت تک اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ قابلِ تحسین ٹھہرا۔ ہر زبان اس حقیقت کا اظہار کر رہی تھی کہ فردِ واحد کی کوششوں سے اتنے ہی اہم کتب خانے کا قیام اپنی مثال آپ ہے۔

علماء تعریف کر رہے تھے اور حبیب الرحمٰن اپنے خیالوں میں بچپن کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ ان کے والد کو مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ ہر وقت کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اسے وہ واقعہ بھی یاد آیا جب اس کے والد کتاب پڑھ رہے تھے اور اسے روشنی بری معلوم ہو رہی تھی۔ اسے والد کا یہ کہنا بھی یاد آیا ”آپ کو ہمارا مطالعہ برا لگ رہا تھا، اس کے جواب میں اپنا کہنا یاد آ رہا تھا مجھے تو کتابیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں پڑھ نہیں سکتا ورنہ میں آپ سے زیادہ کتابیں پڑھتا۔ میں بڑا ہو جاؤں پھر دیکھنا آپ سے بھی زیادہ کتابیں جمع کروں گا۔“ وہ بڑا ہو گیا تھا اور کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔

مولانا بدرالدین نے کتب خانہ حبیب گنج کے مشاہدے کے بعد ایک مضمون میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے۔

”یہ کتب خانہ انفرادی کوشش کا ثمر ہے اور نواب صاحب حبیب گنج میں قیام فرما ہوتے ہیں تو لازمی طور پر صبح سے دوپہر تک کا وقت کتب خانے میں گزرتا ہے۔ ممکن نہیں اس میں فرق آ جائے۔ وہ کتب خانے میں داخل ہوئے علائق ریاست باہر چھوڑے۔ فرماتے ہیں کتاب خانے میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن مولفین کی کتابیں اس میں ہیں ان کی مجلس میں آ گیا ہوں۔ پھر اس مجلس میں اسی کے حسبِ حال مطالعہ یا مذاکرے کا مشغلہ ہوتا ہے۔

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے چند اہم کارناموں میں ایک ممتاز کارنامہ کتب خانہ حبیب گنج کی فراہمی ہے جس کی نادر کتابوں کے حصول میں مولانا شبلی جیسے صاحب ذوق و نظر کے مشورے بھی شامل رہتے تھے۔ اس کتب خانے کے قلمی حصے میں شاید ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی ندرت نہ ہو۔ یہ کسی کتابوں کے محض شائق کا کتب خانہ نہیں بلکہ اس کا بانی صفِ علماء کا ممتاز فرد تھا اور مسلمانوں کے گزشتہ علمی کارواں کا راز داں تھا۔ آج بھی اس کتب خانے کی ندرت اور اہمیت دنیا کے علمی حلقوں میں مسلم ہے اور ایشیا کے علماء کے علاوہ مستشرقین یورپ بھی اس سے مستفید ہوتے اور اس کی قدر کرتے ہیں۔“

☆......☆

ابھی وہ فلاحی اور تعلیمی کاموں کے ساتھ ساتھ انتظام ریاست کی تربیت میں مشغول تھے کہ ان کے والد محمد تقی خاں کا اچانک انتقال ہو گیا۔ محمد تقی خاں بڑے بھائی عبدالشکور خاں کے ساتھ مل کر ریاست کا کام کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد وہ چچا کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا لیکن چچا کے دل میں ہمیشہ یہ تردد رہتا تھا کہ بھتیجا ہے، نوجوان ہے، پڑھا لکھا ہے کہیں ریاست پر قبضہ ہی نہ جما لے۔ حبیب الرحمٰن نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی غلط فہمی کو دور کیا۔

”اب بھی حضور اسی طرح ریاست کے مالک ہیں جیسے کہ والد مرحوم کی حیات میں تھے۔ آپ نے ریاست کا انتظام میرے ہاتھ میں دے دیا ہے لیکن مالک تو آپ ہی ہیں۔ میں تو آپ کا محض...کارندہ ہوں۔“

عبدالشکور خاں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ ”میں نے کب کسی شبہے کا اظہار کیا۔ میرا جو کچھ ہے وہ تیرا ہی تو ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ خاندان میں دراڑیں نہ پڑیں۔ سب مل جل کر رہیں۔“

عبدالشکور خاں کے دل میں اگر کوئی تردد تھا بھی تو وہ دور ہو گیا۔ حبیب الرحمٰن نے بھی وہی طرزِ عمل جاری رکھا جو ان کے والد کا تھا بھیکن پور صبح جا کر کام کرتے اور قبل دوپہر واپس آجاتے اور اپنے علمی کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ جب عبدالشکور خاں نے دیکھا کہ وہ انتظامی معاملات میں طاق ہو چکا اور ان کی غیر موجودگی سے فرق نہیں پڑے گا تو وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔

قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حج ادا ہو چکا تھا۔ واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ابھی جدہ تک پہنچے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔ ہندوستان پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عبدالشکور خاں کو جدہ ہی میں دفن کر دیا گیا۔

انتقال کی خبر بھیکن پور پہنچی تو کہرام مچ گیا اس کے ساتھ ہی یہ فکر ہوئی کہ اب ریاست کا کیا ہوگا۔ مرحوم نے تین لاکھ کا قرض ریاست پر چھوڑا تھا کسی میں اہلیت نہیں تھی کہ یہ قرض اتار سکے اور ریاست کو اپنے پیروں پر کھڑا کر سکے۔ تمام اعزہ سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ طے ہوا کہ ریاست کا کام حبیب الرحمٰن کے سپرد کیا جائے۔

عبدالشکور خاں ریاست کے کارگزار تھے۔ اس لیے تمام قرض ان کے دستخطوں سے لیا گیا تھا۔ تمام معتمد وکیلوں کی یہ رائے تھی کہ اگر وہ (حبیب الرحمٰن) قرض کی ادائیگی سے انکار کر دے تو وہ قرض ادا کرنے کا پابند نہیں ہوگا لیکن اس کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ سبکدوش ہو کر سارا بار دوسرے عزیزوں پر ڈال دے۔

اس نے ریاست کا کام اس خوبی سے کیا کہ کارِ خیر میں روپیا صرف کرنے کے باوجود پانچ چھ سال میں قرض چکا دیا۔ عزیز و اقارب نے جب یہ دیکھا کہ قرض اتر گیا ہے تو انہوں نے اپنے اپنے حصے طلب کر لیے خصوصاً عبدالشکور خاں کی اولادوں نے۔ حبیب الرحمٰن نے پہلے تو اس رائے کی مخالفت کی لیکن بالآخر انہیں مجبور ہونا پڑا اور ریاست کی تقسیم پر تیار ہو گئے اور اپنی ذاتی جائیداد کی دیکھ بھال اس خوبی سے کی کہ جایداد کا اضافہ بھی ہوا اور آمدنی بھی بڑھی۔ وہ تمام جھگڑے پاک ہوئے جو عرصہ دراز سے چلے آرہے تھے۔

☆......☆

سرسید نے مسلمانوں کی علمی ترقی کے لیے ایک اہم تحریک ''آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس'' شروع کی اور اس کا پہلا جلسہ علی گڑھ میں بلایا۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کے لیے بیداری پیدا کی اور ان کے اندر علم و تعلیم کا ایک نیا ذوق و شوق ابھارنے میں کامیاب ہوئی۔

حبیب الرحمٰن شروانی کی طبیعت کو فطری طور پر اصلاحی اور تعمیری پروگرام سے شغف تھا۔ وہ سرسید کے پروگراموں کو بہ غور دیکھ بھی رہے تھے۔ سرسید کے مذہبی خیالات سے تو انہیں مطلق سروکار نہیں تھا لیکن وہ سرسید کی تعلیمی پالیسی سے مکمل اتفاق رکھتے تھے لہٰذا جب ''آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس'' وجود میں آئی اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگے تو انہوں نے اس عظیم قومی مقصد کے لیے دست تعاون بڑھایا۔ اوّل اوّل اس کے لائف ممبر ہوئے پھر جوائنٹ سیکریٹری اور آخر میں سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس وقت سے آخر تک انہوں نے اس ادارے کو چلایا اور ملک کے گوشے گوشے میں اس کے جلسے کرائے جس سے مسلمانوں میں تعلیم کے مسئلے سے دلچسپی اور تعلیم میں بیشی ہوئی۔ کانفرنس کی طرف سے اردو میں بہت سی مفید کتابیں اور ایک اخبار کانفرنس گزٹ شائع کیا۔

کانفرنس کا پہلا جلسہ مولوی سمیع اللہ خاں کی صدارت میں ہوا اس میں سرسید نے اپنا پہلا رزولیشن پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''اے صاحبو! جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی تو میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بہ جز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جائے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزلی کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔''

یہ منظر دیکھنے کا تھا، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہمدردانِ قوم اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ حبیب الرحمٰن نے اس جلسے میں خطاب تو نہیں کیا لیکن انہیں ان کی خدمات کے عوض شبلی کے بالکل برابر نشست پر بٹھایا گیا۔ اسی جلسے میں مولانا شبلی نے یہ تجویز پیش کی۔ ''گورنمنٹ صرف مغربی علوم کی تعلیم دے، مشرقی علوم کو مسلمانوں کے لیے چھوڑ دے۔''

سرسید نے اس کی تائید کی۔

حبیب الرحمٰن خان شروانی اس دن کے بعد سے اس کے ہر اجلاس میں شریک ہونے لگے۔ ان کی تعلیمی حیثیت اور خاندانی وجاہت اس قدر تھی کہ ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جانے لگا اور مختلف عہدوں سے سرفراز کیا جانے

لگا۔ اس کانفرنس کے تحت جتنی کمیٹیاں بنیں حبیب الرحمٰن خان ہر کمیٹی میں شامل ہوئے اور وہ کارنامے انجام دیے کہ سرسید بھی معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

☆......☆

انقلاب وحوادث کے جو طوفان ملک میں اٹھ رہے تھے ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے۔ مدارس کا پرانا نظام ختم ہو رہا تھا۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی رونق بڑھ رہی تھی۔ عیسائی مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیل رہے تھے۔

مدرسہ فیض عام کانپور کی چٹائی پر چند علماء سر جوڑے بیٹھے تھے۔ نئی صورتِ حال زیرِ غور تھی بالآخر یہ طے پایا کہ ایک مجلس قائم کی جائے اور آئندہ سال فیض عام کے جلسے کے موقع پر تمام ہندوستان کے علماء کو اس کے لیے عام دعوت دی جائے۔ اس مجلس کا نام ''ندوۃ العلماء'' قرار دیا گیا۔

ملک میں جب ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے آئندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک نئے جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف سے علماء آ آ کر شریک ہونے لگے۔

شبلی نئے نئے قسطنطنیہ کے سفر سے واپس آئے تھے اور مسلمانوں کی ترقی کا راز مشرقی علوم میں تلاش کر رہے تھے۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد میں انہیں اُمید کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ وہ اس کے پہلے ہی اجلاس میں بڑے کروفر سے شریک ہوئے۔

حبیب الرحمٰن شروانی نے ہمیشہ اپنی سرگرمیوں کو علم و تعلیم اور خدمت دین تک محدود رکھا تھا۔ وہ ہر ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے اور پہل کرنے کی کوشش کرتے تھے جس سے دین وملت کا کوئی فائدہ ہوتا لہٰذا جب ''ندوۃ العلماء'' قائم ہوئی تو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلق ہونے کے باوجود ندوۃ العلماء میں بھی شامل ہو گئے۔ وہ عرصہ دراز سے کسی ایسی تحریک کی تلاش میں تھے جو جدید وقدیم کا سنگم ہو۔ انہیں یہ تحریک ''ندوۃ العلماء'' کی شکل میں مل گئی۔ مولانا لطف اللہ کے فیض صحبت نے انہیں روشن خیال بنا دیا تھا۔ یہ روشنی انہیں ندوۃ العلماء میں نظر آئی۔ انہیں ایک ایسا پلیٹ فارم مل گیا جس کے ذریعہ وہ عربی مدارس میں اصلاح نصاب کا کام کر سکتے تھے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کے ہر اجلاس میں اپنی تجاویز کو دہرایا۔

ضروری ہے کہ طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم دونوں میں اصلاح کامل ہو جس سے معاملہ فہم، معاملات عالم سے باخبر علماء پیدا ہوں جو عملی زندگی میں داخل ہو کر اپنی قوت فہم و فراست اور معاملہ دانی کا سکہ اہل معاملہ اور کاروباری دنیا کے دلوں پر بٹھا دیں۔ جب یہ سکہ چلے تو ہدایت ورہنمائی کا نشان ہو اور دین کا بول بالا ہو جائے۔

جب ندوۃ العلماء کا پہلا جلسہ ہوا تو حبیب الرحمٰن شروانی اس میں شریک تھے۔ اس میں انہوں نے نصاب تعلیم سے متعلق مقالہ پڑھا۔

دوسرے سال قیصر باغ بارہ دری لکھنو میں دوسرا جلسہ ہوا۔ اس میں حبیب الرحمٰن خاں شریک ہوئے اور گرانقدر چندہ دیا۔ اپنے تعلقات استعمال کیے اور دوسرے لوگوں سے مالی امداد کرائی۔ ملک بھر کے مخیر اور صاحب ثروت افراد کو خطوط لکھے اور ان کی توجہ ندوۃ العلما کے کاموں کی طرف مبذول کرائی۔ ان کی اپیلیں بے کار بن گئیں۔ سرمائے کی فراہمی شروع ہو گئی۔ جب سرمایہ اکٹھا ہو گیا تو اس تجویز پر عمل کرنے کا وقت آ گیا جو کسی اجلاس میں پیش کی گئی تھی یعنی دارالعلوم ندوۃ کی تعمیر۔

شبلی انگریزوں کی نظروں میں مشکوک ہو گئے تھے لہٰذا وہ محسن الملک کے مشورے سے حیدرآباد چلے گئے۔ اب حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے جو ندوہ کا کام چلا رہے تھے۔

ندوہ کی طرف سے حکومت کی بدگمانیاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ ہندوستان تک چھوڑ دیا تھا۔ ایک حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے جو اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے جو ندوۃ العلما کے اجلاسوں میں برابر شریک ہو رہے تھے۔ مولانا شبلی سے ان کی خط و کتابت برابر جاری تھی۔

ندوۃ کے اجلاسوں میں اب دارالعلوم کی تعمیر کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ عمارت کی تعمیر کے لیے دو مقامات کے نام زیرِ غور تھے دہلی یا لکھنو، اراکین میں اس کے متعلق اختلافات تھے۔ کچھ دہلی کے حق میں تھے کچھ لکھنو کے۔ ایک اجلاس میں انہوں نے تحریک پیش کی کہ دارالعلوم دہلی کی بجائے لکھنو میں تعمیر کیا جائے۔ اپنی تجویز کے حق میں ایک مختصر سی تقریر بھی پیش کی۔ ان کی تقریر کے بعد رائے شماری ہوئی جس کے نتیجے میں فیصلہ لکھنو کے حق میں ہوا۔ پھر انہوں نے یہ تحریک پیش کی کہ دارالعلوم کا ابتدائی درجہ وسیع پیمانے پر کھولا جائے اور پھر اس کے بہ تدریج اور درجے کھولے

جائیں۔

شبلی حیدر آباد میں تھے لیکن ندوہ کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ اپنے مشوروں سے برابر نوازتے رہتے تھے خصوصاً حبیب الرحمٰن شروانی سے خط وکتابت جاری رہتی تھی انہی کے مشوروں سے لکھنو میں دریائے گومتی کے کنارے نہایت دلفریب منظر کے روبروز مین خرید لی گئی۔

زمین کی خریداری کے بعد دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھنے کا مسئلہ تھا۔ شبلی کا خیال تھا کہ سنگ بنیاد نازلی بیگم آف جنجیرہ کے ہاتھوں نصب کرایا جائے کیونکہ انہوں نے مالی امداد کی تھی اور آیندہ بھی اُمید تھی لیکن علماء نے مخالفت کی۔ ایک دینی ادارے کا سنگ بنیاد ایک عورت کے ذریعے کیسے ممکن تھا اس لیے یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ ہز آنر گورنر بہادر ممالک متحدہ کے نام قرعہ فال نکلا کہ سنگ بنیاد وہ رکھیں گے۔ یہ ایک سیاسی مصلحت تھی۔

سنگ بنیاد کی رسم بڑی شان وشوکت سے ادا کی گئی۔ اس کثرت سے لوگ جمع ہوئے گویا پورا ہندوستان امڈ آیا ہو۔ سنگ بنیاد رکھے جانے کے بعد عمارت کی تعمیر کا مرحلہ تھا نگرانی کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی۔ حبیب الرحمٰن شروانی اس میں بھی پیش پیش تھے۔

عمارت کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ اس سے پہلے نصاب وغیرہ کی تیاری کے ضروری کام کرنا لازمی تھے۔ حبیب الرحمٰن خان اس سلسلے میں اپنی تجاویز سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

ندوۃ العلما نے ابتدا سے اس امر پر زور دیا ہے کہ نصاب تعلیم سے منطق وغیرہ فنون کی غیر ضروری کتابیں خارج کر کے ضروری علوم کے اضافے اور ترقی کے لیے وقت نکالا جائے۔ تعلیم کا مفہوم خاص خاص کتابوں کے الفاظ کے افہام وتفہیم تک محدود نہ رہے بلکہ علوم کی تعلیم پیش نظر ہو۔ نصاب میں ایسے فنون کا اضافہ ہو جن سے بنی نوع انسان اور ممالک اسلامی کا علم صحیح دماغوں میں راسخ ہو مثلاً تاریخ وجغرافیہ...... علوم دینیہ خصوصاً کلام مجید پر زیادہ توجہ کرنے میں سرف ہو۔ ادب عربی پر زور دیا جائے۔

☆......☆

حبیب الرحمٰن شروانی کے سرسید سے تعلقات زمانہ طالب علمی سے تھے لیکن ایجوکیشنل کانفرنس میں شمولیت کے بعد یہ تعلقات گہرے ہو گئے۔ سرسید پر ان کے علمی وانتظامی جوہر کھلے لہٰذا سرسید نے انہیں محمڈن کالج کا ٹرسٹی بنا دیا۔ اس سے پہلے ان کے والد اور چچا بھی ٹرسٹی رہ چکے تھے اور اب یہ اعزاز انہیں مل رہا تھا۔

حبیب الرحمٰن شروانی ان برائے نام ٹرسٹیوں کی طرح ثابت نہیں ہوئے جو محض حاضری لگوانے اجلاسوں میں آتے تھے یا اندرونی سیاستوں میں شامل ہو کر کالج کے مفاد کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ان کا اجلاس میں آنا اس بات کی ضمانت ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی تجویز پیش اور منظور ہو گی۔ ان کے ذاتی رعب کا یہ حال تھا کہ سب کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں۔

جب کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مرحلہ آیا تو ان کی جانفشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے مسلمان زعماء اور لیڈروں سے اپنے خرچ پر ملاقاتیں کیں اور انہیں قائل کیا کہ وہ اس کے لیے آواز اٹھائیں۔ انہی کی کوششوں سے مسلمان لیڈروں کا ایک وفد آغا خان کی قیادت میں شملہ جا کر وائسرائے سے ملا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ بالآخر محمڈن کالج مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

حبیب الرحمٰن خان کو طالبات کی تعلیم سے نہایت دلچسپی تھی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں وہ اس کے لیے آوازیں اٹھاتے رہے تھے۔ جب ٹرسٹی بن گئے تو اس مطالبے میں مزید تیزی آگئی چنانچہ انتظامیہ نے اس کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی میں انہیں بھی شامل کیا گیا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے کمیٹی کے ان خدشات کو دور کر دیا اور علی گڑھ میں مسلم گرلز کالج کا قیام عمل میں آ گیا۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہ سکی کہ کالج کی ترقی کے لیے وہ وقتاً فوقتاً گرانقدر چندہ دیتے رہے۔ آپ ہی کی کوششوں سے طلبہ کی دینی پابندی کے لیے نماز کی حاضری لازمی قرار دی گئی۔

مولانا شروانی کے دو کارنامے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے کہ ایک موقع پر ایم او کالج کا انگریز پرنسپل اس کالج کو بجائے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے صرف عربی کا ایک کالج بنا دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مولوی سمجھ کر مولانا شروانی کو استعمال کرنا چاہا کہ وہ تو ضرور عربی کے حق میں فیصلہ کریں گے لیکن وہ کہاں اس کے دام میں آنے والے تھے۔ یہ سمجھتے انہیں دیر نہیں لگی کہ اس طرح مسلمانوں پر انگریزوں کے جدید علوم کا دروازہ بند کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے فوراً صاحبزادہ آفتاب احمد سے بات کی اور اس طرح کالج محض

عربی کا مدرسہ بننے سے بچ گیا۔

دوسرا کارنامہ انہوں نے اس وقت انجام دیا جب کانگریس اور خلافت کی زیرِ قیادت عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے کئی لیڈر مسلم یونیورسٹی پہنچے اور طلبہ کو تعلیم بائیکاٹ پر ابھارا۔ محمد علی جوہر تو یہ کہہ کر جامعہ کی مسجد میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ خدا کے حکم سے یہاں آیا ہوں اور خدا ہی کے حکم سے یہاں سے نکلوں گا۔ ذمہ داران کالج سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ ان لیڈروں کی تقریروں کا طلبہ پر بہت اثر ہو رہا تھا۔ اس موقع پر مولانا شروانی نے طلبہ کو مخاطب کیا اور ایسی مؤثر تقریر کی کہ بھاگتے ہوئے طلبہ رک گئے اور کالج ویران ہونے سے بچ گیا۔ ذمہ داران کالج میں سے کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان لیڈروں کا مقابلہ کرتا۔ یہ شروانی ہی تھے جو پامردی سے میدان میں اترے۔

مولانا آزاد کا بیان اخبار میں شائع ہوا۔ ”مولوی شروانی یا تو قرآن وشریعت سے بالکل ناواقف ہیں یا عدم تعاون کی حقیقت نہیں سمجھتے یا پھر حق گوئی پسند نہیں کرتے۔“

مولانا شروانی نے اپنی ایک تقریر میں اس کا جواب ان لفظوں میں دیا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ترک موالات کرو۔ ترک موالات کا فتویٰ کون دیتا ہے؟ گاندھی! کیا اسلام وہ مذہب ہے جس کو ہم شرک سے سیکھیں۔ نہ ہمارا یہ مذہب ہے نہ ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ اپنا مذہب شرک سے سیکھیں۔ اسلام نے ترک موالات ضرور بتایا ہے مگر سب سے اوّل اپنے نفس سے...... کہا جاتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کفار مسجد نبوی میں داخل ہوتے تھے۔ یہ صحیح ہے لیکن آپؐ نے کبھی کسی مشرک سے یہ نہیں فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو مسجد میں آ کر تلقین کرے اور وعظ سنائے۔ کیا جو لوگ مشرکوں سے ایمان و مذہب حاصل کر رہے ہیں، ان کا ایمان قائم رہا؟ میں بالاعلان کہتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ضرور ہونا چاہیے ملک اور قوم کی بہبود اس پر منحصر ہے لیکن یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ یہاں تک اتحاد کی حد ہے اس سے آگے مذہب ہے۔ اتحاد پر قائم رہو مگر مذہب میں دخل نہ دو۔ میرے نزدیک کالج سے جو مطالبات کیے جا رہے ہیں وہ ترک موالات میں داخل نہیں ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

☆......☆

مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایک طرف وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹرسٹی تھے دوسری طرف اس کی بالکل مخالف تحریک ندوۃ العلما کے بانی اراکین میں تھے۔ انجمن حمایت اسلام اور انجمن تبلیغ اسلام جیسی تحریکوں میں بھی بیک وقت دلچسپی لے رہے تھے کہ ایک مصروفیت اور نکل آئی۔ یہ مصروفیت پچھلی تمام مصروفیات سے مختلف تھی۔ معاملہ نوکری کا تھا اور نوکری خاندانی روایت کے منافی تھی۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کی جانب سے تار موصول ہوا تھا۔ وہ اسے صدر الصدور کے عہدے پر متعین کرنا چاہتے تھے۔ یہ عہدہ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ کی وفات سے خالی ہوا تھا۔

تار ملتے ہی خیالات نے ہجوم کیا۔ کبھی نوکری بھی کرنی ہوگی یہ تو سوچا تک نہیں تھا۔ خاندان میں کسی نے نوکری نہیں کی تھی۔ اب بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر یہ خیال آتا تھا کہ سرزمین ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے اور دینی خدمت ہے۔ اگر حشر کے میدان میں خدا نے مجھ سے پوچھا کہ میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا تو نے انکار کیوں کیا۔ صرف اپنی تن آسانی کے لیے؟ وہ رات بھر ان خیالوں سے لڑتے رہے۔ نوکری اپنی توہین معلوم ہوتی تھی، دین کی خدمت اپنی طرف کھینچتی تھی بالآخر انہوں نے صبح تک یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اس تار کا مثبت جواب دیں گے۔

تار کا جواب دیا اور قدرے تاخیر سے حیدرآباد پہنچے۔ اپنی آمد کی عرضی حضور نظام تک پہنچائی۔ دوسرے ہی دن حاضری کا حکم پہنچ گیا اور وہ ملاقات کے لیے حاضر ہو گیا۔ نظام حیدرآباد کے ہاں دستور تھا کہ دربار کے لوگ حضور نظام کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے اور کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن حبیب الرحمٰن خان شروانی کی نشست کو کرسی مرحمت فرمائی گئی اور نہایت شفقت سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو بہت سے کام چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔“

”مجھے تو یہ ندامت ہے کہ حاضری میں اس قدر تاخیر ہو گئی۔ سرکار نے یاد فرمایا اور میں نے دیر کر دی۔ گھریلو الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“

اس کے بعد نظام نے فرمایا۔ ”میری طبیعت دو تین روز سے نادرست ہے۔“

"خداوند تعالیٰ شفا عطا فرمائے اور دیر تک سرکار کا سایہ مسلمانوں کے سر پر قائم رکھے۔ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں سرکار کی طرف لگی ہوئی ہیں اور سب اپنا سردار اور لیڈر تصور کرتے ہیں۔"

نظام نے انہیں نواب صدیار جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا اور وہ تمام کام ان کے سپرد کیے جو سابق صدر الصدور کے ذمے تھے۔ انہوں نے یہ خطاب اس لیے قبول کرلیا کہ یہ ایک دولت اسلامیہ کی نشانی تھی۔

بجی سجائی ایک کوٹھی پہلے سے مقرر تھی۔ وہ اس میں اتر گئے۔ ایک ہفتے کے آرام کے بعد۔ انہوں نے اپنی عادت یہاں بھی ترک نہیں کی۔ فجر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے لیے باہر نکلے۔ جو محتاج سامنے آیا اس کے ہاتھ پر ایک پیسا رکھ کر آگے بڑھتے رہے۔ ہوا خوری سے واپس آنے کے بعد خطوط لکھنے بیٹھ گئے۔ جب ذرا دن چڑھ گیا تو دفتر پہنچ گئے۔ دفتر کے لوگوں نے ضروری مثلیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ کام سمجھنے میں کچھ وقت لگنا لازمی تھا۔ ہر مثل خود پڑھتے رہے۔

ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کی اور پھر عصر کی نماز کے بعد چائے نوش کی، چند دوستوں کو ساتھ لیا اور موٹر میں سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکل گئے۔ واپسی پر نماز مغرب ادا کی۔ کھانا عشا کی نماز کے بعد کھایا۔ پھر دیر تک مطالعہ کرتے۔ کتنی ہی دیر میں سوتے فجر کی نماز کے لیے اٹھ جاتے۔ یہی معمول روز کا تھا۔

چند دن نہیں گزرے تھے کہ مولانا شروانی نے انقلاب آفریں کاموں کا بیڑہ اٹھایا۔ اسے پرانی فائلوں میں ایک فائل نظر آئی، اس فائل سے انہیں معلوم ہوا کہ آصف جاہ حیدر آباد میں ایک یونیورسٹی کے قیام کے خواہش مند تھے لیکن مولانا انوار اللہ سابق صدر الصدور اس کے مخالف تھے اور پھر یہ قصہ دبا دیا گیا۔ حبیب الرحمٰن نے اسے دینی و قومی ترقی کے لیے مفید سمجھا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی طرح یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ ایک روز انہوں نے یہ تمام کاغذات سمیٹے اور نظام کے پاس پہنچ گئے۔ مولانا انوار اللہ کی باتوں کا اثر ان کے دل پر بھی تھا۔ انہوں نے بھی عذر پیش کیا لیکن مولانا شروانی اپنی رائے پر قائم رہے۔ کئی ملاقاتوں کے بعد نظام نے ان کی رائے سے اتفاق کرلیا۔ جامعہ عثمانیہ کا چارٹر مل گیا اور فرمانِ مبارک کی رو سے پہلے وائس چانسلر شروانی صاحب مقرر ہوئے۔ اس چارٹر میں انہوں نے یہ بھی منظور کرا لیا کہ مغربی علوم و فنون کے ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشوونما کا کام بھی اس جامعہ سے لیا جائے گا۔ ہر مسلمان طالب علم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون دینیات کا بھی لازماً لینا پڑے گا اور امتحان بھی دینا پڑے گا۔ اس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

شیخ الجامعہ کی حیثیت سے انہوں نے خطبہ افتتاحیہ دیا اور بہت سی باتوں کی وضاحت کی۔

"حضرات! آج کا مبارک دن ایک تاریخی دن ہے۔ آج کے دن سے عہد ہمایونی کا وہ علمی کارنامہ شروع ہوتا ہے جو بفضل خدا صدیوں تک یادگار رہے گا۔

جامعہ عثمانیہ کا چشمۂ فیض رود عیسیٰ بن کر مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور جہالت کے مریضوں کو شفا بخشنے میں اعجاز مسیحا دکھائے گا۔ اعلیٰ حضرت خسرو دکن کی سرپرستی میں یہ مجلس رفقا اور اساتذہ کا مجمع اس لیے قائم ہوا ہے کہ نعمت علم کو زیادہ سہل الحصول اور زیادہ سریع الفہم بنا کر علم و امید کی کرنیں جھونپڑوں تک پہنچا دیں...... جامعہ عثمانیہ کی آیندہ نیک نامی و کامیابی کا زیادہ تر مدار اس کے محترم اساتذہ اور عزیز طلبہ کی کوششوں پر ہے۔ جامعہ کے حکام نے پوری کوشش لائق اور فاضل علما کے فراہم کرنے میں کی ہے اور منشور خسروی نے علوم ظاہری کے ساتھ علم دین اور اخلاقیات کو لازم قرار دیا ہے لہٰذا یہ توقع بالکل بجا ہے کہ ہمارے اساتذہ کی تعلیم میں علوم جدیدہ کی وسعت اور نئے اعلیٰ اصول تعلیم کے دوش بدوش قدیم استادوں کی شفقت، دل سوزی اور متانت کا جلوہ ہمیشہ قائم رہے گا جو تعلیم قدیم کا سرمایہ ناز ہے۔"

سب سے بڑا مسئلہ ایسے اساتذہ کا تقرر تھا جو اردو میں تعلیم دے سکیں کیونکہ مولانا شروانی کی تحریک پر ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا تھا۔ ایسے اساتذہ بھی مہیا ہو گئے تھے جو اردو میں پڑھا سکتے تھے لیکن خصوصاً اعلیٰ جماعتوں میں نصاب کی کتابیں انگریزی میں تھیں۔ اردو میڈیم کے طلبہ ان سے استفادہ کیسے کر سکتے تھے۔ مولانا ہی کی کوششوں سے دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ قابل ترین لوگ ہندوستان بھر سے بلائے گئے اور انہیں بھاری تنخواہوں پر دارالترجمہ میں ملازم رکھا گیا تاکہ وہ انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کریں۔ اس محکمے نے تیزی سے کام شروع کر دیا۔ سائنس

کی بیش بہا کتابیں اردو میں منتقل ہونے لگیں۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ اردو میں تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ انہوں نے دیکھا کہ جامعہ عثمانیہ میں سائنس اور میڈیکل تک کی تعلیم اردو میں دی جارہی ہے۔

یہ ایک ایسی روشن مثال تھی جس پر اگر دوسرے تعلیمی ادارے عمل کرتے تو بہت جلد اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد بے شمار ہو جاتی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ریاست ضبط ہوئی اور کارخانہ ریاست درہم برہم ہو گیا۔

مولانا نے جامعہ عثمانیہ میں دینیات کا شعبہ بڑے شوق سے متعارف کرایا تھا لیکن وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ دوسرے شعبوں کے مقابلے میں دینیات کے شعبے کو حقارت سے دیکھا جارہا ہے۔ دوسرے مضامین کے اساتذہ کے مقابلے میں ان کی تنخواہیں بھی بہت کم ہیں۔ عام تاثر یہ تھا کہ مولوی حضرات کی جو تنخواہیں جو جامعہ سے باہر طے ہیں اس سے زیادہ کیوں دی جائیں لیکن مولانا شروانی نے تنگ و دو کی خود نظام سے ملے اور یہ قضیہ طے کرالیا۔

جامعہ عثمانیہ جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تو وہ حیدرآباد کی عوامی اور معاشرتی اصلاح کی طرف راغب ہوئے۔ حیدرآباد کی مذہبی زندگی میں میلاد کی محفلوں کا بڑا چرچا تھا لیکن ان محفلوں کا حال بہت پست تھا۔ پیشہ ور میلاد خواں پارٹیاں بنائے ہوئے تھے۔ میلاد پڑھانے والے ان ٹولیوں میں سے کسی ایک کو دعوت دیتے۔ یہ ٹولی اس گھر میں کچھ رات گزرے پہنچ جاتی۔ یہ ٹولی چیخ چیخ کر اردو فارسی کے اشعار پڑھتی رہتی۔ اکثر گھر والے سوتے رہتے۔ میلاد محض برکت کے لیے تھا۔ صبح ہوتے ہی یہ میلاد خواں اپنی فیس لیتے اور چلے جاتے۔ مولانا شروانی نے میلاد خوانی کا نیا نظام وضع کیا۔ انہوں نے اپنا منصب ایک طرف رکھا اور خود پہل کی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہے انہیں خبر کرے۔ مولانا ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا تھا۔ جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے۔ مولانا کے وسیع مطالعہ کا کیا کہنا تھا جس گھر میں پہنچے سیرت طیبہ پر ایسی پُر مغز تقریر کرتے کہ لوگوں کا ایمان تازہ ہو جائے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا ذوق بدلنے لگا اور بجائے انفرادی مجلسوں کے اجتماعی مجلسوں کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا۔ وہ جس اجتماع میں تقریر کرتے پورا حیدرآباد امنڈ کر پہنچ جاتا۔ کئی کئی ہزار کے اجتماع ہونے لگے۔ مولانا گھنٹوں تقریر کرتے لیکن مجال ہے جو سننے والوں پر اکتاہٹ طاری ہو جائے حالانکہ ان کی تقریروں میں صرف علمی واقعات اور نصیحت کی باتیں ہوتی تھیں۔ بیان کا طرز بھی سیدھا سادا تھا۔ سرکاری مصروفیات کے باوجود میلاد کی مجلسوں کے لیے وقت نکالنا آسان نہیں تھا۔ رات کے بارہ بارہ بجے واپسی ہوتی تھی لیکن نہ شکایت زبان پر نہ تھکن کا احساس نہ نیند کا بوجھ حالانکہ نہ یہ ان کا پیشہ تھا نہ پیسوں کا لالچ۔ بس اگر لالچ تھا تو یہ کہ اس طرح تبلیغ دین کا موقع مل رہا ہے۔ میلاد خوانوں کے چولہے ٹھنڈے ہو گئے لیکن عوام کی دینی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ان کی تقریریں کسی فرقے کے خلاف نہیں تھیں بلکہ وہ یہ کوشش کرتے تھے کہ تعصبات کی دھند چھٹ جائے۔ وہ جب تک حیدرآباد میں رہے ان کی زبان سے ایک فقرہ بھی ایسا ادا نہ ہوا جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔

ربیع الاول میں مجالس عید میلاد النبی میں شروع ہوتیں۔ یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدرآباد میں جاری رہتا اور جن پیمانوں پر یہ مجالس ہوتیں حیدرآباد کو یہ سعادت پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ شروانی صاحب ان جلسوں کے صدر ہوتے۔

ان جلسوں میں ان کی شرکت محض اس لیے تھی کہ عوام میں ان جلسوں کا شوق پیدا ہو۔ جب یہ شوق پیدا ہو گیا تو انہوں نے میلاد خوانوں کی ٹولیوں کو عدالت عالیہ میں طلب کیا اور ان کی علمی حیثیت کی جانچ پڑتال کی گئی۔ جو اہل نکلے انہیں یہ اجازت دی گئی کہ وہ میلاد پڑھا سکتے ہیں اور جو معیار پر پورے نہیں اترے ان پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔

انہوں نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ عہدہ اس لیے دیا ہے کہ وہ دین کی خدمت کریں۔ عوام میں جو ان کی مقبولیت ہو گئی تھی اس کے بعد یہ کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک حکم کے ذریعے شراب اور دیگر نشوں کی دکانیں شہر پناہ سے باہر نکال دیں اور نشہ آور اشیا کا شہر کے اندر لانا جرم قرار دے دیا۔

صدر الصدور (چیف جسٹس) پہلے بھی تھے لیکن کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

دینی شعبوں کی تنظیم و ترقی کی طرف راغب ہوئے۔ رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط سے اہتمام کیا۔ مسجدوں میں تنخواہ دار اماموں کا اضافہ کیا گیا۔ عیدگاہ کی درستی و توسیع کرائی۔ اضلاع میں دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنیں قائم کی گئیں انگریزی مدرسوں میں دینی تعلیم کا خاص نگرانی

کے ساتھ انتظام ہوا۔ واعظین مقرر کیے گئے جو اضلاع کے دورے کرتے۔ ہفتہ وار مذہبی رسالے جاری ہوئے۔ ماہِ صیام میں چائے خانے اور ہوٹل بند رکھنے کے احکام جاری ہوئے۔

ان کی یہی انتظامی صلاحیتیں تھیں جن کی بدولت وہ بہ یک وقت کئی عہدوں پر فائز رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہوئے، جامعہ کی مجلس دینیات کے امیر بھی تھے۔ کتب خانہ آصفیہ کی مجلس ذیلی کے صدر اور مجلس انتظامی کے نائب صدر، اشاعت علوم کے صدر، دائرۃ المعارف کے رکن، مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر، انجمن احترام اوراق تبرکہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے، انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد میں تھی تو مولوی عبدالحق سے پہلے اس کے بھی سیکریٹری تھے۔

عشقِ رسولؐ رگ و پے میں سرائیت کیے ہوئے تھا۔ برسوں سے ایک تڑپ تھی کہ روضہ رسولؐ پر حاضری دی جائے لیکن مصروفیت تھیں کہ سر اٹھانے کی فرصت ہی نہیں دے رہی تھیں۔ حیدرآباد میں قیام کو دس سال ہو چکے تھے۔ اپنی بے بسی پر رونا بھی آتا تھا۔ سوچتے تھے کہ اگر ملازمت کی زنجیر پاؤں میں نہ ہوتی، حبیب گنج میں آزادی کی زندگی گزار رہے ہوتے تو کب کے حج بیت اللہ پر روانہ ہو چکے ہوتے۔ پھر خیال آیا دنیا کے یہ بکھیڑے تو چلتے ہی رہیں گے۔ ہمت کرلوں تو اعلیٰ حضرت (نظام حیدرآباد) سے اجازت مل ہی جائے گی۔ نظام سے ملاقاتوں کا حال یہ تھا کہ جب اور جس وقت چاہتے بلاواسطہ ملاقات کر سکتے تھے۔ جب رخصت پر آنے کے بعد حیدرآباد واپس پہنچتے تو معمول یہ تھا کہ اسٹیشن سے براہِ راست نظام کی کوٹھی پر جاتے۔ اطلاع ہوتے ہی سرا... پردہ اٹھتا اور نظام برآمد ہوتے۔ اکثر نظام کہتے ''اچھا مولوی صاحب'' جس پر وہ اپنے مکان واپس آجاتے اور اگر کوئی بات کرنی مقصود ہوتی تو نشست کا بندوبست کر دیا جاتا اور بلاتکلف باتیں ہوتیں۔ ان کے لیے یہ پابندی نہیں تھی کہ ڈیوڑھی میں انتظار کریں اور پھر نظام کے روبرو دست بستہ ہو کر گزارشات پیش کریں۔ اس دن بھی وہ ناوقت چلے گئے تھے لیکن حضور نظام میں باریابی میسر آگئی۔ انہوں نے اپنا ارادۂ حج ظاہر کیا۔

''مولوی صاحب! ریاست کے کام تو بہت ہیں اور آپ کی غیر موجودگی میں تعطل کا شکار بھی ہوں گے۔ آپ کے سوا مجھے کسی پر بھروسا بھی نہیں لیکن اس سفر کے لیے آپ کو اجازت نہ دے کر گناہ گار بننا نہیں چاہتا۔ کہیے کب روانگی کا ارادہ ہے۔''

''حج کے زمانے سے ایک دو ماہ قبل حیدرآباد چھوڑ دینا چاہتا ہوں شاید ماہ رجب میں۔''

''وہ کیوں۔''

''سفرِ حج سے قبل بعض زندہ بزرگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ بعض ایسے مزارات ہیں جن پر حاضری ضروری ہے۔ اپنے پیرو مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن کے مزار پُرانوار پر بھی حاضری کا مقصد۔''

''مابدولت آپ کی رخصت قبول کرتے ہیں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ آپ جب وہاں جائیں تو اس بندۂ عاجز کا بھی ایک چھوٹا سا کام کر دیں تاکہ میں بھی اس سعادت میں شامل ہو جاؤں۔ بہت دن سے ایک ارادہ تھا لیکن کسی پر بھروسا نہیں تھا۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔''

''فرمائیے میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

''آپ جب وہاں جائیں تو مسجد نبوی اور روضہ منورہ کی مرمت اور جاء نمازوں وغیرہ کی تیاری کا تخمینہ لگا کر ہمارے حضور پیش کریں۔''

''یہ خدمت تو اس فقیر کے لیے بھی سراپا سعادت ہے لیکن یہ خدمت مجھ اکیلے سے ادا نہیں ہو سکے گی اگر کوئی انجینئر میرے ہمراہ ہو تو پیمائش وغیرہ میں آسانی ہوگی۔''

''آپ جس کو چاہیں۔''

''مولوی سید عطا حسین مناسب ہوں گے۔''

''ان کے نام احکامات جاری کر دیئے جائیں گے۔ آپ سفر کی تیاری کریں۔''

وہ حیدرآباد سے روانہ ہو کر علی گڑھ پہنچے۔ من جملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہنچے۔ یہاں حضرت گنج مرادآباد کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد تشریف فرما تھے۔ ان کا قیام ایک چھپر کے نیچے تھا جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترا میدان میں تھا۔ بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں۔ شاہ صاحب نے انہیں اس چبوترے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی قیمتی شیروانی کے ساتھ گرد سے اٹے اسی چبوترے پر بیٹھ گئے۔ کسی نے ان کا تعارف کرایا تو فرمایا۔ ''پرانے شہزادے ہیں۔''

انہوں نے استدعا کی کہ ان کے حق میں دعا فرمائیں۔ استدعا قبول کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''بارالہٰا یہ حبیب الرحمٰن خان شروانی تیرا ایک بندۂ ناچیز ہے۔ بارالہٰا جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس

اکھڑ رہی ہو تو اس کی امداد فرمائی جائے۔ بارالہا جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال..... بارالہا جب حشر کا میدان قائم ہو اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہوں تو اس بے چارے حبیب الرحمٰن بھیکن پور والے کی دستگیری فرما۔ اس کے گناہوں کو بخش دے اور بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لے جائیں۔ اے اللہ! اس غریب پر اس کے حج وزیارت کے سفر کو آسان فرما۔"

جس وقت یہ دعا کی جا رہی تھی اس وقت کا عالم دیدنی تھا۔ مولانا شروانی کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ سارا مجمع مجسم گریہ بنا ہوا تھا۔

حضرت خواجہ غریب نواز کا عرس قریب آرہا تھا۔ اجمیر میں حاضری دی اور مزار پر حاضر ہو کر دعائے کامیابی سفر کی گئی۔ مزار سے واپس ہوئے تو ایک نوجوان صدا لگا رہا تھا۔ "کوئی موٹا آئے گا تو روٹی کھلوائے گا۔" مولانا نے کچھ نذر کیا۔ فقیر نے آواز پھر لگائی۔ "خواجہ میرا موٹا تو آگیا۔" ایسی کئی صدائیں سنتے اور کچھ نہ کچھ نذر کرتے وہ آگے بڑھ گئے اور ہوٹل پہنچ گئے۔ انہیں کبھی کا کہیں پڑھا ہوا یاد آرہا تھا کہ یہ وہی درگاہ ہے جہاں اکبر بادشاہ نے ننگے پاؤں آکر حاضری دی تھی اور بیٹے کی دعا مانگی تھی۔ خواجہ کی چشم عنایت سے جہانگیر پیدا ہوا تھا۔

حبیب گنج سے ضروری تیاری اور اقرباء سے ملاقات کے بعد بمبئی روانہ ہوئے تاکہ جہاز پر سوار ہو سکیں۔ بمبئی میں بارہ دن قیام کے بعد گرجستان نامی جہاز میں سوار ہوئے۔ جہاز نہایت شاندار تھا۔ بہترین سیلون اور کمرے قیام کے لیے۔ انتظام اور صفائی بہت اچھی تھی۔

جہاز پر سوار ہوتے ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ بجز ایک خیال ہر خیال جاتا رہا۔ مولانا کا حال یہ تھا کہ اخبار بینی کے بغیر چین نہ آتا تھا۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی یہ شوق گویا فنا ہو گیا۔ دورانِ سفر اور بمبئی واپس آنے تک اخبار دیکھا تک نہیں۔ پان خوری کی بہت عادت تھی لیکن جہاز پر قدم رکھتے ہی پان چھوٹ گیا۔ شعر گوئی کا ذوق از خود پیدا ہو گیا تھا۔ بے اختیار شعر موزوں ہوتے تھے۔ اس سفر کے دوران گویا یہ سوتا بھی خشک ہو گیا حالانکہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ آرام ہی آرام تھا۔

جہاز کے راستے میں چونکہ عدن نہیں آتا تھا اس لیے سب سے پہلے مبارک سرزمین عرب کا حصہ پیرم جزیرہ آیا۔

یہ خیال آتے ہی آنکھیں بھر آئیں کہ جہاز سرزمین عرب میں داخل ہوا ہے۔ اپنی گناہ گاری یاد آئی۔ دیر تک توبہ استغفار کا ورد جاری رہا۔ جدہ کی بندرگاہ آئی اور جہاز لنگر انداز ہوا تو ملک الحجاز بعض سعودی حکام کے ہمراہ، ابن سعود کی جانب سے خیر مقدم کیا۔ یہ تمام افراد ان کے سیلون میں آئے۔ کیونکہ انہیں خبر مل چکی تھی کہ ملک ہند کی سب سے بڑی ریاست کا نمائندہ حج کی غرض سے آرہا ہے جو یقیناً واپسی کے وقت بھاری امداد دے جائے گا۔ اس وقت تک تیل کی دولت ہاتھ آئی نہیں تھی اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ امداد تھی۔ اس لیے حاجیوں کی خوب خوب پذیرائی ہوتی۔ ان کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔ مولانا شروانی اور ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو موٹر کشتی میں سوار کر کے کنارے تک بہ آرام پہنچایا گیا۔ سمندر کے کنارے پر ایک شاندار عمارت، قصر شریف تھی۔ مولانا شروانی اور ان کے ہمراہیوں کو وہاں ٹھہرایا گیا۔ اس دن اور شب کو یہیں قیام کیا۔ ضیافت ابن سعود کی جانب سے تھی۔ پھر موٹر کے قافلوں کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف چلے۔ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ ایک عمر کی تمنا فضل ربانی سے بر آئی زیارت بیت اللہ المکرم وحاضری مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا۔ طواف، عمرہ سعی و صفا سے مشرف ہو کر احرام اتارا۔ قیام حرم شریف سے بالکل متصل "بیت خوفیر" میں تھا۔

سلطان ابن سعود کی جانب سے پیغام آیا کہ وہ ملاقات کے خواہاں ہیں۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ سرکاری موٹر آگئی۔ جو انہیں ابن سعود کے محل میں لے گئی۔ گفتگو شروع کی۔ راستے کی خیریت دریافت کی آسائش قیام کا حال پوچھا۔ حیدر آباد کی آبادی اور پیداوار پر گفتگو کی۔

8 ذی الحجہ سے قبل "منیٰ" میں جا کر مکان پسند کیا۔ اثنائے راہ میں جبل نور دیکھا۔ ایک سیدھی چٹان دیدہ افروز تھی اس مبارک چٹان سے گویا نگاہ لپٹ گئی۔

نماز عصر خیمے میں ادا کی۔ اس کے بعد جبل رحمت کی حاضری سے مشرف ہوئے۔ دعا شروع کی۔ ہاتھ اٹھنے کے بعد دعا کے الفاظ زبان پر آئے تھے کہ قلب میں ایک جوش پیدا ہوا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ دیر تک توبہ استغفار کا عالم رہا۔ ندامت کا احساس ایسا تھا کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

مغرب کا وقت اچھی طرح ہو جانے پر عرفات سے مراجعت ہوئی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہزاروں انسان اور

اونٹ اس اندھیرے میں رواں تھے۔ مزدلفہ پہنچ کر نماز مغرب وعشاء ملا کر پڑھی۔ رمی کے لیے کنکریاں چنیں۔ اونٹوں کے حلقے میں زمین پر بستر جمائے۔

منیٰ واپس آکر قربانی کی۔ شیطان کو کنکریاں مارنے سے بہ اطمینان فراغت ملی۔

21 ذی الحجہ تھا کہ طبیعت علیل ہوگئی۔ نقاہت اس قدر بڑھی کہ چلنا پھرنا موقوف ہوگیا۔ حکیم تفضل حسین خاں رام پوری کے علاج سے کچھ افاقہ ہوا تو سوچا تبدیلی آب وہوا کے لیے طائف جایا جائے اور بدن میں قوت آجانے پر مدینہ طیبہ کا سفر مبارک ہو۔ اس ارادے کی اطلاع ابن سعود کو ہوئی تو انہوں نے وہاں قیام کا بندوبست کرادیا۔

ذہن تو یہی کہتا تھا کہ تبدیلیٔ آب وہوا کے لیے طائف جایا جائے لیکن قلب مضطر مدینہ طیبہ کی حاضری کے لیے بضد تھا۔ نہ جانے طائف میں کتنا وقت لگ جائے۔ یہ سوچ کر طائف جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو
نوید آنکھ کو ہر تہنیت ہو سینے کو

روانگی کے وقت یہ شعر خود بخود موزوں ہوگیا۔

مدینہ منورہ میں حاضری کا شرف حاصل ہونے والا تھا کہ طبیعت خود بخود بحال ہوگئی۔ درد وغیرہ سب جاتا رہا۔ مدینہ سے ایک منزل پہلے غسل کیا، نئے کپڑے بدلے، عطر لگایا اور بقیہ مسافت پاپیادہ طے کی۔

صبح صادق کی روشنی میں مبارک مسجد نبویؐ کے نورانی مینارے دیدہ افروز ہوئے۔ مسجد میں داخل ہوئے۔ اوّل دو رکعت مسجد محراب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ادا کیا۔ پھر روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر درود وسلام عرض کرنے کا شرف حاصل کیا۔

شرف حضورؐ کے بعد قیام گاہ پر آئے۔ یہ مکان حرم شریف سے چند ہاتھ کے فاصلے پر باب رحمت سے متصل تھا۔ در خیر پر حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔

مدینہ میں قیام تھا۔ حاضری کی سعادت ہر نماز کے بعد میسر آرہی تھی کہ ایک روز مدیر حرم تشریف لائے اور مولانا شروانی سے مخاطب ہوئے۔ ''حکم ہوا ہے کہ آپ کو روضۂ اقدس کے اندر لے جایا جائے۔''

یہ سنتا تھا کہ مولانا کا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ ''حضرت! میں اس قابل کہاں۔ مجھے تو روضہ مبارک کی جالی کے قریب کھڑے ہونے کی جرأت نہیں ہوتی۔''

''وہ حکم شاہی تو یہی ہے۔ آپ کو یہ سعادت مل رہی ہے تو اسے قبول کیجیے۔ یہ مواقع بار بار نہیں آتے۔''

مولانا شروانی کے شوق اشتیاق نے بھی صدا لگائی، دیکھتا کیا ہے یہ پیش کش قبول کرلے۔ ارے نادان! یہ سعادت کسے ملتی ہے۔ مل رہی ہے تو آگے بڑھ کر چھین لے۔ ایک مرتبہ اپنی عزت افزائی پر خود ناز ہونے لگا۔ عاجزی سے گردن جھکالی۔ خدام کرام حسب قاعدۂ مقررہ غایت ادب کے ساتھ روضۂ اقدس کے باب معلیٰ پر حاضر ہوکر صف بستہ ایستادہ ہوئے۔ کلید بردار خادم سب سے آگے ایستادہ تھے۔ ان کے گلے میں بھاری چاندی کی زنجیریں تھیں جن میں بڑی بڑی کنجیاں تھی۔ سب نے اوّل درود وسلام عرض کیا اور پھر در سعادت کھولا۔ سب خاموش نیچی نظر کے ساتھ آہستہ بدن کو سمیٹے ہوئے داخل ہوئے۔ فرط ادب سے نگاہ فرش ادب پر بھی نہ جھکی۔ ادب نے نگاہ کو اتنا قابو میں رکھا کہ باہر آنے پر بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا دیکھا۔

جب تک رہے حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ اور دوسرے مزارات پر حاضری کے لیے جاتے رہے۔

تمام مراحل بہ آسانی طے ہوگئے۔ واپسی سے پہلے وہ ضرور کام کرلینا چاہتے تھے جس کے لیے نظام حیدرآباد نے خاص ہدایت دے کر روانہ کیا تھا اور مولوی سید عطا حسین صاحب مہندس دلی کے ہمراہ گئے تھے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے شاہ سعود سے ملنا ضروری تھا۔ ان کے حضور درخواست گزاری، درخواست فوراً قبول ہوئی اور شرف ملاقات نصیب ہوا۔ انہوں نے اپنا مقصد ان کے سامنے رکھ دیا۔

''والی دکن حضرت میر عثمان علی خاں نے بعد از سلام یہ عرض کیا ہے کہ درستی آخرت کے لیے... وہ مسجد نبویؐ کی توسیع وتزئین آرائش کے لیے کچھ رقم بطور نذرانہ بھیجنے کے خواہش مند ہیں۔ میں ہندوستان سے اپنے ساتھ انجینئر صاحب کو لے کر آیا ہوں جو تخمینہ لگا کر بتائیں گے کہ کتنی رقم درکار ہوگی۔ اس کے لیے آپ کی مشفقانہ اجازت کا طلب گار ہوں۔''

شاہ سعود نے نظام کی غیرت دینی کی تعریف کی اور بہ کمال شفقت اجازت مرحمت فرمادی۔ انہوں نے اپنی تحریر اپنی مہر کے ساتھ امیر مدینہ کے نام لکھ دی کہ وہ ان ہر دو حضرات کو جو سہولت ہوسکتی ہے فراہم کریں۔

جب کاموں کی فہرست تیار کی گئی، پیمائش کی گئی، حساب لگایا گیا تو ضروری تعمیر، قالین، دری، برقی روشنی

وغیرہ کا تخمینہ نو لاکھ روپے ہوا۔

شاہ سعود سے ملاقات کے بعد عصر کی نماز ادا کر کے روضۂ اقدسؐ پر حاضر ہو کر الوداعی درود و سلام عرض کیا اور اسی وقت واپسی کے لیے جدہ روانہ ہوگئے۔

تقریباً پانچ ماہ جملہ ایام سفر مبارک کے گزارنے کے بعد بمبئی پہنچے اور یہاں سے حیدرآباد پہنچ گئے۔ نظام سے ملاقات کی اور تخمینہ بارگاہِ خسروی میں پیش کیا۔

حسب ضابطہ باب حکومت سے رائے طلب کی گئی۔ وہاں سے صرف ایک لاکھ تیس ہزار کی منظوری ملی۔ محکمہ جاتی کارروائی میں بہت سارا وقت ضائع ہوگیا لیکن عذر پیش کیا جاتا رہا کہ خزانہ اتنی بڑی رقم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ نظام نے ان کارروائیوں کو بالائے طاق رکھا اور پورے نو لاکھ کی منظوری دے دی۔

☆......☆

مولانا کی پانچ مہینے کی غیر حاضری نے حیدرآباد کی ریاستی سازشوں نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ حکومتی حلقوں میں ان کے خلاف ایک گروپ تشکیل پا گیا۔ حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی کا امتیاز بھی بہت تھا۔ یہ تعصب بھی مولانا کے خلاف جا رہا تھا۔ احترام دین کی بدولت جو قربت انہیں حاصل ہو گئی تھی وہ بھی لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی۔ دربار کے قریبی حلقوں میں یہ بازگشت سنائی دی تو مولانا دل برداشتہ ہوگئے وہ اس ماحول میں کام کرنے کے عادی نہیں تھے اور نہ ضرورت مند تھے کہ سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے پہلے کہ آگ اور بھڑکتی انہوں نے اپنا استعفیٰ اس عذر کے ساتھ نظام کی خدمت میں بھیج دیا۔

”حکومت کے دور جدید میں میرے پاس اب کام کم رہ گیا ہے۔ قلتِ کار کی حالت میں کثیر تنخواہ لینا اور گھر سے دور رہنا گوارا ہونے کے قابل نہیں۔“

نظام، مولانا کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ انہوں نے ان کا استعفیٰ ارکان حکومت کو بھیج دیا اور وہاں سے منظوری کے بعد وہ بھی بے بس ہوگئے۔

مولانا کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔

”مولانا میرے ہاتھ بھی تو بندھے ہوئے ہیں ورنہ یہ صورت پیش نہ آتی۔“

بارہ سال بعد انہوں نے حیدرآباد کو الوداع کہا اور حبیب گنج چلے گئے۔ ملازمت کی مصروفیات نے بہت سے کاموں سے دور کر دیا تھا۔ حبیب گنج کی فرصت نے انہیں پھر علمی مشاغل اور ملی مسائل کی طرف متوجہ کر دیا۔ خاص طور پر ندوۃ العلماء، اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں، مسلم یونیورسٹی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، مسلم گرلز کالج علی گڑھ، ایشیا ٹک سوسائٹی کلکتہ، انجمن ترقی اردو، انجمن حمایت اسلام، طبیّہ کالج دہلی، دارالعلوم دیوبند، دائرۃ المعارف، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد۔ کتنے ہی بکھیڑے تھے جو ان کی جان کو لگے ہوئے تھے۔ ان کے لیے وقت نکال کر سفر کرنا پڑتا۔ حیدرآباد کے قیام نے کتب خانے سے بھی دور کر دیا تھا۔ اب کتب خانے کی دیکھ بھال، نئی کتابوں کے حصول اور مطالعہ میں بھی وقت گزرنے لگا۔

صبح کے ناشتے کے بعد دوپہر تک پابندی سے اپنا وقت کتابوں کے درمیان کتب خانے میں گزارتے، کتب خانے سے اٹھنے کے بعد کچہری کرتے جہاں ریاستی معاملات طے ہوتے۔ کچہری ختم ہوتی تو کھانا تناول کرتے۔ کچھ دیر قیلولہ کرتے، نماز ظہر مسجد میں ادا کرتے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔ پھر ڈاک دیکھتے، نماز عصر کے بعد مغرب تک باغ میں نشست رہتی۔

☆......☆

مولانا کے عہد میں شاعری پیشہ شرفا تھی۔ خاندانی ہونے کی علامت یہی تھی کہ وہ شخص اگر سخن گو نہ ہو تو کم از کم سخن فہم ضرور ہو۔ مولانا شروانی نے تو ابتداء ہی سے اردو اور فارسی کے اساتذۂ سخن کا مطالعہ کیا تھا۔ قدیم و جدید شعراء کے دواوین منظر غائر دیکھے تھے۔ اس کثرت مطالعہ نے انہیں سخن فہم نہیں رہنے دیا بلکہ بیس سال کی عمر ہی میں شعر کہنے لگے۔

کچھ نہ دیکھی ہم نے تاثیر فغاں
روتے روتے اک زمانہ ہو گیا
آ گئی جب یاد اس بے درد کی
درد سا اک دل میں پیدا ہو گیا
جس میں وحشت کے حوصلے نکلیں
ایسا صحرا نظر نہیں آتا
مٹا چکے رہِ الفت میں ہم نشاں اپنا
فدا ہے جس پہ دل اس کا نشان نہیں معلوم
رواں ہے قافلۂ عمر تیز گامی سے
کہاں ٹھہرتا ہے یہ کارواں نہیں معلوم
گئے وہ دن کہ اپنا آشیاں تھا صحن گلشن میں
قفس سے جھانک لیتے ہیں کبھی اب تو گلستاں کو

دل وحشی کو کیا تسکین ہو صحرا نوردی سے
اٹھا کر کوئی رکھ دے گوشہ دل میں بیاباں کو
دل لگی کو ہنسی سمجھتے ہو
ابھی بچپن کا ہے اثر باقی
تم کو لائے گی راہ پر اک دن
کشش شوق ہے اگر باقی

☆......☆

ابتداء میں دامن تخلص رکھا تھا لیکن جب کلام میں ذرا پختگی آئی تو ''حسرت'' تخلص کرنے لگے۔

راہِ سخن میں قدم آگے بڑھا تو رہبری کے لیے استاد کی ضرورت پیش آئی۔ اس وقت اقلیم سخن میں دو اساتذہ کی بادشاہ ہی تھی امیر مینائی اور داغ دہلوی، داغ کی رنگینی مولانا کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی البتہ امیر مینائی کی طبیعت ان سے قریب تھی۔ انہوں نے امیر مینائی کا دامن تھاما اور ان سے اصلاح سخن لینے لگے۔ جب ان کا قیام حیدرآباد میں ہوا تو امیر کے شاگرد جلیل مانکپوری وہاں موجود تھے۔ ان سے صحبتیں گرم ہونے لگیں اور پھر ان سے مشورۂ سخن بھی کرنے لگے۔ جلیل امیر مینائی کے شاگرد اور جانشین تھے۔ شعر کے خارجی محاسن میں ان کا رنگ استادانہ تھا۔ مولانا نے ان کی خوبیوں کو بڑی خوبی سے اپنایا اور دوسرے اساتذہ کی طرحوں پر بھی کامیاب غزلیں کہیں۔

مولانا کی دوسری مصروفیات اتنی تھیں کہ شعر گوئی کے لیے زیادہ وقت نہ نکال سکے۔ شعر کہے اور خوب کہے۔ دیوان مرتب کرلیا لیکن وہ کوئی انفرادی رنگ پیدا نہ کر سکے۔ شاعری کی لیکن شاعری کی دنیا میں کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ یہی حال ان کی فارسی شاعری کا بھی رہا۔

مطالعہ کی کثرت نے انہیں تصنیف و تالیف کی طرف بھی راغب کیا تھا۔ ملازمت ختم ہو جانے کے بعد یہی شغل رہ گیا تھا کہ جو کچھ پڑھیں اس کے بارے میں لکھیں۔ شائقین ان کے کتب خانے سے مدد لے کر صاحب تصنیف بن گئے تھے وہ تو ان کتابوں کے مالک تھے۔ کتابوں کا حق تھا کہ وہ ان کے بارے میں لکھیں۔ مولانا کی ذمہ داری بھی تھی کہ جو کتابیں ان کے پاس ہیں ان سے دنیا کو متعارف کرائیں۔

مصنف بہت سے ہوتے ہیں لیکن مصنف گر مصنف مشکل سے ملتے ہیں۔ مولانا نے اپنے لیے یہی راہ منتخب کی۔ انہوں نے مختلف نئے اور اچھوتے موضوعات پر مختصر مضامین لکھ کر دوسرے لکھنے والوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ پہلا چراغ خود جلایا پھر اس چراغ سے کتنے ہی چراغ جل اٹھے۔ بنیاد انہوں نے اٹھائی عمارت دوسروں نے بنادی۔ ان کے کتب خانے میں ایسی ایسی نادر کتابیں تھیں جن کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگی تھی۔ انہوں نے ان کتابوں کو بنیاد بنا کر جب مضامین لکھنے کا آغاز کیا تو ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ بڑے بڑے مصنفین ان موضوعات کی کھوج میں لگ گئے اور نتیجے میں ضخیم کتابیں وجود میں آگئیں۔

انہوں نے اپنی اہمیت زمانہ طالب علمی میں منوالی۔ ہوا یہ کہ اردو کا ایک رسالہ حسن حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس رسالے میں چیدہ مضامین پر ایک اشرفی انعام دیا جاتا تھا۔ رسالے کی مدیر نے ان سے بھی فرمائش کی اور پھر تقاضا ہونے لگا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ مضمون کس موضوع پر لکھا جائے۔ انہیں آگرہ کالج میں دیکھے ہوئے ایک نادر نسخے ''واقعات بابری'' کا خیال آیا۔ اس کی نقل ان کے پاس تھی۔ انہوں نے بابر کے حالات پر واقعات بابری اور تاریخ فرشتہ کی مدد سے مضمون لکھ کر رسالہ مذکور کو بھیجا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کا مضمون اشرفی کے انعام کا مستحق ٹھہرا ہے۔ اس حوصلہ افزائی نے انہیں مضمون نگاری کی طرف راغب کیا۔

اردو میں بابر کے حالات پر مشتمل کوئی جامع کتاب موجود نہیں تھی۔ ان کے مضمون نے اس کمی کو پورا کیا۔ بعد میں بابر کے بارے میں اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو ان واقعات سے آگے نہ بڑھ سکا جو ان کے مضمون میں بیان ہو چکے تھے۔

اس مضمون کے بعد اپنے قلم پر اعتبار ہو جانا لازمی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مقالہ علمائے سلف کے عنوان سے تحریر کیا اور ندوۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ میرٹھ میں پڑھا اور پھر یہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ الطاف حسین حالی نے اس کی پذیرائی میں انہیں خط لکھا۔

''افسوس ہے کہ مجھے اس عمدہ تصنیف پر مفصل ریمارک کرنے کی فرصت نہیں مگر مختصر یہ ہے کہ اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اور بھی بڑھا دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے کہ

مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی صدہا کتابیں لکھیں مگر ایسا خیال کرنا سخت غلطی کی بات ہے آپ نے در حقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سیلف ہیلپ لکھنے میں کیا ہے۔ اس نے بھی ہزاروں بایوگرافیاں پڑھ کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں نہیں لکھی گئی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ایسی کتاب لکھ دے جیسی کہ آپ نے لکھی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دو دو جلدیں ہر مدرسہ اسلامیہ میں ہونی چاہئیں بلکہ محمڈن کالج کے طلبہ بھی اس سے مستفید ہوں تو بہت مناسب ہے۔''

اس کتاب کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بمبئی کے ایک پارسی نے انہیں خط لکھا کہ جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ پارسیوں کے سلسلے میں بھی ایسی ہی کوئی کتاب لکھیے۔

فن رجال ہی سے متعلق انہوں نے ایک اور کتاب ''نابینا علماء'' لکھی۔ اس کتاب میں دنیائے اسلام کے ان علماء کے حالات لکھے جو آنکھوں کی نعمت سے محروم تھے۔

''استاد العلماء'' کے عنوان سے انہوں نے ایک رسالہ اپنے استاد لطف اللہ صاحب علی گڑھی، ان کے اساتذہ اور تلامذہ کی تعریف میں لکھا۔ اسی رسالے میں اس علمی تحریک کا تعارف بھی تھا جو مولانا لطف اللہ کے سلسلے سے منسلک تھی۔

ایک کتاب ''اسلامی اخلاق'' بھی شائع ہوئی جس میں دینیات کے ان لیکچروں کا مجموعہ تھا جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کو دیے تھے۔

اس کتاب میں انہوں نے احادیث کی روشنی میں اسلامی اخلاق پر جامعیت کے ساتھ گفتگو کی تھی اور مستند معلومات واحکام جمع کر رہے تھے۔

ان کی دوسری تصانیف کی طرح یہ تصنیف بھی اپنے زمانے میں انفرادیت رکھتی تھی۔

شبلی نعمانی کی تصنیفات المامون اور الفاروق کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا شروانی نے الفاروق کے نمونے کو سامنے رکھ کر سیرت الصدیق تصنیف کی۔

دوسری تصانیف کی طرح اس میں بھی عبارت آرائی سے گریز کیا ہے اور صرف پونے دو سو صفحات میں ان جلیل القدر صحابی کی سیرت کو جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس وقت اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں تھی۔

☆......☆

جب تک بدن میں جان رہی قلم ہاتھ سے نہیں رکھا لیکن پیرانہ سالی کی کمزوری برابر کام کر رہی تھی۔ ان مسودات کی بڑی فکر تھی جو چھپنے سے رہ گئے تھے۔ رسائل سیرت اور مقالات شروانی چھپ کر آئے تو بہت خوش ہوئے۔

کمزوری پاؤں جماتی چلی گئی۔ جسمانی صحت بظاہر اچھی تھی لیکن حافظے میں کچھ فرق آ گیا تھا۔ اکثر باتیں کرتے کرتے بھول جاتے تھے کہ کیا بات کر رہے تھے۔ احباب و اعزہ کے نام تک بھول جاتے تھے۔

یہ معذوری سال دو سال رہی پھر بستر پکڑ لیا۔ معالجین کی کیا کمی تھی۔ حکیم شبیر احمد خان شروانی تو ہر وقت ہی ساتھ تھے۔ حکیم ظفر احمد خاں دہلی سے اور ڈاکٹر عبدالمجید لکھنو سے آ کر معائنہ کر گئے تھے۔ علالت کا یہ سلسلہ ایک ہفتے سے زیادہ رہا۔ ایک دن پوچھنے لگے۔ ''آج کون سا دن ہے۔'' ''بتایا گیا منگل ہے۔ تاسف سے فرمایا افسوس جمعہ نکل گیا۔''

گویا یہ آخری خواہش تھی جو اس طرح پوری ہوئی کہ تین دن گزر گئے اور جیسے ہی 11 اگست 1950ء کو جمعہ کا سورج طلوع ہوا علم و دین تقویٰ اور تہذیب و شرافت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

انتقال کی خبر آگ کی طرح شہر و مضافات میں پھیل گئی۔ حکام ضلع، عمائدین شہر، اکابر مسلم یونیورسٹی، غرباء اور عام لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ مسلم یونیورسٹی میں مکمل تعطیل ہوئی۔ نماز جمعہ کے بعد مسلم یونیورسٹی کرکٹ لان پر ہزاروں آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔

وصیت پہلے ہی سے موجود تھی لہٰذا جنازہ علی گڑھ سے 26 میل دور خاندانی قبرستان بھموری لے جایا گیا جہاں تدفین عمل میں آئی۔

وصیت کے ہی مطابق مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کا عظیم الشان کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالے کر دیا گیا۔

ماخذ

صدر یار جنگ

از شمس تبریز خان

دیوانی کرکٹ

کاشف زبیر

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس کے شائقین پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں اس کھیل نے جنم لیا ہے وہاں فٹ بال مقبول ہے لیکن کرکٹ کی مقبولیت کی وجہ سے اس کھیل پر سب سے زیادہ سٹہ وہیں کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کو تجارتی بِنا پر منعقد کرنے والوں نے کیسی کیسی چالیں چلیں۔

شائقین کرکٹ کے لیے تحفہ خاص

میدان میں کھیلے جانے والے کھیلوں میں سب سے ست کھیل گالف شمار ہوتا ہے۔ مگر یہ انفرادی کھیل ہے۔ ٹیم کی صورت میں بھی ایک وقت میں ایک ہی آدمی کھیلتا ہے۔ ٹیم اسپورٹس میں سب سے ست کھیل ٹیسٹ کرکٹ ہے۔ یہ نہ صرف ست ہے بلکہ اکثر پورے پانچ دن جاری رہنے کے بعد بھی بے نتیجہ رہتا ہے۔ کسی زمانے میں چھ دن کے ٹیسٹ میچز بھی ہوتے تھے اور ایک ٹیسٹ میچ جو انگلینڈ اور جنوبی افریقا کے درمیان جنوبی افریقا میں کھیلا گیا وہ دس

دن تک جاری رہا اور اس کے بعد بھی ڈرا ہوا۔ ممکن ہے یہ ٹیسٹ جو 3 مارچ سے 11 مارچ 1939 تک دس دن جاری رہا۔ اس سے بھی زیادہ دن چلتا مگر پہلے طوفانی بارش نے اسے روکا اور پھر انگلینڈ کی ٹیم کے وطن واپسی کا وقت آ گیا اور بندرگاہ پر ان کا جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ مجبوراً فتح سے صرف 43 رنز کی دوری پر یہ میچ چھوڑ کر انگلینڈ کی ٹیم واپس وطن لوٹ گئی۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد جب بین الاقوامی کرکٹ کا دوبارہ آغاز ہوا تو اس وقت ٹیسٹ کرکٹ کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔ ٹی وی کا دور نہیں تھا اور ریڈیو کمنٹری بھی صرف انگلینڈ، آسٹریلیا، جنوبی افریقا اور نیوزی لینڈ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں پیش کی جاتی تھی۔ ویسٹ انڈیز، انڈیا اور پاکستان میں ریڈیو کمنٹری بھی خاصی دیر سے آئی تھی۔ لوگ کرکٹ دیکھنے کے لیے میدان کا رخ کرتے۔ ٹیسٹ کرکٹ کے ساتھ ساتھ تین اور چار دن تک ہونے والے فرسٹ کلاس میچز بھی بہت مقبول تھے۔ نہ صرف ترقی یافتہ ملکوں بلکہ پاکستان، انڈیا اور ویسٹ انڈیز میں بھی شائقین فرسٹ کلاس کرکٹ دیکھنے کے لیے میدانوں کا رخ کرتے تھے۔ اس وقت کرکٹ سے لطف اندوز ہونے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ میدان کا رخ کیا جائے۔ راقم کو یاد ہے کہ ستر کی دہائی میں عام کلب کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے خاصی تعداد میں لوگ میدان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے گھر سے کرسیاں اور چارپائیاں تک لے آتے تھے تاکہ سکون سے بیٹھ کر کرکٹ سے لطف اندوز ہو سکیں۔

پھر ٹیکنالوجی اور ٹی وی کا دور آیا۔ انگلینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقا میں ٹیسٹ کرکٹ ساٹھ کی دہائی کے آخر میں براہِ راست نشر کی جانے لگی تھی۔ البتہ ترقی پذیر ملکوں میں کرکٹ کو ٹی وی تک آنے میں اسّی کا عشرہ لگ گیا تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں کرکٹ کی براہ راست نشریات کا اثر یہ ہوا کہ کرکٹ کمرشل ہونے لگی اور کرکٹ بورڈز کو آمدنی کا ایک نیا ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ یوں کرکٹ کے معاملات کرکٹ کھیلنے اور اسے آرگنائز کرنے والے ہاتھوں سے نکل کر نان کرکٹنگ ہاتھوں یعنی میڈیا کے پاس جانے لگے۔ میڈیا کے ناخداؤں نے محسوس کر لیا کہ اگر انہیں کرکٹ سے زیادہ کمانا ہے تو اس کے فارمیٹ میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اسّی کے عشرے کے آغاز میں ہی ایک روزہ کرکٹ کا آغاز ہو گیا تھا۔ جب 5 جنوری 1971 کے دن آسٹریلیا اور انگلینڈ کے درمیان ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلا گیا۔ ٹیسٹ میچ کی طرح اس میں بھی آسٹریلیا فاتح رہی تھی۔

اس کے بعد مختلف بین الاقوامی کرکٹ کھیلنے والی اقوام آپس کی سیریز میں ایک روزہ میچوں کو بھی شامل کرنے لگیں۔ اگرچہ اس وقت کرکٹ کے ناقدین نے ایک روزہ کرکٹ کو کرکٹ کی تباہی قرار دیا تھا اور قدامت پرست ماہرین ٹیسٹ کرکٹ کو ہی اصل کرکٹ قرار دیتے تھے۔ مگر کرکٹ کے شائقین نے ایک روزہ کرکٹ کو پسند کیا تھا اور ان سے زیادہ اسپورٹس میڈیا کو یہ فارمیٹ پسند آیا تھا کیونکہ پانچ دن کے ٹیسٹ کے مقابلے میں ایک روزہ میچ نہ صرف زیادہ تیز رفتار تھا بلکہ اس میں نتیجہ بھی یقینی ہوتا تھا۔ صرف خراب موسم ہی نتیجے میں خلل انداز ہو سکتا تھا۔ نہ صرف میدان میں دیکھنے کے لیے زیادہ لوگ آنے لگے بلکہ ٹی وی نشریات کی صورت میں ٹیسٹ سے کئی گنا زیادہ لوگ ایک روزہ میچ دیکھتے تھے۔ نتیجے میں ایک روزہ کرکٹ تیزی سے اوپر آنے لگی۔ پھر اس کی وجہ سے اوّلین کرکٹ ورلڈ کپ ممکن ہوا جو ٹیسٹ فارمیٹ میں ممکن نہیں تھا۔ پہلا ایک روزہ میچ کھیلے جانے کے صرف چار سال بعد 1975 میں اوّلین کرکٹ ورلڈ منعقد ہوا اور اس کے بعد سے یہ ہر چار سال بعد ہو رہا ہے۔

مقبولیت، شائقین کی حاضری اور آمدنی کے لحاظ سے صد سالہ ٹیسٹ کرکٹ بھی ایک روزہ کرکٹ ورلڈ کپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ ٹیسٹ کرکٹ اصل میں شوقیہ کرکٹ تھی اور اس سے کھیلنے والے کھلاڑیوں کو براہ راست کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں بورڈز اور مقامی ایسوسی ایشنز ٹکٹوں کی فروخت سے اچھا خاصا کما لیا کرتی تھیں۔ ٹیسٹ کرکٹ میں جان مارنے والے کرکٹر پیشہ ور کرکٹ یعنی کرکٹ سے کمانے کے لیے کاؤنٹی کا رخ کرتے تھے جہاں انہیں ان کے نام کے حساب سے معاوضہ مل جاتا تھا۔ مگر یہ بھی بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ بس اتنا ہوتا کہ دس پندرہ سال کاؤنٹی کرکٹ کھیل کر ترقی پذیر ملکوں کے کرکٹر مالی لحاظ سے بہتر پوزیشن میں آ جاتے تھے۔ اس سے زیادہ کمانے کے لیے انہیں دوسرے پیشوں کا رخ کرنا پڑتا تھا۔

یہ ایک روزہ کرکٹ فارمیٹ تھا جس نے پہلی بار کرکٹرز کو براہِ راست اپنے پیشے سے زیادہ کمانے کا موقع فراہم کیا۔ گورے ممالک کے کرکٹرز اسّی کی دہائی میں ہی پیشہ ور ہو چکے تھے اور اچھا کما رہے تھے۔ مگر ترقی یافتہ اور

رنگ دار ملکوں کے کرکٹرز ابھی تک کاؤنٹی کے محتاج تھے۔ اس وقت ٹیسٹ کرکٹ کے میدان سونے ہونے لگے تھے۔ 1977 میں جب پاکستان کی ٹیم انڈیا سے کھیلتی تو میدان تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر جاتے تھے۔ ہمیشہ گنجائش سے زیادہ ٹکٹس بکتی تھیں۔ صرف چند سالوں میں یہ منظر دیکھنے میں آنے لگا کہ پاکستان اور انڈیا کھیل رہے ہیں اور میدان میں چند سو یا چند ہزار تماشائی بیٹھے ہیں۔ برصغیر میں سرکاری کنٹرول اور نجی میڈیا نہ ہونے کی وجہ سے میچوں کی نشریات مفت میں سرکاری چینل سے دکھائی جاتی تھی اور کرکٹ بورڈز کو اس کے بدلے کچھ نہیں ملتا تھا جب کہ یہ چینل اشتہارات سے ڈھیروں کماتے تھے۔ بورڈز کے لیے ٹیسٹ کرکٹ خسارے کا سودا بن گئی تھی۔ بورڈز کو نہ صرف مہمان ٹیموں کی مہمان نوازی کرنا پڑتی تھی بلکہ انتظامات پر بھی اپنے پلے سے خرچ کرنا پڑتا تھا۔ جواب میں معمولی سی گیٹ منی ملتی تھی۔

ابھی بین الاقوامی میڈیا نہیں آیا تھا۔ گویا ترقی پذیر کرکٹ اقوام کے لیے میڈیا رائٹس کی فروخت کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ایسے میں بورڈز کو آمدنی کے حصول کا ایک ہی ذریعہ دکھائی دیا۔ یہ ایک روزہ کرکٹ تھی۔ اس طرز کی کرکٹ روٹھے تماشائیوں کو کھینچ کر واپس میدان میں لا سکتی تھی۔ بورڈز کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ وہ شائقین جو ٹیسٹ کرکٹ کی سست روی اور اکثر ڈرا نتیجے کی وجہ سے میدان تک آنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ اب وہ ایک روزہ میچوں کی سنسنی خیزی، تیز رفتاری اور یقینی نتیجے کی وجہ سے میدانوں کا رخ کرنے لگے۔ گیٹ منی سے کم ہو جانے والی آمدنی پھر سے بڑھنے لگی۔ انگلینڈ میں لگاتار تین کامیاب ورلڈ کپ کرانے کے بعد چوتھا ورلڈ کپ ایشیا کو ملا جو سری لنکا، پاکستان اور بھارت میں مشترکہ ہوا۔ اگرچہ مالی لحاظ سے یہ ان ملکوں کے لیے سودمند ثابت نہیں ہوا مگر اس تجربے سے برصغیر و لنکا (جو کرکٹ کھیلنے والے ممالک کا اب سب سے بڑا گروپ بھی ہے) کے کرکٹ بورڈز نے یہ جان لیا کہ بڑے کرکٹ ٹورنامنٹ کیسے کراتے ہیں۔

میڈیا ٹیکنالوجی کا دور شروع ہو گیا تھا اور اب یہ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کے فرق کے بغیر ساری دنیا میں پھیل رہی تھی۔ خاص طور سے سیلائٹس چینلوں کی آمد آمد تھی۔ کیبل ٹی وی نے اچانک ہی ٹی وی کو پرانے انداز سے نکال کر ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ پہلے انٹینا کی مدد سے درجن یا چند درجن چینل دیکھے جا سکتے تھے مگر اب کیبل ٹی وی سینکڑوں کے حساب سے چینل دکھا رہا تھا اور اس میں مقامی اور بین الاقوامی، انٹرٹینمنٹ، مووی، کڈز اور اسپورٹس چینل شامل تھے۔ بعد میں مزید اقسام کے چینل بھی آ گئے۔

اسپورٹس چینل کی آمد نے جہاں دوسرے کھیلوں کو براہ راست نشر کرنے کی راہ ہموار کی وہیں کرکٹ میڈیا کے لیے ایک پرکشش کھیل بن گیا اور اس کا مرکزی نقطہ برصغیر کے ڈیڑھ ارب لوگ تھے جو کرکٹ سے دیوانہ وار محبت کرتے ہیں۔

انگلینڈ کرکٹ کی جنم بھومی ہے مگر وہاں کرکٹ سے زیادہ فٹ بال اور ٹینس کو پسند کیا جاتا۔ اسی طرح آسٹریلیا، جنوبی افریقا اور نیوزی لینڈ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی کرکٹ کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ مطلب ملک کے زیادہ لوگ نہ تو اسے کھیلتے ہیں اور نہ ہی اسے دیکھتے ہیں۔ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اسے ملک گیر پیمانے پر پسند کیا جاتا ہے مگر وہاں کرکٹ کے لیے ایسی دیوانگی نہیں ہے جو برصغیر یا کسی زمانے میں ویسٹ انڈیز میں نظر آتی تھی۔ جب چالیس ڈگری سینٹی گریڈ کی گرمی اور تیز دھوپ میں نہ صرف بائیس کھلاڑی بلکہ بے شمار دیکھنے والے بھی کرکٹ سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔ دس سال سے پچیس سال کی عمر کے بیشتر نوجوان فارغ وقت اور چھٹی کے دن کرکٹ کھیلنے کے لیے میدانوں، پارکوں اور سڑکوں کا رخ کرتے ہیں۔

اگر کوئی بین الاقوامی میچ آرہا ہو۔ بے شک وہ ٹیسٹ میچ کیوں نہ ہو۔ تو ۹۰ فیصد ٹی وی ان چینلوں پر ہوتے جہاں سے براہ راست میچ نشر کیا جارہا ہوتا تھا۔ گھر کا ہر فرد ٹی وی کے آگے ہوتا سوائے ان کے جو کسی مجبوری کی وجہ سے ٹی وی سے دور ہوتے تھے۔ دفتروں، بازاروں، ہوٹلوں، پارکوں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی تک میں موضوع کرکٹ ہوتا تھا۔ وہ لوگ جو غلطی سے بھی کبھی ریڈیو نہیں سنتے وہ میچ کی کمنٹری لگائے ہوئے ہمہ تن گوش ہوتے۔ ڈھابا ہوٹلوں اور پان کی دکان پر میچ والے دن سے زیادہ رش کبھی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ باقی بازار اور گزرگاہیں سنسان ہوتی تھیں۔ کوئی فرد گھر سے باہر نظر بھی آتا تو ایسی عجلت میں ہوتا کہ اس کی ٹرین چھوٹنے والی ہو۔ ایسا منظر کسی ترقی یافتہ ملک میں نظر نہیں آتا۔

اسی منظر نے اسپورٹس میڈیا کے ساتھ ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو بھی متاثر کیا جو اتنی بڑی آبادی کو اپنی مصنوعات کا

خریدار بنانا چاہتی تھیں۔ یہ حقیقت ہے 1987ء کے ورلڈ کپ کے فوراً بعد عالمی میڈیا اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اس آبادی کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور ان کا سب سے مؤثر ہتھیار کرکٹ تھا جو بلا رنگ و نسل و زبان اور مذہب اس خطے میں یکساں مقبول تھا۔ کیونکہ انڈیا اس کھیل میں مرکزی کھلاڑی تھا اس لیے سب سے پہلے اسے شامل کیا گیا۔ اپنی بڑی آبادی اور بڑی منڈی کے ساتھ وہ مرکزی کھلاڑی کے لیے موزوں ترین بھی تھا۔ ایک پلان کے تحت مقامی کرکٹ کو اسپانسر کیا جانے لگا۔ کیونکہ سگریٹ ساز کمپنیاں ملٹی نیشنل کے زمرے میں نہیں آتی تھیں۔ اس لیے برصغیر کے بورڈز کو مجبور کرکے ان کو کرکٹ اسپانسر شپ سے خارج کردیا گیا۔ اس وقت تک ساری دنیا میں سگریٹ ساز کمپنیاں ہی کرکٹ کو اسپانسر کررہی تھیں۔ آسٹریلیا اور انگلینڈ میں اب بھی کر رہی ہیں۔ صرف برصغیر سے ان کو میدان سے باہر کردیا گیا۔

ملٹی نیشنل مشروب ساز کمپنیاں سامنے آئیں اور کرکٹ کو اسپانسر کرنے لگیں۔ انڈیا میں یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا۔ دوسری طرف آسٹریلیا میں ہونے والا ورلڈ کپ تاریخ کا پہلا مکمل کمرشل ورلڈ کپ بن گیا اور اس نے مختلف مدوں میں بھاری رقوم کمائیں۔ اس سال آسٹریلین کرکٹ بورڈ اور آئی سی سی نے ریکارڈ آمدنی حاصل کی تھی۔ اس ورلڈ کپ نے ثابت کردیا کہ کرکٹ اور خاص طور سے ایک روزہ کرکٹ میں بین الاقوامی میڈیا اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کو متوجہ کرنے کی پوری صلاحیت ہے۔ اسٹیج پوری طرح تیار ہوگیا تھا اور اب صرف کھیل شروع کرنے کی ضرورت تھی مگر یہ کھیل تاریخ میں پہلی بار گوروں کے ہاتھ سے نکل کر رنگ دار اقوام کے ہاتھ میں آنے والا تھا۔ جیسے ایک زمانے میں انگلینڈ اور آسٹریلیا کھیل سے لے کر اس کی قانون سازی تک تمام معاملات پر حاوی تھے۔ اب یہ درجہ ان سے چھننے والا تھا۔ کھلاڑی صرف ایک رہ جاتا اور سارا کھیل اس کے گرد ہوتا۔ اور وہ کھلاڑی تھا میڈیا۔

1992ء کے ورلڈ کپ سے پہلے شارجہ کی بینیفٹ فنڈ سیریز بھی بے حد کامیاب رہی اور اس کا بنیادی نقطہ برصغیر کی کرکٹ کی دیوانی اقوام تھیں۔ یو اے ای میں انڈین، پاکستانی اور سری لنکن لوگ بڑی تعداد میں روزگار کے لیے مقیم ہیں۔ وہ پیسا بھی اچھا کماتے ہیں اس لیے جب ان کے لیے کرکٹ منعقد کی گئی تو وہ جوق در جوق اسٹیڈیم آئے۔ پچیس ہزار افراد کی گنجائش رکھنے والے شارجہ کرکٹ اسٹیڈیم میں نوے کی دہائی میں ہونے والے بیشتر میچز جیم پیک جاتے تھے۔ حالانکہ ٹکٹ بہت زیادہ مہنگا ہوتا تھا۔ پاکستان اور انڈیا کے میچ میں وی آئی پی اسٹینڈ کا ٹکٹ پانچ ہزار درہم کا بھی ہوتا تھا اور باکس پندرہ سے پچیس ہزار درہم میں ملتا تھا۔ کم سے کم ٹکٹ بھی ڈیڑھ سو درہم کا ہوتا تھا۔ کرکٹ کی پوری تاریخ میں آج تک کسی میدان کو اس قدر گیٹ منی حاصل نہیں ہوئی جو شارجہ گراؤنڈ نے حاصل کی۔

پھر تاریخ میں پہلی بار کھلی نیلامی سے ٹورنامنٹس کے میڈیا رائٹس فروخت کے لیے پیش کیے گئے۔ اسی وجہ سے سی بی ایف ایس نئے اور پرانے کھلاڑیوں کو خطیر رقوم (پچاس ہزار امریکی ڈالرز) دیتی تھی۔ پھر میچوں کی فیس، مین آف دی میچ ایوارڈ اور ٹرافی جیتنے والی ٹیم کو بھی بڑی رقم انعامات میں دی جاتی تھیں۔ برصغیر کے کرکٹرز نے یہاں سے بہت زیادہ مالی فوائد حاصل کیے اور بے شمار کرکٹرز کو اس سیریز سے فائدہ ہوا۔ جاوید میانداد نے تو ایک چھکے سے ایسی کمائی کی جو مثال بن گئی۔ مگر اس سیریز میں پاکستان اور انڈیا کے کھلاڑیوں نے مساوی فائدے اٹھائے بعد میں سری لنکن کرکٹرز کو بھی اس فنڈ سے فائدہ ہوا۔ مگر کرکٹ کے نئے اسٹیج پر شارجہ کا میدان قابلِ قبول نہیں تھا۔ وجہ وہی تھی کہ انڈیا کی بڑی آبادی اور منڈی کو فوکس کرنا تھا تب بھی بڑے فوائد حاصل کیے جاسکتے تھے۔ اس لیے شارجہ کو پیچھے کیا جانے لگا۔

اس کے لیے انڈین کرکٹ بورڈ کو استعمال کیا گیا۔ جو ویسے ہی شارجہ میں پاکستان کے ہاتھوں انڈیا کی مسلسل شکستوں سے چراغ پا تھا۔ اس نے اچانک ہی سٹے بازی اور میچ فکسنگ کا بہانہ بنا کر اپنی ٹیم شارجہ کے ٹورنامنٹس میں بھیجنے سے انکار کردیا۔ شارجہ کپ جو پاکستان انڈیا اور سری لنکا کے درمیان ہوتا تھا۔ آسٹریلیشیا کپ جس میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی ٹیمیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ کرکٹ کی تاریخ کے کامیاب ترین ٹورنامنٹس میں شمار ہوتے ہیں۔ ان بین الاقوامی ٹیموں کے درمیان نہ صرف کانٹے کے مقابلے ہوتے تھے بلکہ انہیں دیکھنے کے لیے ساری دنیا سے لوگ بھی یہاں آتے تھے۔ شارجہ اسٹیڈیم میں نہ صرف بین الاقوامی معیار کی سہولتیں تھیں۔ بلکہ یو اے ای میں ایک مکمل ٹورسٹ انڈسٹری موجود تھی اور یہاں سیاحوں کو تمام سہولیات اعلیٰ درجے کی ملتی تھیں اس لیے انگلینڈ، آسٹریلیا

اور جنوبی افریقا تک سے شائقین یہاں کرکٹ دیکھنے کے لیے آنے لگے تھے۔

صرف اپنے مفاد کی خاطر کرکٹ کے بڑوں نے ایک خوب صورت کرکٹ وینیو کو یوں تباہ کیا کہ اب یہاں صرف پاکستان اور افغانستان ہوم سیریز کھیلتے ہیں۔ جہاں تک سٹے بازی اور میچ فکسنگ کا تعلق ہے اس کا اصل گڑھ تو انڈیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں سٹے بازی ہو یا کھلاڑی میچ فکسنگ میں ملوث پائے جائیں اس کے تانے بانے ہمیشہ انڈیا کے سٹے بازوں سے جا کر ملتے ہیں۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقا کے متعدد کرکٹرز اپنے ملک میں انڈین سٹے بازوں سے روابط اور میچ فکسنگ میں ملوث ہونے کی وجہ سے سزا کے مستحق ٹھہرے۔ اسی طرح پاکستانی کھلاڑی انگلینڈ میں میچ فکسنگ میں ملوث پائے گئے اور انہیں سزا ملی۔ مگر کسی ملک کو کرکٹ کے لیے بین قرار نہیں دیا گیا۔ ایسا انوکھا کام صرف شارجہ کے ساتھ ہوا۔ مزے کی بات ہے کہ اسی ملک میں آئی سی سی نے اپنا ہیڈ کوارٹر رکھا ہوا ہے اور اب یہاں پاکستان سے تمام دنیا کی ٹیمیں سیریز کھیلنے آتی ہیں تو کیا وہاں سٹے بازی و میچ فکسنگ کا اندیشہ باقی نہیں رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سٹے بازی صرف ایک بہانہ تھا۔

شارجہ کو بین الاقوامی کرکٹ کے لیے شجرِ ممنوعہ بنانے کے بعد انڈیا میں کرکٹ کے بین الاقوامی ایونٹس کو پروموٹ کیا جانے لگا۔ اس کا آغاز 1992 کے ورلڈ کپ کے فوراً بعد ہوا تھا۔ انڈیا کی ٹیم دو یا تین دوسری ٹیموں کے ساتھ اپنے ملک میں ٹورنامنٹ کھیلتی اور حیرت انگیز طور پر ہمیشہ فائنل جیت جاتی چاہے باقی ٹورنامنٹ میں اس کی کارکردگی کیسی ہی کیوں نہ ہوتی۔ ناقدین نے ان فائنل میچوں کو مشکوک قرار دیا۔ مگر کون تحقیق کرتا۔ اسی طرح 1996 کے ورلڈ کپ میں کئی مشکوک میچز دیکھنے میں آئے جس میں پاک بھارت کوارٹر فائنل اور پھر فائنل بھی تھا جہاں آسٹریلیا جیسی ماہر ٹیم نے اہم ترین مواقعوں پر تین آسان کیچ ڈراپ کر دیئے۔ تقریباً یہی کہانی 2011 کے ورلڈ کپ میں دوہرائی گئی جس کے بارے میں بکیز کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس کے بیشتر میچ فکس تھے۔ مگر کسی نے اس پر انگلی نہیں اٹھائی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ کرکٹ کا کھیل اس سمت بڑھ رہا ہے جب پیسا ہی اس کا واحد اصول رہ جائے گا۔

لوگ بے وقوف نہیں ہیں میڈیا نے جہاں کرکٹ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا وہیں اس نے کرکٹ دیکھنے والے عام فرد کو تقریباً ماہرین کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ ٹی وی پر دیکھتے کہ کھلاڑی کیا کر رہے ہیں اور میچ کا نقشہ اچانک ہی کس طرح پلٹ جاتا ہے۔ پھر وہ دیکھتے کہ سٹے باز کس بات پر کیا بھاؤ دے رہے ہیں۔ پھر کھیل کا رخ سٹے بازوں کی منشا کے مطابق بدل جاتا۔ رفتہ رفتہ لوگ جاننے لگے اور ان کی نظروں میں میچ مشکوک ہونے سے کرکٹ کے کھیل کی وقعت کم ہونے لگی۔ ایک بار کرکٹ کو اسی بحران کا سامنا کرنا پڑا جس کا سامنا اسے اسی کی دہائی میں ہونے والے ٹیسٹ میچوں میں کرنا پڑا تھا۔ یعنی لوگوں نے میدان میں آنا اور کھیل میں دل چسپی لینا چھوڑ دیا۔ اگرچہ ٹیسٹ میچوں میں عدم دلچسپی کی وجہ اس کی سستی تھی مگر ایک روزہ کرکٹ کو میچ فکسنگ اور سٹے بازی نے داغ دار کیا۔ مسلسل تنازعات اور مشکوک میچوں نے اس کی ساکھ کو متاثر کیا ہی تھا۔ صرف تیس سال کے دوران ایک روزہ میچوں کے میدان بھی خالی دکھائی دینے لگے۔

میدان سونے کرنے میں ایک کردار ٹی وی کی لائیو کوریج نے بھی کیا۔ نئی ٹیکنالوجی اور جدید ٹیکنیک کی مدد سے اب ٹی وی اسکرین پر میچ اتنا واضح دکھایا جانے لگا کہ میدان میں جانے والا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے اگرچہ میدانوں میں بھی بڑی اسکرینیں لگائی جاتی ہیں جن پر تماشائی ری پلے دیکھ سکتے ہیں مگر جو مزہ اپنے گھر میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر دیکھنے میں آنے لگا وہ میدان میں باقی نہیں رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میدان کا جوش و خروش الگ ہی مزہ دیتا ہے پھر کھلاڑیوں اور ان کے کھیل کو سامنے سے دیکھنا الگ ہی سنسنی رکھتا ہے مگر یہ کشش بھی کب تک لوگوں کو میدان کی طرف کھینچ کر لاتی جب کہ لائیو کوریج نے ایسی جدتیں پیدا کر دیں کہ میچ کے دوران ٹی وی کے آگے سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا۔ کھلاڑیوں کے انٹرویوز اور اسٹوڈیو میں ہونے والے تبصرے اور مباحثے زیادہ دل چسپی کے حامل ہو گئے تھے۔ مگر یہ واحد وجہ نہیں تھی۔

1996 کے ورلڈ کپ سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اب لوگوں کو میدان میں آنے سے زیادہ دل چسپی نہیں ہے۔ حد یہ کہ پاک انڈیا کوارٹر فائنل دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم ایک چوتھائی خالی تھا۔ فائنل کے موقع پر قذافی اسٹیڈیم صرف ساٹھ فیصد بھرا ہوا تھا۔ جب کہ اس سے پہلے کسی بھی ورلڈ کپ کا فائنل نوے فیصد سے کم تماشائی نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں کرکٹ کے بڑوں کو دکھائی دینے لگا کہ اگر جلد کرکٹ

میں کوئی انقلابی تبدیلی نہ لائی گئی تو ایک روزہ کرکٹ بھی لوگوں کو اس کھیل کی طرف زیادہ دیر متوجہ نہیں رکھ سکے گی اور جلد کرکٹ صرف اسکرین کا کھیل بن کر رہ جائے گا۔ جب کہ کوئی بھی کھیل اسی وقت کھیل شمار ہوتا ہے جب اسے میدان میں لوگ دیکھنے کے لیے آئیں ورنہ یہ ویڈیو گیم بن کر رہ جاتا ہے۔ ٹی وی کی جدید کوریج ساری دنیا کے کھیلوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ مگر ان کے مقابلے دیکھنے کے لیے لوگ بڑی تعداد میں میدان میں جانا پسند کرتے ہیں۔

کرکٹ کے ماہرین نے اندازہ لگایا کہ میچوں میں لوگوں کی عدم آمد کی ایک وجہ کرکٹ کا طویل دورانیہ ہے۔ پانچ روزہ کرکٹ تو بہت زیادہ ہوتی ہے اب لوگوں کے لیے ایک پورا دن نکالنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ کرکٹ سے دل چسپی رکھنے والا طبقہ دوسری مصروفیات بھی رکھتا ہے۔ اس کے لیے آٹھ نو گھنٹے میدان میں گزارنا ممکن نہیں رہا تھا۔ پھر نوجوان طبقہ جو میدان میں جانا پسند کرتا ہے مگر وہ بھی اتنی طویل تفریح کا قائل نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک روزہ میچوں میں بھی میدان رفتہ رفتہ تماشائیوں سے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے تدارک کے لیے کوششیں کی گئیں۔ جیسے میدانوں میں زیادہ سہولتیں اور آرام دہ نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹکٹوں کی قیمت بھی کم کی گئی۔ گروپ کی صورت میں آنے کی صورت میں اسکولوں اور انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ کو خاص رعایت دی جانے لگی۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سیریز کے ایک روزہ میچوں میں سرے سے ٹکٹ ہی ختم کر دیا گیا اور انٹری فری ہو گئی۔

اس کے باوجود اسٹیڈیم ایک روزہ میچوں میں بھی ٹیسٹ میچوں کا سا سماں پیش کرنے لگے تھے۔ ایسے میں کسی نئی کرکٹ فارمیٹ کی تلاش شروع کی گئی۔ اگرچہ مقامی سطح پر چھوٹی طرز کی کرکٹ کے کئی تجربے کیے جا رہے تھے۔ جیسے انگلش اینڈ ویلز کرکٹ بورڈ نے 2003 میں چھوٹی طرز کی کرکٹ کی تجویز پیش کی کہ ایک روزہ میچ کو دو اننگز کے بجائے بیس بیس اوورز کی چار اننگز میں تقسیم کر دیا۔ یعنی ہر ٹیم ٹیسٹ میچ کی طرح دو باریاں لے گی۔ مگر یہ تجویز کاغذ سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کے بجائے ایک اور تجویز سامنے آئی اور اسے نہ صرف پذیرائی ملی بلکہ اسی سال یہ کاؤنٹی پروفیشنل سرکٹ میں شامل بھی کر لی اور یوں دنیا کے اوّلین پیشہ ورانہ ٹوئنٹی مقابلوں کا آغاز ہوا۔ اس میں ایک اننگ بیس اوور تک محدود کر دی گئی۔ بہ ظاہر ٹی ٹوئنٹی کی پیدائش بھی کرکٹ کی جنم بھومی میں ہوئی۔ کم سے کم کرکٹ کے ماہرین یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ پیشہ ور کرکٹ کی سطح تک ان کا یہ دعویٰ درست بھی ہے۔

لیکن جہاں تک بیس اوور کے کھیل کی ایجاد ہے تو راقم کے خیال میں اس کی پیدائش پاکستان میں ہوئی۔ وہ اس طرح کہ وطن عزیز میں شروع سے اتوار کی چھٹی چلی آرہی تھی اور کلب کی سطح پر کرکٹ اتوار والے دن ہوتی تھی۔ اس میں دن کی طوالت کے لحاظ سے پچاس سے ساٹھ اوور پر مشتمل ایک روزہ میچ کھیلا جاتا تھا۔ مگر بھٹو صاحب نے اچانک ہی اتوار کی بجائے جمعے کے دن چھٹی کر دی۔ جمعے کا دن جمعے کی نماز کی وجہ سے مذہبی حیثیت بھی رکھتا ہے اور بیشتر مسلمان اس دن جمعے کی نماز میں شرکت کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ خاص اہتمام کرتے ہیں جیسے غسل اور صاف کپڑے پہننا پھر سب مل کر مسجد جاتے ہیں۔ جمعے کا خطبہ سنتے ہیں۔ اس میں دو سے ڈھائی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اگر کلب اس دن میچ رکھتے تو درمیان میں نہ صرف طویل وقفہ آتا بلکہ کرکٹرز کو جمعے کی تیاری کے لیے ٹھیک سے وقت نہیں ملتا۔ دوسری صورت میں کھیل کے میدان سے براہ راست مسجد میں حاضری بھی ممکن نہیں ہوتی کہ لباس اور جسم دونوں صاف نہیں ہوتے۔ کچھ کھلاڑی کھیلنے کو اور کچھ نماز کو ترجیح دینا چاہتے تھے۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر جمعے والے دن میچ نماز جمعہ کے بعد سے شروع ہونے لگا۔ کھلاڑی دو ڈھائی بجے میدان میں پہنچ جاتے اور ان کے پاس تین ساڑھے تین گھنٹے کا وقت ہوتا تھا جب وہ مختصر دورانیے کا میچ کھیل سکتے تھے اور اتنے وقت میں بیس یا بہت زیادہ ہوئے تو پچیس اوور سے زیادہ کا میچ نہیں ہوتا تھا۔ سردیوں میں دن چھوٹا ہونے اور پنجاب کے شمال میں ہونے کی وجہ سے یہاں میچ نماز جمعہ سے پہلے اور بعد ہوتا تھا۔ اس میں بھی ایک اننگ بیس پچیس اوور سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کیونکہ درمیان میں کم سے کم دو گھنٹے کا وقفہ آ جاتا تھا۔ اوور کم ہونے سے لازمی کھیل کی رفتار بڑھ جاتی تھی اور چوکوں چھکوں کی ایسی بارش ہوتی کہ دیکھنے والوں کو لطف آجاتا تھا۔ مختصر دورانیے کے میچوں کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک چھٹی دوبارہ اتوار کے دن نہیں کر دی گئی۔ مگر چھوٹی طرز کی یہ کرکٹ جاری رہی۔ اس کے گواہ بہت سے انٹرنیشنل کرکٹرز ہیں جو اسی قسم کی کرکٹ سے نکل کر آگے آئے۔

نئی صدی کے آغاز میں ایک روزہ کرکٹ کا زوال تیز ہو گیا تھا۔ کھیل کو تیز کرنے کے لیے قوانین میں متعدد تبدیلیاں بھی کارآمد ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ جیسے دائرے کا قانون اور فیلڈروں کو آخرا وورز میں اس کے اندر رکھنا تاکہ بلے باز زیادہ آزادی سے چوکے چھکے لگا سکیں۔ باؤلرز کو باؤنسر کرانے پر نو بال کا قانون اسی طرح وائیڈ کا قانون سخت کر دیا۔ مگر ان تبدیلیوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ اس سے کھیل کے دورانیے پر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ایک روزہ میچ کی ایک اننگ اوسطاً ساڑھے تین گھنٹے کی ہوتی ہے اس کے بعد پینتالیس منٹ سے ایک گھنٹے تک کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ یوں میچ کم سے کم پونے آٹھ سے آٹھ گھنٹے دورانیے کا ہو جاتا ہے اور تماشائیوں کا اتنی دیر تک جم کر میدان میں بیٹھنا یقیناً آسان کام نہیں ہو سکتا۔ خاص طور سے معمر افراد، بچے اور خواتین کو بھی بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ایسے میں انگلش اینڈ ویلز کرکٹ بورڈ کا تجربہ کامیاب رہا۔ 2003 کے پروفیشنل سرکٹ میں ٹی ٹوئنٹی میچوں کی شمولیت نے تماشائیوں کی میدان میں حاضری کو حوصلہ افزا حد تک ریکارڈ کیا۔ اگرچہ اس وقت بھی ماہرین اس کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں پچاس اوور دورانیے سے کم کرکٹ اصل میں کھیل کے ساتھ صرف ایک مذاق ہوگا۔ بورڈز اور کھلاڑیوں نے ماہرین کی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ ایک روزہ کرکٹ کے آغاز پر بھی ایسی ہی باتیں کی گئی تھیں۔ سب سے بڑھ کر تماشائیوں نے اسے پسند کیا تھا۔ اس کے باوجود صورت حال واضح نہیں تھی۔ ایک طرف ماہرین اس طرز کی کرکٹ کی مخالفت کر رہے تھے تو دوسری طرف بین الاقوامی کرکٹ کھیلنے والے کرکٹرز اور ان کی ایسوسی ایشن تذبذب میں تھی کہ ایک نئی طرز کی کرکٹ کا اضافہ ان پر پہلے سے موجود ٹیسٹ اور ون ڈے کے دباؤ کو بڑھا نہیں دے گا۔ زیادہ کرکٹ کا مطلب ہوگا کہ کرکٹرز اپنے اوپر زیادہ دباؤ لے رہے ہیں۔ ان کے زخمی ہونے اور ان کا کیریئر مختصر ہونے کا امکان بڑھ جائے گا اور وقتاً ایسا ہی ہوا۔

ٹی ٹوئنٹی کی آمد سے پہلے میڈیا رائٹس آنے کے بعد بورڈز کے لیے آمدنی کے حصول کا آسان طریقہ ہاتھ آ گیا کہ اچھی ٹیموں سے زیادہ سے زیادہ دو طرفہ سیریز رکھیں۔ جتنے زیادہ میچز ہوں گے بورڈ کو میڈیا رائٹس کی مد میں اتنی ہی زیادہ رقم ملے گی۔ جتنی بڑی ٹیم ہو گی میڈیا رائٹس اتنی زیادہ رقم میں فروخت ہوں گے۔ یہاں بڑی ٹیم سے مراد اچھی کرکٹ ٹیم کھیلنے والی چیمپئن ٹیم نہیں ہے بلکہ وہ ٹیم بڑی شمار ہوتی ہے جسے زیادہ لوگ کھیلتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے عالمی نمبر ون جنوبی افریقا چھوٹی ٹیم ہے جب کہ دوسرے سے چھٹے نمبر تک پر موجود انگلینڈ، آسٹریلیا اور انڈیا کا شمار بڑی ٹیموں میں ہوتا ہے۔ اس لیے اگر مقابلہ جنوبی افریقا اور آسٹریلیا میں ہو۔ جو صف اوّل کی ٹیمیں ہیں تو میڈیا رائٹس اچھے ملیں گے لیکن اگر مقابلہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ہو جو صف اوّل کی ٹیمیں نہیں ہیں تو ان کے میڈیا رائٹس منہ مانگے داموں فروخت ہو سکتے ہیں۔ انڈیا کی پاکستان سے ایک سیریز آئی پی ایل کے ایک ایڈیشن کی آمدنی پر بھاری ہوتی ہے جب کہ اس کے اخراجات آئی پی ایل سے بہت کم ہوتے ہیں۔

پیسوں کے لالچ میں تمام ہی بورڈز نے اچھی ٹیموں سے زیادہ سے زیادہ سیریز رکھنا شروع کر دیں۔ خاص طور سے آسٹریلیا، انگلینڈ، انڈیا اور جنوبی افریقا نے بے تحاشہ کرکٹ کھیلنا شروع کر دی۔ کرکٹ کی بہتات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2006 میں ٹیسٹ ڈیبیو کرنے والے انگلش ٹیم کے کپتان الیسٹر کک نے دس سال سے بھی کم وقت میں ایک سو چوبیس ٹیسٹ میچز کھیل لیے ہیں اور وہ سب سے کم عمری میں ٹیسٹ میچوں کی سنچری مکمل کرنے والے کرکٹر بن گئے ہیں۔ یہی حال آسٹریلیا اور انڈیا کے کھلاڑیوں کا ہے وہ زیادہ میچز کھیل رہے ہیں۔ جنوبی افریقا کے سابق کپتان گریم اسمتھ نے بارہ سال کے مختصر عرصے میں ایک سو سترہ ٹیسٹ لگاتار کھیل لیے۔ یہ چاروں ٹیمیں اوسطاً بارہ سے چودہ ٹیسٹ میچ سالانہ کھیل رہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے پچھلے دس سالوں میں صرف تراسی ٹیسٹ میچ کھیلے ہیں۔ یہ تعداد سری لنکا سے بھی کم ہے جسے اسی عرصے میں سو سے زائد ٹیسٹ کھیلنے کو ملے۔

دوسری ٹیموں کے مقابلے میں پاکستان کو اتنے کم ٹیسٹ مل رہے ہیں کہ 1999 میں ڈیبیو کرنے والے یونس خان نے بہ مشکل ابھی ٹیسٹ میچوں کی سنچری مکمل کی ہے۔ یہی حال دوسرے فارمیٹس کا ہے جن میں یہ چاروں ٹیمیں بہت زیادہ کرکٹ کھیل رہی ہیں اور نتیجے میں ان کے کھلاڑیوں پر ذہنی اور جسمانی دباؤ آتا ہے اور وہ زیادہ ان فٹ ہوتے ہیں یا ان کی کارکردگی میں فرق آ جاتا

ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مصباح الحق، یونس خان، محمد حفیظ اور سعید اجمل اس عمر میں بھی فٹ ہیں۔ کیونکہ وہ کم کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ ان میں یونس خان کے بعد بیالیس کے ہونے والے مصباح الحق نے ساٹھ ٹیسٹ بھی نہیں کھیلے ہیں۔ یہی حال پاکستان کے باقی کرکٹرز کا ہے۔ سعید اجمل نے چھ سال سے زیادہ بین الاقوامی کرکٹ کھیلی اور ہنوز اس کے ٹیسٹ میچز کی تعداد چالیس بھی نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں انگلش آل راؤنڈر معین علی نے دسمبر 2014 میں اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز کیا اور وہ اب تک بائیس ٹیسٹ کھیل چکا ہے۔ وہ بھی صرف تیرہ مہینے کے مختصر سے عرصے میں۔

جس وقت ٹی ٹوئنٹی کا آغاز ہوا اور اسے بین الاقوامی کرکٹ کا حصہ بنانے کی تیاری شروع کی گئی تو اس وقت اس خدشے کا آغاز ہوگیا تھا کہ اس سے کھلاڑیوں پر دباؤ آئے گا اور وہ مزید کرکٹ کھیلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ زیادہ کرکٹ کا مطلب ہوگا کہ کرکٹرز کی عمر مختصر ہو جائے گی۔ 1980 تک کرکٹرز زیادہ نہیں کھیلتے تھے اور ان کا کیریئر سولہ سے بیس سال پر محیط ہوتا تھا۔ ایسے ٹیسٹ کرکٹرز بھی گزرے ہیں جنہوں نے پچیس سال تک کرکٹ کھیلی۔ تعجب کی بات ہے کہ فاسٹ بالرز جن کی کرکٹ کا دورانیہ سب سے کم ہوتا ہے۔ وہ بھی اس دور میں طویل عرصے تک کرکٹ کھیلتے تھے۔ جیسے عمران خان نے بیس سال تک بین الاقوامی کرکٹ کھیلی۔ سرفراز نواز نے انیس سال تک کرکٹ کھیلی۔ این بوتھم، کپیل دیو اور رچرڈ ہیڈلی نے اٹھارہ سال سے زائد عرصے تک بین الاقوامی کرکٹ کھیلی۔ اس کے باوجود ان کے میچوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سرفراز نواز نے مشکل سے ساٹھ ٹیسٹ کھیلے۔ عمران خان اور رچرڈ ہیڈلی ٹیسٹ میچوں کی سنچری بھی نہ مکمل کر سکے۔ بوتھم اور کپیل دیو نے زیادہ میچز کھیلے مگر وہ فتح گر بالرز نہیں رہے تھے اور محض آل راؤنڈر کے طور پر کھیلتے رہے۔

ان کے بعد آنے والے فاسٹ بالر کا کیریئر مختصر ہوتا چلا گیا۔ وسیم اکرم نے اگرچہ اٹھارہ سال کرکٹ کھیلی مگر وہ اس دوران میں اَن فٹ بہت زیادہ رہا۔ وقار یونس کا کیریئر چودہ سال میں ختم ہوگیا۔ میلکم مارشل جیسا فاسٹ بالر صرف گیارہ سال تک کھیل سکا۔ کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین فاسٹ بالرز میں سے ایک گلین میک گرا صرف تیرہ سال بین الاقوامی کرکٹ میں رہا۔ کرکٹ کے تیز ترین بالرز شعیب اختر اور بریٹ لی کا کیریئر صرف دس اور نو برس پر محیط رہا۔ مگر بریٹ لی نے نو سال میں شعیب اختر سے تقریباً دوگنے ٹیسٹ کھیل لیے کیونکہ شعیب اختر کرکٹ کی تاریخ کے تیز ترین ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ اَن فٹ ہونے والا کرکٹر بھی تھا۔

بہت زیادہ کرکٹ کا اثر بلے بازوں پر بھی پڑا۔ جاوید میانداد، ویوین رچرڈ، سنیل گواسکر، ایلن بارڈر اور اس دور کے دوسرے عظیم بلے بازوں کا کیریئر بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے پر محیط رہا تھا۔ اسٹیو وا نے بیس سال تک ٹیسٹ کرکٹ کھیلی تو ٹنڈولکر نے چوبیس سال بین الاقوامی کرکٹ کھیلی مگر اس کے بعد جیسے جیسے کرکٹ کی رفتار اور میچوں کی تعداد بڑھتی گئی بلے بازوں کا کیریئر بھی مختصر ہوتا چلا گیا۔ اسٹیفن فلیمنگ جسے نیوزی لینڈ کی طرف سے سب سے زیادہ ٹیسٹ کھیلنے کا اعزاز حاصل ہے وہ صرف چودہ سال بین الاقوامی کرکٹ کھیل سکا۔ گریم اسمتھ جیسا عظیم بلے باز بارہ سال کے کیریئر کے بعد ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ محمد یوسف نے بھی بارہ سال کرکٹ کھیلی اور اس کے میچوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ حالیہ عرصے میں بہترین کھلاڑی جس طرح ایک کے بعد ایک کرکے بین الاقوامی کرکٹ سے رخصت ہو رہے ہیں اس سے یہ خدشہ کھل کر سامنے آگیا ہے کہ زیادہ کرکٹ نے کھلاڑیوں کا کیریئر مختصر کردیا ہے۔

مگر 2003 میں ان تمام خدشات (جو اب ایک حقیقت بن گئے ہیں) کو نظر انداز کرتے ہوئے انگلش کرکٹ بورڈ نے بینسن اینڈ ہیجز ٹورنامنٹ کے اختتام پر مزید کوئی ایک روزہ ٹورنامنٹ کرانے کی بجائے کرکٹ کے اس نئے فارمیٹ کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ 13 جون 2003 کے دن دو انگلش کاؤنٹیز سرے اور وارو کشائر کے درمیان پہلا آفیشل ٹوئنٹی ٹوئنٹی میچ کھیلا گیا تھا۔ اگلے سال لارڈز میں مڈل سیکس اور سرے کے درمیان ٹی ٹوئنٹی میچ میں ستائیس ہزار سے زیادہ افراد لارڈز کے میدان میں موجود تھے جو تماشائیوں کی حاضری کا ایک ریکارڈ ہے۔ اس میدان پر کسی مقامی میچ میں صرف 1953 کے ون ڈے کپ فائنل میں اس سے زیادہ تماشائی موجود تھے۔ 2004 میں پاکستان ٹی ٹوئنٹی پر مشتمل مکمل ٹورنامنٹ کرانے والا پہلا ملک بن گیا اور یہ ٹورنامنٹ فیصل آباد وولف نے جیت لیا۔ اگلے سال آسٹریلیا میں اولین ٹی ٹوئنٹی

واکا پرتھ کے میدان پر ویسٹرن واریئرز اور وکٹوریا بس رینجرز کے درمیان ہوا اور بیس ہزار نشستوں والا میدان مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ پچیس سال بعد یہ پہلا موقع تھا جب تمام ٹکٹ فروخت ہو گئے تھے۔

2008 میں جب انڈین پریمیئر لیگ کا آغاز ہوا تو کلکتہ کے ایڈن گارڈن اسٹیڈیم میں کلکتہ نائٹ رائیڈر اور چنائے سپر کنگ کے درمیان میچ میں ایک لاکھ سے زیادہ تماشائی میدان میں موجود تھے۔ اس میدان کی پوری تاریخ میں بھی اتنے تماشائی کرکٹ دیکھنے نہیں آئے تھے۔ یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ ٹی ٹوئنٹی نے کرکٹ کے سونے ہوتے میدانوں کو ایک بار پھر تماشائیوں سے بھر دیا تھا۔ ایک روزہ کرکٹ کا 2007 کا ورلڈ کپ جو ویسٹ انڈیز میں ہوا اور اسے تماشائیوں کے لحاظ سے کرکٹ کی تاریخ کا ناکام ترین ورلڈ کپ کہا جاتا ہے۔ جب نہ صرف بیشتر میچوں کی نصف ٹکٹ بھی فروخت نہیں ہو پائی تھیں بلکہ فروخت ہونے والی ٹکٹوں کے مقابلے میں تماشائیوں کی حاضری بھی مایوس کن تھی۔ اس ورلڈ کپ نے صحیح معنوں میں کرکٹ کے کرتا دھرتاؤں کے لیے گھنٹی بجا دی تھی کہ اب ایک روزہ کرکٹ بھی شائقین میں مقبول نہیں رہی ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ کرکٹ کا کھیل خسارے کا سودا بن گیا تھا۔ مالی لحاظ سے کرکٹ اب بھی نفع بخش کھیل تھا بلکہ ایک روزہ کے ساتھ ساتھ ٹیسٹ کرکٹ کے میڈیا رائٹس سے بورڈز کو اتنا ملنے لگا تھا کہ وہ اپنے خرچ آرام سے پورے کر سکتے تھے۔ ٹورنامنٹس کی آمدنی جو آئی سی سی کے اکاؤنٹس میں جاتی تھی وہ بھی بالآخر ٹیسٹ کھیلنے والے ممالک میں تقسیم کی جاتی تھی اور بورڈز کو اس مد میں بھی بھاری آمدنی ہوتی تھی۔ مگر کرکٹ کے سونے ہوتے میدان اور طویل دورانیے کی کرکٹ میں شائقین کی بتدریج کم ہوتی دل چسپی لمحۂ فکریہ تھی۔ اگر ابھی سے اس کی فکر نہ کی جاتی تو ایک وقت ایسا آتا جب لوگوں کی عدم دل چسپی بالآخر میڈیا رائٹس کی آمدنی پر بھی اثر انداز ہوتی۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ٹی ٹوئنٹی کے حامی افراد میں اضافہ ہونے لگا۔ خاص طور سے ایسے افراد جو دولت رکھتے تھے اور وہ ٹی ٹوئنٹی سے مزید دولت کمانے میں بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ ان میں ایک روبرٹ اسٹین فورڈ تھا۔

یہ امریکی ارب پتی نہ صرف امریکا بلکہ اینٹی گوا اور بارباڈوس کی شہریت بھی رکھتا ہے۔ یہ دونوں ممالک ویسٹ انڈیز کی ٹیم میں شامل ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر جزائر کریبین میں ایک ٹی ٹوئنٹی لیگ کرائی جائے تو یہ مالی لحاظ سے اچھا سودا ہو سکتی ہے۔ اس نے ورلڈ کپ سے پہلے جولائی 2006 میں اسٹین فورڈ ٹی ٹوئنٹی ٹورنامنٹ کے نام سے ایک لیگ منعقد کی جس کی انعامی رقم ہی دو کروڑ اسی لاکھ امریکی ڈالرز تھی۔ اس ٹورنامنٹ میں انیس مقامی ٹیموں نے حصہ لیا۔ ہر میچ میں مین آف دی میچ سمیت مختلف کیٹیگریز میں بیش بہا انعامات دیے گئے۔ فائنل ٹرینی ڈاڈ اینڈ ٹوباگو نے پانچ وکٹ سے جیتا اور اسے دس لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم انعام میں ملی۔ مزے کی بات ہے کہ اگلے سال ہونے والے ایک روزہ ورلڈ کپ کی فاتح آسٹریلین ٹیم کو بھی تقریباً اتنی ہی انعامی رقم ملی تھی۔

لیگ مالی لحاظ سے کامیاب رہی۔ اس کے میڈیا رائٹس بھاری رقم کے عوض فروخت ہوئے اور ساری دنیا

مینتھول

کافور کی مانند، سفید بلور جیسی ایک چیز، جسے پیپر منٹ سلفر بھی کہتے ہیں۔ اسے پیپر منٹ کے تیل سے نکالتے ہیں۔ بالعموم ادویات میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مینتھول کا مرہم زیتون کے تیل میں بنا کر درد کی جگہوں پر مالش کے کام آتا ہے۔ مثلاً جوڑوں کا درد، کمر کا درد، خارش کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے کہ اس کے لگانے سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ گلے کی خرابی میں اس کے غرارے کیے جاتے ہیں۔ کان کے درد میں اس کے قطرے ڈالے جاتے ہیں۔

مرسلہ: عزیز افضل۔ ملتان

مینٹگمری

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ریاست الباما کا دارالحکومت 1847ء سے کپاس کی تجارت کا اہم مرکز ہے۔ وفاقی فوجی دستوں نے 1865ء میں اس پر قبضہ کیا یہاں ریلوے اسٹیشن اور یونیورسٹی (1874ء) بھی ہیں۔ اسی نام کا ایک شہر پاکستان میں تھا جو اب ساہیوال کہلاتا ہے۔

مرسلہ: رابعہ عنایت بھٹی۔ ملتان

سے جزائر کریبین میں تفریح کے لیے آنے والے سیاحوں نے اس لیگ سے بھی لطف اٹھایا۔ میدان بھرے ہوئے تھے اور مقامی سیاحت کا کاروبار چمک اٹھا تھا۔ غریب مقامی کھلاڑیوں کو پہلی بار انعامات میں اتنی بڑی رقوم ملی تھیں۔ اسٹین فورڈ لیگ کی کامیابی نے بورڈز کو چونکا دیا تھا۔ اس سے پہلے آئی سی ایل نے دنیائے کرکٹ میں ہلچل مچادی تھی۔ ایک تو اس میں ساری دنیا سے کرکٹرز بورڈز کی مرضی کے بغیر جا رہے تھے۔ دوسرے یہ انڈیا میں ہو رہی تھی۔ اسٹین فورڈ لیگ میں صرف مقامی ویسٹ انڈین کرکٹرز شامل ہوئے تھے اور اس میں بورڈ کی مرضی شامل تھی۔ مگر جب ویسٹ انڈین بورڈ نے لیگ کی کامیابی دیکھی تو اس کی رال ٹپک گئی اور اس نے آیندہ اپنی ٹی ٹوئنٹی لیگ کرانے کا فیصلہ کرلیا۔

اگلے سال آسٹریلیا کی ٹی ٹوئنٹی لیگ میں کوئنز لینڈ بلز اور ساؤتھ آسٹریلیا بلیوز کے درمیان کھیلے گئے میچ میں ابتدائی طور پر گیارہ ہزار ٹکٹ فروخت ہوئے مگر میچ کے دن اس وقت برسبین گابا کی انتظامیہ کو غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا جب میچ سے پہلے مزید سولہ ہزار سے زیادہ ٹکٹ فروخت ہوگئے اور اس کے باوجود لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ گیٹ کھلنے سے بہت سے لوگ مفت میں اندر پہنچ گئے۔ گابا کی تاریخ میں کبھی اتنے زیادہ تماشائی میچ دیکھنے نہیں آئے تھے۔ اگلے سال انڈیا اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلے گئے بین الاقوامی ٹی ٹوئنٹی میچ کو دیکھنے کے لیے پچاسی ہزار لوگ میلبورن کرکٹ گراؤنڈ میں پہنچ گئے تھے۔ صرف 1992 کے ورلڈکپ کے فائنل میں اس سے زیادہ لوگ میچ دیکھنے آئے تھے۔ اس میچ سے آسٹریلیا کرکٹ کو ریکارڈ آمدنی ہوئی تھی۔ عالمی سطح پر یہ ثابت ہوچکا تھا کہ ٹی ٹوئنٹی میں صرف لوگوں کی دل چسپی ہی نہیں بلکہ اس میں بہت زیادہ آمدنی بھی تھی۔

اسٹین فورڈ نے بھانپ لیا تھا اب اسے لیگ کرانے کی اجازت نہیں ملے گی اس لیے اس نے نیا کام کیا اس نے انگلینڈ کی ٹی ٹوئنٹی ٹورنامنٹ کی فاتح مڈل سیکس کا مقابلہ انگلینڈ میں اسٹین فورڈ لیگ کی فاتح ٹرینی ڈاڈ اینڈ ٹوباگو سے کرایا۔ یہ میچ بھی ٹرینی ڈاڈ اینڈ ٹوباگو نے جیت لیا اور اسے دو لاکھ اسی ہزار ڈالرز کی انعامی رقم ملی۔ اس میچ میں بھی ریکارڈ تماشائی آئے اور میڈیا رائٹس سے بھاری رقم ملی۔ یہ اسٹین فورڈ سپر اسٹار کا اوّلین میچ بھی تھا۔ اسٹین فورڈ کا ارادہ آنے والے سالوں میں ایسے پانچ میچ اور کرانے کا تھا اور اس میں ہر میچ کے فاتح کو دو کروڑ ڈالرز کی انعامی رقم ملتی۔ دو کروڑ ڈالرز اتنی بڑی رقم تھی کہ کرکٹ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ آج بھی کرکٹ میں بے تحاشہ پیسا آنے کے باوجود یہ اس کی انعامی رقوم کروڑ ڈالرز تک نہیں پہنچی ہیں۔

پچھلے آئی سی سی ورلڈکپ کی فاتح آسٹریلین ٹیم کو انتالیس لاکھ پچھتر ہزار امریکی ڈالرز کی رقم ملی اور اسٹین فورڈ سپر وِنر کو ایک میچ کے عوض دو کروڑ ڈالرز ملنے والے تھے۔ مگر اسٹین فورڈ کا یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا جب اسے اپنی لیگ کے سلسلے میں ٹیکس فراڈ کے کیس کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی محکمہ ٹیکس نے دعویٰ کیا کہ اسٹین فورڈ نے لیگ سے جو رقم کمائی اس پر ٹیکس کی ادائیگی نہیں کی۔ آئی سی سی اور کرکٹ بورڈز کی خوش قسمتی کہ اسٹین فورڈ اپنے منصوبے کو عملی جامع نہ پہنا سکا ورنہ کرکٹ کے معاملات بہت پہلے ہی ان کے ہاتھوں سے نکل چکے ہوتے۔ یہ قدرت کی طرف سے موقع تھا کہ کرکٹ کے ٹھیکیدار اس کے معاملات درست کرلیں۔ مگر ان کی سمت غلط ہی رہی۔

پہلا انٹرنیشنل ٹی ٹوئنٹی میچ آکلینڈ کے ایڈن پارک میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے درمیان 9 جنوری 2005 میں کھیلا گیا۔ مگر بدقسمتی سے اسے وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو اس کے بعد ہونے والے عام لیگ میچوں نے حاصل کرلی۔ حالانکہ یہ اس طرز کی کرکٹ میں اوّلین بین الاقوامی مقابلہ تھا۔ اگلے سال آسٹریلیا میں ہونے والے ٹی ٹوئنٹی میچ میں آسٹریلین کھلاڑی پہلی بار اس طرح میدان میں آئے کہ ان کی شرٹ کی پشت پر ان کا نام اور نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس میچ کو برسبین گابا میں ریکارڈ اڑتیس ہزار سے زائد تماشائیوں نے دیکھا۔ اس طرز کی کرکٹ میں تماشائیوں کی دل چسپی اور آپس کے میچوں کے مسلسل انعقاد نے بالآخر آئی سی سی کو مجبور کردیا کہ وہ ٹی ٹوئنٹی ورلڈکپ کے بارے میں سوچے۔ آئی سی ایل اور اسٹین فورڈ لیگ کی کامیابی نے مہمیز کا کام کیا تھا کیونکہ ایک بار اس قسم کی لیگ کامیاب ہو جاتیں اور خطیر معاوضہ کھلاڑیوں کو کھینچ لیتا تو پھر معاملات آئی سی سی یا کرکٹ بورڈز کے ہاتھ میں نہ رہتے۔

بالکل جیسے فٹ بال میں پیشہ ور لیگز ہیں۔ اسی طرح اور کھیلوں کی لیگز ہیں جو بزنس کے لحاظ سے کھیل کی مرکزی باڈی کے اثر سے آزاد ہیں وہ صرف قوانین اور اصولوں کی

حد تک ان کی پابند ہیں۔ مگر کرکٹ طویل دورانیے کا کھیل ہے اور اس میں بورڈز کو کھلاڑیوں کی مسلسل ضرورت رہتی ہے۔ جب کہ دوسرے ٹیم کھیلوں میں صرف عالمی ٹورنامنٹس میں کھلاڑیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ کھیل بھی مختصر دورانیے کے ہوتے ہیں۔ کرکٹ بورڈز اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ کھلاڑی ان کے ہاتھ سے نکل جائیں۔ کیری پیکر کے موقع پر بورڈز کا سخت ردِعمل سامنے آگیا تھا اور پھر اس سیریز پر آسٹریلین بورڈ قابض ہوگیا۔ اسی طرح آئی سی ایل کو ناکام بنانے کے لیے انڈین کرکٹ بورڈ نے آئی پی ایل شروع کی اور کرکٹ پر اپنا تسلط قائم رکھا۔ یہ سب آئی سی سی کے مکمل تعاون سے ہوا۔ اس تعاون کے بدلے آئی سی سی نے اپنا ئی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

ٹی ٹوئنٹی فارمیٹ میں صرف دو ممالک یعنی پاکستان اور جنوبی افریقا مسلسل ڈومیسٹک ٹورنامنٹ کرا رہے تھے اور انہیں اس کا انتظامی تجربہ تھا۔ مگر خراب سیکیورٹی کی صورتِ حال اور اتنے بڑے ایونٹ کے لیے مناسب انفرااسٹرکچر نہ ہونے کے باعث پاکستان کے بارے میں غور ہی نہیں کیا گیا اور پہلا ورلڈ ٹی ٹوئنٹی کپ جنوبی افریقا کو ایوارڈ کر دیا گیا۔ اس ٹورنامنٹ میں ٹیسٹ کھیلنے والے ملکوں کے علاوہ دو ایسوسی ایٹ ٹیموں کو بھی ان کی ون ڈے کارکردگی کی بنیاد پر شامل کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اگلے ورلڈ ٹی ٹوئنٹی سے پہلے ایسوسی ایٹ ممالک کے درمیان کوالی فائنگ ٹی ٹوئنٹی ٹورنامنٹ کرایا جائے گا۔ فائنل میں پاکستان اور انڈیا کا آمنا سامنا ہوا اور بدقسمتی سے آخری بال پر پاکستان صرف پانچ رنز سے ہار گیا یوں پہلا ٹی ٹوئنٹی انڈیا کے نام گیا۔

دو سال پاکستان نے انگلینڈ میں کھیلے جانے والے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں فیورٹ سری لنکا کو فائنل میں باآسانی آٹھ وکٹوں سے شکست دے دی۔ یہ سب سے یک طرفہ فائنل تھا جو اب تک ٹی ٹوئنٹی میں کھیلا گیا ہے۔ پاکستان نے لگاتار دوسرا فائنل کھیلا تھا۔ اس ٹورنامنٹ کے لیے چھ ایسوسی ایٹ ممالک کے درمیان کوالی فائنگ راؤنڈ کرایا گیا اور اس کی فائنلسٹ دو ٹیموں کو ورلڈ کپ کھیلنے کا موقع تو ملا ہی، ساتھ ہی فاتح کو ڈھائی لاکھ ڈالرز کی خطیر انعامی رقم بھی ملی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایسوسی ایٹ ممالک کے درمیان ہونے والے کسی ٹورنامنٹ میں آئی سی سی نے اتنی بڑی انعامی رقم دی ہو۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فارمیٹ میں کتنی تیزی سے پیسا آیا اور ورلڈ کپ جیتنے والی ٹیم کو اب ملین ڈالرز میں انعامات دیئے جا رہے تھے۔ انعامی رقوم اور معاوضے جس لحاظ سے بڑھ رہے ہیں۔ کروڑ ڈالرز والی حد بھی جلد آتی دکھائی دے رہی ہے۔

ورلڈ ٹی ٹوئنٹی کے بارے میں طے ہوا تھا کہ یہ ہر دو سال بعد ہوگا سوائے اس سال کے جب ایک روزہ ورلڈ کپ اسی سال میں ہو رہا ہو۔ اس صورت میں ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ ایک سال پہلے کرایا جاتا۔ اس لیے اگلا ورلڈ کپ ٹی ٹوئنٹی جو 2011 میں ہونا تھا۔ ایک روزہ ورلڈ کپ کی وجہ سے 2010 میں ویسٹ انڈیز میں منعقد ہوا۔ اس ورلڈ کپ میں دو روایتی حریف آسٹریلیا اور انگلینڈ آمنے سامنے آئے۔ انگلینڈ نے سات وکٹوں سے کامیابی حاصل کی۔ 2012 کا ورلڈ ٹی ٹوئنٹی سری لنکا میں ہوا اور ویسٹ انڈیز نے سری لنکا کو اس کے ہوم گراؤنڈ پر شکست دے کر یہ اعزاز اپنے نام کر لیا تھا۔ یہ پہلا موقع بھی تھا کہ ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کسی ایشیائی ملک میں ہوا تھا۔ اس سے اگلا ورلڈ کپ ٹی ٹوئنٹی بھی ایشیائی ملک کو ملا اور اس بار ملک تھا بنگلہ دیش جہاں سری لنکا نے دوسری بار فائنل میں آنے والی انڈیا کی ٹیم کو آؤٹ کلاس کرتے ہوئے فائنل یک طرفہ انداز میں چھ وکٹوں سے جیت لیا۔ آئی سی سی نے مسلسل تیسرا ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ ایشیا کو ایوارڈ کیا اور اب اگلا ورلڈ کپ ٹی ٹوئنٹی اسی سال انڈیا میں ہے اور جب قارئین یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے تو ورلڈ کپ جاری ہوگا۔

☆☆☆

ٹی ٹوئنٹی نے آکر کرکٹ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ ایک زمانے میں کرکٹ کو معمر افراد کا کھیل کہا جاتا تھا۔ ٹیسٹ کرکٹ کی حد تک یہ بات درست بھی ہے۔ جب ٹیم میں زیادہ تر بڑی عمر کے کھلاڑی ہوتے تھے۔ پھر ایک روزہ میچ آیا تو اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے معمر کھلاڑیوں کے لیے مشکل ہوگیا کہ وہ نوجوانوں جیسی چستی، رفتار اور قوت کا مظاہرہ کرسکیں۔ اسی کی دہائی میں ٹیموں کی اوسط عمر بتیس سال ہوتی تھی جو نوے کی دہائی میں کم ہو کر اٹھائیس برس اور نئی صدی میں مزید گر کر پچیس برس رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نوجوان خون زیادہ تیزی سے کرکٹ میں آیا بلکہ اس کا مطلب ہے کہ کھلاڑی اب جلد ہی ریٹائرمنٹ لینے لگے تھے اور ان کی جگہ نئے نوجوان کھلاڑی آ رہے تھے۔ اس وجہ سے ٹیموں کی اوسط عمر گر گئی۔

مگر اس سے کارکردگی میں بھی فرق آیا۔ جب ایک

تجربے کار کھلاڑی ریٹائر ہوتا ہے اس کی جگہ آنے والے نوری اس کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے اور اس سے ٹیم کا معیار اور رینکنگ بھی گرتی ہے۔ حالیہ برسوں میں ہمیں تواتر سے ایسا ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس کی ایک مثال انڈین ٹیم کی بیرونِ ملک کارکردگی ہے جب اسے ٹنڈولکر، ڈریوڈ، گنگولی اور لکشمن جیسے اچھے بلے باز میسر تھے تو بیرونِ ملک اس کی کارکردگی نسبتاً بہتر ہوتی تھی مگر ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً ہر سیریز جو انڈیا نے ایشیا سے باہر کھیلیں اس کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوئیں۔ نئے آنے والے بلے باز انڈیا میں یا اگر انڈیا جیسی وکٹیں ملیں تو خود شائن کرتے ہیں مگر جہاں انہیں ذرا تیز باؤنسی وکٹ مل جائے تو ان کی چمک دمک وہیں ختم ہوجاتی ہے۔

البتہ بگ تھری کے آنے کے بعد انڈیا اب عالمی کرکٹ پر اتنا حاوی ہوگیا ہے کہ وہ بیرونِ ملک اپنی مرضی کی وکٹیں بنوانے لگا ہے۔ حالیہ دورہ جنوبی افریقا اس کا ایک ثبوت ہے جب وہاں انڈیا کی سہولت کی خاطر بیٹنگ وکٹ تیار کی گئیں اور انڈین ٹیم اس کے باوجود سیریز اور تمام اقسام کے کرکٹ میں شکست کھا کر آیا۔ شاید ہی اسے کوئی میچ جیتنے کا موقع ملا ہو۔ اس کے برعکس جنوبی افریقا کے دورہ بھارت میں ایسی اسپن وکٹیں تیار کی گئیں جن پر خود انڈین ٹیم نے بھی کبھی نہیں کھیلا تھا۔ ڈین ایلگر جیسا پارٹ ٹائم بالر یہاں وکٹیں لے گیا۔ اسی طرح جب انڈیا نے آسٹریلیا کا دورہ کیا تو وہاں بھی ست وکٹیں تھیں۔ مگر نتیجہ وہی رہا انڈیا سارے میچ ہار گیا۔ انگلینڈ میں اسے ریکارڈ شکست کا سامنا کرنا پڑا جب وہ ایک بھی میچ جیتے بغیر واپس آیا۔ یہ سب اس وقت ہو رہا تھا جب آئی پی ایل کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ساری دنیا کے کرکٹ بورڈ انڈیا سے کھیلنے کے لیے مرے جارہے تھے اور اس کی خوشنودی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔ مگر انڈین ٹیم اتنی سہولتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی۔

ون ڈے کرکٹ کی بہتات نے کھلاڑیوں کو بے سکون تو کیا مگر وہ اسے انجوائے بھی کرتے تھے کیونکہ ٹیسٹ کرکٹ کی طرح ون ڈے بھی بورڈز اور آئی سی سی کی سطح پر کھیلی جاتی تھی۔ اس کی الگ سے کوئی لیگ نہیں تھی۔ واحد لیگ کیری پیکر تھی جسے بروقت ختم کردیا تھا۔ اس کے بعد ایک روزہ میچوں میں کوئی لیگ سامنے نہیں آئی۔ مگر ٹی ٹوئنٹی تو شاید ایجاد ہی پیشہ ور لیگ کے لیے کی گئی ہے۔ اس میں کھلاڑیوں کو پیسے کی خاطر کھیلنا پڑتا ہے۔ اس سے کھلاڑی دو طرف بٹ گئے۔ ایک طرف انہیں اپنے ملک کے لیے کھیلنا پڑتا ہے اور آئی سی سی نیز بورڈز کے ذاتی قوانین کے تحت یہ لازمی ہے۔ (صرف آئی پی ایل اس سے مستثنیٰ ہے کہ جو کھلاڑی آئی پی ایل کھیلتا ہے وہ اپنے ملک کی طرف سے بھی اس دوران میں کرکٹ نہیں کھیل سکتا جب کہ آئی پی ایل جاری ہو) کہ کھلاڑی پہلے اپنے ملک اور بورڈ کے ڈومیسٹک سیزن کے لیے کھیلے گا اس کے بعد اسے اجازت ملے گی تو وہ پیشہ ور لیگ کرکٹ کھیلے گا۔ لیکن یہ امتیاز زیادہ دن چلنے والا نہیں ہے۔

حالیہ دور میں بورڈز بھی کھلاڑیوں کو بہت اچھا معاوضہ دے رہے ہیں۔ جیسے ماہانہ تنخواہ، ٹیسٹ، ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی میچوں کی فیس اور اسپانسر شپ میں سے حصہ ملتا ہے۔ پاکستان میں یہ رقم ایک اچھے کھلاڑی کی حد تک کروڑ روپے سالانہ سے اوپر چلی جاتی ہے۔ اس کے باوجود یہ معاوضہ چند ہفتے کی ایک لیگ کے مقابلے میں کم ہے۔ چند میچز کھیلنے یا بینچ پر بیٹھے رہنے کے عوض لاکھوں ڈالرز ملتے ہیں۔ جو ملک کے لیے کھیلنے کے عوض ملنے والے پورے سال کے معاوضے سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بعض کرکٹر جو ملک کے لیے ایک میچ بھی نہیں کھیلتے وہ ملک کے لیے کھیلنے والوں سے کہیں زیادہ کما لیتے ہیں۔ یعنی قومی ٹیم کے لیے منتخب نہ ہونا ان کھلاڑیوں کے باعث خوش قسمتی بن جاتا ہے مگر صرف مالی لحاظ سے۔ ورنہ اپنے ملک کی نمائندگی کرنا بہرحال ہر کرکٹر کا خواب ہوتا ہے۔

چند کھلاڑیوں کو چھوڑ کر کرکٹ کھیلنے والے اکثر کھلاڑیوں کو دونوں جگہوں پر کھیلنا پڑتا ہے یعنی اپنے ملک کے لیے بھی اور کسی لیگ کے لیے بھی۔ خاص طور سے ویسٹ انڈیز اور ایشیائی ملکوں کے کھلاڑی (بھارت کو چھوڑ کر) جن کو اب بھی اس لحاظ سے معاوضہ نہیں ملتا ہے کہ وہ ریٹائر ہونے کے بعد فکر معاش سے آزاد ہوجائیں۔ پھر کیریئر بھی غیر یقینی ہوتا ہے۔ ایک بار اچھا کھلاڑی بھی ٹیم سے باہر ہو جائے تو اس کی واپسی مشکل ہوتی ہے۔ یعنی بے روزگاری کا خطرہ ہمہ وقت سر پر لٹکا رہتا ہے۔ یہ بات ہو رہی ہے ان کھلاڑیوں کی جو باقاعدگی سے اپنی ٹیم کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کھلاڑیوں کی نہیں جو ایک دو میچوں کے لیے آتے ہیں اور پھر غائب ہوجاتے ہیں۔ مستقل کھیلنے والوں کے لیے یہ دوہری کرکٹ مشکل اور عذاب ناک ہوتی جارہی ہے۔

یہی وجہ ہے اب ٹیسٹ کرکٹ چھوڑنے والے اسٹار

کرکٹرز کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سری لنکا میں تلشان تلکا رتنے اور لاستھ مالنگا، انگلش کرکٹر کیون پیٹرسن، آسٹریلین شین واٹسن، نیوزی لینڈ کا برینڈن میک کولم، انڈیا کا ایم ایس دھونی اور پاکستان کا شاہد آفریدی جیسے اسٹار کرکٹرز کرکٹ کے اسی بڑھتے بوجھ کی وجہ سے ٹیسٹ کرکٹ چھوڑ کر محدود اوورز کی کرکٹ تک محدود ہوئے۔ اگرچہ اس کی بہت سی وجوہات بیان کی جاتی ہیں مگر اکثر ملکوں میں رائج معاوضوں کا نظام اس کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اکثر ملکوں میں ٹیسٹ کرکٹ اور ٹی ٹوئنٹی میں ایک میچ کی فیس میں خاص فرق نہیں ہوتا ہے لیکن جہاں تک دورانیے کا تعلق ہے تو اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ٹیسٹ میچ پانچ دن اور تقریباً تیس سے بتیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔ جب کہ ٹی ٹوئنٹی زیادہ سے زیادہ تین سے سوا تین گھنٹے میں نمٹ جاتا ہے۔ ٹیسٹ میچ میں بلے باز عام طور سے سیٹ ہونے میں اتنی گیندیں کھیل لیتے ہیں جتنی کہ ٹی ٹوئنٹی کی ایک پوری اننگ میں پھینکی جاتی ہیں۔ دوسری طرف ایک بالر کو ٹی ٹوئنٹی میچ میں کل چار اوورز کرانے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ٹیسٹ کرکٹ میں اتنے اوورز بالر صرف وارم اپ ہونے میں لگا دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اعصابی دباؤ اکثر ٹی ٹوئنٹی میچوں میں اتنا زیادہ ہوتا ہے جس کا کھلاڑی پورے ایک ٹیسٹ میں بھی سامنا نہیں کرتے مگر جسمانی محنت کم ہوتی ہے اور اس کا صلہ بہت زیادہ ملتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ٹیسٹ میچ میں فی گھنٹا جو معاوضہ ایک کھلاڑی حاصل کرتا ہے۔ ٹی ٹوئنٹی میں یہی کھلاڑی فی گھنٹا اس سے دس گنا زیادہ معاوضہ حاصل کرتا ہے۔ کرکٹ ماہرین کے نزدیک معاوضوں میں یہی فرق اکثر ٹیموں کے ٹیسٹ اسکواڈ سے نامور کھلاڑیوں کے اخراج کا سبب بن رہا ہے۔ آسٹریلیا اور انگلینڈ کے کرکٹ بورڈ اپنے اچھے کھلاڑیوں کو ٹیسٹ کرکٹ میں رکھنے کے لیے انہیں نہ صرف بہت زیادہ معاوضہ بلکہ اب بورڈ کی آمدنی میں سے بھی حصہ دے رہے ہیں۔ مگر ترقی پذیر ملکوں کے بورڈز جو مالی لحاظ سے اتنے مضبوط نہیں ہیں وہ اتنا زیادہ معاوضہ نہیں دے سکتے۔ آمدنی میں سے حصہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

طویل دورانیے کی کرکٹ سے کھلاڑیوں کے تیز انخلا کی ایک اور وجہ زیادہ کرکٹ کی وجہ سے کھلاڑیوں کی بڑھتی ہوئی انجریز ہے۔ جسم ایک حد تک بوجھ برداشت کرسکتا ہے اور اس کے بعد وہ ردعمل دیتا ہے جس کے نتیجے میں کھلاڑی ان فٹ ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی کرکٹ محدود کرلیں اور اس کے لیے وہ عام طور سے ٹیسٹ کرکٹ کی قربانی ہی دیتے ہیں۔ کیون پیٹرسن اور شین واٹسن جیسے کرکٹرز اسی وجہ سے ٹیسٹ کرکٹ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے۔ لاستھ ملنگا اور محمد عرفان جیسے بالرز اسی بنا پر طویل دورانیے کی کرکٹ سے دور ہوئے۔ ہاں وہ کرکٹرز جنہوں نے محدود دورانیے کی کرکٹ چھوڑی جیسے مصباح الحق، یونس خان اور ایلسٹر کک تو وہ اپنے بورڈز کے ہاتھوں مجبور ہوئے جنہوں نے انہیں محدود دورانیے کی کرکٹ سے ہٹا دیا اور انہوں نے ریٹائرمنٹ میں ہی عزت سمجھی تھی۔

ایک اور وجہ کھلاڑیوں کا مزاج بھی ہوتا ہے۔ وہ خود کو محدود دورانیے کی کرکٹ میں زیادہ مطمئن اور فٹ محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ چھوڑ دی۔ یہ ان کھلاڑیوں کا مزاج ہی نہیں رہی۔ اس کی سب سے بڑی مثال شاہد آفریدی ہے جس نے اپنے بیس سالہ طویل کیریئر میں کل چھبیس ٹیسٹ کھیلے مگر ایک روزہ اور ٹی ٹوئنٹی اس نے ریکارڈ تعداد میں کھیلے۔ یہ دونوں فارمیٹ آفریدی کے مزاج کے مطابق ہیں اور وہ اس طرز کی کرکٹ میں خود کو خوش محسوس کرتا ہے۔ یہی حال کرس گیل اور شعیب ملک کا ہے جو ایک روزہ اور ٹی ٹوئنٹی کے لیے زیادہ موزوں تصور کیے جاتے ہیں۔ نئے کرکٹرز میں گلین میکس ویل، این مورگن، کولن منرو، کورے اینڈرسن اور انور علی اس فارمیٹ کے لیے موزوں تصور کیے جاتے ہیں اور یہ اپنی ٹیم کی طرف سے ٹیسٹ نہیں کھیلتے ہیں۔

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ صف اوّل کی ٹیمیں اپنے اسٹار کرکٹرز کو کم سے کم ٹی ٹوئنٹی کے فارمیٹ سے باہر دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ وہ انہیں اپنے ٹی ٹوئنٹی اسکواڈ میں شامل ہی نہیں کرتی ہیں۔ جیسے جنوبی افریقا کے فاسٹ بالرز، ڈیل اسٹین اور مورکل ہیں۔ ہاشم آملہ بھی ٹی ٹوئنٹی کا حصہ نہیں ہے۔ آسٹریلیا کے اسٹیون اسمتھ اور مچل اسٹارک ٹی ٹوئنٹی میں شامل نہیں ہوتے۔ انگلینڈ کی تو تقریباً پوری ٹیسٹ ٹیم ہی اس کے ٹی ٹوئنٹی اسکواڈ سے باہر ہے۔ پاکستان کا ٹیسٹ اسکواڈ اس کے ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی اسکواڈ سے بہت مختلف ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بورڈز کی پالیسی ہے جو اپنے کرکٹرز کو مختلف اسکواڈ میں بانٹ کر ان پر بوجھ کم کرتی ہے۔ اسی طرح بورڈز نے مختلف فارمیٹ کے لیے مختلف کپتان مقرر

کیے ہوئے ہیں تا کہ کسی ایک کھلاڑی پر ہر حوالے سے سارا بوجھ نہ آئے اور ان کی ذاتی کارکردگی بہتر ہو۔

ان سب اقدامات کے باوجود عالمی کرکٹ کی صورت حال ہر گزرتے دن اس حوالے سے انتشار کا شکار نظر آتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ مختلف ملکوں میں ہونے والی مختلف ٹی ٹوئنٹی لیگ ہیں۔ انڈیا کی آئی پی ایل، آسٹریلیا کی بگ باش، ویسٹ انڈیز کی کریبین لیگ، بنگلہ دیش کی بی پی ایل اور اب پاکستان کی سپر لیگ۔ ان سب لیگوں میں عالمی کرکٹ کے ستارے جگمگاتے ہیں اور ان کی چکاچوند سے لیگ کے میدانوں میں روشنی ہوتی ہے۔ مگر مسئلہ وہی ہے اگر ایک کھلاڑی ان تمام لیگوں کی طرف سے کھیلے تو اس کے بعد اس کے اندر بچے گا کیا جو وہ اپنے ملک کی طرف سے کرکٹ کھیل سکے۔ انڈیا کے کھلاڑی سوائے آئی پی ایل کے اور کچھ نہیں کھیلتے۔ جب کہ ساری دنیا کے کھلاڑی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ عام طور سے ایک سال میں اس کے دو ایڈیشن ہوتے ہیں اور لیگ کا دورانیہ کسی طرح ایک مہینے سے کم نہیں ہوتا ہے۔

کرکٹرز کو اگرچہ میچ تو تین گھنٹے کا کھیلنا ہوتا ہے لیکن اس کی تیاری اسے مسلسل کرنا پڑتی ہے۔ ذاتی فٹ نس کے پروگرام کے علاوہ کرکٹ پریکٹس بھی لازمی ہوتی ہے۔ کرکٹرز کی ہائی کلاس ٹریننگ کرائی جاتی ہے جس میں انہیں بہت جان مارنی پڑتی ہے کیونکہ ٹی ٹوئنٹی میں فٹ نس کا معیار ٹیسٹ اور ایک روزہ کرکٹ کے معیار سے کہیں زیادہ سخت ہو گیا ہے تب ہی کھلاڑی کرکٹ کی اس مختصر ترین لیکن سخت ترین فارمیٹ سے عہدہ برا ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اسکواش ہے۔ جس کے ایک میچ میں تیس سے چالیس منٹ میں کھلاڑی کے جسم سے اتنے حرارے خارج ہوتے ہیں جتنے کہ ایک گولفر پورے دن میں خارج کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ٹی ٹوئنٹی کا ایک میچ کھلاڑیوں سے مختصر وقت میں کہیں زیادہ محنت مانگتا ہے۔ اس معیار کو حاصل کرنے کے لیے کھلاڑیوں کو سخت ترین ٹریننگ پروگرام سے گزرنا پڑتا ہے۔

ماہرین کے مطابق ٹی ٹوئنٹی نے آکر کرکٹرز کی فٹ نس کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب کرکٹ کے کھلاڑیوں سے اولمپک ایتھلیٹ جیسا جسمانی معیار طلب کیا جاتا ہے۔ پیسا کمانے کے لیے کھلاڑیوں کو یہ معیار حاصل کرنا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ مقابلے سے باہر ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ٹی ٹوئنٹی لیگ میں کسی کھلاڑی کی جسمانی فٹ نس کا صحیح امتحان ہوتا ہے۔ اکثر کھلاڑی جو اپنے ملک میں کامیابی سے کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں وہ لیگ کے معیار پر پورا اترنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ ٹی ٹوئنٹی کے ناقدین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کھلاڑیوں کی جسمانی حالت میں واضح بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔ انگلینڈ کا معروف کرکٹ مبصر اور لیجنڈ کھلاڑی کہتا ہے۔

''وہ (کھلاڑی) جانتے ہیں کہ ٹی ٹوئنٹی لیگ میں بے حساب پیسا ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لیے انہیں سخت محنت کی ضرورت ہے اور وہ خود کو بدل رہے ہیں۔ یہ لیگ آنے والے دنوں میں کرکٹ کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیں گی۔''

ٹی ٹوئنٹی نے کرکٹ کو صحیح معنوں میں پیشہ ور کر دیا ہے۔ اس میں بے حساب پیسا ہے لیکن یہ پیسا لیگ والے دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ کھلاڑی لیگ اور بورڈز کے درمیان پس جاتے ہیں۔ مجبوراً انہیں کوئی ایک راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہ راستہ عام طور سے لیگ کا ہوتا ہے۔ بورڈز کے پاس کھلاڑی کو محدود کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ وہ سینٹرل کنٹریکٹ کے نام پر کھلاڑیوں کو اپنا پابند بنا لیتے ہیں۔ مگر آخری حربہ کھلاڑیوں کے پاس ہوتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے ملک کی نسبت لیگ کرکٹ کھیلنے میں زیادہ فوائد ہیں تو وہ ریٹائرمنٹ لے لیتے ہیں۔ ایسا ہو بھی رہا ہے اور عالمی کرکٹ کے میدان اچھے کرکٹرز سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ کرس گیل اور اس جیسے بہت سے کھلاڑیوں کی واحد دل چسپی اب لیگ کرکٹ رہ گئی ہے کیونکہ یہاں ان کو کم وقت اور محنت میں زیادہ معاوضہ مل رہا ہے۔ لیگ کرکٹ اس ملک میں تو مقبول ہو سکتی ہے جہاں کھیلی جا رہی ہو لیکن اس سے ہٹ کر اس میں دل چسپی بہت کم ہوتی ہے۔ یہ بہرحال کرکٹ کے عالمی مقابلوں کا متبادل نہیں بن سکی ہے۔ آئی پی ایل جو اخراجات اور آمدنی کے لحاظ سے آئی سی سی کے ٹورنامنٹس سے آگے جا چکا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی وہ اہمیت نہیں ہے۔

ٹی ٹوئنٹی کے ناقدین شروع سے کہتے آئے ہیں کہ یہ فارمیٹ بالآخر ٹیسٹ اور ایک روزہ کرکٹ کی تباہی کا باعث بن جائے گا۔ مگر وہ اسے مقبولیت کے حوالے سے لے رہے تھے۔ اپنی تیز رفتاری اور مختصر دورانیے کی وجہ سے ٹی ٹوئنٹی ٹیسٹ اور ایک روزہ کرکٹ سے کہیں زیادہ مقبول ہے۔ مگر

اس نے جس طرح سے طویل دورانیے کی کرکٹ کو متاثر کرنا شروع کیا وہ اب ایک بڑے مسئلے کی طرح سامنے آرہا ہے۔ آئی سی سی اور کرکٹ بورڈز خاص طور سے ٹیسٹ کرکٹ کے بارے میں سنجیدہ ہو چکے ہیں اور اسے بچانے کے نت نئے طریقے تلاش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈے اینڈ نائٹ ٹیسٹ میچ ہے۔ حالیہ دنوں میں نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے درمیان تاریخ کا پہلا ڈے اینڈ نائٹ ٹیسٹ میچ کھیلا گیا اور اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزا نکلا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ایشیا میں ڈے اینڈ نائٹ میچ ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح انگلینڈ اور ویسٹ انڈیز میں رات کے وقت نمی کے مسائل ہوتے ہیں۔ صرف آسٹریلیا اور جنوبی افریقا دن رات کے ٹیسٹ میچ کے لیے مناسب موسم رکھتے ہیں۔

اب یہ تجویز سامنے آرہی ہے کہ آئی سی سی ٹیسٹ کرکٹرز کے لیے خاص فنڈ قائم کرے اور اچھے کرکٹرز کو اس سے بھاری معاوضہ دے کر انہیں ٹیسٹ کرکٹ جاری رکھنے پر مجبور کیا جائے۔ مگر ماہرین کے خیال میں اس قسم کو کوئی فنڈ کھلاڑیوں کو ایک ہتھیار مہیا کر دے گا کہ وہ ہمیشہ آئی سی سی اور اپنے بورڈز کو بلیک میل کرتے رہیں۔ ان کا مطالبہ ہمیشہ بڑھتا رہے گا اور ایک حد آئے گی جب یہ فنڈ بھی کھلاڑیوں کو ٹیسٹ کرکٹ سے انخلا سے روکنے میں ناکام ہو جائے گا۔ یہ تو واضح ہے کہ ٹی ٹوئنٹی لیگز کی وجہ سے معاملہ بہت تیزی سے بورڈز اور اسپورٹس اتھارٹیز کے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک بار کھلاڑی دولت کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ اس میں بے تحاشہ دولت ہے مگر وہ لوگ جو اسے آرگنائز کر رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ کما رہے ہیں۔ انڈین کرکٹ بورڈ آئی پی ایل کی وجہ سے دنیا کا دولت مند ترین کرکٹ بورڈ بن گیا ہے۔ یہ کھلاڑیوں کو ملین ڈالرز دے رہا ہے لیکن خود بلین ڈالرز کما رہا ہے۔ آئی سی سی سے تمام سہولتیں اور ضمانتیں لینے کے باوجود اسے ایک ڈالر کی ادائیگی نہیں کر رہا۔

بگ تھری کی صورت میں انڈیا نے آسٹریلیا اور انگلینڈ کے ساتھ مل کر پہلے ہی کھیل کے اصولوں کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اب اگر کوئی نئی لیگ ایسے سیٹ اپ اور معاوضوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ جس کا مقابلہ یہ لوگ نہ کر سکیں تو وہ کھلاڑیوں کو کیسے اس طرف جانے سے روک سکیں گے۔ ایک بار کھلاڑی صرف پیسے کے لیے کھیلنا شروع کر دے تو اس کے بعد اسے زیادہ سے زیادہ معاوضہ ہی اچھا لگتا ہے۔ بعض بڑے تجارتی گروپس کی طرف سے ایسی تجاویز سامنے آرہی ہیں کہ ایک عالمی سطح کی پروفیشنل کرکٹ لیگ کرائی جائے جو کسی بھی ملک کے اثر سے آزاد ہو۔ اس میں ٹیموں کے مالکان کسی قسم کی پابندی سے آزاد ہو کر اپنی مرضی سے کھلاڑی منتخب کریں۔ آئی پی ایل میں ایک ٹیم ایک وقت میں چار سے زیادہ غیر ملکی کھلاڑی نہیں کھلا سکتی ہے۔ یعنی ہر ٹیم میں چار پانچ ایسے کھلاڑی ہوتے ہیں جن کی عالمی کرکٹ میں کوئی پہچان نہیں ہوتی ہے۔

اگر کوئی پروفیشنل لیگ وجود میں آجاتی ہے تو وہ سارے کے سارے کھلاڑی عالمی کرکٹ سے چننا پسند کرے گی۔ گویا ہر ٹیم کا ایک ایک کھلاڑی اسٹار ہوگا۔ اس سے ان مقابلوں کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عالمی اسپورٹس گروپ آئی سی سی اور بگ تھری کے بورڈز سے کہیں زیادہ دولت رکھتے ہیں۔ ان کے پاس کھیل کو آرگنائز کرنے کے وسائل اور ماہرین موجود ہیں۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی فٹ بال، بیس بال، باسکٹ بال، ٹینس، فارمولا ون اور گولف سمیت متعدد کھیلوں پر اسی طرح قابض ہو چکے ہیں۔ دو دہائیوں میں کرکٹ بھی بلین ڈالرز اسپورٹس کی

شارک سے آپ سب ہی واقف ہوں گے۔ اس کے سونگھنے کی حس کا اس سے اندازہ کرلیں کہ لامتناہی سمندر میں اگر کہیں بھی خون کے چند قطرے بھی شامل ہو جائیں تو یہ میلوں دور سے اس کی بو سونگھ کر دوڑی ہوئی چلی آتی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے قد صبح لمبے ہوتے ہیں اور شام کے وقت چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں آپ کا قد شام کے وقت ایک انچ کم ہو جاتا ہے۔ بہ نسبت صبح کے۔

☆☆☆

چلیں یہ بتا دیں کہ یوٹیوب پر کتنی وڈیوز ہوں گی، کچھ اندازہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ کوئی اندازہ نہیں ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور بتا دوں کہ اگر آپ اس ویڈیو کو تفصیل سے دیکھنے بیٹھ جائیں تو مسلسل ایک ہزار سال تک دیکھ سکتے ہیں، جی ایک ہزار سال۔

مرسلہ: نوی۔ کراچی

فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت بھی کوئی گروپ منصوبہ بندی میں مصروف ہو کہ کس طرح کرکٹ کی ایک عالمی پروفیشنل لیگ کو آرگنائز کرے اور اس سے دولت کمائے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی بڑا گروپ بلین ڈالرز کی لیگ شروع کرتا ہے۔ آسٹریلیا یا جنوبی افریقا کے تمام سہولیات سے آراستہ اسٹیڈیمز کرائے پر حاصل کرتا ہے۔ شوبزنس سے تعلق رکھنے والی سیلی بریٹیز کو ایمبیسیڈر بناتا ہے۔ کھلاڑیوں کو ملٹی ملین ڈالرز میں معاوضہ پیش کرتا ہے کہ وہ صرف اسی کے لیے کھیلیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ کرکٹرز پر مشتمل ایک درجن ٹیمیں تشکیل دیتا ہے اور طویل عرصے تک چلنے والی سیزن لیگ متعارف کراتا ہے تو اسے کامیابی سے کون روک سکتا ہے؟ ساری دنیا سے دولت مند ترین طبقہ لگژری سے بھرپور خوب صورت ماحول میں کرکٹ سے لطف اندوز ہونے آئے گا۔ جن کے لیے اعلیٰ ترین سہولیات پہلے ہی ان ممالک میں موجود ہیں۔ لیگ کے میچز کے ٹکٹ ہی بھاری رقم میں فروخت ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ایڈورٹائزنگ رائٹس اور میڈیا رائٹس کے حقوق ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائیں گے۔

میچوں کی کوریج ایچ ڈی سے بڑھ کر تھری ڈی میں ہوگی اور ساری دنیا میں شائقین اپنے اسمارٹ تھری ڈی ٹی وی کے سامنے یوں میچ دیکھیں گے جیسے کھیل ان کے سامنے ہو رہا ہو۔ دوسرے کھیلوں میں یہ سب ہو رہا ہے جو بڑے بزنس گروپوں کے ہاتھ میں جا چکے ہیں۔ کرکٹ ابھی اس سے بچی ہوئی ہے لیکن آخر یہ کب تک محفوظ رہے گی۔ بالآخر وہ وقت آنے والا ہے جب بگ تھری بھی قصہ پارینہ بن جائیں گے۔ جو کھیل انہوں نے شروع کیا ہے وہ خود ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لے دے کے آئی سی سی اور بورڈز کے پاس وہی ٹیسٹ اور ایک روزہ کرکٹ رہ جائے گی مگر اسے کھیلنے کے لیے اسٹار کرکٹرز زیادہ عرصے ان کے پاس نہیں رہیں گے۔ ڈومیسٹک کرکٹ سے نکل کر آنے والے کھلاڑی ذرا شہرت ملتے ہی وہ سیدھے کسی پروفیشنل لیگ کا رخ کریں گے اور چند سال میں اتنی دولت اور شہرت کما لیں گے کہ پھر انہیں کسی طرز کی کرکٹ کھیلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ اپنی کمائی کے بل بوتے پر باقی زندگی عیش و آرام سے گزاریں گے۔ یہی نہیں بلکہ فٹ بال اور دوسرے کھیلوں کی طرح اس کا بھی امکان ہے کہ اچھا کھلاڑی ابھی ڈومیسٹک کرکٹ میں اپنے جوہر دکھانے کا آغاز کرے گا کہ کوئی پروفیشنل لیگ ٹیم اسے لے اڑے گی۔ وہ اسے پالش کرے گی۔ دنیا کے بہترین کوچز اور بہترین فٹ نیس انسٹرکٹر اسے تربیت دیں گے اور پھر اسے کسی ہیرے کی طرح تراش خراش کر میدان میں اتارا جائے گا۔

کہتے ہیں کہ بہت اچھے اور معزز خاندان بھی کسی ایک بگڑی اولاد کی وجہ سے اپنی ساری عزت اور نجابت کھو دیتے ہیں۔ کیا ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کے کھیل کی وہ سب سے بگڑی ہوئی اولاد ثابت ہو رہی ہے جو بالآخر پورے کھیل کی تباہی کا باعث بن جائے گی۔ اس فارمیٹ کو عالمی کرکٹ کا حصہ بنے ہوئے دس سال ہونے کو آئے ہیں۔ ویسے تو اس نے کرکٹ کو بہت کچھ دیا ہے۔ خاص طور سے پیسے اور مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن ایک بات قابلِ غور ہے۔ ٹی ٹوئنٹی نے آج تک ایک بھی اسٹار کرکٹر پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ ٹی ٹوئنٹی کی لیگوں میں پرفارم کر رہے ہیں۔ وہ سب ٹیسٹ کرکٹ اور ایک روزہ کرکٹ سے نکل کر آئے ہیں۔ یعنی ٹی ٹوئنٹی نے کسی کو اسٹار نہیں بنایا لیکن یہ عالمی کرکٹ کے بہت سے اسٹارز کھا چکی ہے۔ کسی بلیک ہول کی طرح جو چھوٹا بلکہ ایک نقطے سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے مگر اپنی بے پناہ کشش کی وجہ سے بڑے بڑے ستاروں کو کھا جاتا ہے اور اپنے وجود کا حصہ بنا لیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی ٹی ٹوئنٹی اپنی بے پناہ کشش کی وجہ سے دوسرے فارمیٹس سے آنے والے اسٹارز کھا رہی ہے۔

ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے اور ابھی اسے روکا جا سکتا ہے۔ پہلے قدم کے طور پر کرکٹ کو بہ طور کھیل اس کی ساکھ کے ساتھ بحال کیا جائے۔ نام نہاد بگ تھری رضا کارانہ آئی سی سی کے اختیارات واپس کریں اور ساری دنیا میں کرکٹ کے فروغ کی کوشش کی جائے۔ کرکٹ کھیلنے والے چھوٹے ممالک کو ان کی کارکردگی کے حساب سے آئی سی سی کی آمدنی میں زیادہ حصہ دیا جائے۔ ٹی ٹوئنٹی کو عالمی کپ تک محدود کر دیا جائے اور دو ملکوں کی باہمی سیریز میں اسے شامل نہ کیا جائے۔ دنیا میں بھانت بھانت کی لیگوں کے بجائے تمام کرکٹ کھیلنے والے ایک مشترکہ لیگ کا اہتمام کریں اور اس میں تمام ممالک کو مساوی حصہ اور آمدنی میں شیئر دیا جائے۔ صرف یہی ایک صورت ہے جو کرکٹ کے کھیل کو غیر متعلقہ ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ جنھوں نے اس خوب صورتی کو رزقِ بصارت نہیں بنایا ان کے لیے یہ تحریر ایک تحفے سے کم نہیں، اپنے وطن کے کوہ و دمن سے آپ پیار کرتے ہیں تو انہیں لفظی تحریر کے آئینے میں دیکھیں، لطف اٹھائیں۔

ایک وطن پرست کا تحفہ وطن دوستوں کے لیے

سمجھ نہیں آرہا کہ میں اس کو اپنی آپ بیتی کہوں سفر نامہ یا کوئی افسانہ؟ زندگی تو خود بھی ایک سفر ہے جہاں آپ ہر روز سفر کرتے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ میری یہ داستان لگ بھگ ایک سال پر محیط ہے تو میں اس کو سفر نامہ ہی کہوں گا۔ آپ کچھ بھی سمجھ لیں، یہ آپ پر منحصر ہے۔

یہ واقعہ ایک سال سے کچھ زاید عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ عرصہ 1999ء کے مارچ سے شروع ہوتا ہے اور اگلے سال کے جولائی پر تمام ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کچھ

لمحے، کچھ دن، ماہ یا کچھ سال ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس پر اپنا بھرپور اثر ڈالتے ہیں۔ ان کی زندگی بدل کر رہ جاتی ہے۔ جب یہ لمحے گزر جاتے ہیں تو آپ ذرا سا رک سکتے ہیں اور ایک لمحے کو پیچھے مڑ کر ماضی میں جھانکتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ اس کی زندگی میں تبدیل ہو گیا مگر یہ سب ہوا کیسے تھا؟ یہی سنانے کے لیے میں تھوڑا بہت آپ لوگوں سے اپنے تجربات بانٹنا چاہتا ہوں۔

میں اس عرصے میں ہنزہ کے آگے ایک مقام ہے ''شمشال'' وہاں جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اور ساتھ ہی کینیڈا میں مکمل طور پر آنے کے لیے تیاری بھی کر رہا تھا۔

ان تمام دنوں میں ہر ایک دن ایک نیا تجربہ لا رہا تھا کچھ سکھ اور باقی دکھ۔ میں نے اپنی زندگی میں جتنی تبدیلیاں اس ایک سال میں دیکھیں، جو تجربات اس عرصے میں حاصل ہوئے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب میں ملتے ہیں۔ ایک جدوجہد تھی، ایک سفر تھا اور منزل کوئی نہیں تھی۔ بس چھوٹے چھوٹے اہداف تھے، جن کو حاصل کرنے کی کوشش تھی۔

مجھے سفر کرنے کا شوق ہمیشہ سے بہت زیادہ رہا ہے۔ ہر پل بدلتے مناظر ہی میری روح کو تسکین دے سکتے ہیں۔ میں ہر دم ایک حرکت میں رہا ہوں اور کسی مقام کا سفر کرنا میرے اندر ایک ہلچل مچا دیتا تھا۔ سفر کسی بھی طرح کا ہو، آگے بڑھائے رکھتا ہے۔ اس لیے زندگی میں، میں کبھی کسی کا نہ رہا۔

جب میں کینیڈا آ رہا تھا تو میں اپنے دوستوں سے سوال کرتا ''تم بتاؤ! میں کیوں باہر جا رہا ہوں۔'' اور ہر ایک کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ، ظاہر ہے پیسوں کے لیے! مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے دنیا دیکھنے کا شوق تھا۔ مجھے کسی ایسے پاسپورٹ کی ضرورت تھی جس پر ہر ملک اپنے دروازے کھلے رکھتا ہے اور باہر رہ کر میں اتنے پیسے بچا سکتا تھا، جن سے میں اپنا یہ شوق پورا کر سکوں۔

مجھے در بدر بھٹکنے کا جنون رہا ہے۔ میں اپنے اس سفر نامے کو شروع کرنے سے پہلے کئی سال قبل کا ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں، جس میں یہ بتا سکوں کہ مجھے نت نئے لوگ، شہر اور ثقافتیں دیکھنے کا کتنا شوق تھا اور سفر کسی قسم کا ہو، وہ مجھے کیسے اپنی طرف کھینچے رکھتا تھا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہر چیز خوب صورت ہوتی تھی زندگی میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ زندگی کی ندی مستی میں بہتی تھی۔ کوئی تلاطم نہ تھا اور نہ کوئی سرکش موجیں تھیں۔ نہ زیادہ خواہشیں تھیں اور نہ ضرورتیں۔ پھر بھی ہم رات دن کسی جوش اور جذبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ میں دسویں کلاس میں تھا اور پرچے قریب تھے۔ ہمارے گھر سے ذرا دور ایک قبرستان تھا۔ اس شہر خموشاں کی خاموشی پڑھائی کے لیے موزوں تھی۔ میں ہر روز صبح کے بعد اپنی کتابیں لیے، اس قبرستان کی جنازہ گاہ کے قریب، لہلہاتے سبزے کے ساتھ لگی ایک پگڈنڈی پر اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتا اور سخت بور قسم کے مضمون پڑھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ میرا دوست فضل الٰہی بھی ہوتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے ایک فاصلے پر بیٹھے اسکول کے خشک مضمون پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت خاموشی کا راج ہوتا تھا کبھی کبھی پرندوں کی چہچہاہٹ خاموشی کو چیر دیتی۔ قبرستان سے لگی ایک کچی سڑک تھی اس پر کوئی سواری کبھی کبھی نظر آ جاتی، جو کبھی کسی گدھے کی ہوتی یا پھر اونٹ کی، یا پھر سائیکل رکشے کی۔ ان دنوں ہمارے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں سائیکل رکشے چلا کرتے تھے۔

ایک دن تازہ اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، بادل چھائے ہوئے تھے اور میں انگریزی کا کوئی مضمون یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فضل جو شہر کے مسلم بازار میں ایک تختے پر شام کو کباب لگایا کرتا تھا، وہ بھی کچھ دور بیٹھا، میری طرح کی کسی مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ اتنے میں میرا چھوٹا بھائی آیا اور بولا کہ والد صاحب دکان پر بلا رہے ہیں۔ والد صاحب کی شہر کے بازار میں کھیلوں کے سامان کی دکان تھی۔ وہ کھیلوں کا سامان مقامی اسکولوں کو سپلائی بھی کرتے تھے۔ دکان پر گیا تو والد صاحب نے کہا سیالکوٹ سے کھیلوں کا سامان ٹرین سے دریا خان کے لیے بک کروایا تھا اس سامان کے بورے دریا خان ریلوے اسٹیشن پر آ گئے ہوں گے۔ تم یہ دو سو روپے لو اور آج ہی دریا خان جاؤ اور سامان لے آؤ۔

ان دنوں دو سو بہت زیادہ ہوتے تھے۔ آج کل کے پچیس ہزار جتنی وہ رقم تھی۔ اس رقم سے ریلوے کی بلٹی بھی دینی تھی، دریا خان سے ڈیرہ اسماعیل خان تک کا کرایہ بھی تھا اور ظاہر ہے میرا اپنا خرچ بھی شامل تھا۔ میں نے فضل سے کہا کہ دریا خان چلتے ہیں، شام سے پہلے واپس گھر آ جائیں گے۔ وہ بخوشی تیار ہو گیا کیونکہ کسی انکار کی کوئی وجہ اس کے پاس بھی نہ تھی۔

اس کو ساتھ لیا اور دریا خان کے لیے چل پڑا۔ اس وقت میں بہت خوش تھا اس لیے کہ اکیلے سفر کرنے کا موقع پہلی بار مل رہا تھا۔

دریا خان ڈیرہ سے صرف 14 میل کے فاصلے پر تھا مگر

بیچ میں دریا سندھ کا میلوں پھیلے چوڑے پاٹ میں بہتا تھا۔ سردیوں میں دریا خان کی آمدو رفت کے لیے اس پر کشتیوں کے پل بنا دیے جاتے تھے۔ پل پار کرتے ہی کچے کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

راستہ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ ایک پل کے پار اترتے تو ایک اور پل کا سامنا ہوتا ہر پل پر مسافر بس سے اتر جاتے اور بس کے پیچھے چلتے یا کبھی آگے آگے۔ چودہ میل کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل ہوتا۔ جو بسیں اس روٹ پر چلتیں، وہ ایک انوکھا نمونہ ہوتیں۔ وہ کئی بسوں، ٹریکٹروں اور ویگنوں کے مختلف پارٹس ملا کر ایک بس کی شکل میں لائی گئی تھیں۔ ہر ایک ہفتے بعد، پوری بس کو پھر سے کھول کر کسا جاتا۔ اس کے ٹکٹ کے حصول کے لیے بھی بہت پاپڑ بیلنے پڑتے۔ ان میں سیٹیں کم اور لکڑی کی چوکی نما چیزیں زیادہ ہوتیں۔ چلتے وقت وہ اتنے ہچکولے لیتیں کہ منزل پر پہنچ محسوس ہوتا کہ شاید جسم کا کوئی حصہ بس میں نہ رہ گیا ہو۔ کپڑے مٹی سے بھرے ہوتے۔ یہ بسیں پورے ڈیرہ میں ایم رمضان کی بسوں کے نام سے مشہور تھیں اور اب بھی جہاں سے یہ بسیں روانہ ہوتی تھیں وہ جگہ ایم رمضان کے اڈّے کے نام سے مشہور ہے۔

میں اور فضل اس خوشگوار سفر کے بعد دریا خان پہنچے تو مٹی سے ڈوبے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہار کی آمد کے دن تھے اور جاڑے ختم ہو رہے تھے۔ ہم نے ہلکی سویٹریں پہن رکھی تھیں اور گلوں میں مفلر تھے۔ انہی مفلروں سے ہم نے ایک دوسرے پر سے مٹی جھاڑی اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔

دریا خان کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت ویسی ہی ہے اس جیسی لائن پر بنے دوسرے اسٹیشنوں کی ہے۔ اینٹوں سے بنی اونچی سی عمارت، جو ایک حال نما کمرے میں لے جاتی ہے۔ ایک سائیڈ پر دو تین کھلی کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں اور ان سلاخوں کے پیچھے کسی اونچی کرسی پر معتنک بابو بیٹھا کسی رجسٹر کے ورق پلٹتا رہتا تھا ہم اس کے سامنے با ادب کھڑے ہو گئے اور فریادی انداز سے معلوم کیا کہ یونین اسپورٹس کے نام سے کوئی سامان یہاں پہنچا ہے۔ اس نے رجسٹر دیکھے، ہمیں دیکھا اور کچھ کاغذ الٹے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ہم پریشان ہوئے کہ سامان تو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اس بابو سے میں نے رائے مانگی اور مشورہ طلب کیا تو اس نے کہا کہ شاید سامان ابھی کندیاں میں پڑا ہو۔ آپ کندیاں جا کر معلوم کر لیں۔ کندیاں؟ ان دنوں ٹرین پر دو تین گھنٹے لگتے تھے۔

فون ان علاقوں میں ابھی نایاب تھے۔ ہم نے پوچھا کہ کندیاں کیسے جائیں تو بتایا گیا کہ کچھ دیر میں ایک ٹرین کندیاں کے لیے پلیٹ فارم پر آئے گی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور کچھ سوچا پھر سوچ سمجھ کر ایک خاموش فیصلہ کیا کہ کندیاں چلتے ہیں۔ ہمارے پاس پیسے بہت تھے۔ دو یا چار روپے کی ایک ٹکٹ تھی۔ ہم نے بکنگ کھڑکی سے ٹکٹیں لیں اور ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ میں اندر ہی اندر خوشی سے اچھل رہا تھا کہ ٹرین کا سفر کر رہا ہوں۔ خوشی میں کچھ مونگ پھلی اور ریوڑیاں لیں۔ ٹرین آئی تو ہم انٹر کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ سواریاں کم تھیں، با آسانی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

ٹرین روانہ ہوئی اور باہر کے مناظر میرے دماغ کی اسکرین پر چلنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آتے، ٹرین رکتی اور کم ہی لوگ اترتے مگر زیادہ سوار ہوتے تھے۔ سفید قمیصوں، دھوتیوں اور اسی رنگ کی پگڑیوں میں دیہاتی لوگ اپنی کسی گٹھڑی سمیت سلام کرتے سوار ہوتے اور خاموشی سے کسی نشست پر بیٹھ جاتے۔ میں ان سب کو دیکھتا، ان کے چہرے پڑھتا اور پھر جیسے ٹرین روانہ ہوتی تو میری نگاہیں کھڑکی سے باہر پیچھے کی جانب دوڑتے نظاروں پر جم جاتی اور میں کھو سا جاتا۔

یہ 70ء کی دہائی کے آخر سالوں کی باتیں ہیں۔ اسٹیشن ایک ثقافتی مرکز ہوتا تھا۔ اپنے شہر کے مزاج کے مطابقت سے اشیا فروخت ہوتی تھیں ٹھیلے لگے ہوتے۔ زیادہ چیزوں کی بھر مار نہیں ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ طلب چائے کی ہوتی اور یا پھر کھانے کا کوئی چھوٹا ہوٹل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹھیلوں والے ہوتے، جن کی خاموش زبانیں ٹرین رکتے ہی چل پڑتیں۔ پورا اسٹیشن حرکت میں آجاتا۔ ایک ہلچل مچتی اور جیسے ٹرین روانہ ہوتی تو اس ہلچل کے آفٹر شاکس اسٹیشن پر کچھ دیر رہتے اور ٹرین ایک خاموشی اپنے پیچھے چھوڑے، دھما چوکڑی مچاتی آگے بڑھ جاتی۔

ہم کندیاں پہنچے تو دن شام کی سیاہی میں بدل چکا تھا۔ ٹرین سے اترے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے گودام سے منسلک دفتر میں جا پہنچے۔ وہاں بیٹھے لوگوں سے وہی سوال کیا جو ہم دریا خان کے اسٹیشن پر کر چکے تھے اور ہمیں وہی جواب ملا جو وہاں ملا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہوں نے ہماری تسلی کی خاطر، ہمیں گودام بھی دکھلا دیا۔ گودام میں پٹسن کی بوریاں مختلف

سامانوں سے بھری تھیں اور ایک ہلکے زرد بلب کی روشنی میں ہم بوریوں پر کالی سیاہی سے لکھے بلٹی کے نمبر پڑھتے گئے۔ ہم نے ان کو پھر پورا ماجرا سنایا کہ سامان سیالکوٹ سے روانہ ہوا ہے اور اتنے دنوں میں اسے دریا خان پہنچ جانا چاہیے انہوں نے میرے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ سامان کہیں سرگودھا میں نہ اتار لیا گیا ہو۔

ہم دونوں نے پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر پہلے کی طرح کا ایک خاموش فیصلہ کیا کہ سرگودھا چلتے ہیں۔ سرگودھا کی گاڑی کا پوچھا تو کہا گیا کہ ابھی کچھ دیر میں آئے گی۔ ٹکٹ گھر سے جا کر سرگودھا کی حسب سابق دو ٹکٹیں لیں اور اسٹیشن کے ایک ہوٹل کی مدھم روشنی میں بیٹھ کر کچھ کھایا پیا۔

رات مکمل چھا چکی تھی اور ہم ایک بے یقینی کے سفر پر نکلے تھے پیچھے گھر والے ہمارے لیے کتنے پریشان ہوں گے، ہمیں کچھ پرواہ نہ تھی۔ میری ماں تو مجھے اس طرح دریا خان بھیجنے کے بھی خلاف تھی۔ وہ پریشان تھیں کہ ایک چھوٹے لڑکے کو اکیلے چودہ میل دور، دریا کے پار پنجاب کے کسی قصبے میں بھیجا جا رہا تھا۔ میرے والد صاحب ان کو سمجھاتے تھے کہ تین چار گھنٹوں میں واپس آجائے گا۔ اس حساب سے مجھے شام سے پہلے اپنے گھر پر ہونا چاہیے تھا اور یہاں رات اتر آئی تھی اور میں گھر سے مختلف سمت میں سفر کرتا تھا۔

جیسے جیسے ریل کے آنے کا وقت قریب آتا گیا، کندیاں کا ویران پڑا اسٹیشن آباد ہونے لگا۔ کچھ چہل پہل شروع ہوئی۔ اس گاڑی نے کندیاں سے براستہ سرگودھا لاہور جانا تھا۔ ہم نے سرگودھا کے ٹکٹ لیے تھے۔ کچھ دیر میں ٹرین ایک دھوم دھڑکے کے ساتھ اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ایک قیامت سی برپا ہوئی۔ ہم سوار ہوئے۔ کچھ لوگ اترے۔ کوئی شور شرابا سا اٹھا اور اپنے پیچھے وہی خاموشی چھوڑ کر وہ سرگودھا کی طرف چل پڑی۔

ہم اپنی سیٹوں پر بیٹھے ایک سرور کے عالم میں سفر کرتے تھے۔ سرگودھا آیا تو رات آدھی بیت چکی تھی۔ سرگودھا کا اسٹیشن کندیاں سے بڑا تھا۔ یہاں چہل پہل بھی زیادہ تھی۔ ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ گاڑی سے اترے۔ باقی تھیلوں کی جانب بڑھ گئے اور ہم پہلے کی طرح، بلٹی ہاتھ میں تھامے اسٹیشن پر اپنے سامان کے بورے ڈھونڈ رہے تھے۔ یہاں کے گودام میں کندیاں کی نسبت روشنی اور سامان دونوں زیادہ تھے۔ پورا عملہ پہلے تو ہمارے سوال پر حیران ہوا اور پھر سب کی آنکھوں میں ہمدردی اتر آئی، کیونکہ ہم بھی تو ابراہیم ادھم کے خواب کی طرح ہاتھیوں کو محل کی چھت پر ڈھونڈ رہے تھے۔ ہم سب نے مل کر گودام کو کھنگال ڈالا مگر ہمارا سامان کہیں نہ تھا۔ میں نے اپنا وہی پرانا سوال دہرایا کہ سامان کہاں ہوسکتا ہے۔ کسی نیک بخت کی آواز آئی کہ شائد ابھی سیالکوٹ کے اسٹیشن پر پڑا ہو۔ میں نے شائد یہی پوچھا تھا کہ سیالکوٹ کہاں ہے؟ کتنا دور ہے یہ نہیں پوچھا تھا اور یہ ضرور پوچھا کہ وہاں کیسے جایا جاسکتا ہے۔ کوئی صاحب بولے کہ جس گاڑی پر آپ آئے ہیں، وہ لاہور جارہی ہے۔ آپ لاہور اتر کر کسی بس میں یا دوسری ٹرین سے سیالکوٹ چلے جائیں۔

یہ سننا تھا کہ ہم نے ٹکٹ گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ اس بار ہمیں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کا موقع نہ ملا اور نہ کچھ سوچنے کا کیونکہ اس وقت ہماری گاڑی لاہور جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ مسافر دھڑا دھڑ اس میں سوار ہورہے تھے اور ٹرین کا انجن اپنی مخصوص آوازوں میں غرا رہا تھا۔ ہم ٹکٹ گھر کی کھڑکی تک پہنچے ہی ہوں گے کہ ٹرین نے ہمیں چڑانے کے لیے ایک لمبی وسل ماری اور چھک چھک کرتی رینگنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک خاموشی، ویرانی اور تنہائی اپنے پیچھے چھوڑ کر کہیں اندھیرے میں معدوم ہوتی چلی گئی اور ساتھ ہی اس کی سیٹیوں، پٹڑی کی رگڑ اور انجن کی غرغراہٹ بھی کہیں تحلیل ہو گئی۔ میں فضل کی طرف دیکھتا تھا اور وہ میری جانب ایک بے بسی سے تکتا تھا۔

ہم اسٹیشن پر تنہا رہ گئے تھے۔ رات کے بارہ یا ایک بج رہے تھے۔ ٹکٹ گھر پر دوبارہ پہنچے تو بابو صاحب وہی لمبی ٹانگوں والی لکڑی کی کرسی پر بیٹھے اپنے کاغذات مکمل کررہے تھے۔ ہم نے اپنا ماجرا بیان کیا اور انہوں نے پہلے ٹکٹ واپس لے کر دو اور ٹکٹ اس ٹرین کے تھمادیے، جس نے کچھ دیر بعد لاہور کے لیے اسی اسٹیشن پر آنا تھا۔ اس دوران ہم ایک بینچ پر نیم دراز لیٹے اگلی ٹرین کا انتظار کررہے تھے۔ کچھ تھکاوٹ اتر گئی تھی۔

ہم نیم غنودگی میں تھے کہ دوسری ٹرین شور مچاتی آ دھمکی۔ ہمارے پاس کوئی سامان نہ تھا اور ہم جھٹ پٹ اس میں سوار ہوگئے۔ ڈبے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور ہم دونوں بے کسوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہم دونوں شدید تھکاوٹ اور نیند سے نڈھال تھے اگر کسی کو ہماری حالت دیکھ کر کوئی ترس آ بھی جاتا تو بھی وہ ہماری مدد کرنے کے قابل نہ تھا۔ ہر ایک اپنی سیٹوں پر چپکا بیٹھا اونگھ رہا تھا اور خوش قسمت لوگ سلیپر پر نیند کے مزے لے رہے تھے۔ معلوم نہیں کتنے

اسٹیشن گزرے ہوں گے کہ ہمیں سیٹیں میسر ہوئیں اور ہم دھڑام سے ان پر گر پڑے۔

کچھ دیر تک اونگھتے رہے پھر اپنی سیٹوں پر سو گئے۔

ٹرین کی سیٹ پر سونے کا ایک دکھ بھی ہوتا ہے اور سکھ بھی۔ پہیوں کی پٹڑی کے ساتھ رگڑنے کی گڑگڑاہٹ رات بھر کانوں میں بجتی رہی۔ جب دن کی روشنی، چھک چھک کرتی ٹرین کی کھڑکیوں سے اندر آ کر آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوئی تو میری آنکھ کھلی۔

ہم دیہاتی سے حلیے میں تھے اور غریب الوطن مسافر تھے۔ ہمارے سامنے والی سیٹوں پر ایک خاندان اپنے قیمتی لباسوں اور امیرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ بے زاری سے بیٹھا تھا اور کبھی کبھار ہم پر نظر کرم ڈال دیتا۔ اس خاندان میں سب سے خوب صورت بات وہ ایک دلکش لڑکی تھی جو کھڑکی سے ٹیک لگائے، بیزارگی کے عالم میں ہم سے لاتعلق بیٹھی تھی۔ فضل اس کو کن انکھیوں سے دیکھتا تھا اور میں بھی اس پر سے اپنی نظریں ہٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس میں کوئی کشش تھی جو مجھے اسے دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ شائد اس میں کوئی کشش نہ ہو مگر ہمارے لیے اس لیے تھی کہ وہ ایک ہماری عمروں کو پہنچتی ایک لڑکی تھی اور ہم پہلی بار کسی غیر لڑکی کے بالکل روبرو بیٹھے تھے اور یہ ہمارے لیے انوکھا تجربہ تھا۔ کوئی کسک دل میں اٹھتی تھی اور ایک سرشاری پورے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ مجھ میں اور فضل میں ایک مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ میرے کان میں بڑبڑاتا کہ لڑکی نے اسے دیکھا ہے اور میں بضد تھا کہ نہیں اس کی پلکیں میری جانب اٹھی ہیں۔ ہمارا سفر اسی خام خیالی میں خوشگوار ہوتا چلا گیا۔

ہماری ٹرین کہیں کھیتوں میں بھاگی پھر رہی تھی اور ہم لاہور کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ کہیں جلدی نہ آ جائے۔ اتنے میں ٹرین نے اپنی بریکیں کھینچیں اور پہیے رگڑتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ ایک ہلچل پورے پورے ڈبے میں پھیلی اور لوگ کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے۔ سب میں تجسس تھا کہ اس ویرانے میں ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ ٹرین رکنے کے بعد کچھ مسافر نیچے اتر گئے مگر ہم اپنی نشستیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے سیٹوں سے چپکے بیٹھے رہے اور سامنے بیٹھی اس حور پری کو دیکھتے رہے جس کا چہرہ روشنی میں تمتما رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ایک شور سا اٹھنا شروع ہوا اور ایک اندوہناک خبر پورے ڈبے میں پھیل گئی کہ آگے کسی ٹرین کا خوفناک حادثہ ہو گیا ہے۔ نیچے اتر کر دیکھا تو دور کہیں کسی ٹرین کے ڈبے پٹڑی سے لڑھک کر زمین پر الٹے پڑے ہیں۔ ایک آہ و بکاہ پھیلی ہے۔ معلوم ہوا کہ جو ٹرین سرگودھا میں ہم سے چھوٹ گئی تھی، وہ حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ کئی اموات ہو چکی تھیں اور زخمیوں کو باہر نکال کر کہیں منتقل کیا جا رہا تھا۔ ہم دونوں دم بخود تھے۔ یہ حادثہ ہمارے حصے میں آنے والا تھا مگر چند منٹوں کے فرق سے اس نے ہمیں کھو دیا تھا۔ ہم بھی اسی بھگدڑ میں ٹرین سے نیچے اترے۔

ہم دونوں پہلے تو کچھ یقینی حادثے سے بچ جانے والی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر کچھ دیر مسلسل ایک ساتھ بولتے تھے کہ کس طرح ہم پر ایک معجزہ اترا ہے۔ ہم اپنی سیٹوں پر دوبارہ آ بیٹھے اور پھر ہم گرد و نواح کی توجہ حاصل کرنے کے لیے با آواز بلند اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو ایک روحانی کرشمہ قرار دیتے رہے۔ اس گرد و نواح سے ہمیں کوئی زیادہ توجہ نہ ملی ... تو ہم خاموش ہو گئے۔

سب اس حادثے پر بات کر رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ اگر میں اس ٹرین کا مسافر ہوتا اور اس حادثے کا شکار ہو جاتا تو میرے ماں باپ کو کبھی بھی اس کی خبر نہ ملتی کہ ان کا بیٹا کہاں اور کس حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ ان کے تو دماغ کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھا کہ ان کا پندرہ سالہ بیٹا، دریا پار ایک ..... چھوٹے سے قصبے دریا خان سے لاہور کے لیے نکل چکا ہے۔ مجھے یہ بھی خیال نہ آیا کہ میری ماں کتنی پریشان ہو گی اور میرے والد سے کتنا جھگڑی ہوں گی کہاں میرے کم سن بیٹے کو اکیلے بھیج دیا۔ ادھر میں اور فضل اپنی موج میں تھے۔

ایک دو گھنٹے ہماری ٹرین رکی رہی اور پھر جب روانہ ہوئی تو لاہور بہت جلد آ گیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ حادثہ کس مقام پر ہوا ہے اور لاہور کتنا دور ہے؟ ہمیں یہ سب معلوم کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ہم نے لاہور پہنچ کر سیالکوٹ جانا تھا۔ کس وقت پہنچتے ہیں اور کیسے؟ یہ ہمارا مسئلہ نہ تھا۔

ہم لاہور ٹرین اسٹیشن پر اترے تھے اور دوپہر ابھی شروع ہو رہی تھی یہ ایک بہت بڑا اسٹیشن تھا، جس کے کئی پلیٹ فارم تھے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ ہر آدمی دوسرے سے ٹکرا رہا تھا۔ ہم اسی میلے میں کھو گئے اور کچھ دیر بے مقصد اسٹیشن پر گھومتے رہے۔

میں نہ تو اس اسٹیشن کی تاریخ جانتا تھا اور نہ جغرافیہ نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی بنیاد 1857ء میں رکھی گئی تھی، جب

جنگ آزادی ختم ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کو ایک ریلوے اسٹیشن کے علاوہ کسی ایک قلعے کی شکل بھی دی گئی تھی۔ جب انگلش انڈیا اور افغانستان کی 1878ء میں جنگ ہوئی تو ایک دن میں پچھتر ریل گاڑیاں فوجی، اسلحہ اور بارود لے کر یہاں سے افغانستان کے محاذ پر جاتیں۔ یہ جو آج یہاں کھوے سے کھوا چل رہا ہے، پہلے یہاں باہر سب ویران تھا، کچی زمین کے بیچ یہ عمارت اٹھائی گئی تھی۔ باہر سر پر پگڑی باندھے قلی کسی مسافر کا انتظار کررہے تھے۔ وکٹورین ہیٹ پہنے دیسی بابو اکڑتے ہوئے نکلتے اور اشارے سے ان کو اپنا سامان اٹھانے کا حکم دیتے اور خود کسی تانگے میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتے۔

ہم کچھ دیر اسٹیشن کی رونق میں کھوئے رہے اور پھر سر جوڑ کر کھڑے ہوئے کہ اب ہمیں کرنا کیا ہے۔ وہیں اسٹیشن پر کچھ کھا پی لیا تھا۔ ہمیں تو جانا سیالکوٹ تھا کہ والد صاحب کا سامان ڈھونڈ سکیں مگر لاہور کے اسٹیشن نے ہمیں جکڑ لیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے مختصر مشورہ کیا۔ اتنی رقم بچی نہ تھی کہ ہم سیالکوٹ جاکر سامان اپنے ساتھ لے جاتے اور دوسری لاہور کی ایک کشش تھی جو ہمیں اور اسے چھوڑ کر جانے نہ دیتی تھی۔ ہم نے ایک خاموش سا فیصلہ پھر کرلیا جیسے ہم پہلے کرتے چلے آرہے تھے کہ ہم سارا دن لاہور گھومتے ہیں اور رات کو نیو خان بس سے صبح دریا خان پہنچیں گے اور پھر وہی ایم رمضان کی چاند گاڑی سے ڈیرہ جائیں گے۔

ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو ویگنوں، تانگوں، ٹھیلوں اور لوگوں کے ہجوم کو دیکھا تو رک سے گئے۔ ہم میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ ہم دھیمے دریا کے باسی، ایک پُرشور سمندر میں بہتے آنکلے تھے۔ ہم اس دنیا کے عادی نہ تھے مگر یہ دنیا دیکھنے کا ایک چسکا ہمیں یہاں لے آیا تھا۔

ہم کچھ دیر ایک دوسرے سے مشورہ کرتے رہے کہ اب کہاں جائیں۔ ہم نے اپنی کورس کی کتابوں میں مینار پاکستان، شاہی قلعہ اور انارکلی بازار کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ ہمارے لیے یہی لاہور تھا۔ کسی سے پوچھا تو اس نے ہمیں بھاٹی گیٹ جانے والے تانگے پر بٹھادیا۔

ہم تانگے پر بیٹھے بڑی عمارتیں، کھلی سڑکیں اور اس پر تیزی سے رواں دواں چلتی ٹریفک دیکھ رہے تھے۔ بھاٹی سے پہلے کسی نے کہا کہ انارکلی والے اتر جائیں، تو میں نے کچھ سوچے بغیر جست لگائی اور سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ فضل بھی بڑبڑاتا ہوا اتر آیا ہم ایک نئی نکور دنیا دیکھ رہے تھے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شہر اتنا بارونق اور بڑا ہوسکتا ہے جہاں اتنے زیادہ تانگے چلتے ہوں۔ ایک میلا سا لگا تھا۔ ہم کبھی فٹ پاتھوں پر چڑھ جاتے۔ کبھی سڑک کے بیچ آجاتے تو پھر کسی تانگے یا کسی ریڑھے والی کی جھڑک سن کر دوبارہ فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے۔

کسی نے انارکلی کا راستہ دکھایا تو ہم انارکلی کی لہر میں اتر گئے۔ بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ہجوم تھا جس میں ہم دھکے کھا رہے تھے۔ ٹھیلے تھے اور ہر کوئی اپنی دکان سجائے اپنا سودا بیچ رہا تھا۔ ہم لاہور آئے تھے اور ہمیں دوسروں کو باور کرانا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں اس لیے ایک ٹھیلے سے مول بھاؤ طے کر کے دو عدد گہرے کالے شیشوں والی عینکیں خریدیں اور آنکھوں پر چڑھالیں۔ اب دو کم سن لڑکے کالے شیشوں کی عینکیں لگائے انارکلی میں بے خوف گھوم رہے تھے۔ دکانوں کے بورڈ پڑھتے، بچی دکانوں میں جھانکتے مگر اندر گھسنے کی کوشش نہ کرتے۔ آگے دیکھا کہ چند آدمی ایک لڑکے کی ٹھکائی کررہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی لڑکی کو چھیڑا ہے۔ ہماری دانست میں کسی لڑکی کو دیکھنے کو چھیڑنا کہتے ہیں۔ میں نے فضل سے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کریں کیس جب تم ٹرین میں لڑکی کو چھیڑ رہے تھے تو تمہیں مار نہیں پڑی۔ فضل نے کہا کہ ہاں یار اللہ نے عزت بچالی اور پھر لڑنے لگا کہ چھیڑ تو تم بھی رہے تھے۔ اس کے بعد ہم بڑی احتیاط سے چلتے رہے۔ اگر کوئی سامنے سے لڑکی آتی نظر آجاتی تو ہم نظریں جھکا کر دوسری جانب منہ پھیرے کھڑے ہوجاتے کہ کہیں چھیڑنے پر ہماری ٹھکائی نہ لگ جائے۔

کتابوں، رسالوں کا شوق میرا پروان چڑھ رہا تھا۔ انارکلی اور لوہاری گیٹ کے اس پاس کچھ لوگ سڑک پر کتابیں اور رسالے لگائے بیچ رہے تھے۔ میں نے اتنی ڈھیر ساری کتابیں دیکھیں تو میری رال ٹپک پڑی۔ میں نے خریداری شروع کی تو ڈھیر لگ گیا۔ اس کے لیے مجھے ایک بیگ خریدنا پڑا۔ کچھ دیر میں بیگ کا وزن بڑھتا گیا اور جیب ہلکی ہوتی چلی گئی۔ میں نے واپسی کے کرائے کے علاوہ کچھ پیسے علیحدہ رکھ لیے اور جتنے پیسے بچ گئے ان سے کتابیں اور بہنوں کے لیے بالوں کے کلپ اور کچھ دوسری چیزیں خریدلیں۔ بہنوں کے تحفے میں نے اور فضل نے بانٹ لیے، کیونکہ اس کی بھی بہنیں تھیں۔

اب وہ تھیلا کندھے سے لٹکائے میں بمشکل چل رہا تھا۔ ایک تانگہ پکڑا اور کسی طرح مینار پاکستان کی طرف آنکلے۔ مینار پاکستان دیکھ کر ہم خوشی اور حیرت سے پاگل ہو رہے تھے۔ یہ سوچتے کہ جو تصویریں ہماری درسی کتابوں میں

ہیں، وہ اصلی حالت میں ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ فضل کہتا کہ یار بڑے شہروں کے یہی تو مزے ہیں کہ ہر چیز یہاں نظر آتی ہے۔ ہم نے مینار پاکستان کو چاروں جانب گھوم کر دیکھا اسے چھو کر محسوس کیا اور اسے ہر زاویے سے دیکھتے رہے پھر اس سے دور، نرم گھاس پر بیٹھے اسے دیکھتے اور کبھی بادشاہی مسجد کے میناروں کو دیکھتے رہے یہ سب چیزیں ہم نے صرف کتابوں اور کیلنڈروں میں دیکھی تھیں اپنے سامنے پا کر ہم اپنے آپ کو حاجی سمجھ رہے تھے۔ کچھ بھوک لگی تو ساتھ گزرتے ایک شخص سے مولیاں خریدیں، جو وہ کالا نمک لگا کر بیچ رہا تھا۔

مولیاں کھا کر ہم کچھ دیر کے لیے نیند میں چلے گئے۔ کتابوں بھرا بیگ میرے سر تلے تھا اور ہم جب نیند سے اٹھے تو سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بیگ اٹھائے ہم شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد دیکھنے آئے۔ بھاری بیگ ہم دونوں باری باری کبھی سر پر اور کبھی کاندھوں پر اٹھاتے قلعے کے سامنے پہنچے۔ یہیں مجھے لاہور سے محبت ہو گئی۔ یہ شہر مجھے بھا گیا۔ اس کی فضا میں کچھ جادو سا تھا تو جسم میں اترتا چلا گیا۔ شاندار تاریخی عمارتیں، قسم قسم کے کھانوں کے ٹھیلے۔ کہیں دہی بڑے ہیں اور کہیں گول گپے، کہیں حلیم اور کہیں چاٹ کوئی مشروب بیچتا ہے اور کوئی چھلے اور کھانے والوں کا جمگھٹ، ایک رعب و دبدبہ بھی تھا اور ماحول میں نرمی بھی تھی۔

ہمارے پاس قلعہ دیکھنے کی ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے، اس لیے باہر سے اسے دیکھا۔ بادشاہی مسجد میں داخلہ مفت تھا اور اسی لیے اس کے صحن اور برآمدوں میں گھومتے رہے۔ مسجد کے مینار پر بیگ کے بوجھ سمیت چڑھے اور لاہور کو دیکھتے اور تعریفوں کو پل باندھتے تھے۔ شام ہوئی تو ہم کسی طرح بادامی باغ پہنچے۔ وہاں دریا خان کے لیے نیو خان کی بسیں چلتی تھیں۔ آج کل تو بڑی آرام دہ بسیں ہیں۔ ان دنوں ان کے ڈبے چلتے تھے وہ بسیں چلتیں تو اس کی کھڑکیاں تک بجتی تھیں۔ بادل آسمان پر چھا چکے تھے اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ رات کے کھانے کے اتنے پیسے نہیں تھے کہ ہم کسی ہوٹل سے کھانا کھاتے۔ اسی لیے ہم نے آدھ درجن کیلے خرید کر اپنا ڈنر کیا۔ رات بس میں بے آرام گزری۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ سردی بس کے اندر ہمیں بے آرام کرتی اور سردی سے ہم اپنی سیٹوں پر سکڑے پڑے تھے۔

دریا خان تک سارا راستہ بارش ہوتی رہی۔ ہم سردی سے ٹھٹھر کر رہ گئے تھے۔ دریا خان پہنچے تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ دریا خان کا اڈا ویران پڑا تھا۔ ہمیں ڈیرہ کے لیے ایم رمضان کی کوئی بس نظر نہ آئی۔ بارش کی وجہ سے چاروں جانب کیچڑ تھا اور پانی کھڑا تھا۔ ہمارے بدن سرد ہو رہے تھے۔ سامنے کچھ کچے کمرے تھے اور ایک تندور تھا جو اب بجھ چکا تھا۔ تندورچی اپنے تندور کے پہلو میں پڑا سو رہا تھا۔ ہم دونوں اس کے پاس گئے اور اس نے ہمارا حال دیکھا تو اپنی جگہ چھوڑ کر ہمیں دے دی۔ تندور سے بجھے کوئلوں کی مہک اٹھ رہی تھی اس نے کچھ لکڑیاں تندور میں جھونکیں اور کچھ لمحوں میں لکڑیوں نے آگ پکڑی تو اس کی تپش سے ہمارے اکڑے بدن ڈھیلے پڑنے لگے۔ تندور والے نے ہم کو رات کی بچی روٹیاں گرم کر کے دیں، تو ہم ان پر پل پڑے۔ کچھ ہی دیر میں ہم وہیں زمین پر بچھی بوریوں پر سوتے تھے۔

آرام کرنے کے بعد اٹھے تو سورج نکل چکا تھا اور آسمان پر کہیں اِکا دُکا بادل... تیر رہے تھے اب ہم دونوں والدین کے غصے اور عتاب سے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ ہماری کیا درگت بنے گی، یہ سوچ ہمیں شرمندہ اور خوف زدہ کر رہی تھی۔ لاہور نامہ ختم ہو چکا تھا اور اب آگے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ پہلے جو ہم دونوں ہر بات پر تبصرہ کر رہے تھے اب خاموش تھے۔

اڈا اب ویران نہیں تھا۔ کچھ چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ہم اپنے بیگ کو گھسیٹتے ایم رمضان ٹرانسپورٹ کے دفتر پہنچے جو ایک ٹوٹی پھوٹی میز، ایک ہچکولے لیتی کرسی، میز پر رکھے بوسیدہ رجسٹر اور ایک ٹوٹی پینسل پر مشتمل تھا اور وہ کسی کچے کوٹھے کے برآمدے میں سجایا گیا تھا۔ ہچکولے لیتی کرسی پر ہچکولے لیتا اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا منیجر بیٹھا تھا۔ آس پاس کچھ مسافر اسے گھیرے کھڑے تھے۔ میں نے جب یہ پوچھا کہ اگلا ٹائم کب نکلے گا تو سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔

وہاں کہانی یہ تھی کہ کل رات کی بارش نے دریا خان سے ڈیرہ تک چودہ میل کچے کے علاقے کو دلدل بنا دیا تھا۔ ایم رمضان کی گاڑیاں تو کسی موٹر وے پر بھی دھکے سے چلتی ہوں گی اور یہاں تو کیچڑ کا سمندر تھا۔ یہ راستہ ایک دو دن کے لیے بند ہو چکا تھا، جب تک اس پر سورج پوری آب و تاب سے چمکے اور اس کا کیچڑ پھر سے مٹی میں بدلے، یہاں کوئی موٹر چلنے والی نہیں تھی۔

میں نے اپنے آپ سے فریاد کی کہ اب ڈیرہ ہم کیسے پہنچیں گے تو ایک نے کہا کہ یہاں سے میانوالی تک پکی سڑک ہے۔ پہلے وہاں جائیں اور وہاں سے براستہ چشمہ اور بلوٹ شریف ڈیرہ جایا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس تو ایم رمضان کی بس کے کرایے کے پیسے بھی بمشکل رہ گئے تھے۔

''اب کیا کریں؟'' میں نے یہ سوال فضل سے کیا تو فضل کو تو نکا کھڑا رہا مگر کہیں اور سے یہ جواب آیا۔ ''تو پھر پیدل چلے جائیں۔''

کہنے والے نے شاید مذاق میں یہ بات کہی ہو مگر وہ فقرے میرے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ ہم دونوں نے آپس میں پھر صلاح مشورہ کیا۔ کچھ دیر اور غور و غوض کیا چودہ میل کے راستے کو ناپا، اپنے بھری بھر کم بیگ کو تولا، اپنی خالی جیب کو ٹٹولا اور یہ سب جانچنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دلدل کو پیدل ہی عبور کیا جائے۔

ہمیں نہ تو کسی نے روکا اور نہ ٹوکا، نہ کسی نے کوئی نصیحت کی۔ ہم بغیر پانی اور کھانے کے صرف اپنی ہمت اور عزم پر روانہ ہوگئے۔

ہم چلے تو صبح چمک رہی تھی۔ ایک بندہ بیگ اٹھاتا اور کچھ دیر چلنے کے بعد دوسرا وہ بوجھ لے لیتا۔ ہم ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کا احساس تھا۔ ہم ایک دوسرے کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے درمیان دوستی کا ایک اٹوٹ انگ رشتہ تھا مگر یہ کتابی باتیں کچھ ہی دیر میں ہوا ہو گئیں۔ ابھی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے بس اڈا نظر آرہا تھا اور ہم اپنا بوجھ ایک دوسرے پر پھینکنے لگے۔ پندرہ بیس قدم چلتے اور پھر ہانپتے ہوئے بیٹھ جاتے۔ وہ بیگ پوری قوم کے گناہوں کے بوجھ کی طرح ہمارے ناتواں کندھوں پر تھا۔ وہ بیگ کبھی سر اور کبھی کاندھے اور کبھی زمین پر پڑا ملتا۔ ہم بے بیان ریگستان کے ایسے مسافر تھے جو اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے چل رہے تھے۔ پیاس لگتی تو کسی کھڈے میں بارش کا پانی اکٹھا ہوا ملتا تو پی لیتے۔ زبانیں ہماری باہر نکل آئی تھیں اور آنکھوں کی پتلیاں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ٹانگیں کسی سوکھی ٹہنی کی طرح زمین پر قدم رکھتے ہی لرزنے لگتی تھیں۔ ایک لمبا سفر ہمیں درپیش تھا۔

ہم اسی کچی سڑک کے روٹ پر چلتے تھے، جہاں سے ایم رمضان کے اڑن کھٹولے گزرتے تھے۔ ایک جگہ ہم نے کچھ سوچ کر فیصلہ کیا کہ شارٹ کٹ لگاتے ہیں۔ بس تو وہیں سے چلتی ہے جہاں کچی سڑک ہے۔ ہم نے سوچا کہ ہم ریت کے ٹاپوؤں پر شارٹ کٹ مار کر اس راستے کو آگے ہی سے پکڑ لیں گے۔ اور پھر ہم ریت پر سفر کرنے لگے، جہاں ہمارا ہر قدم ریت میں ایک ایک فٹ دھنس جاتا تھا۔ کچا راستہ یا اس کا کوئی نشان ہمیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہم بے نشان بھٹکتے تھے۔ کوئی ایک دو گھنٹے بعد ہم نے اس راستے کو جا لیا مگر ہم نے شارٹ کٹ لگانے سے تو مکمل تو پ کر لی مگر یہ خوشی تھی کہ ایک بڑا راستہ ہم نے طے کرلیا ہے مگر جب غور کیا تو ہم تو وہیں کھڑے تھے جہاں سے ہم نے شارٹ کٹ شروع کرنے کی ابتدا کی تھی۔

ہم ایک درد اور اذیت سے ریت پر گر گئے۔ ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھتے تھے تاکہ ہمارے آنسو دوسرا نہ دیکھ لے۔ دور دور تک ویرانگی تیر رہی تھی، جو ہمارے دلوں سے نکل کر فضا میں بلند ہو رہی تھی۔

ایک دکھ تھا کہ کوئی درد تھا جس میں ہم گھر چکے تھے اور ان کی ٹیسیں بدن سے نکل رہی تھیں۔ ایک کراہ بھی اور الم تھا۔ وہ بیگ ایک ناسور بن گیا تھا۔ میں اسے پھینک بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ میرا عشق اس میں تھا۔

لاکھوں لمحے گزر گئے اور ہم چلتے رہے ہر چند قدم بعد بے سدھ ہو کر نرم ریت پر خاموش لیٹ جاتے۔ آسمان تلے پرواز کرتے پرندوں کو میں حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ کس آزادی اور بے فکری سے فضا میں تیر رہے ہیں۔

بھوک سے برا حال تھا۔ ہم نے چند روٹی کے ٹکڑے دریا خان کے تندور پر کھائے تھے۔ رات بھی کچھ کیلے کھا کر اپنا پیٹ بھرا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میں یہاں کیوں ہوں اور میں نے اپنے جگری دوست فضل کو کیوں اس عذاب میں جھونکا ہے۔ مختلف دیسوں میں گھومنے کا شوق بہت ہی اچھا سہی مگر اتنا بھی نہیں کہ آپ کسی بے آب و گیاہ ریگستان میں بے حس و حرکت پڑے ہوں اور گدھ آپ پر منڈلا رہے ہوں۔

شام اترنے کے آثار نظر آرہے تھے۔ سورج دھیما پڑتا جا رہا تھا۔ دور دور تک کوئی بندہ بشر نہ تھا کہ اتنے میں بہت دور میں نے فضا میں بلند ہوتا دھواں دیکھا۔ ہمارے مرجھائے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ہم اپنے وزنی قدموں کو گھسیٹتے اس دھوئیں کی جانب بڑھنے لگے۔

وہ کوئی خانہ بدوش تھے۔ چند جھونپڑے تھے۔ شام کی اترتی سیاہی میں ایک عورت توے پر روٹیاں بنا رہی تھی۔ کچھ بچے جھونپڑوں کے ارد گرد صرف قمیصیں پہنے کھیل رہے تھے۔ ایک دو مرد بان بن رہے تھے۔ ہمارے کپڑوں اور بالوں میں خاک اڑ رہی تھی، آنکھیں ویران تھیں اور حالتِ زار فقیروں سے بھی بدتر۔

اس روٹیاں بناتی مائی نے ہمیں دیکھا تو ایک ماں کی ممتا میں نے اس کی آنکھوں میں اترتی دیکھی۔ بچے ہمیں دیکھ کر اپنی چوکڑیاں بھرنا بھول گئے۔ وہ مرد اپنا کام چھوڑ کر بھاگے

ہمارے پاس چلے آئے۔ ہم کو بٹھایا گیا۔ کسی نے پانی سے بھرے کٹورے ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دیے۔ ہم نے وہ آبِ حیات پیا تو ہماری آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ گندم کی مہک چہار جانب پھیلی تھی۔ گرم گرم روٹیاں توے پر سے اتر رہی تھیں۔ اس عورت نے ایک ایک گرم روٹی ہمارے پھیلے ہاتھوں پر رکھ دی۔

میں تیس سال بعد یہ واقعہ لکھ رہا ہوں اور میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ میں اللہ کو حاضر جان کر قسمیہ یہ کہتا ہوں کہ جو ذائقہ اس روٹی میں تھا، وہ مجھے بعد میں کبھی نصیب نہیں ہوا۔ جو راحت اور اطمینان اس روٹی میں تھا وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ میں نے بڑے سے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھایا۔ اپنے گھر میں انواع واقسام کے کھانے کھائے، بڑی بڑی دعوتوں میں گیا مگر اس روٹی کا ذائقہ اب بھی میرے دل ودماغ پر ہے۔ میں وہ ماحول نہیں بھول سکتا جب بھوک سے نڈھال میں اس روٹی کے لقمے لیتا تھا اور چولہے کا دھواں نیلے آسمان کی وسعتوں میں اٹھتا اور تحلیل ہو جاتا تھا۔ شام اتر رہی تھی اور شمال سے سرد ہوا کے بوسے میرے بدن کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔

ان خانہ بدوشوں نے بتایا کہ کشتیوں کا پل زیادہ دور نہیں ہے اور آپ لوگ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پل پر پہنچ جائیں گے پل کے پار ڈیرہ کا شہر تھا۔ اب ہم زیادہ ہمت لے کر چل رہے تھے۔ شام اتر چکی تھی اور ہم پل کراس کر کے اس سائیکل رکشے کی جانب بڑھے جس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہمارے پاؤں سوج چکے تھے۔ بدن کپکپا رہا تھا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو میری ماں کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ گھر میں موت جیسی خاموشی تھی۔ والد صاحب غصے سے مجھے مارنے کے لیے اٹھے مگر میری حالت دیکھ کر وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ماں نے اپنی چادر سے مجھے لپیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں بخار میں کئی دن تپتا رہا تھا۔ رات کو میرے والد صاحب میری ماں سے یہ کہہ رہے تھے کہ تمہارے بیٹے کے پاؤں میں چکر ہے اور یہ لوفر نکلے گا اور یہی ہوا اور اسی پاؤں کے چکر نے مجھے ملکوں ملکوں گھمایا ہے۔ نئے نئے جہاں دکھلائے ہیں اور ابھی تک یہ من پیاسا ہے۔ (فضل کچھ سال پہلے اپنے اسی تختے پر کباب لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی روح پرواز کر گئی جیسے اس شام جھونپڑی کے باہر چولہے کا دھواں آسمان میں تحلیل ہو رہا تھا۔ میں اب جب بھی پاکستان جاتا ہوں تو اس کی قبر پر پھول چڑھاتا ہوں۔ اس کی قبر میرے والدین کی قبروں کے پہلو میں ہے۔ اس کی مرمت اور خیال رکھنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔)

سنانے جا رہا ہوں شمشال سے ٹورنٹو تک پھیلی سفر کہانی مگر بچپن کا یہ ذکر اس لیے بیچ میں آ گیا کہ کس طرح جہاں گردی میرا شوق اور ولولہ رہا ہے۔

اس کے بعد زندگی ماہ وسال عمومی رفتار سے گزرتے رہے اور یورپ، امریکا یا کینیڈا جانے کا شوق بھی ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ اپنی تعلیم مکمل کی۔ کراچی میں کئی سال رہا، پھر حیدر آباد میں جاب کی۔ پھر کسی اور یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری لی اور یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گیا۔

میرے چچا کا لڑکا طارق چند سال پہلے امریکا چلا گیا تھا۔ وہ جب یہاں آیا تو میں اس سے امریکا کی معلومات لینے لگا کہ کیسا ملک ہے؟ لوگ کیسے ہیں اور کیسے رہتے ہیں؟ موسم کیسے ہیں اور زندگی کیسے گزرتی ہے؟ یہ ضروری نہیں کہ کوئی امریکا یا یورپ میں رہا ہو اور وہ دنیا کو ایسے دیکھے جیسے میں دیکھتا ہوں یہ تو میری دیوانگی اور خبط تھا کہ کسی طرح میں امریکا پہنچ جاؤں اور پھر وہ دنیا دیکھوں جو نت نئے رنگ لیے میرا انتظار کر رہی ہے۔ ایک بار میں نے امریکا اور کینیڈا کے سیاحتی ویزے کے لیے درخواست دی جو ایک لمحے میں ٹھکرا دی گئی۔ جس دن میرا ویزا مسترد ہوا، وہ دن مجھ پر بہت بھاری گزرا تھا۔ ایک عام تاثر یہ رہا ہے کہ کسی کا ویزا ایک بار مسترد ہو گیا، وہ کبھی اس ملک کی سرحد پار نہیں کر سکتا۔ میں اسی غم میں کئی میل چل کر امریکی ایمبیسی سے پیدل گھر آیا تھا۔ غم سے دل گرفتہ تھا۔ کئی گھنٹے پیدل چل کر گھر پہنچا تو احساس تک نہ ہوا کہ کس ذہنی حالت میں کتنا دور چلتا آ رہا ہوں۔ میں نے ایک ذہن بنایا ہوا تھا کہ کس طرح سیاحتی ویزے پر امریکا میں داخل ہو کر اپنے کاغذات بنوا لوں گا مگر ویزا نہ ملنے پر سخت مایوس تھا۔ دنیا پھیکی پھیکی اور آزردہ نظر آ رہی تھی مگر میرے مالک کی ذات میرے لیے کچھ اور سوچ رہی تھی۔ غیر قانونی طور پر جانے کے بجائے میرے لیے قانونی اور باعزت راستہ تیار کر رہی تھی مگر مجھے ابھی کچھ انتظار کرنا تھا اور ان دنوں میں اپنے طور پر امریکا اور یورپ سے دستبردار ہو چکا تھا۔

اس لیے شادی کی اور اگلے سال اللہ نے مجھے ایک پیاری سی بیٹی قندیل دے دی۔ قندیل کی پیدائش سے پہلے، سردیوں کی ایک رات تھی۔ میں سویا ہوا تھا۔ میں نے کسی کی آواز سنی جیسے مجھ سے کوئی مخاطب ہو۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری بیٹی ہو گی اور اس کا نام قندیل رکھنا۔ میں ہڑبڑا کر

اٹھ بیٹھا۔ جیسے اٹھا تو سامنے والی مسجد سے صبح کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ میرے اس طرح اٹھنے پر میری بیوی اٹھ بیٹھی۔ میری حالت دیکھ کر کہا ''کیا بات ہے کیا ہوا ہے؟''

کچھ دیر میں سکتے میں بیٹھا رہا پھر میں نے اسے پورا واقعہ بتایا۔ میرا جسم پسینے پسینے تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرے ہاں پہلا بچہ بیٹی ہی ہوگی اور مجھے اس کا نام قندیل رکھنا ہے۔ کچھ عرصے بعد میں اسپتال کے باہر انتظار کر رہا تھا اور کسی نے قندیل کو لا کر میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس وقت میرے اندر خوشی کا جو جوار بھاٹا اٹھا تھا وہ بیان سے باہر ہے مگر بیٹی کی محبت مجھے زیادہ دیر باندھ نہ سکی۔ تین چار مہینے بعد میں ....کینیڈا کی امیگریشن کے لیے اسلام آباد جا پہنچا اور درخواست دے دی۔

درخواست دے کر میں بھول گیا اور اپنی معاشی زندگی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے لگا، اسی دوران میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر فارمیسی بنائی اور اپنے آپ کو ایک چکر میں ڈال لیا۔ دن میں ایک آدھ لیکچر یونیورسٹی میں ہوتا اور ایک بجے گھر واپس آکر، تین بجے فارمیسی چلا جاتا اور رات دس بجے گھر پہنچتا، اپنے لیے ٹائم ختم ہو گیا تھا مگر میں اس معمول سے جلد اکتا گیا۔ اب میری زندگی کی دلکشی اور کشش دو چیزوں میں رہ گئی تھی ایک کینیڈا جانے کی آس اور دوسرا شمشال کا سفر۔

زندگی اپنی روانی میں گزرتی رہی۔ معلومات کے اتنے ذرائع ابھی ایجاد نہ ہوئے تھے۔ ابھی انٹرنیٹ پاکستان میں نہیں آیا تھا۔ کمپیوٹر آنا شروع ہوا تھا مگر وہاں نہیں تھا۔ زندگی ایک دھیمے پن سے ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک مستنصر حسین تارڑ صاحب کا سفرنامہ ''نانگا پربت'' پڑھا اور مجھے ان پہاڑوں سے عشق ہوتا چلا گیا۔ عشق ہونا اور بات ہے خواب کو تعبیر دینا اور ہے لیکن عشق سچا ہو تو......! جی ہاں میرا عشق سچا تھا۔ ایک سال بعد تعبیر ملی جس کا احوال آپ نے بھی پڑھا مگر نانگا پربت سے ہو کر آیا تو میں شدید بیمار پڑ گیا۔ دو تین ماہ میں میرا وزن بہت کم ہو گیا اور ہڈیاں نمایاں ہو گئیں چہرے کا رنگ اتر گیا مگر پہاڑوں سے میرا عشق نہ اترا۔

عشق نے ایک نئی راہ ڈھونڈی اور میں نے یونیورسٹی میں ایک مہم جوئی کا کلب بنا لیا اور اپنے اسٹوڈنٹس کے ہمراہ ایک دو ٹریک بھی کیے۔ اسی دوران میں مستنصر حسین تارڑ سے ملا۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ اگلے سال شمشال چلتے ہیں۔ یہی بتایا گیا کہ شمشال ہنزہ سے آگے خنجراب کے راستے پر دو دن کی پیدل مسافت پر ایک دور افتادہ وادی ہے۔

1999ء کا مارچ کا مہینا تھا جب میں اپنے شمشال ٹریک کے لیے تیاری کر رہا تھا کہ مجھے کینیڈا ایمبیسی سے ایک خط موصول ہوا جس میں مجھے امیگریشن کے لیے انٹرویو پر بلایا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا تھا کہ انٹرویو تو ایک رسم ہے ورنہ وہ تو آپ کو کینیڈا بھیجنے سے پہلے ملنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنے ذہن میں اپنے اگلے سفروں کا یہ خاکہ بنایا کہ گرمیوں میں شمشال اور پھر جیسے ہی امیگریشن کے کاغذات ملیں گے۔ ایک نئی دنیا دیکھنے کے لیے ٹورنٹو اڑ جاؤں گا۔

سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو فارمیسی سے دور کیا تاکہ وقت کی بچت ہو سکے۔ میرے انداز و اطوار سے میرا دوست یہ جان چکا تھا کہ اب میں ہاتھ سے نکل چکا ہوں۔ ڈھائی سال کا معمول ٹوٹ چکا ہے۔ میں اب کوئی ہلکی سی اداسی پہلو میں لیے، خوشی سے آنے والے ان دنوں کا انتظار کر رہا ہوں کہ میں نے شمشال جانا ہے اور پھر پاکستان کو خیر آباد کہہ کر کینیڈا چلے جانا ہے۔

اداسی یہ تھی کہ اپنا ملک، شہر، بستی، محلّہ، دوست، رشتہ دار اور فیملی کو چھوڑ کر کینیڈا جا رہا ہوں۔ ان کو کب بلاتا ہوں، یہ ابھی معلوم نہ تھا۔ سوچا تھا کہ کینیڈا جا کر کوئی جاب ڈھونڈوں گا اور جب کچھ پیسے بنانے لگوں گا تو پھر بچوں کو اسپانسر کروں گا۔ اسی دوران ایک دن شاہ جی کا فون آ گیا۔ انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ''سنا ہے تم کینیڈا جا رہے ہو۔''

''ارادہ ہے۔''

''وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے کینیڈا سے اچھے پہاڑ جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوتی ہیں کینیڈا سے اچھے جنگل جہاں کے پیڑ جب ہلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی گیت گا رہا ہو......اور تو اور کینیڈا سے اچھے تو ہمارے شہر ہیں پھر وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''جانا ضروری ہے۔''

''اچھا سمجھا......وہاں کے مناظر کو کیمرے میں بند کرنا ہے۔ یہ تو نری بے وقوفی ہے۔ کراچی یا لاہور چلے جاؤ وہاں فوٹو والے میگزین بہت مل جائیں گے۔ ان میں وہاں کے مناظر دیکھ لو خوش ہو جاؤ۔''

''میں وہاں نوکری کی تلاش میں جا رہا ہوں۔''

''کیا ضرورت ہے اپنے ڈیرا میں بھی بہت نوکری ہے۔ کالج میں کر ہی رہے ہو، ہماری دکان کے سامنے شام میں چائے کا ہوٹل کھول لو۔''

اس بات پر میں حیران رہ گیا کہ میں روؤں یا ہنسوں۔

قہقہہ لگاؤں یا سر پیٹوں۔ مگر کچھ بول نہ سکا اور صرف اتنا کہا۔ ”وہاں کے کالج سے بلاوا ہے۔“
”وہاں تو سب انگریز ہیں ان کو کیسے پڑھاؤ گے؟“
”انہوں نے ہمیں دو سو سال تک مکر و فریب جھوٹ بے حیائی کا سب پڑھایا۔ اب میں انہیں حق کی تعلیم دوں گا، ایمان کا درس دوں گا۔“ اتنا سنتے ہی انہوں نے نعرہ لگایا۔ ”مارا وے۔“
اس دن کے بعد ہر دو تین روز کے بعد شاہ جی کا فون آجاتا کہ ثواب کمانے کب تک انگریزوں کے ملک جا رہے ہو۔ اور میں کہتا۔ ”بس کچھ دن کی بات ہے۔“
بس ایک انتظار سا انتظار تھا۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا اور ایمبیسی سے کال نہیں آرہی تھی۔ اسی درمیان میرے گھر دوسری رحمت بھی آگئی۔ جس کا نام اریبہ رکھا۔
اس کی پیدائش کے تیسرے روز مجھے کینیڈا ایمبیسی جانا پڑا میرے امیگریشن کا انٹرویو تھا۔ ایک گورا میز کی دوسری جانب بیٹھا مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تم کینیڈا کیوں جانا چاہتے ہو؟ میں نے اس سے کہا کہ میں نے اب دنیا دیکھنی ہے۔ میرے جواب پر وہ حیران رہ گیا اور اس نے دو منٹ میں مجھے بھگتا دیا جب مجھے باہر چھوڑنے آیا تو کہہ رہا تھا کہ ایک ہفتے میں میڈیکل کے کاغذات تم کو مل جائیں گے۔ کیونکہ تم نے جھوٹ نہیں بولا۔ ایسے سچے آدمی کو میں روک نہیں سکتا۔
میرے شمشال جانے کے دن بھی قریب آرہے تھے اور مجھے میڈیکل کے کاغذات کا بھی انتظار تھا۔ میڈیکل ساری فیملی کا کروانا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ جیسے ہی میڈیکل کے کاغذات ملتے ہیں تو میں فیملی کو پشاور لے جا کر ان کے ڈاکٹر سے میڈیکل کروا کر سیدھا پنڈی آجاؤں گا۔ پھر وہاں سے فلائٹ لے کر گلگت پہنچ جاؤں گا۔ تارڑ صاحب اور باقی ٹیم بھی انہی دنوں میں گلگت پہنچ جائے گی لیکن یہ کاغذات کہیں راستے ہی میں کھو گئے۔ میں ایمبیسی فون کرتا تو وہ کہتے کہ ہم نے دو ہفتے پہلے میل کر دیے ہیں اور ادھر انتظار تڑپ گھیرے ہوئے تھی مگر ڈاک سے کاغذات نہ آنا تھے اور نہ آئے۔
گلگت کی فلائٹ سے دو دن پہلے میں اسلام آباد جا پہنچا۔ ایمبیسی والوں سے ملا تو انہوں نے کہا کہ تم ٹریک پر جاؤ۔ واپسی پر گھر فون کر کے معلوم کر لینا اگر کاغذات نہ ملیں تو ہم نئے بنا دیں گے جو تم واپسی پر ہم سے لے لینا۔
اس جانب سے میں بے فکر ہو گیا تھا۔ مجھے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ میں بہت جلد کینیڈا کے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ

یقین ایسے ہی تھا کہ جیسے میرے ہاتھ میں امیگریشن کا ویزا آ گیا ہو۔ اب میں کچھ بھی سوچتا، کوئی بھی سفر کرتا تو اس ذہنی حالت میں کرتا کہ یہاں سے میرا دانا پانی اٹھ کر کہیں اور منتقل ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میں بے یقینی اور یقین کے بیچ میں رہا تھا کہ میں باہر جاؤں گا یا نہیں مگر اب میں یقین کے آس پاس تھا شاداماں گھومتا اور سوچتا تھا۔

مسعود تھوڑا عرصہ پہلے اپنی ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ میرا وہ سابقہ اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں میری مہم جوئی کے گروپ کا ممبر بھی تھا۔ اسلام آباد کے پوش علاقے E-7 میں اپنے باپ کے دو کنال کے خوب صورت گھر میں رہتا تھا۔ ان دنوں اپنے مستقبل کے بارے میں غور و خوض کر رہا تھا۔ میں اسی کے پاس ٹھہرا تھا وہی مجھے ہر جگہ لے جاتا تھا۔ کبھی گلگت کی ٹکٹ کے لیے پی آئی اے کے دفتر اور کبھی کینیڈا ہائی کمیشن۔ پی آئی اے کے انیس صاحب نے گلگت کے لیے میرا ٹکٹ کنفرم کر دیا تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ میری خوشی کو دوچند کرنے کے لیے مسعود نے اپنی گاڑی کو شکر پڑیاں کی جانب موڑ دیا وہ مجھے کنول جھیل دکھلانے جا رہا تھا۔ جون کی تپش سے پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہم نے گاڑی سڑک کنارے روکی اور کنول جھیل کے لیے پیدل چل کر درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے پھر جھیل تک پہنچے۔ اس کا پانی سوکھ چکا تھا اور وہ ایک آسیبی گرفت میں گھری نظر آ رہی تھی۔ گرمیوں کی تپتی دوپہر میں وہاں ویرانگی کا راج تھا۔ جیسے ہم جھیل پر نہیں، کسی کی فاتحہ پڑھنے آئے ہوں۔ میں دراصل ملک چھوڑنے سے پہلے وطن عزیز کے وہ تمام مقامات دیکھنا چاہتا تھا جن کی یاد میرے ساتھ پردیس میں ہمیشہ رہتی۔

شکر پڑیاں سے اسلام آباد کا نظارہ ہمیشہ دلکش دکھلائی دیا ہے۔ شکر پڑیاں پر اپنے وقت کے حکمرانوں کے ہاتھوں لگے پودے، اکثر درخت بن چکے تھے۔ میں نام پڑھتا گیا جن میں سے کئی ایک اسی وقت تک قتل ہو چکے تھے اور باقی بعد میں ہوئے۔ شاہ فیصل سے لے کر قذافی تک ایک لمبی فہرست بنی تھی۔ وہ سب ایک ایک کر کے مارے گئے۔

شکر پڑیاں کو میں نے پہلی بار اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ میری یادیں جڑی ہیں۔ بھٹو نے اپنے دور میں بوائے اسکاؤٹس کی ایک بہت بڑی بین الاقوامی جمبوری اسلام آباد میں منعقد کروائی تھی۔ ان دنوں میں ساتویں کلاس میں تھا۔ جمبوری میں سارے ملک بھر کے اسکاؤٹ کے علاوہ ایران، انڈونیشیا سمیت بہت سے ممالک سے اسکاؤٹس آئے تھے۔ اسلام آباد میں خیموں کا شہر بسا تھا۔ نومبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ میں پورے گروپ میں سب سے چھوٹا تھا۔ ہم پہلے پشاور گئے تھے۔ ڈیرہ سے پشاور جاتے ہوئے خشک پہاڑ پڑتے ہیں۔ پہاڑ دیکھنے کا شوق اتنا تھا کہ مجھے بس کی سیٹ پر کھڑا کر دیا جاتا کہ میں آسانی سے پہاڑ دیکھ سکوں۔ پھر اسلام آباد میں آئے جو ایک نیا نکور شہر تھا۔ ان دنوں میلوڈی اور آب پارہ کا علاقہ بنا تھا۔ باقی سارا جنگل تھا۔ میلوڈی میں ہم نے اداکار رنگیلے کی فلم ایماندار دیکھی تھی۔ ہم گھومنے راجا بازار جاتے تھے۔ زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ بازار سے ڈرائی فروٹ لیا تھا۔ ساتھ نشاط سینما تھا جہاں ہم نے مشہور فلم بنارسی ٹھگ دیکھی تھی۔ ان ہی دنوں ہم شکر پڑیاں گئے تھے جو ایک انتہائی خوب صورت مقام تھا۔ وہاں سے اسلام آباد ایک جنگل کی صورت نظر آتا تھا۔ قائداعظم یونیورسٹی بن رہی تھی۔ ان دنوں بھی حیرت سے ہر چیز دیکھتا تھا اور آج بھی شوق سے دیکھتا ہوں۔

شکر پڑیاں میں ہم بیٹھے اور مسعود اپنے مستقبل کے منصوبے بتا رہا تھا۔ وہ ہر نوجوان کی طرح ملک سے باہر جانا چاہتا تھا۔ ہم ایسی ہی باتیں کرتے فیصل مسجد کے عقب میں بنے سبزہ زاروں میں جا لیٹے اور آسمانی بلندیوں کو چھوتے مسجد کے مینار دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی مرگلہ کے پہاڑوں کا جاذبِ نظر حسن دیکھتے۔ اگلے دن میری گلگت کی فلائٹ تھی۔ تارڑ صاحب ایک دو دن پہلے گلگت پہنچ چکے تھے۔ مجھے کل وہاں پہنچ کر ان سے رابطہ کرنا تھا۔ وہاں کوئی سیاحتی کانفرنس تھی جس میں نامور لوگ شریک ہو رہے تھے۔ میرے لیے وہ کانفرنس دنیا کی بور ترین اور اکتا دینے والی جگہ تھی۔ سب لکھی ہوئی باتیں سنا کر ایک دوسرے پر رعب ڈالتے ہیں۔ میرے خیال سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

صبح چھ بجے فلائٹ تھی اور میں چار بجے اٹھ بیٹھا۔ مسعود اپنی موٹی عینک اتارے بغیر سو رہا تھا۔ وہ نیند میں خراٹے نہیں لیتا تھا بلکہ باقاعدہ غراتا تھا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی، وہ بمشکل اٹھا اور ناشتے کا پوچھا۔ میں نے کہا کہ تارڑ صاحب نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے کہ پی آئی اے والے جہاز میں ناشتا دیتے ہیں، تم یہ زحمت مت کرو۔ اسلام آباد کی صبح دھلی ہوئی اور رنگین تھی۔ بڑے افسروں کا علاقہ تھا اور بہت سے بڑے افسر صبح کی سیر کرتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور میں خاموش تھا۔ میں کسی نامعلوم منزل کی جانب سفر کرنے والا تھا۔

میرے ذہن میں کئی چیزیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھے واپسی پر اپنا اور پوری فیملی کا میڈیکل ٹیسٹ کروانا تھا۔ شنید تھی کہ میڈیکل کے ایک دو ماہ بعد امیگریشن کے تمام کاغذات مل جائیں گے اور جب میری امیگریشن ہو جائے گی تو آگے میں نے کیا کرنا ہے۔ یہی سوچتا تھا کیونکہ ایک بسا بسایا گھر ہے، باعزت نوکری ہے، بچے اور بیوی ہے۔ یہ سب چھوڑ کر ایک انجانی دنیا میں قدم رکھنا تھا۔ مجھے ابھی تو مسائل کا علم بھی نہ تھا۔ بس ایک رنگین دنیا سامنے بانہیں پھیلائے منتظر تھی۔ جہاں زندگی ایک پُرسکون انداز سے چل رہی ہے، کسی میدانی دریا کی لہروں کی طرح پُرسکون۔ ان لہروں میں اپنی ذات کی کشتی کو ڈال کر خمار میں مجھے بہتے جانا تھا۔ آگے کہیں اپنے بچوں کو بلا کر اسی کشتی میں سوار کرا دینا تھا۔ پھر ایک پیارا سا بنگلا ہوتا اور کوئی چمچماتی گاڑی، جس میں ہمیں گھومنا تھا اور بے فکر ہو کر دنیا اور اس کے نظارے دیکھنے تھے۔

مجھے یہی کہا گیا تھا کہ کم سے کم اُجرت میں بھی آپ اتنے پیسے بنالیں گے کہ اپنا خرچ نکال کر آدھے سے زیادہ بچا سکیں گے۔ روزانہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں ہوتا۔ مجھے اسی کی خوشی تھی کہ کم از کم میری اس عذاب سے جان چھوٹے گی جو میں اب بھگت رہا ہوں۔ روزانہ پندرہ گھنٹے گھر سے باہر رہ کر مٹی دھول چاٹتا ہوں۔ وہاں آٹھ گھنٹوں کے بعد سارا وقت میرا ہوگا۔ میں کتابیں پڑھوں گا، سفرنامے لکھوں گا اور فلمیں دیکھوں گا۔

میرا سفر تو اب شمشال کا تھا مگر میں دو منزلوں کا راہی بن چکا تھا۔ شمشال کے ساتھ رنگین کینیڈا...... جہاں ایک پُر لطف اور خوشحال زندگی میرا انتظار کر رہی تھی۔

مسعود نے مجھے اسلام آباد ایئر پورٹ ڈراپ کیا۔ واپسی کا پوچھا اور میں نے کہا کہ فون کر کے بتادوں گا کہ کب واپسی ہے۔ وہ واپس چلا گیا اور میرا رخ قراقرم کے پہاڑوں کی جانب مڑ گیا۔

میں بورڈنگ کارڈ لے کر لاؤنج میں آیا تو مفتی صاحب اور کشور ناہید بھی شاید اسی کانفرنس میں گلگت جا رہی تھیں، جس میں تارڑ صاحب کو بھی جانا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ گلگت پہنچ چکے ہیں یا ابھی لاہور میں ہی ہیں۔

ایک بس سب مسافروں کو طیارے کے پاس چھوڑ آئی۔ مجھے سب سے پیچھے دائیں ہاتھ، کھڑکی کے ساتھ والی نشست ملی۔ میرے ساتھ گلگت کے محمد علی صاحب بیٹھے تھے۔ اتنے میں طیارے میں تارڑ صاحب اور رحمت نبی داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ کوئی سعید چودھری صاحب تھے، جنہیں ہمارے ساتھ شمشال جانا تھا۔ وہ مرنجاں مرنج قسم کے انتہائی شریف انسان دکھتے تھے اور میرے حساب سے وہ ٹی وی اسکرین پر بھی قراقرم کی دہشت کو دیکھنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ تارڑ صاحب کی نظر انتخاب ان پر کیسے ٹھہر گئی۔ رحمت نبی سے فیری میڈو میں دو سال پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ ہمارا ایک اور ساتھی بقا شیخ بھی ملتان سے گلگت پہنچ رہا تھا۔ بقا کئی بار تارڑ صاحب کے ساتھ مختلف ٹریکس پر جا چکا تھا۔

تارڑ صاحب نے مجھے دیکھا تو ٹھٹک گئے۔ تارڑ صاحب اردو لکھنے اور پنجابی بولتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ بلکہ یوں کہہ دوں کہ وہ ہمیشہ پنجابی بولتے اور اردو لکھتے پائے گئے ہیں۔ تارڑ صاحب کو پورا پاکستان ان کے سفرناموں اور ٹی وی کے حوالے سے پہچانتا ہے۔ کسی ہمسفر کی نظر سے انہیں شائد کوئی نہیں جانتا۔ وہ خیال رکھنے والے ایک ہمدرد انسان ہیں۔ جب ہمارا شمشال کا پروگرام بن رہا تھا تو ان دنوں میں اکثر لاہور جاتا اور ان کی اسٹڈی میں بیٹھ کر باتیں ہوتا۔ ٹریکس کے بارے میں غور کیا جاتا۔ کتابوں سے بھری، چھوٹی سی اسٹڈی کے ایک کونے میں میز کرسی رکھی ہے۔ جس پر انہوں نے بیٹھ کر اپنی کئی لازوال تحریریں قلم بند کی ہیں۔ میں جب بھی جاتا تو ان سے کچھ کتابیں بھی لے آتا تھا۔

ایک دن ہم شمشال ٹریک پر بات کر رہے تھے کہ انہوں نے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ ”ندیم! میرے ساتھ سفر کرنا آسان نہیں ہے۔ میں سخت ڈکٹیٹر قسم کا انسان ہوں۔“

میں مصلحت میں اور احترام میں خاموش رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں خود پر کسی ڈکٹیٹر کا وجود برداشت نہیں کرتا مگر تارڑ صاحب کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ میری اپنی خواہش تھی اور میں نے سوچا کہ ایڈجسٹ کرلیں گے۔ سفر میں، ہم سفروں کی انسانی کمزوریاں آپ کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ پورے سفر میں تارڑ صاحب کو مجھ سے شکایت رہی تھی، ورنہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہ رہی۔ وہ سفر میں اپنے ساتھیوں کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں۔ ایک ذمہ داری کا احساس ان میں ہوتا ہے۔ پورٹرز کے ساتھ تو وہ بہت نرم دل ہوتے ہیں۔ ان کی ضرورتوں کا ادراک رکھتے تھے۔ واپسی پر بہت سا سامان ان میں بانٹ دیتے ہیں۔ مجھے تو ویسے ہی کینیڈا آنا تھا، اس لیے میرا سارا سامان سوائے خیمے کے، میرے پورٹروں کے پاس پہنچ

گیا تھا۔

جیسے ہی مجھے جہاز میں بیٹھے دیکھا تو وہ میری سیٹ کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ سعید صاحب فوراً بولے۔ ''لاہور سے تارڑ صاحب کو آپ کی فکر تھی کہ ندیم گلگت کیسے پہنچے گا؟''

ہم ایک دوسرے کو جہاز میں دیکھ کر مسرت کا اظہار کر رہے تھے کہ جہاز کے اڑنے کا اعلان ہو گیا۔ ہم سب اپنی سیٹوں سے چپٹ کر بیٹھ گئے۔

میری آنکھوں سے دور بین لگی تھی اور میں اپنے طیارے کا سایہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر پڑتا دیکھ رہا تھا۔ پچھلی بار میرے ہمراہ شاہ جی تھے اور اس بار میں کسی اور کے ہمراہ تھا۔ تارڑ صاحب، بقا شیخ، چودھری سعید اور میں۔ یہ ہماری ٹیم تھی۔ پھر بھی شاہ جی بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے۔

مجھے چودھری صاحب کی صحت اور ہمت پر شک تھا کہ وہ ان ہولناکیوں کو کیسے سہیں گے؟ میں تو دو سال پہلے یہ دشواریاں دیکھ چکا تھا، تارڑ صاحب اور بقا تو ویسے ہی اس دشت کے پرانے سیاح تھے۔

☆......☆

ہمارا طیارہ بشام کے اوپر تھا۔ سورج کی ابتدائی کرنیں بلند چوٹیوں کو سنہری کر رہی تھیں۔ دریائے سندھ ایک خاموش بہاؤ میں بہہ رہا تھا۔ شاہراہ ریشم کا سلیٹی فیتہ ہمالیہ سے لپٹا جاتا تھا۔ ان پہاڑوں کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے جو آپ کو ایک ہیجان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں ایک عام سا انسان تھا اور اب میں ایک خانہ بدوش بن چکا تھا۔ میں اس پُراسرار دنیا میں داخل ہو چکا تھا جس نے اب میرے سامنے بے نقاب ہونا تھا۔ جسم میں ایک سرسراہٹ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

ہم داسو کے اوپر سے گزرے تو برفانی چوٹیاں نظر آنا شروع ہوئیں۔ پہاڑ پہلے سرسبز تھے، پھر چٹیل ہوئے اور اب برفانی ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے جیسے ہی برفیں دیکھیں تو ساتھ بیٹھے محمد علی صاحب، جو اونگھ رہے تھے، اُن کا کندھا ہلایا۔ ''یہ نانگا پربت ہے؟''

انہوں نے اپنی ایک آنکھ کھولی، کھڑکی سے باہر جھانکا اور اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ اونگھنے لگے۔ میں تو خوشی سے کھل اٹھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں نانگا پربت کے اوپر سے گزر کر اس کا نظارہ نہ کروں۔ طیارہ آگے بڑھتا رہا اور برفیں وسیع سے وسیع ہوتی چلی گئیں۔ پہاڑ بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔

ایک دم بکسن کے محل کے ستونوں سے ہزار گنا زیادہ ہیبت ناک برفانی شہر میرے سامنے آیا۔ تاحد نگاہ برفوں کا راج اور گہری خاموشی اور تنہائی تھی۔ برفانی وادیوں سے برفانی ہی دیواریں ہزاروں فٹ تک اٹھا دی گئی تھیں۔ اوپر چوٹیاں سرخ اور سنہری ہو رہی تھیں۔ وہاں سے ایک ٹھنڈ مجھ تک پہنچتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک قبر کی خاموشی اور ٹھنڈ کا احساس تھا جو دہلا رہا تھا۔ وہ ایک شاندار منظر تھا، جو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ برف بہت نیچے تھی اور میں اپنی سیٹ پر سن بیٹھا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا ابھی وجود میں آئی ہے یا میں اس دنیا میں ابھی ابھی اتارا گیا ہوں۔ ایک نیا نکور جہاں ہے جو مجھے کسی نامعلوم کامیابی کے بدلے ایک تحفے کے طور پر ملا ہے۔

اتنے میں طیارے کے کپتان کی آواز اسپیکر سے نکلی۔ ''معزز خواتین و حضرات! ہم دنیا کی گیارہویں اور پاکستان کی دوسری بلند ترین چوٹی نانگا پربت کے اوپر سے گزر رہے ہیں جس کی بلندی آٹھ ہزار چھ سو فٹ سے زائد ہے۔''

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ کپتان کہہ رہا ہے۔ ''معزز خواتین و حضرات! ہم کہیں اور جا رہے تھے لیکن کسی گم شدہ جنت میں آ نکلے ہیں، آپ کو یہ تحفہ ہم نے نہیں قدرت نے دیا ہے۔ آپ بس اس کو دیکھتے رہیں کیونکہ یہ بس گم ہونے والی ہے۔'' میں نے کچھ ایسا ہی سنا اور پھر ایک سحر تھا جو اترتا چلا گیا اور برف کہیں پیچھے رہ گئی۔

اسی نانگا پربت کو دو سال پہلے میں نے شاہ جی، اشفاق اور شاہد کے ہمراہ دیکھا تھا۔ ایک بے مثال حسن تھا جو جادو کی طرح سر چڑھ کر بولا مگر اترا نہیں تھا۔ میں ہمالیہ اور قراقرم کا اسیر ہو چلا تھا۔ چند ماہ بعد میں اپنی زندگی کے ایک اہم موڑ سے گزرنے والا تھا۔ اس ملک کو خیر آباد کہہ کر کسی اور دیس جا بسنا تھا۔ جانے سے پہلے میں ایک سلامی ان دیوتاؤں کو دینا چاہتا تھا۔ مجھے کینیڈا جانے کے لیے بہت کام کرنے تھے اور میں نے یہی سوچا تھا کہ اپنے دیار غیر کے سفر کے بارے میں شمشال کے بعد سوچوں گا۔ اسی طرح میرے ذہن کے کسی گوشے میں، اس پورے سفر میں کینیڈا کا سفر اور تیاری چپکی رہی۔

کچھ دیر میں سرسبز وادیاں نظر آنے لگیں جو خشک اور بنجر سلیٹی پہاڑوں سے گھری تھیں۔ گندم کے خوشے تھے، باغات تھے اور کئی رنگوں کی بہار تھی، جس کی طرف میں بڑھتا جا رہا تھا۔ سیٹ بیلٹ کس لی گئیں۔ ناشتے کا نہ ایئر لائن والوں نے پوچھا اور نہ مجھے یاد رہا۔ طیارہ ایک پہاڑ کے دامن سے ذرا سا بچتا، گلگت کی تنگ وادی میں اترتا چلا گیا۔ میں اب بہت کچھ

پیچھے چھوڑ کر ایک نئے سفر کی تلاش میں آ نکلا تھا۔
میں اپنے رک سیک سمیت ایئرپورٹ کے باہر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتے سوچ رہا تھا کہ کس ہوٹل کا رخ کروں۔ پچھلی بار میں اور شاہ جی شیر باز کے لاہور ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ شیر باز اپنا سب کاروبار سمیٹ کر اسلام آباد جا بیٹھا تھا کہ کسی طرح انگلینڈ چلا جائے اور ساتھ میں ٹمبر کے پرمٹ بیچ رہا تھا۔
اتنے میں میرے کندھے پر کوئی ہاتھ آ پڑا۔ دیکھا تو تارڑ صاحب تھے۔ کہنے لگے۔ ''کانفرنس والوں کی جانب سے رویل ہوٹل میں قیام ہے اگر چاہو تو وہیں آجاؤ۔''
میں نے شکریہ کے ساتھ معذرت کر لی۔ مجھے کانفرنسوں، سیمینارز سے شدید بوریت ہوتی ہے اور وہ بھی جب آپ گلگت میں ہوں اور آپ کے دن رات ایک لگے بندھے ایجنڈے کے تحت گزریں۔ یہ ایک قید ہے۔ میں تو اپنی ذات کی قید میں بھی مشکل سے رہتا ہوں۔
تارڑ صاحب نے سامان اٹھایا اور ایک جانب چل پڑے اور میں ٹیکسی لے کر لاہور ہوٹل کی طرف چلا آیا مگر اب یہاں لاہور ہوٹل کا نہیں، بلکہ نیو گارڈن ہوٹل کا سائن بورڈ لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دو سال پہلے کے مناظر چلنے لگے۔ شاہ جی اور میں، یہیں فیری میڈو جانے سے پہلے ٹھہرے تھے۔ یہ ہمارا ایک گھر سا بن گیا تھا۔ کہیں بھی جاتے تو یہیں واپس آتے۔ وہی کمرے اور ساتھ والی کیمپنگ سائیڈ میں اسی درخت تلے وہی کرسیاں رکھی تھیں جہاں میں اور شاہ جی خوبانیاں کھاتے تھے اور اب اس ہوٹل کو شیر باز کا کزن سجاد چلا رہا تھا۔
سجاد پرتپاک انداز میں ملا۔ مجھے وہی کمرا ملا جس کی کھڑکی کیمپنگ میں کھلتی تھی۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا اسی دوران سجاد کمرے میں آگیا۔ چائے کا پوچھا تو میں نے کہا کہ ناشتا کیمپنگ میں لگوا دو۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔ گلگت کے ماحول سے پہاڑ نکال دیے جائیں تو باقی گلگت بھی نہیں بچتا۔ یہ پہاڑ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ تصویریں دیکھنے سے نہیں بلکہ ان کے درمیان رہنے سے دکھتے اور محسوس ہوتے ہیں۔ میں ناشتا کر رہا تھا اور برف پوش پہاڑوں سے ہوا بلا روک ٹوک نیچے اتر رہی تھی۔
اب کی بار میں بظاہر تنہا تھا مگر میرے اندر کوئی لہر بہے چلی جا رہی تھی۔ شمشال میں بہتی کوئی ندی میرے وجود میں بھی رواں تھی۔ کینیڈا میں گرتی نیاگرا فالز کا دھواں دھار وجود مجھے بھی بھگوئے چلا جا رہا تھا۔ میرا دھیان شمشال کے ساتھ کینیڈا کی حسین وادیوں کی جانب بھی تھا۔ مجھے مشکل یہ پیش تھی کہ میں ایک ساتھ دونوں مسافتوں کا مسافر تھا۔ میں بٹ کر رہ گیا تھا۔ یورپ اور نارتھ امریکا کا خواب میرا بہت پرانا تھا، جو پل کر اب جوان ہو گیا تھا۔ شمشال کا جنوں مجھے دو سال پہلے چڑھا تھا اور یہ بھوت اتارے بغیر میں کینیڈا نہیں جا سکتا تھا۔ میں ایک طرح سے یہ بھوت اتارنے شمشال جانا چاہتا تھا اور اسی لیے میں آج تنہا، ان اداس ہوتے پہاڑوں کے درمیان گھرا، خوبانی کے درخت تلے بیٹھا، اپنے ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ چار دیواری کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نرم و ملائم گھاس بچھی تھی جس کے کناروں کے ساتھ جنگلی گلاب مہکتے رہتے تھے۔ خوبانی کے ایک نہیں، کئی درخت تھے۔ ان کی ٹہنیاں اپنے پھلوں کے بوجھ سے جھکی چلی جا رہی تھیں۔
اتنے میں ایک تراشی ہوئی داڑھی لیے ایک بندہ کیمپنگ میں آیا اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نام مجھے یاد نہیں آ رہا مگر میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ 1948ء کی جنگ آزادی لڑ چکا ہے۔ آج کل گائیڈ کا کام کرتا ہے۔ عمر بتائی تو میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ کر شرمندہ ہو گیا۔ اسّی سال ہونے میں چند برس رہ گئے تھے۔ صحت مند جسم اور کمان کی طرح تنا سینہ ہلکی بھوری داڑھی اور آنکھوں میں چمک۔ مجھے آس پاس اور دور کے علاقے بتانے لگا جہاں وہ مجھے بطور گائیڈ لے جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ مجھے کچھ سنا رہا تھا اور نگاہیں اس کی اس پاس کے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر تھیں مگر مجھے ان چوٹیوں سے کہیں پار کسی اور دنیا کی طرف جانا تھا۔ میں نے جب اسے یہ بتایا کہ میں شمشال جا رہا ہوں تو وہ کچھ لمحے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا اور یہ بول کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شمشال...... تمہیں شمشال والے ہی لے جائیں گے۔''
ڈیرہ اسماعیل خان کا میرا ایک دوست نذیر گلگت میں دوائیوں کی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ ڈیرہ سے اٹھ کر اپنی بیوی اور دو بچوں سمیت گلگت میں آبسا تھا۔ کچھ دیر میں وہ ملنے آگیا۔ اتنے میں فیری میڈو کا ساتھی اشفاق بھی آ گیا۔ نذیر ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک ہی انداز میں ایک گھنٹا بیٹھا رہا۔ بڑے مہذب اور دھیمے لہجے میں مسکرا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''آپ کینیڈا کی تیاری کریں۔ یہ کیا ایک بڑے سفر سے پہلے، اتنے بڑے ہولناک ٹریک پر چل پڑے ہیں۔'' اشفاق میری جانب دیکھ کر مسکرایا۔ میں اسے مسکراتے دیکھ کر اپنے

حوصلے کو داد دیتا رہا۔ دراصل مجھے خود بھی معلوم نہ تھا کہ میں یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہا ہوں یا کوئی مجھ سے کروا رہا ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہو کہ یہ میرا ارادہ تھا اور اس میں میرے خالق کی منشا تھی، جو مجھ سے یہ سب کچھ کروا رہی تھی۔

نذیر کی سوزوکی کار میں باہر نکلے اور گلگت کے بازاروں میں بلا مقصد گھومنے لگے۔ وہ اپنی مہمان نوازی دکھلا رہا تھا۔ گھومتے ہوئے چنار باغ کی جانب آ نکلے۔ یہاں خاموشی تھی۔ شہتوت اور چنار کے بلند و بالا درخت جو ایک ترتیب میں خاموش کھڑے تھے۔ آزادی کے شہیدوں کی یاد میں ایک مینار تھا اور اس کی چوٹی پر مارخور کا مجسمہ تھا۔ معلوم نہیں کتنے لوگ جانتے ہوں گے کہ پاکستان کا قومی جانور مارخور ہے اور یہ مارخور صرف ہمالیہ اور قراقرم کی دور دراز وادیوں میں پایا جاتا ہے۔ مجھے زندہ مارخور دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ کسی نے بتایا کہ لاہور کے چڑیا گھر میں مارخور موجود ہے۔ پھر اپنی پہلی فرصت میں لاہور گیا اور وہاں جا کر چڑیا گھر میں مارخور کے سامنے کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ ایک بار میں کینیڈا کے صوبے البرٹا میں واقعہ بینف (Banff) نیشنل گیا۔ میں بینف سے جیسپر (Jesper) جا رہا تھا۔ دونوں جانب راکی پہاڑوں کی بلند برفلی چوٹیاں تھیں اور سامنے میلوں پھیلے جنگل تھے، نیلی جھیلیں تھیں اور میری گاڑی جیسپر کی جانب دوڑی چلی جا رہی تھی۔ آگے دیکھا تو کئی بسیں، کاریں ایک لائن میں رکی ہوئی تھیں۔ میں بھی رک گیا۔ بہت سے لوگ اپنے کیمرے پکڑے آہستگی سے ایک جانب جا رہے تھے اور کچھ وہاں سے سرگوشیاں کرتے واپس آ رہے تھے۔ میں بھی اپنی کار سے اترا اور جا کر دیکھا تو بلند پہاڑوں سے تین مارخور اتر کر سڑک کنارے کسی چشمے سے پانی پی رہے تھے۔ بھوری رنگت اور پیچھے کی جانب مڑے لمبے سینگ، میں انہیں حیرانگی سے دیکھتا رہا۔ اپنے قدرتی ماحول میں وہ کتنے شاندار دکھتے تھے ان کی موجودگی میں بلند برفوں سے ڈھکے پہاڑوں کا حسن بڑھ گیا تھا۔

چنار کے درختوں سے مجھے ایک انس سا تھا کیونکہ ان پر خزاں نہیں آتی۔ اس کے پتے نہیں جھڑتے۔ یہی چنار مجھے ہمیشہ اپنی جانب کھینچتے چلے آ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اب میں نے اپنے گھر کے پچھلے یارڈ میں چنار کے درخت لگا رکھے ہیں۔ سردیوں میں جب برف باری ہوتی ہے تو ان کی شاخیں برفوں کو تھام کر رکھتی ہیں اور ایک دلکش منظر تخلیق پاتا ہے۔ (اپنے پچھلے سفرنامہ نانگا پربت کا عقاب میں ایک غلطی کی تصحیح کرنا چاہوں گا۔ اس میں جب ہم ہنزہ جاتے ہوئے سلک روڈ کی تعمیر کے دوران ہلاک ہونے والوں کی قبروں پر کھڑے تھے تو میں نے لکھ ڈالا تھا کہ چنار کے درخت اپنے پتے گرا رہے تھے۔ دراصل وہاں چنار کے درختوں کے ساتھ پیپل کے درخت بھی تھے۔ پتے ان کے گرے ہوئے تھے)۔

میں چنار کے درختوں تلے، چنار باغ میں نذیر اور اشفاق کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ وہ مجھ سے کینیڈا کی باتیں کر رہے تھے اور میں ان سے قراقرم کا احوال پوچھتا تھا۔ بھوک لگی تو دریائے گلگت کے کنارے بیٹھ کر خنک ہوتی ہوا میں گرم سموسے کھاتے اور چائے پیتے۔ اب تجسس کے ساتھ اداسی بھی تھی۔ اداسی اپنا وطن چھوڑنے کی تھی، اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں دور ٹھکانا بنانے کی تھی۔ میں اس سے پہلے پاکستان سے باہر کبھی نہیں گیا تھا۔ ایک شوق اور جوش بھی تھا کہ مغرب جس کے سفرنامے پڑھتے تھے، وہ دیکھنے میں کیسا ہوگا۔ لوگ کیسے ہوں گے اور کس طرح رہتے ہوں گے۔ اتنے خوش حال لوگ اپنے رویوں میں کیسے ہوں گے؟ مجھے اس خوب صورتی اور اس نئی دنیا کو دیکھنے کا شوق تھا، جس کے بارے میں سفرناموں میں پڑھا تھا یا تصویروں میں دیکھا تھا۔

نذیر نے ہمیں ہوٹل میں ڈراپ کیا اور واپس آنے کا کہہ کر اپنے کسی دفتری کام سے چلا گیا۔ ہوٹل میں شاہد ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ شاہد بھی میرے فیری میڈو ٹریک کا ساتھی تھا۔ بڑی گرم جوشی سے گلے ملا تھا۔ ”سر! بہت خوشی ہوئی جو آپ دوبارہ آ گئے اب تو آپ میرے ساتھ نگروٹ چلیں گے ناں؟“

میں نے جب یہ کہا کہ تارڑ صاحب بھی ساتھ ہیں تو بضد ہو گیا کہ پھر تو سب چلیں گے۔

ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے اپنے پچھلے ٹریک کے قصے ایک دوسرے کو سنا رہے تھے اور ساتھ ہی پاکستان اور زمبابوے کے درمیان ہونے والا کرکٹ میچ بھی دیکھ رہے تھے۔

میں، نذیر، شاہد اور اشفاق۔ تارڑ صاحب کے پاس روپل ہوٹل میں ان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہیں سعید چودھری صاحب بھی کچھ مایوسیوں میں نچڑے بیٹھے تھے۔ سعید چودھری صاحب جو ہمارے ساتھ شمشال جا رہے تھے اور میں اس بات پر حیران تھا کہ وہ گلگت تک کیسے آ پہنچے۔ ایک نازک مزاج شخصیت کے مالک چودھری صاحب، ایک صاف ستھرے لباس اور افسرانہ انداز میں بیٹھے معلوم نہیں کس چیز کو

انجوائے کر رہے تھے کیونکہ وہ اپنی عینک کے پیچھے مسلسل مسکرا رہے تھے۔ وہ شاید زراعت کے محکمے میں ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ مجھے وہ شمشال وغیرہ جانے والی شخصیت نہیں لگتے تھے۔ شاہد مسلسل بگروٹ جانے کی دعوت دے رہا تھا اگر شمشال نہ جانا ہوتا تو جتنے خلوص سے وہ اصرار کر رہا تھا، اسے منع کرنا مناسب نہ ہوتا مگر یہ ممکن نہ لگتا تھا۔

آخر تارڑ صاحب کے ساتھ دو باتوں پر متفق ہو کر ہم وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے ایک یہ کہ میں ایک دو دن میں ہنزہ جاؤں گا اور تارڑ صاحب جیسے ہی اپنی کانفرنس کا آخری سیشن مکمل کرنے ہنزہ آئیں گے تو اس کے اختتام پر وہیں سے شمشال کے ٹریک پر چلیں گے۔ سارے انتظامات تارڑ صاحب کے ذمے تھے اور اس بار میں ان سے فارغ تھا۔ دوسرا فیصلہ یہ ہوا کہ بگروٹ جانے کی ہمت اگر شمشال کے بعد رہی تو گلگت پہنچ کر شاہد کے گاؤں چلیں گے جو ہراموش کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔

تارڑ صاحب، کشور ناہید اور عکسی مفتی بدھا کا مجسمہ دیکھنے کارغہ چلے گئے اور ہم چاروں نذیر کی گاڑی میں بیٹھ کر جماعت خانہ بازار کی جانب آ نکلے۔ یہیں شاہد اور اشفاق اتر گئے۔ میں اور نذیر جٹیال کی جانب چلے جہاں نذیر کا گھر تھا۔ جٹیال دراصل نیا گلگت ہے۔ یہ کینٹ کا علاقہ ہے۔ انتہائی سرسبز اور صاف ستھرا۔ خوبصورت سڑکیں، باغات اور ارد گرد بلند و بالا پہاڑ۔ دریائے گلگت کے ساتھ ساتھ چلتے ہم اس کے گھر پہنچے تو میں نذیر کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ گھر کے صحن میں سیب کے درخت اور سامنے قراقرم کے برفوں سے ڈھکے اونچے پہاڑ...... نذیر کے دو چھوٹے بچے عائشہ اور عبداللہ تھے۔ انہوں نے میری جانب ایسے دیکھا جیسے مدتوں بعد کوئی انسانی شکل دیکھ رہے ہوں۔ نذیر کی بیوی آنکھوں میں وطن سے دوری اور اپنی تنہائی کا درد چھپا رہی تھی۔

نذیر کی جانب دیکھ کر کہنے لگی۔ ”خود تو صبح کام کے لیے نکل جاتے ہیں اور میں دو بچوں کے ساتھ تنہا ان روکھے سوکھے، بنجر پہاڑوں کو دیکھتی رہتی ہوں۔ نہ ہمسائے ہمیں جانتے ہیں اور نہ اس شہر میں کوئی پہچانتا ہے۔“

میں نے تسلی دینے کے لیے کہا۔ ”بھابی! آپ کچھ عرصے بعد یہاں سے چلی جائیں گی اور پھر پوری زندگی یہی پہاڑ آپ کو یاد آئیں گے۔“ میں ان کو تسلی دیتا رہا اور نذیر بڑے سکون سے بیٹھا بچوں سے کھیلتا رہا۔

موسم بہت اچھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم گرم چائے کے ساتھ پکوڑے اور سینڈوچ کھا رہے تھے۔ مجھے بھی یہاں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بھابی اور نذیر کے خلوص نے مجھے باندھ لیا تھا۔ شام اتر رہی تھی۔ پہاڑ اپنی رنگت بدل رہے تھے۔ چوٹیوں کی برف زیادہ چمکنے لگی اور کہیں سے چاند آ کر آسمان پر ٹھہر گیا۔

☆......☆

تارڑ صاحب کے کمرے میں مجمع لگا تھا۔ نذیر کچھ دیر پہلے مجھے رویل ہوٹل اتار کر واپس چلا گیا تھا۔ کمرے میں رحمت نبی تھا اور ساتھ میں اکرام بیگ۔ چودھری سعید صاحب ایک کونے میں ویسے ہی بیٹھے تھے جیسے چند گھنٹے پہلے میں انہیں چھوڑ گیا تھا۔ شاہ زمان بانسری پر کوئی دھن چھیڑتا کونے میں دوسرا فنکار ڈھولک کی تاپ پر ردھم اٹھاتا۔ میں نے نیچے کہیں قالین پر جگہ پائی۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا تھا۔ کوئی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر مشروب کا لفافہ تھما کر چلا گیا۔ رحمت نبی نے اسے چوم کر اپنی آنکھوں سے لگایا اس کے بعد کسی کونے میں چھپا دیا اور پھر دوبارہ ڈھولک کی تال پر ناچنے لگا۔ کبھی کسی ساتھی نے لطیفے سنائے اور کئی ایک کا قہقہہ اٹھا۔ فنکار لوگ اپنی بے قدری پر خفا تھے اور روٹھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھڑکی سے چاند جھلک رہا تھا اور رحمت نبی پر حال پڑ رہے تھے۔ اشفاق مجھے لینے آ پہنچا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی اور جب ہم گلگت کے بازاروں سے گزر رہے تھے تو ہو کا عالم تھا اور بازاروں میں آوارہ کتے گھوم رہے تھے۔

گارڈن ہوٹل پہنچے تو شاہد کو اپنا منتظر پایا اس سے کہا کہ کل صبح ہنزہ چلنا ہے تو پہلے اس نے کچھ تردد کیا اور پھر خود ہی راضی ہو گیا۔

رات کافی بیت چکی تھی اور ایک ایک چارپائی میں نے اور شاہد نے سنبھال لی اور اشفاق کہیں سے میٹرس لے آیا اور فرش پر بچھا کر لیٹ گیا۔

پورے دن کی تھکاوٹ تھی کہ میں گھوڑے بیچ کر سویا۔

صبح اٹھا تو شاہد جاگ رہا تھا۔ اشفاق مست نیند میں تھا۔ تیار ہو کر ناشتا کیا۔ وہ دونوں یہ کہہ کر چلے گئے کہ دس بجے تک وہ اپنے سامان سمیت حاضر ہو جائیں گے۔

میں اپنی کیمپنگ سائٹ میں خوبانی کے درخت تلے اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی مگر مجھے وہاں بیٹھنے سے روک نہیں رہی تھی۔ میں موسم اور ماحول میں کھویا ہوا تھا۔ دس کیا گیارہ بج گئے مگر وہ دونوں واپس نہ پہنچے۔ اتنے میں نذیر اپنے کسی مقامی دوست کے ہمراہ آ پہنچا۔

پہلے تعارف ہوا اور جب نذیر نے اسے بتایا کہ میں شمشال جا رہا ہوں، تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"آپ نہیں جا سکتے۔" اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دھمکی دے رہا ہے۔

نذیر بھی پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے صورتِ حال کو بھانپا اور کہا۔ "نہیں......نہیں! دراصل شمشال دریا کے بہاؤ کے آگے ایک گلیشیئر آ گرا ہے اور دریا کا پانی اس کے پیچھے جمع ہو رہا ہے اور گرمی سے گلیشیئر پگھل گیا تو بہت بڑی تباہی آ جائے گی۔"

مجھے اپنا پروگرام بگڑتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر کہنے لگا۔ "1960ء میں ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا اور شمشال دریا میں بڑی طغیانی آ گئی تھی۔"

شمال میں جب آپ کسی ٹریک پر ہوں تو ایسی باتیں آپ کو سننے کو بہت ملتی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی جھوٹ ہوتا ہے۔ ایک خبر آگ کی طرح پورے گلگت بلتستان میں پھیل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں پریشان رہا مگر پھر یہ بات کھلی کہ یہ گلیشیئر شمشال گاؤں سے کافی دور دریا کے بیچ میں آ گرا ہے اور ہمیں شمشال گاؤں تک ہی جانا تھا۔ اس لیے ہمارے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ تھا۔

بادل ہلکے ہلکے برس رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بادل ذرا سے ہٹے تو سامنے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر تازہ برف کا ہلکا سفید سفوف بچھا نظر آیا جو کچھ دیر پہلے نہیں تھا۔

نذیر گیا تو فدا حسین میرے ساتھ آ بیٹھا۔ اس کے ہمراہ ایک لڑکا بھی تھا۔ فدا حسین گارڈن ہوٹل میں کک تھا اور مناپس میں راکاپوشی کے نیچے اپنی کینٹین بھی چلاتا تھا۔ وہ کل مناپس جا رہا تھا۔ شاہد اور اشفاق ابھی نہیں آئے تھے اور نذیر کے بعد میں فدا حسین سے باتیں کرنے لگا۔ مضبوط جسامت والا فدا حسین مجھے مناپس لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے درن پیک بیس کیمپ کی تصاویر بھی دکھائیں۔ وہ بہت خوب صورت جگہ تھی۔ وہ کہنے لگا کہ گلیشیئر پر چار گھنٹے کا بیس کیمپ کا سفر ہے اور میرا گدھا علاقے کا سب سے تگڑا گدھا ہے۔ آپ کو لے جاتے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔ ہم یہاں اپنی گاڑی کے ماڈل یا برانڈ پر اتراتے ہیں اور یہ لوگ اپنے جانور کی مضبوطی پر فخر کرتے ہیں۔ میں نے اپنے پروگرام کا بتایا تو وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔

سیزن میں آپ کو اس طرح کے بہت سے گائیڈ ملتے ہیں۔ وہ سردیوں کے لیے کچھ پیسے کما کر جمع کرنا چاہتے ہیں اگر آپ گلگت پہنچ جائیں اور کسی ہوٹل میں آپ کا قیام ہو تو آپ کو بہت سے لوگ مل جائیں گے جو آپ کو کسی نہ کسی ٹریک پر لے جانے کے لیے باآسانی تیار ملیں گے۔

فدا حسین اٹھے تو ایک اور صاحب میرے سامنے آ بیٹھے۔ میں نے سلام دعا کے بعد پہلے اپنا شمشال کا پروگرام ان کے سامنے رکھا۔ اس نے سر سے ٹوپی اتاری اور اپنی ٹنڈ کھجانے لگا۔ اس کی ٹنڈ پر برفوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ کچھ نہ بن پڑا تو کارگل کی جنگ پر بات کرنے لگا۔ ان دنوں کارگل کا محاذ گرم تھا اور جنگ جاری تھی۔ این ایل آئی کے جوان گلگت میں نظر آ رہے تھے۔ کچھ شہیدوں کی لاشیں بھی آ چکی تھیں۔ مجھے اس ٹریک پر جتنے بھی مقامی ملے وہ سب پُرجوش لگے۔ ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ اب جنگ چھڑ گئی ہے تو کسی انجام تک پہنچے۔

جب اشفاق اور شاہد پہنچے تو تین بج چکے تھے۔ اس دوران میں کئی مقامی لوگوں کے انٹرویو اس خوبانی کے درخت تلے کر چکا تھا۔ دونوں کہنے لگے کہ آج دیر ہو چکی ہے، کل ہنزہ چلیں گے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی بات بھی ماننا تھی مگر میں اندر سے کھول رہا تھا۔ یہ کیا کہ میں تیار ہو کر بیٹھا ہوں اور اتنی دیر سے ان کی راہ تک رہا ہوں اور یہ صاحبان ایک تو اتنی دیر سے آئے اور پھر ہنزہ جانے کا پروگرام بھی کینسل کر دیا۔ میں نے اپنا ضبط برقرار رکھا۔ اشفاق زیرِ لب مسکرا رہا تھا اور میں اس کو دیکھ کر اپنا غصہ پی رہا تھا۔ شاہد کہیں اپنے کام سے چلا گیا۔

میں اور اشفاق کیمپنگ سائٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اشفاق کہنے لگا کہ آج ہنزہ جانے کا پروگرام اس لیے ختم کیا ہے کہ آج مجھے آپ کو سلطان آباد اپنے ماموں کے گھر لے جانا ہے اور آپ کی دعوت میرے گھر پر ہے۔

میں اس کے خلوص پر مسکرا دیا۔ شاہد اور اشفاق دونوں انتہائی ملنسار اور خلوص کے پیکر ہیں۔ وہ اپنے کام چھوڑ کر مجھے اتنا وقت دے رہے تھے۔ میں نے کہا کہ تمہارے گھر ہم واپسی پر چلیں گے تو وہ کہنے لگا کہ ان کے ماموں صاحب کو کہیں باہر جانا ہے اور آج وہ میرے انتظار میں ہیں۔

شام ہوئی اور ہم سلطان آباد کی طرف چل پڑے۔ گلگت سے کچھ فاصلے پر ہم نے پرانا پل کراس کیا اور پھر ایک سرنگ سے گزرے۔ قراقرم چٹانوں میں کھودی گئی یہ سرنگ گلگت کو سلطان آباد سے ملاتی ہے۔ خشک چٹانوں میں گھری سلطان آباد کی سرسبز وادی اپنے حسن میں یکتا تھی۔ چیری اور شہتوت کے باغوں سے گزرتے ہوئے میں اس کے نظاروں

منبع (Source)

وہ جھیل یا چشمہ جس سے دریا نکلے دریا کا منبع کہلاتا ہے۔ دریا عموماً پہاڑوں سے آتے ہیں جو یا تو کسی جھیل سے نکلتے ہیں یا چھوٹے ندی نالوں کا پانی جمع ہو کر بنتے ہیں جو پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف کے آہستہ آہستہ پگھلنے سے بنتے ہیں یا پہاڑوں پر پانی ہونے سے بارش کا پانی ان ندی نالوں میں آجاتا ہے اگر منبع پر بارش زیادہ ہوگی تو دریاؤں میں پانی زیادہ آئے گا اگر میدانی حصوں میں بارش ہوتی رہے اور منبعوں پر نہ ہو تو دریاؤں میں طغیانی نہیں آئے گی جو دریا برفانی علاقوں سے نکلتے ہیں ان میں سارا سال پانی آتا رہتا ہے۔

مرسلہ: اسماء توحید۔ العین (یو اے ای)

عادت سے مجبور ہر کام جلدی میں کرنے کا عادی تھا۔ ہم بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ میں اس کے بعد والی کوسٹر بھی پکڑ سکتا تھا مگر مجھے راکاپوشی کو کریم آباد سے ڈھلتی شعاعوں میں دیکھنا تھا اور میں سورج کے ڈوبنے سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

اب کوسٹر کے نکلنے کا ٹائم ہو گیا اور ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اشفاق اس سے بات کر رہا تھا اور وہ غصے سے سر ہلا رہا تھا۔ فضا خوش گوار تھی اور اس نسبت سے ڈرائیور کا موڈ ذرا اچھا ہوا مگر اب وقت سر پٹ بھاگنے لگا اور شاہد کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ ڈرائیور اور سواریاں جھنجلاہٹ کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے شدید غصہ آ رہا تھا کہ پہلے بھی یہ لوگ اتنے لیٹ ہوئے اور اب عین وقت پر یہ غائب ہو گیا ہے۔ میں پچھتا رہا تھا کہ مجھے اکیلے ہی چلنا چاہیے تھا۔ ڈرائیور اب اشفاق سے زوردار لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مجھے ان کی باتیں سمجھ تو نہیں آ رہی تھیں مگر اندھا تو نہیں تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ اشفاق اس کی منتیں کر رہا ہے مگر وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے پر بضد ہے۔ کھیل اشفاق کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ ناکام میرے ساتھ کوسٹر میں آبیٹھا۔ ڈرائیور نے طیش میں آکر کوسٹر اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی اور کچھ دیر غر غر کی آواز آئی اور پھر انجن خاموش ہو گیا۔ سب مسافر خاموش ہو گئے۔ ڈرائیور نے پھر چابی گھمائی اور اب کی بار بھی وہی نتیجہ نکلا۔ پھر اس نے یہ عمل کتنی ایک بار دہرایا مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔ دونوں گوریاں بھی یہ

سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ درختوں پر سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ شام اتر چکی تھی اور چاندنی چہار جانب پھیلی تھی۔ پھر سلطان آباد کا گاؤں آیا اور ہم گلیوں میں سے گزرتے ایک لکڑی کے پھاٹک کے سامنے جا رکے۔ بلند درختوں کی ٹہنیوں کے پیچھے چاند چمک رہا تھا اور پتے ہوا سے سرسرا رہے تھے۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اس پر سایا فگن تھیں۔ اشفاق کو میں خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ کیسے دلکش مقام پر اس کا گھر ہے۔

ہم ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ اشفاق کے ماموں بڑے خلوص سے باتیں کر رہے تھے۔ ابلے ہوئے آلوؤں کے ساتھ چیری کا کشید کیا ہوا مشروب تھا اور کھڑکی سے چاندنی بلا روک ٹوک کمرے میں آ رہی تھی۔ زمین پر قالین بچھے تھے اور تکیے لگے تھے۔ صوفوں پر بیٹھنے کے تکلفات سے ہم پرہیز کر رہے تھے۔ میں تکیوں سے ٹیک لگائے شمال کی وادیوں کے قصے سن رہا تھا۔ اشفاق کے ماموں کہہ رہے تھے کہ میرے والد نے شمشال یا میر کراس کر کے انگریزوں کے دور میں ایک جرمن جاسوس کو گرفتار کیا تھا۔ پھر کہنے لگے وہ تو بہت مشکل راستہ ہے، وہاں تو کوئی نہیں جاتا۔ تبھی چکن روسٹ آ گیا اور میں ان کی باتوں پر صرف سر ہلاتا رہا۔ روسٹ سے انصاف کرتا رہا۔ ایک سحر زدہ ماحول تھا اس لیے میں کسی بات پر غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات بیتتی رہی اور ہم دھیمے لہجوں میں باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ اشفاق دوسرے بیڈ پر سو رہا تھا۔ وقت رکا لگتا تھا اور میں نے اپنے آپ کو وقت کے دھارے میں ڈال دیا تھا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ کچھ دیر بعد شاہد بھی اپنے سامان سمیت آ پہنچا۔ میں ہشاش بشاش تھا، کیونکہ آج مجھے اپنے من پسند علاقے ہنزہ جانا تھا جہاں سے مجھے شمشال کی وادی کو کوچ کرنا تھا۔

ہم ویگن اسٹینڈ پر پہنچے تو ساڑھے تین بجے والی کوسٹر تیار تھی۔ ٹکٹیں لیں اور اندر جا بیٹھے۔ اتنے میں دو یورپین عورتیں بھی کوسٹر میں آ بیٹھیں تو شاہد اور اشفاق نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے کیے اور شینا زبان میں ان کی گفتگو بلند ہوئی اور میں جان گیا کہ یہ دونوں انہیں اپنی ملکیت بنا بیٹھے ہیں۔ شاہد نے کچھ لمحے بعد سوچا کہ لگے ہاتھ کچھ ڈاکٹروں کو اپنی میڈیسن کمپنی کے لیے مارکیٹنگ بھی کر لے گا اور میڈیسن کے سیمپل لینے ابھی آیا کہتا نیچے اترا اور چھلاوے کی طرح ایک دم غائب ہو گیا۔

کوسٹر جانے میں دس منٹ رہ گئے تھے اور شاہد اپنی

تماشا دیکھ رہی تھیں کہ انجن کی جگہ ڈرائیور غرّا رہا ہے۔
یہ کھیل تماشا جاری رہا۔ سب مسافر نیچے اتر گئے۔ چار بج چکے تھے۔ اس گاڑی کی جگہ ایک اور گاڑی آئی اور اتنے میں شاہد بھی میڈیسن کا ڈبہ اٹھائے مستی میں آتا دکھائی دیا۔ اب اس پر غصہ نکالنا فضول تھا بلکہ اب تو وہ ہمارا مذاق اڑا رہا تھا کہ دیکھا میرے بغیر کوسٹر کیسے جا سکتی تھی۔
ہم دوسری گاڑی میں جا بیٹھے۔ میرے ساتھ پہلے اشفاق بیٹھا تھا مگر اب کوئی مقامی براجمان ہو گیا۔ اشفاق اور میں نے اس کو کہا کہ پہلے تم پیچھے بیٹھے تھے تو اب بھی اپنی جگہ پر جاؤ۔ اس نے کہا کہ وہ دوسری گاڑی تھی اور یہاں تو میں اسی سیٹ پر بیٹھوں گا۔ شاہد نے جھگڑا کرنا چاہا مگر میں نے شاہد کے آگے ہاتھ جوڑ لیے مجھے اپنا موڈ ٹھیک رکھنا تھا کیونکہ میں راکا پوشی کو کسی ذہنی ہیجان میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔
کوسٹر روانہ ہوئی۔ جٹیال سے نکلی تو فراٹے بھرنے لگی۔ منظر مکمل کرعیاں ہوتے گئے اور چنار کے درختوں نے پیچھے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ بلند اور شاندار پہاڑوں کی چوٹیوں سے بادل لپٹے جاتے تھے اور برفوں کا سنوف ان چھ ہزار میٹر سے بلند پہاڑوں پر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پڑنے لگا۔ اس بار میرے پاس ایک طاقتور دوربین بھی تھی اور میں ان چوٹیوں کو اپنے قریب سے قریب دیکھتا رہا۔
اسماعیل آباد سے گزرے تو دریائے ہنزہ اپنے وسیع و عریض پھیلاؤ میں نالیوں کی صورت، چھوٹے بڑے پتھروں کی اوٹ میں بہہ رہا تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ اور دریا کے پار وہی عظیم وشان پہاڑ اسی طرح کھڑے تھے جنہیں میں اور شاہ جی دو سال پہلے دیکھتے یہاں سے گزرے تھے۔
کچھ دیر بعد ہم دیوزاد پتھریلی چٹانوں میں گھرے ایک روڈ سائیڈ ہوٹل پر چائے پینے رکے۔ چٹانوں کے پیچھے برف پوش چوٹیاں تھیں جہاں سے یخ بستہ ہوائیں سنسناتی ہوئی اتر کر ہمیں یخ کر رہی تھیں۔ کچھ بلندی پر چٹانوں کے بیچ کوئی چشمہ ابل رہا تھا۔ ہم نے اس چشمے کے میٹھے اور ٹھنڈے ٹھار پانیوں سے اپنے چہرے اور حلق دونوں تر کیے۔ ایک تازگی کی لہر پورے جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ کیا خوش ذائقہ پانی تھا، جی چاہتا تھا کہ یہیں کے ہو کر رہ جائیں۔ یہاں مجھے محسوس ہوا کہ پانی کا بھی کوئی ذائقہ ہوتا ہے۔ چائے پیتے پیتے ہم نے بہت دیر کر دی اور تمام مسافر، گوروں کے علاوہ ہمیں کوسٹر کی کھڑکیوں سے گھور رہے تھے۔
نوبل اور سکندر آباد سے گزرے تو گندم کے سنہری خوشے ہوا کے زور سے لہرا رہے تھے۔ خوبانیاں ابھی پکنے کے قریب تھیں۔ پچھلی بار جب ہم آئے تھے تو خوبانیوں کا موسم ختم ہو رہا تھا اور اس بار شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ درخت پھلوں سے بھرے تھے اور ٹہنیاں ان کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔
شاہد میرے ساتھ بیٹھا یونیورسٹی کی باتیں سنا تا رہا اور میں اور اشفاق زیر لب مسکراتے رہے۔ شاہد کے بقول کلاس کی لڑکیاں اس پر مرمٹی تھیں مگر اسے یہ خبر بھی نہ تھی اور آج دو سال بعد اس پر یہ بھید کھلا تھا۔ اس وقت وہ کوسٹر میں افسوس سے بیٹھا اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ اشفاق اس کو چڑھا رہا تھا۔ ”اس کو اپنے حسن کا اندازہ بھی نہ تھا۔ لڑکیاں اس سے بہانے بہانے سے کبھی نوٹس کے لیے، کبھی کوئی اور کام کروانے آتیں اور یہ اتنا ڈفر تھا کہ وہ انہیں سمجھ ہی نہ سکا۔“
شاہد ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ ”ہاں! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ میں بڑا ڈفر تھا بس اب کیا ہو سکتا ہے۔“ پھر وہ خلاؤں میں تکنے لگا۔ اشفاق کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ شاہد اپنی سادگی میں اس کے ہاتھ آ چکا تھا پھر اس نے شینے زبان میں کچھ کہا جسے سن کر شاہد کا چہرہ بن گیا مگر کوسٹر میں بیٹھے تمام مقامی افراد ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا۔ ”ایسا کیا سنایا جسے سن کر سب ہنس رہے ہیں۔“
اشفاق شاید سنانا نہیں چاہتا تھا مگر میرے اصرار پر بولا۔ ”ایک لطیفہ سنایا تھا۔“
میں نے پوچھا۔ ”کون سا؟“ وہ رک رک کر بتانے لگا۔ ”ایک سردار جی ... اپنی محبوبہ کے گھر آیا، گھر بالکل خالی تھا۔ محبوبہ کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ محبوبہ نے فریج سے مٹھائی نکالی۔ ایک پلیٹ میں تھوڑی سی رکھ کر اسے دی پھر بولی۔ ”آج گھر خالی ہے کوئی بھی نہیں ہے۔ جو دل میں آئے کر لو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔“
اتنا سنتے ہی سردار چھلانگ مار کر اٹھا اور فریج سے باقی مٹھائی نکال کر کھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو جو میرے دل میں ہے کر رہا ہوں۔ شاہد بھی سردار سے کم نہیں۔“
لطیفہ موقع کا تھا مزہ دے گیا۔
انہی لمحوں میں کوسٹر نے ایک موڑ کاٹا اور آسمان سے زمین پر راکاپوشی کا سورج کی زرد کرنوں میں پگھلتا سونا بہتا نظر آیا۔ کہیں کہیں بادل اس سے چمٹے تھے اور باقی جگہوں سے وہ سنہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آنکھیں اس چمک سے خیرہ ہو رہی تھیں اور نظر اس کے حسن کی تاب لانے کے قابل نہ تھی۔ کیا بلندیاں تھیں جو دل میں خوف بھر رہی تھیں۔ میں

خاموش ہوگیا۔ یکسوئی میں غرق کہیں کھو گیا۔ ایک خواب میں ڈوبتا چلا گیا۔ کوسٹر یہاں نہ رکی اور خواب دوسرے موڑ کے بعد ٹوٹ کر کہیں بکھر گیا اور راکاپوشی کا سحر ایک موڑ پیچھے رہ گیا۔

ہنزہ پہنچے تو آہستہ آہستہ تاریکی چھا رہی تھی۔ شام کی سیاہ چادر چہار جانب پھیل گئی اور ایک سناٹا بھی اتر آیا۔ ایک سکون اور طمانیت تھی۔ ہنزہ کا یہی لطف ہے کہ آپ کسی نئے اور اجنبی ماحول میں آنکلتے ہیں جس سے پہلے آپ کبھی واقف نہیں ہوتے۔ چلتی ہواؤں میں پتوں کی سرسراہٹ تھی، جو اس ماحول کی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ کچھ لوگ سکون کے لیے گولیاں لیتے ہیں اور میں اس ماحول میں پُرسکون ہوائیں اپنے پھیپھڑوں میں اتار رہا تھا۔

جس ہوٹل میں ہم پچھلی بار ٹھہرے تھے اس بار اس کے عین سامنے Refuge Mountain ہوٹل میں ہمیں کمرے ملے۔ میں Hotel Rainbow کی وہ چھت دیکھ رہا تھا، جس پر میں اور شاہ جی نے بیٹھ کر ستاروں کی کہکشائیں دیکھی تھیں۔ مجھے دو سال پہلے کے گزرے لمحات یاد آنے لگے اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شاہ جی نے ستاروں کو دیکھ کر کہا تھا۔ ”سنتے ہیں زمانہ قدیم میں لوگ ستاروں سے راستہ معلوم کرتے تھے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا تھا۔

”پہلے یہ ستارے بولتے تھے کیا؟“

”نہیں تو۔“

”پھر راستہ کیسے کیسے بتاتے تھے؟“

”بتانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ستاروں کی سمت کا اندازہ کر کے راستہ طے کرتے تھے۔“

”اچھا اچھا۔“ وہ اس طرح سر ہلا کر بولے تھے جیسے سب سمجھ گئے ہوں لیکن کچھ ہی دیر بعد بولے تھے۔ ”مگر ستارے تو آسمان پر ہوتے ہیں۔ سمت کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔“

”میرا دل چاہا تھا سر پیٹ لوں مگر مطمئن کرنے کے لیے بتانا پڑا کہ وہ سامنے والا ستاروں کا جھرمٹ اسی طرف رات کے آخری پہر تک رہتا ہے اس لیے سمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔“

”مار اوے۔“ انہوں نے مطمئن ہونے کا عملی مظاہرہ اس زور سے کیا تھا کہ بیرا بھاگتا ہوا اوپر آگیا تھا کہ صاحب آپ نے آواز دی ہے۔

چائے ہم نے کمرے میں منگوائی۔ کمرے کی کھڑکی بازار میں کھلتی تھی اور راکاپوشی اس ویو میں نہیں آتی تھی۔ ماحول ساکت تھا، گھڑیاں جیسے رک گئی ہوں، وقت کا رواں پہیا تھم گیا ہو۔ جیسے میں خلا میں جا اترا ہوں جہاں میری کوئی حرکت میری اپنی نہیں تھی۔ میں کسی قوت کے تابع نہ تھا جو مجھے اپنی گرفت میں رکھتی ہو۔ میں آزاد اور بےلگام سوچ رہا تھا۔

ہم بازار میں آنکلے، جہاں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہنزہ میوزیم گیلری میں جا گھسے۔ ایک ان تراشا بھاری پتھر پڑا تھا۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ بارہ لاکھ کا ہے۔ دکاندار قیمت بتا کر مسکرایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ خالی پتھر کی اتنی زیادہ قیمت کیوں ہے؟ قیمت کا تعین تو تراشنے کے بعد ہوگا اور قیمت اس نسبت سے طے ہوتی ہے، جس مہارت سے یہ تراشا جائے گا۔

دکاندار کہنے لگا کہ اگر ٹھیک طریقے سے تراشا گیا تو یہ کروڑوں میں جائے گا اور پھر اس نے وہ بھاری پتھر میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ شوکیس میں رکھ دیا۔

وہاں بیش قیمت پتھروں کے ہار تھے جو لاکھوں کے مول کے تھے۔ قیمتی اور نفیس قالین تھے، بدھا کا سالم سر ایک مخمل کے کپڑے پر رکھا تھا اور ساتھ ہی بدھ کا بغیر سر کا مجسمہ کھڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بدھا اپنا سر دھیان سے رکھ کر خود ایک کونے میں جا کھڑا ہوا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ میرے سر کی کیا قیمت لگتی ہے۔

کریم آباد میں کوئی ورکشاپ نہیں اور نہ کوئی قسائی کی دکان ہے۔ قصاب دور دور تک دکان نہیں کھول سکتے ہیں۔ یہاں لوگ اپنی آب و ہوا اور ماحول کا خیال رکھتے ہیں۔ صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے اور اسی لیے ہنزہ پاکستان میں ایک جنت ہے۔

ہم بازار میں بے مقصد گھومتے گھومتے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آبیٹھے۔ بنچ پڑے تھے اور آگے اسی سائز کی لمبی میزیں تھیں۔ ہم نے بھاپ اڑاتا چکن کارن سوپ پیا۔ میں نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور سر پر اونی ٹوپی تھی۔ ہمارے ساتھ کراچی سے آئے ایک صاحب بیٹھے سوپ پی رہے تھے مگر نظریں ٹی وی پر تھیں۔ آج پاکستان کا بجٹ پیش ہو رہا تھا اور وہ بھی میری طرح سرکاری جاب کرتے تھے۔ کہنے لگے۔ ”اللہ کرے تنخواہ بڑھنے کا کوئی اعلان ہو جائے، گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔“

میں دنیا گردی سے فرار چاہتا تھا اور یہاں وہی باتیں تھیں جو میری روزمرہ زندگی کا حصہ تھیں۔ سیاحتی مقامات پر

کوئی ٹی وی، اخبار اور انٹرنیٹ نہیں ہونا چاہیے۔ ہنزہ میں بیٹھ کر پاکستان کے بجٹ پر بحث کرنا نری بدذوقی تھی۔ میں ابھی 2016ء میں وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھا یہ سوچتا ہوں کہ اگر اب میں ہنزہ یا اسکردو کے کسی قہوہ خانے میں بیٹھا ہوں اور سامنے ٹی وی پر کوئی سیاسی ٹاک شو چلتا ہو تو کیسا آلودہ ماحول بن جائے گا؟ ایسے کہ آپ کے گرم سوپ میں کوئی ریت ڈال دے اور پھر کہا جائے کہ اس کو پینا بھی ہے۔ میں نے اپنا سوپ کا پیالہ آدھا چھوڑ دیا اور باہر آنکلا۔ شاہد اور اشفاق نے اپنا بقیہ سوپ ختم کیا اور میں بلتت فورٹ کو ایک بلندی پر اکا دیکھ رہا تھا جو اب روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔

شام اب تاریکی میں بدلتی جا رہی تھی۔ میں نے کچھ تازہ چیری خریدیں اور پھر ہم اپنے ہوٹل کی بالکونی پر بیٹھے چیری سے لطف اندوز ہوئے۔ بالکونی سے راکاپوشی اندھیرے میں ڈوبی تھی اور بس ایک شائبہ تھا کہ یہاں راکاپوشی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان تاروں سے بھرا تھا۔ ایک سکون اور طمانیت پورے بدن میں محسوس ہو رہی تھی۔ ہنزہ کی ایسی شامیں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اب حیرت نہ تھی بلکہ ٹھہراؤ سا اتر رہا تھا۔

اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اچانک ایک جانی پہچانی خوشبو ساتھ تیرتی ہوئی آئی۔ میں نے اشفاق سے پوچھا تو اس نے بتاتا کہ یہ خاص قسم کی بیری کا درخت ہے جب پھول کھلتے ہیں۔ تو ایسی ہی خوشبو پھیلتی ہے۔ وہ پھول توڑ کر لایا تو ونیلا کی خوشبو سے پوری فضا مہک اٹھی۔ یہ ونیلا کے پھول تھے اور میری بیٹی قندیل ونیلا آئس کریم شوق سے کھاتی ہے اور جب بھی میں اس کے لیے یہ آئس کریم لاتا تو یہی مہک اٹھتی تھی۔ اس خوشبو نے مجھے اپنی بیٹی کی یاد دلا دی اور کچھ لمحے میں اس کے خیالوں میں کھو گیا۔ اس کا معصوم چہرہ ذہن کے کینوس پر ابھر آیا اور میرے ہونٹوں پر شفقت بھری مسکراہٹ کھیل اٹھی۔

پوری رات سر میں ہلکا سا درد رہا جو مجھے بے چین کرتا رہا۔ شاید بلندی کا اثر تھا یا کوئی تھکاوٹ تھی۔ صبح اٹھا تو یہی کیفیت برقرار تھی۔ سورج کی پہلی کرنیں پہاڑوں، کھیتوں اور مکانوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس بار میری کیفیت مختلف تھی۔ پہلی بار صرف فیری میڈو کا عشق سوار تھا اور اس بار میں علیحدہ سی کیفیت میں تھا۔ میں شمشال جانے پر پُرجوش تھا اور اس بار سفر کی ذمہ داریاں بھی نہیں تھیں اور شاہ جی کے لڑکھڑانے کا کوئی اندیشہ بھی نہ تھا۔ نہ مجھے کوئی راشن اٹھانا تھا اور نہ کسی گائیڈ کا مسئلہ تھا۔ میں سب اندیشوں اور ذمہ داریوں سے آزاد تھا۔ اپنی مرضی سے نظاروں معاون آسانی سے کھو سکتا تھا۔ ایک خوبصورت احساس دل میں گھر کیے بیٹھا تھا۔ میری ازلی خوشی پوری ہو رہی تھی۔ ہنزہ سے آگے گوجال اور پھر شمشال تھا۔

صبح اٹھا تو اپنی دوہری سوچوں کے ساتھ اٹھا۔ پھر کینیڈا کو ذہن سے نکالا۔ کیمرا اور دوربین لی اور چھت پر آگیا۔ شاہد اور اشفاق ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

راکاپوشی آدھی بادلوں کے پردے میں چھپی تھی۔ جہاں جہاں سے بے پردہ تھی وہاں سے وہ سورج کی کرنوں میں جگمگا رہی تھی۔ دِرَن پیک بھی بادلوں کی چادر میں لپٹی تھی۔ پیچھے التر پیک کی ڈھلوانوں سے بھی بادل اتر رہے تھے۔ اس کے ساتھ بلند خشک چٹانوں کی چوٹیوں پر تازہ برفوں کا سفوف پڑا تھا۔ اوپر ابھی بھی برف گر رہی تھی۔ مست ہوا انہی برفوں کی ٹھنڈک لیے وادی میں گھومتی پھرتی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا میرے اور راکاپوشی کے بیچ ہوٹل کی چھت کے ساتھ ساتھ پیپل اور سفیدے کے بلند پیڑ اسی ہوا کے زور سے جھوم رہے تھے۔ سورج کی کرنیں جب ان پتوں پر پڑتیں تو ہوا کے زور سے ہلتے پتے جھل مل جھل مل کرنے لگتے جس سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ان درختوں پر بے تحاشا چڑیوں کی سائز کے رنگین پرندے شاخوں پر پھدکتے شور مچا رہے تھے۔ اس وقت ہنزہ کی آب و ہوا میں یہ واحد شور بلند ہو رہا تھا۔

واپس کمرے میں آیا تو وہ دونوں اٹھ چکے تھے۔ کمرے میں تین بیڈ تھے اور یہ خاصا آرام دہ کمرا تھا۔ غسل خانے میں پانی ایسا ٹھنڈا تھا کہ جیسے برف گھولی گئی ہو۔ اس پانی سے غسل کرنا ایک سزا تھی مگر غسل کے بعد پورا بدن ایک دم چست ہو گیا۔ آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ناشتا وہی روایتی سا تھا۔ پراٹھوں کے ساتھ انڈوں کے آملیٹ اور گرم چائے۔ ہم ڈائننگ روم میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اشفاق کے لبوں پر پھر شرارت تھی۔ وہ شاہد سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا کلاس کی ساری لڑکیاں تم پر فدا تھیں یا ایک آدھ؟“

شاہد نوالہ نگلتے ہوئے بولا۔ ”ٹرائی تو سب نے کی مگر.....“ پھر اس نے دوبارہ ایک آہ بھری۔ ”بس مجھے سمجھ ہی نہیں آئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“

میری جانب دیکھتے ہوئے اشفاق بولا۔ ”ندیم صاحب! میں آپ سے یہی کہتا تھا کہ شاہد بہت ہی معصوم شخص ہے۔“

میں اشفاق کی شرارت سمجھ رہا تھا۔ لڑکا ہو یا لڑکی دونوں اس خوش فہمی میں آسانی سے پڑ جاتے ہیں کہ وہی سارے زمانے میں ہر دل عزیز ہیں۔ بس کوئی انہیں اس غلط فہمی میں ڈالنے والا ہو۔ شاہد نے اپنی یہ کمزوری اشفاق کے ہاتھ میں دے دی تھی اور اب وہ اس کا استعمال بڑی خوبی سے کر رہا تھا۔ یہ نہیں کہ شاہد کوئی بیوقوف انسان تھا۔ بلکہ وہ نہایت ہی سمجھ دار اور سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان تھا مگر ہر انسان کی کوئی جبلی کمزوریاں ہوتی ہیں جس میں وہ خوبصورتی سے پھنستا چلا جاتا ہے۔

تبھی اوپر بلتت فورٹ کی جانب سے ڈھول بجنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ایک شور سا تیرتا ہوا ہماری جانب آرہا تھا۔ ہم بھی قلعے کو جانے کے لیے ہوٹل سے باہر آئے۔ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا نیلا آسمان اور دھیرے سے چلتی ہوا نے ہنزہ کا مزاج ہی بدل ڈالا تھا۔ ایسا نیلا آسمان آپ صرف پاکستان کے شمال کے علاقوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ شہروں میں تو آلودگی، دھوئیں اور گرد ہر وقت آسمان پر اٹکی رہتی ہے۔ اس لیے بڑے شہروں اور اب تو چھوٹے شہروں کے رہنے والے آسمان کی جانب کم ہی دیکھتے ہیں۔

قلعے کے باہر پہنچے تو ہنزہ کا روایتی رقص جاری تھا۔ ہنزہ کے مرد حضرات اپنے روایتی لباس میں ڈھول کی تھاپ پر تھرک رہے تھے۔ ایک جشن برپا تھا۔ زندگی تھی اور وہ بھی بھرپور۔ کئی کیمرے لگے تھے جو یہ سب فلم بند کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کچھ گوروں کے لیے یہ میلہ سجایا گیا۔ وہ فلم بنا رہے تھے۔ واپس جا کر ٹی وی چینل کو مہنگے داموں بیچ دیتے۔ کچھ حقیقت اور کچھ باتیں اپنی طرف سے ڈال دیتے۔ یہ ٹورزم کی انڈسٹری تو ہمیشہ فکشن پر چلتی ہے۔ منظر یا جگہ ایک ہوتی ہے اور یہ آپ پر منحصر ہے کہ اس میں کیا رنگ ڈالیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جو دیکھا اور محسوس کیا وہی لکھوں۔ رنگ آمیزی سے دور رہوں ورنہ کچھ رنگ نہ ہوں تو نہ لکھنے کا مزہ آتا ہے اور نہ پڑھنے کا۔

قلعہ پچھلی بار شاہ جی کے ساتھ میں دیکھ چکا تھا۔ اس بار اس کی بلندیوں سے ہنزہ کی وادی کا نظارہ کر رہا تھا۔ بادلوں نے چوٹیوں کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ سورج بادلوں میں پوشیدہ تھا مگر اپنا پتا دیتا تھا۔ خنک ہوا چل رہی تھی اور قلعے کی بلندی پر تو بے دریغ تھی۔ نیچے وادی کے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ یہیں کل والے صاحب سے ملاقات ہوگئی جو ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ہمارے ساتھ بیٹھے سوپ پیتے تھے اور ملکی بجٹ سنتے تھے۔ اپنا نام فیصل بتایا اور چہک کر بتا رہے تھے کہ بیس فیصد تنخواہ بڑھ گئی ہے۔ یہ کہہ کر مجھ سے ہاتھ ملایا پھر بتایا کہ اپنا تو یہ ٹرپ فری میں ہو گیا، کیونکہ جتنی تنخواہ بڑھی ہے، اتنا ہی میرا ٹرپ پر خرچ ہوا ہے اور پھر ہاتھ ملایا۔

میرے دونوں ساتھی دور کھڑے مسکراتے رہے کیونکہ وہ دونوں جانتے تھے کہ میں اس وقت سخت کرب میں ہوں۔ یہ نہیں کہ مجھے اپنی تنخواہ کے بڑھنے کی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ میں ہر سوچ سے آزاد رہنا چاہتا تھا پھر میں نے اس سے ایک طرح کا زبردستی ہاتھ ملایا پھر اجازت مانگی اور کھسک گیا۔

اشفاق شروع میں کہہ رہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ شمشال جائے گا پر مجھے بھی شروع سے یقین سا تھا کہ وہ نہیں جا سکے گا۔ گلگت اور بلتستان کے رہنے والے سیر کے لیے کسی خطرناک ٹریک پر نہیں جاتے۔ یہ میرا خیال ہے۔ انہیں جانے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ ان کی زندگی خود ایک ٹریک پر چلتی ہے۔ میرے ساتھ وہ فیری میڈو چلے گئے تھے اس لیے کہ میں ان کے بغیر نہیں جا سکتا تھا مگر یہاں انہیں معلوم تھا کہ تارڑ جیسا کوہ نورد میرے ساتھ ہے اور مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں اس لیے میں بھی اس پر کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ہم قلعے سے نکلے تو سوچا کہ کوئی چھوٹا سا ٹریک کر لیتے ہیں۔ اشفاق نے کہا کہ دوئیکر چلتے ہیں۔ نام تو میں نے پہلے سے سن رکھا تھا۔ ہنزہ کی ایک حسین وادی، جہاں سے چھ ہزار میٹر بلند لیڈی فنگر کی پیک نظر آتی ہے اور ساتھ چھ ہزار میٹر سے بلند ہنزہ پیک کو دلکش برفانی اور دل دہلا دینے والے نظارے ہیں۔ التر گلیشیر کی جھلک آپ کو وہاں سے دکھتی ہے۔ ایگلنیسٹ کے نام سے ایک ہوٹل بھی وہاں ہے مگر ہنزہ کے مہنگے ہوٹلوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ہم قلعے کی پچھلی سائیڈ پر آ نکلے۔ ایسا لگا کہ ہم کریم آباد یعنی ہنزہ سے کہیں دور آ گئے ہوں۔ یہ ایک خاموش اور گہرائی میں ڈوبی وادی تھی۔ ارد گرد برفانی چوٹیوں کا راج تھا۔ بادل ہنزہ میں نیچے تک اتر آئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی اور پھر تھم جاتی تھی۔ میرا رات والا سر کا درد بڑھ گیا تھا جو مجھے تھوڑا سا بے آرام کرتا تھا۔ میں کبھی زگ زیگ کرتے رستے کی جانب دیکھتا، جو پہلے نیچے گرتا ہوا چلا جاتا تھا اور پھر کہیں اوپر آسمانوں میں اٹھتا اور گم ہو جاتا تھا۔ کبھی اپنے آپ کو شاہد سے نظریں بچا کر دیکھتا اور اپنی صلاحیت جانچتا تھا۔ وہ بھی مجھے اپنی مشکوک نگاہوں سے پرکھتا تھا۔

ایک مقامی بوڑھا وہاں سے گزرا اور ہمیں سوالیہ نظروں

سے دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ راستہ دوئی کر کو جاتا ہے؟'' میں نے اس پُرخطر راستے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ جاتا تو ہے مگر آپ جیپ سے بھی وہاں ایک دوسرے راستے سے جا سکتے ہیں۔'' پھر وہ اشفاق کی جانب مڑ کر بولا۔ ''یہ راستہ عمودی، خطرناک اور تنگ ہے اور یہ نہیں جا سکے گا۔'' وہ میری جانب اشارہ کر کے اشفاق کو مطلع کر رہا تھا۔

میں شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ میں اپنی طور پر شمشال جا رہا تھا اور یہ مجھے دوئی کر کے لیے بھی نااہل قرار دے رہا تھا۔ آج لکھتے ہوئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج تک اس ملک میں کوئی نااہل شخص بھی نااہل نہ ہوا اور میں تو ہنزہ پہنچ کر آدھا تو اپنے آپ کو اہل ثابت کر چکا تھا۔ میں تو فیری میڈو کے علاوہ بھی کئی اور ٹریک کر چکا تھا اور اپنے تئیں ٹریکر تھا۔ مقامی ریڈیو پر کچھ انٹرویو بھی کر چکا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرے، کندھے اچکائے، بھنویں چڑھائیں اور اسی عمودی ٹریک پر چل پڑا۔ مجھے جاتے دیکھ کر وہ دونوں بھی کچھ سوچتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

ہم آہستہ آہستہ نیچے اترے۔ التر دریا کے اوپر بنے ایک لکڑی کے پل کو عبور کیا۔ ایک مقامی عورت پیٹھ پر لکڑیوں کا بوجھ اٹھائے چلی آ رہی تھی اور اس کے اوپر ہنزہ پیک کی برف جمی تھیں۔ بادل جھک جھک کر نیچے اترتے اور وادی میں پھیل رہے تھے۔

اچانک ہمارا سامنا ایک عمودی چڑھائی سے ہوا۔ ایک سیڑھی تھی جو کہیں آسمانوں میں ٹنگی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس پر نپے تلے قدم رکھتا، ایک خوف کی حالت میں اوپر کی جانب چلا جا رہا تھا۔ برف پوش پہاڑ میرے اوپر سایہ فگن تھے۔ برفانی ہواؤں کے باوجود میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اس پسینے میں خوف، ٹانگوں کی لرزش اور کم ہمتی سب شامل تھیں۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا مگر دل کو اتنا وقت میسر نہ تھا کہ اسے آگے بدن کی جانب پھینکے اور اسی لیے وہ زور زور سے احتجاج کر رہا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ ہم دو فٹ کی پگڈنڈی پر چل رہے تھے جس کی ایک جانب پہاڑ تھا اور دائیں جانب ہولناک کھائی تھی۔ ذرا سا پاؤں پھسلا اور آپ ہواؤں میں تیرتے ہوئے سینکڑوں میٹر نیچے اس سرد اور گہری وادی میں کہیں پڑے ہوں گے جس کی تہہ دیکھنے کے لیے اشفاق نے مجھ سے دوربین مانگ لی تھی۔

ہم اشفاق کو چھوڑ کر گائیڈ سے کہہ رہے تھے کہ اگر وہ اس راستے کا تھوڑا سا بھی علم رکھتا ہے تو ہمیں اس پل صراط سے نہ گزارتا۔ کریم آباد ہمارے نیچے تھا اور ہم خلا میں کہیں بلند ہوتے جا رہے تھے۔ سب سے حسین منظر بلتت فورٹ کا تھا۔ یہاں سے اس کی بیک سائیڈ نظر آتی تھی۔ ایک قلعہ، ایک بلند ترین اور پتھریلی چٹان پر اٹکا کھڑا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ہوا کا جھونکا اسے لے اڑے گا یا اس کو نیچے گہری کھائی میں جا پٹخے گا۔ یہ منظر ایک حیرت کا مقام تھا اور میں بار بار پیچھے مڑ کر یہ نظارہ دیکھتا رہا۔

نگر، مومن آباد اور التت گاؤں بہت نیچے ہوتے گئے۔ ان کے مکانات اب کھلونوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ یہ منظر آپ کسی ہوائی جہاز سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تنگ پھسلتی ہوئی پگڈنڈی سے اسے دیکھنا واقعی دل گردے کا کام تھا۔

سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی اور راستہ پاؤں کے نیچے سے کھسکنے لگا۔ میں نے ان دونوں مارخوروں سے کہا کہ آج اس سے بچ نکلا تو شمشال میرے لیے مال روڈ سے زیادہ نہیں۔ پیاس لگی تو پتا چلا کہ ہمارے پاس پانی بھی نہیں ہے۔ میں خون خوار نگاہوں سے اشفاق کو دیکھ رہا تھا اور وہ شہزادہ صرف زیرِ لب مسکرانے پر اکتفا کرتا رہا تھا۔ شاہد بولا۔ ''اگر آپ بگروٹ چلتے تو میں پانی اور کھانے کا سب انتظام کرتا اور یہ .... گائیڈ تو آج ہمیں یہیں ان کھائیوں میں کہیں ہمیشہ کے لیے دفن کر کے چھوڑے گا۔''

اشفاق کہاں خاموش رہنے والا تھا۔ ''میرا وعدہ ہے کہ تمہاری لاش ڈھونڈ کر بگروٹ میں ہی کہیں دفن کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر مجھے تو کینیڈا جانا ہے میرے اس خواب کی کرچیاں تو مت کرو۔''

ہم اس قسم کی گفتگو سے اپنے آپ کو ریلیکس کر رہے تھے۔ اب برفانی چوٹیاں مکمل طور پر ہمارے آمنے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ بادل ان سے لپٹے چلے جا رہے تھے۔ چوٹیوں سے نیچے تک یہ برفوں میں ڈھکی تھیں۔ لیڈی فنگر، گولڈن پیک اور ہنزہ پیک اپنے پورے جوبن اور دلکش حسن کے ساتھ مدمقابل تھیں، جہاں سے برفیلی ہوائیں اٹھ رہی تھیں۔ ہم تین گھنٹے سے چل رہے تھے۔ ہمارے پاس پانی کی ایک بوند نہ تھی۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا جیسے یہی ہمارا آخری سفر ہے۔ اب نہ میں کینیڈا جا پاؤں گا اور نہ شمشال۔

سفر کہانی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے چوتھے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

استاد بڑے غلام علی

وہ اپنے فن میں یکتا تھے۔ ان کی قابلیت نے پچھلوں کی یاد ذہن سے محو کردی اور بعد میں آنے والوں کے سروں کو احتراماً جھکا دیا۔ ان کی آواز نے دلوں کو روشنی سے بھر دیا۔ جہاں ان کے قدم پڑے، وہاں فن کی کونپلیں پھوٹیں۔ اپنے دور میں اُنھیں کلاسیکی موسیقی کا شہنشاہ کہا جاتا تھا۔ یہ تذکرہ ہے جناب بڑے غلام علی کا۔ وہ 2 اپریل 1902ء کو قصور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق مغربی پنجاب کے ایک معروف موسیقار گھرانے سے تھا جو پٹیالا قصور گھرانا کہلاتا ہے۔ اُن کے والد علی بخش خان بہت اچھے گلوکار تھے۔ کچھ تو ماحول کا اثر، پھر خداداد صلاحیت، اُنہوں نے تربیت کے مراحل تیزی سے طے کیے۔ پانچ سال کی عمر میں اپنے چچا کالے خان سے سارنگی اور گائیکی سیکھنی شروع کردی تھی۔ اس زمانے میں قرب و جوار میں کالے خان کا ڈنکا بجا کرتا۔ بڑے معروف گلوکار تھے۔

کچھ برس بعد کالے خان کا انتقال ہوگیا تو وہ اپنے والد کے نقش پا کا تعاقب کرنے لگے۔ ان کی ترتیب دی ہوئی چند دھنوں پر طبع آزمائی کی۔ سفر آگے بڑھ رہا تھا مگر تشنگی کا احساس ہوتا۔ اندر ہی اندر کوئی کمی کھٹکتی۔ دراصل انہیں ایک نئے ساز کی تلاش تھی، جس کا باج اُن کی آواز سے ہم آہنگ ہوجائے۔ انہوں نے ایک ساز سر منڈل تشکیل دیا۔ 21 سال کی عمر میں وہ بنارس منتقل ہوگئے جہاں انہوں نے ہیرابائی نامی ایک فنکارہ کے ساتھ سارنگی بجانا شروع کی۔ ان کا فن عوام کے سامنے آنے لگا۔

سارنگی ذریعہ معاش تھی، مگر حقیقتاً تھے وہ ایک گلوکار۔ اس زمانے میں وہ اپنے چچا اور والد کی دھنیں گایا کرتے۔ وہ پٹیالا گھرانے سے تعلق رکھنے والے استاد اختر حسین خان اور استاد عاشق علی خان کے شاگرد بھی رہے۔ پھر وہ موقع آیا، جب ان کی آواز سامعین کی ایک بڑی تعداد تک پہنچی۔ کلکتہ کی ایک تقریب میں لوگوں نے انہیں سنا تو مسحور ہوگئے۔ جلد ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگوں کو خبر ہوگئی کہ وہ کوئی عام گلوکار نہیں۔ آواز کے تنوع، سرگم پر گرفت، مٹھاس، لہجے کی لچک، ہر تال کو آسانی سے نبھانے کی بے پناہ صلاحیت نے ان کی شہرت کو مہمیز کیا۔

ان کی انفرادیت مختلف ثقافتوں کا علم اور مختلف گھرانوں کی موسیقی سے واقفیت تھی۔ خان صاحب نے موسیقی کی چار وارثتوں کی آمیزش سے ایک نیا انداز ترتیب

دیا۔ ان چار وارثتوں میں اُن کے اپنے پٹیالا قصور گھرانے کا انداز، دھروپد کا بہرام خانی عنصر، جے پور کی گردش اور گوالیار کی آراستگی شامل تھی۔

ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا کہ تقسیم کا مرحلہ آگیا۔ ان کا گھر تو قصور تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ادھر آگئے مگر یہاں انہوں نے خود کو مطمئن نہیں پایا۔ کلاسیکی موسیقی کے لیے ادھر حالات اتنے سازگار نہیں تھے۔ وہ قدرداں بھی نہیں تھے جو ان کی عظمت کو خراج پیش کرتے۔ وہ بھارت چلے گئے۔ وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے۔ ''اگر ہر گھر سے ایک بچے کو کلاسیکی موسیقی سکھائی جاتی تو یہ ملک کبھی تقسیم نہ ہوتا۔'' 1957 میں بمبئی کے وزیر اعلیٰ کی کوششوں سے انہیں ہندوستانی شہریت حاصل ہوئی۔ انہیں مالا بار ہل پر ایک بنگلا فراہم کیا گیا۔

ایک عرصے وہ کلاسیکی موسیقی تک محدود رہے۔ فلمی پروڈیوسروں اور موسیقاروں کے بے حد اصرار کے باوجود اس سمت نہیں گئے۔ پھر لازوال فلم ''مغل اعظم'' کے ڈائریکٹر خان آصف نے یہ بیڑا اٹھایا۔ وہ جنونی آدمی تھے۔ وہ دھن کے پکے۔ خان صاحب کے پیچھے لگ گئے۔ انہوں نے ٹالنے کی لاکھ کوشش کی، مگر جو شخص ''مغل اعظم'' جیسی مشکل فلم بنانے کا ارادہ باندھ چکا ہو، اسے ٹالنا مشکل۔ کہتے ہیں، جان چھڑانے کے لیے خان صاحب نے بھاری معاوضہ طلب کیا کہ ڈائریکٹر خود ہی مایوس ہو کر لوٹ جائیں۔ توقع کے برعکس خان آصف نے فوراً ہامی بھر لی۔ انہوں نے فلم کے لیے دو گیت گائے، جو راگ سوہنی اور راگ رگیشری پر مبنی تھے۔ اس فلم کے موسیقار نوشاد تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں لتا اور محمد رفیع کو زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپے ملا کرتے تھے، بڑے غلام علی نے ایک گیت کے ڈھائی ہزار روپے لیے تھے۔

استاد بڑے غلام علی کی خدمات کے اعتراف میں انہیں سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ اور 1962 میں پدم بھوشن سے نوازا گیا۔ آخری برسوں میں بیماریوں نے انہیں گھیر لیا۔ علالت نے لگ بھگ مفلوج کر دیا تھا۔ 23 اپریل 1968 کو حیدر آباد دکن میں ان کا انتقال ہوا۔

اُس عہد کے تمام بڑے کلاکاروں نے انہیں شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ برصغیر میں ان کی یاد میں کتنی ہی تقریبات منعقد ہوئیں۔ ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو سے ان کے گیت نشر ہوتے رہے۔ آج بھی کلاسیکی موسیقی کے رسیا اُن ہی کے مداح ہیں۔ ان ہی کی آواز شائقین کے دلوں کو مسرور کرتی ہے۔

اقبال بانو

کچھ فنکاروں سے عظمت منسوب ہو جاتی ہے۔ وہ عوام کے دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ چاہے ناقدین کتنا اصرار کریں کہ جناب ان جیسے تو اور بھی کئی ہیں، فلاں ان سے پختہ تھا، فلاں ان سے بہتر، مگر کیا کیجیے، شہرت کی دیوی ان کے ساتھ، محبت ان کے دامن میں، عزت و احترام ان کا نصیب۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال بانو باکمال گائیکہ تھیں۔ ستھری نکھری آواز، زبان پر خوب گرفت، ادائیگی کمال، پھر ان کی نفیس شخصیت... ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں، جو کسی فنکار کو شہرت عطا کر سکتی تھیں مگر ان کے ہاتھ ایک ایسا نسخہ آگیا جس نے شہرت کی چوٹی سے اٹھا کر عظمت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ اور یہ تھا کلام فیض۔ یہ کہانی اقبال بانو کی ہے، جنھوں نے فیض کے کلام کو اس عمدگی سے گایا کہ فیض صاحب نے اپنی وہ نظمیں اُن کے نام کر دیں۔ قصہ مشہور ہے، ایک تقریب میں کسی نے فیض صاحب سے درخواست کی، وہ اقبال بانو کی نظم ''دشت تنہائی میں'' تو سنا دیں۔ فیض صاحب ہنسے اور کہا: ہاں، اب وہ اقبال بانو ہی کی نظم ہے۔

اقبال بانو 1935 میں دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ گائیکی کا شوق بچپن سے تھا۔ یہ ان کی سہیلی کے والد تھے، جنھوں نے ان کے ابا کو قائل کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو موسیقی سیکھنے کی اجازت دیں۔ یہ ان کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ وہ دہلی گھرانے کے استاد چاند خان کی شاگرد رہیں۔ باقاعدہ گنڈا بندھوایا۔ انہوں نے کلاسیکی اور نیم کلاسیکی

گائیکی کے اسرار و رموز سے آگہی حاصل کی۔ تربیت نے ان کا جوہر نکھار دیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے پہلے پہل ان کی آواز سنائی دی جس میں بڑے امکانات تھے۔

ان کی ملتان کے ایک زمین دار گھرانے میں شادی ہوئی۔ تو پاکستان آگئیں، مگر فن سے دور نہیں ہوئیں۔ ریڈیو کے ذریعے ان کی آواز ملک کے کونے کونے میں پہنچی۔ 1957 میں لاہور آرٹس کونسل میں ہونے والی تقریب میں یہ انکشاف ہوا کہ لائیو پرفارمنس ان کا اصل میدان ہے۔ اس وقت فلم انڈسٹری کے حالات خاصے اچھے تھے۔ وہ بھی اس جانب گئیں۔ فلم گم نام، قاتل، انتقام، سرفروش اور نا گن میں ان کی آواز سنائی دی۔ ان کی کاوشوں میں "تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے" اور "الفت کی نئی منزل کو چلا" جیسے لازوال گیت بھی شامل تھے، جنھیں سننے والوں کی دھڑکن آج بھی تیز ہو جاتی ہے۔

فلموں میں تو جگہ بنالی، مگر رجحان غزل اور نیم کلاسیکی موسیقی کی جانب تھا۔ ٹھمری اور دادرے کے ساتھ انہوں نے غزل کو اپنے مخصوص نیم کلاسیکی انداز میں گایا اور خوب داد بٹوری۔ جب کلام فیض کو اپنی آواز میں ڈھالا تو یکدم ان کی حیثیت اساطیری ہوگئی۔ جب وہ "دشت تنہائی میں" گاتی تھیں، تو ایک سماں بندھ جاتا۔ فیض کے جادوئی الفاظ اور ان کی طلسماتی آواز سامعین کو مسحور کر دیتی۔ آج بھی پی ٹی وی کی وہ ریکارڈنگ نشر ہوتی ہے تو انسان گم ہو جاتا ہے۔

انہوں نے فیض کی مشہور زمانہ نظم "ہم دیکھیں گے" بھی گائی۔ ترقی پسندوں نے اسے اپنا ترانہ بنالیا۔ ضیاء دور میں یہ جدوجہد کی علامت تھی۔ اس کی لائیو ریکارڈنگ جادوئی اثر رکھتی ہے، جہاں حاضرین نعرے لگاتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں۔ جب وہ اس مصرعے پر پہنچتی ہیں۔ "جب تاج اچھالے جائیں گے۔" تو برقی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ کہا جاتا ہے، جب 1985 میں انہوں نے یہ نظم گائی تو پچاس ہزار کا مجمع موجود تھا۔ اس وقت فیض صاحب کی شاعری پر پابندی تھی مگر اقبال بانو کی آواز کے ساتھ پیغام فیض پورے ملک میں پھیل گیا۔ انہوں نے متعدد پروگراموں میں یہ نظم گائی۔ یہی غزل ان کا ٹریڈ مارک بن گئی۔ ہر محفل میں اس کی فرمائش ہوتی۔

فیض کے علاوہ انہوں نے ناصر کاظمی کو بھی بڑی خوبی سے گایا۔ وہ فارسی کلام بھی بڑی عمدگی سے گاتی تھیں جس کی وجہ سے ایران میں انہیں بہت پسند کیا جاتا۔ افغانستان میں بھی وہ خاصی مقبول تھیں۔ انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ ناقدین ان کے اور بیگم اختر کے انداز میں مماثلت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ 21 اپریل 2009 کو اس ممتاز گلوکارہ کا لاہور میں انتقال ہوا۔

شان

اگر کوئی آپ سے پوچھے، عہد حاضر کا سب سے بڑا پاکستانی فلم اسٹار کون ہے؟ تو آپ کو زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ بے شک آج علی ظفر اور فواد خان کا ہندوستان میں ڈنکا بج رہا ہے، مگر پاکستان فلم انڈسٹری پر جو شخص راج کرتا ہے، اس کا نام ہے شان۔

اس باصلاحیت فلم اسٹار نے انڈسٹری کو کتنی ہی یادگار فلمیں دیں۔ وہ پاکستان کے مقبول ترین ہی نہیں، مہنگے ترین فنکار بھی ہیں۔ انہیں متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ان کی قابلیت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ البتہ ان کے مزاج سے کچھ لوگ شاکی بھی ہیں۔ ان کے نظریات سے بھی ایک حلقہ متفق نہیں۔

وہ دو عشروں سے پاکستانی انڈسٹری میں ہیں۔ 500 سے زاید فلمیں کیں۔ ان میں سے بیش تر فلمیں قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ اس کا سبب شان نہیں، بلکہ وہ تاریک دور تھا جو 90 کی دہائی کے آخر میں گنڈاسا کلچر کی انڈسٹری میں واپسی ہوئی۔ اردو انڈسٹری بیٹھ گئی۔ کچھ خام فلمیں انہوں نے اپنے کیریر کے اوائل میں بھی کیں۔ البتہ ان کی موجودہ حیثیت ایک بلند مینار کی سی ہے، جو دور سے ممتاز دکھائی دیتا ہے۔

شان نے 27 اپریل 1971 کو لاہور میں آنکھ کھولی۔ وہ اپنے زمانے کی مشہور اداکارہ نیلو اور معروف ہدایتکار ریاض شاہد کے بیٹے ہیں۔ ان کے چچا فیض شاہد کا تعلق بھی پروڈکشن کی دنیا سے تھا۔ ایچی سن کالج میں وہ زیر تعلیم رہے۔ کم عمری میں اداکاری کا تجربہ کیا۔ الف نون میں نظر آئے، ایک ایوارڈ بھی اپنے نام لیا، مگر اس زمانے میں اداکاری ان کی ترجیح نہیں دی۔ وہ امریکا چلے گئے۔ نیویارک کے Newtown High School میں زیرِ تعلیم

رہے۔اس زمانے میں وہ ولن بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ سات برس بعد لوٹے، تو حالات ایسے ہوگئے کہ 19 سالہ شان کو اپنے والد کی کمپنی ریاض شاہد فلمز سنبھالنی پڑی۔ یہ ذمے داری فلموں کی سمت لے آئی۔ ان کی پہلی فلم ''بلندی'' 1990 میں ریلیز ہوئی۔ ریما ان کے مدمقابل تھیں۔ آنے والے برسوں میں یہ جوڑی انڈسٹری پر راج کرنے والی تھی۔

اب وہ متعدد فلموں میں دکھائی دیے۔ ان کا شمار چوٹی کے اداکاروں میں ہونے لگا۔ امریکا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے اس فنکار نے ہدایت کاری کے میدان میں بھی قدم رکھا، ''گنز اینڈ روزس'' جیسی منفرد فلم بنائی، جو 1999 میں ریلیز ہوئی۔ یہ اس زمانے کی مہنگی ترین فلم تھی۔ ''مجھے چاند چاہیے'' بھی ان کی اچھی کاوش تھی۔ 2001 میں ریلیز ہونے والی ''موسیٰ خان'' بطور ہدایت کار ان کی تیسری فلم تھی، جو خاصی کامیاب ہوئی۔ یہ ایک فارمولا فلم تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگا کہ معیاری فلمیں بنانے کے خواہش مند شان انڈسٹری کی جمود پرستی کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔

سید نور کی ''چوڑیاں'' ریلیز ہونے کے بعد پنجابی فلموں کا دور واپس آیا۔ اردو فلموں کا بھٹا بیٹھ چکا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے بے تحاشہ پنجابی فلمیں کیں۔ کئی تو انتہائی بے معنی تھیں۔ کہا جاتا تھا، وہ فلم کا اسکرپٹ نہیں دیکھتے، فقط اپنے وقت کے پیسے چارج کرتے ہیں۔

اس باصلاحیت اداکار کو ہندوستان سے بھی آفرز ہوئیں مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ان کے فیصلے کے حق میں مضبوط دلائل دیے جاتے ہیں مگر کچھ افراد اس کو انا پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چند برس قبل جب ایک ایوارڈ شو میں انہوں نے ہندوستان میں کام کرنے والے پاکستانی فن کاروں کو بکاؤ مال کہا تو خاصی لے دے ہوئی۔ اور بھی کئی اسکینڈلز ان سے منسوب ہوئے۔ انہوں نے ٹی وی پر میزبانی کا بھی تجربہ کیا مگر وہ ناکام رہا۔

شعیب منصور کی فلم ''خدا کے لیے'' نے مرتی ہوئی پاکستانی انڈسٹری کے لیے اُمید کے کچھ دیے روشن کیے۔ شان اس متاثر کن فلم کا حصہ تھے۔ 2013 میں بلال لاشاری کی فلم ''وار'' ریلیز ہوئی، جو اس وقت پاکستان کی تاریخ کی کامیاب ترین فلم تھی۔ اس میں شان اپنی صلاحیتوں کے عروج پر نظر آئے۔ ان کی فلم ''یلغار'' سے خاصی امیدیں ہیں، جو انڈسٹری کی مہنگی ترین فلم ہے۔

یوں لگتا ہے کہ یہ منفرد اداکار لوگوں کو حیران کرنے کی مزید صلاحیت رکھتا ہے۔ شائقین خواہش مند ہیں کہ وہ ہدایت کاری کی جانب لوٹیں۔ ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ وہ کشادہ دلی کے ساتھ ان پاکستانی اداکاروں کو قبول کریں جو بیرونی فلموں میں کام کررہے ہیں۔

نازیہ حسن

ساؤتھ ایشیا میں انہیں "Queen of Pop" کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے البمز کی 60 ملین سے زاید کاپیاں فروخت ہوئیں۔ جب انہوں نے انگریزی میں Dreamer Deewane گیت گایا، تو برٹش چارٹ تک پہنچنے والی پہلی پاکستانی سنگر بن گئیں۔

فقط دس برس کی عمر میں گائیکی کا سفر شروع کرنے والی یہ فنکارہ جب بیس برس کی ہوئی، تو وہ پاک و ہند کی مقبول ترین شخصیت بن چکی تھی۔ 80 کی دہائی میں نازیہ حسن برصغیر کی گائیکی کے افق پر ابھریں اور ایک عرصے تک انڈسٹری پر چھائی رہیں۔ انہوں نے گائیکی کا چہرہ ہی بدل دیا۔

اس منفرد گلوکارہ نے 3 اپریل 1965 کو کراچی میں آنکھ کھولی۔ ان کے بھائی زوہیب حسن اور بہن زارا حسن نے بھی گلوکاری کے میدان میں خود کو منوایا۔ نازیہ نے لندن سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی۔ 70 کی دہائی میں انہوں نے بطور چائلڈ آرٹسٹ پی ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں پرفارم کیا۔ ان کی آواز نے کئی پارکھوں کو متوجہ کیا۔ فلم انڈسٹری انہیں پکارنے لگی۔

عمر فقط 15 برس تھی، جب لندن کی ایک تقریب میں ان کی ملاقات بالی وڈ اداکار اور ہدایت کار فیروز خان سے ہوئی۔ وہ بھی ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے نازیہ کو اپنی فلم کے لیے گیت گانے کی پیشکش کردی۔ 1980 میں انہوں نے فلم ''قربانی'' کے لیے گیت ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے'' گایا۔ اس گیت نے دھوم مچادی۔ اگلے برس انہیں اس گیت کے لیے فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اس کی موسیقی ہندوستانی نژاد

برطانوی موسیقار Biddu نے ترتیب دی تھی۔ آنے والے برسوں میں بھی نازیہ کو اس باصلاحیت موسیقار کی سرپرستی حاصل رہی۔

1981 میں ان کا البم "ڈسکو دیوانے" ریلیز ہوا، جس کی پاکستان اور بھارت میں حیران کن پزیرائی ہوئی۔ اس سے قبل ایشیا میں کسی پوپ البم کو یوں ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا گیا تھا۔ ممبئی میں فقط ایک دن میں اس کی ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ ان کی خوبصورتی کے باعث انہیں انڈین فلموں میں اداکاری کی بھی آفرز ہوئیں، مگر وہ فقط گائیکی تک محدود رہیں۔

اب پوپ میوزک کی دنیا میں نازیہ اور زوہیب کا چرچا ہو رہا تھا۔ ان کی دوسری البم "بوم بوم" 1982 میں ریلیز ہوئی، جس نے ایک بار پھر کامیابی کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس کے گیت فلموں میں بھی استعمال کیے گئے۔ نازیہ حسن اب ایک "آئی کون" تھیں۔ انہوں نے میوزک کا چہرہ بدل دیا۔ تیسری البم "ینگ ترنگ" 1984 میں ریلیز کی گئی۔

ماضی میں پوپ آرٹسٹ کے گیتوں کی ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں ہوتی تھے (جیسے عالمگیر اور محمد علی شہکی کے گیت پی ٹی وی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیے جاتے تھے) مگر اس البم کی گیتوں کو پہلی بار باقاعدہ ویڈیوز کی شکل دی گئی۔ اس البم کا گیت "آنکھیں ملانے والے" سپرہٹ ہوا، جو آج بھی سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ مقبولیت کے بعد وہ پی ٹی وی کے کئی پروگراموں میں نظر آئیں۔ 1988 میں نشر ہونے والے پروگرام "سنگ سنگ" کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ وہ ہی ٹھہریں۔ کچھ یہی معاملہ پروگرام "میوزک 89" کا بھی تھا۔

پھر وہ انڈین فلم انڈسٹری کی طرف چلی گئیں۔ کئی گیتوں میں ان کی آواز سنائی دی۔ 1987 میں چوتھی البم "ہاٹ لائن" ریلیز کی گئی۔ 92ء میں اُن کی آخری البم "کیمرا کیمرا" آئی، جس میں منشیات کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا تھا۔

25 برسوں پر پھیلے فنکارانہ سفر نے انہیں برصغیر کا مقبول ترین فنکار بنا دیا۔ متعدد ملکی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ پاکستانی حکومت نے انہیں اعلیٰ ترین سول اعزاز پرائیڈ آف پرفارمینس دیا۔ انہوں نے یونیسیف کے ساتھ بھی بچوں کے حقوق کے لیے کام کیا۔

دھیرے دھیرے وہ کیمرے سے دور ہونے لگیں۔ انہوں نے گائیکی سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کا ایک سبب ان کی شادی بھی بنی۔ 1995 میں انہیں متعارف کروانے والے موسیقار Biddu نے انہیں "میڈ ان انڈیا" گانے کی پیشکش کی، مگر نازیہ کی حب الوطنی کو یہ گوارا نہیں تھا۔

یہ عظیم فنکارہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر 13 اگست 2000 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس سانحے کے بعد ان کے بھائی زوہیب حسن نے گلوکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

دنیائے موسیقی پر نازیہ حسن کے اثرات آج بھی واضح ہیں۔ پوپ کے میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کے لیے انہیں نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔ اب بھی انڈین فلموں میں ان کے گیتوں کو ری میک کر کے برتا جا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نازیہ حسن کا کوئی نعم البدل نہیں۔

عمر شریف

گووندا اور جونی لیور جیسے فنکار اُن کے پیروں کو ہاتھ لگاتے ہیں، تو ایسا بے سبب نہیں۔ ان سمیت پاک و ہند کے بہت سے اداکاروں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے اس پاکستانی آرٹسٹ کو کاپی کیا۔ ان کے پورے پورے اسکرپٹ اپنی فلموں میں شامل کر لیے۔ وہی چٹکلے، جو وہ اسٹیج پر سنایا کرتے، کچھ عرصے بعد انڈیا ڈراموں اور فلموں میں سنائی دے رہے ہوتے۔ جنھوں نے ان کی بے ساختگی کو چربہ کرنے کی کوشش کی، ان میں ایک بڑا نام اکشے کمار کا بھی ہے۔ اور بھی بہت ہیں۔ جب پڑوس میں اسٹینڈاپ کامیڈی کا چلن عام ہوا، مزاحیہ شو شروع ہوئے، تو کچھ ہی عرصے میں نوجوان پاکستانی فنکار ادھر چھا گئے۔ وجہ صرف ان کی یہ تھی کہ ان کا استاد لاجواب تھا۔

یوں تو معین اختر نے بھی کمرشل تھیٹر میں خوب نام کمایا، لیاقت سولجر اور شہزاد رضا جیسے سینئر فنکار بھی تھے، مگر عمر شریف کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کے فن کی قوت نے جیسے آگ لگا دی۔ ان کی شہرت پاکستان سے نکل کر بھارت پہنچی اور پھر پوری دنیا میں پھیل گئی۔ ہر وہ ملک جہاں اردو سمجھنے والے موجود تھے، وہاں ان کی اداکاری نے قہقہوں کا بازار لگا دیا۔ ایک اسٹیج ڈراما "بکرا قسطوں پر" کراچی سے شروع ہوا اور امریکا تک پہنچا۔ لوگ دیوانے ہو گئے۔ مگر عمر شریف کی شہرت کی وجہ فقط یہ ڈراما نہیں، ایک طویل سفر ہے، محنت سے رنگیں شب و روز ہیں۔ یہ ڈراما تو انہوں نے 89 میں کیا۔ اس کے بعد تو ہر طرف عمر شریف کا ڈنکا بجا کرتا۔ وی سی آر اور کیسٹ کا محتاج یہ ڈراما اگر سرحدیں عبور کر گیا، تو وجہ عمر شریف ہی تھے۔

ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے بھی اپنی دھاک بٹھائی۔ وہ منظر کون بھول سکتا ہے، جب ان کی نئی کیسٹ آتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی۔ ماتی کی دکان ہو یا پان کا کھوکھا، عمر شریف کی آڈیو کیسٹ چل رہی ہوتی۔ یہی کیسٹیں جب انڈیا پہنچیں تو وہاں سننے والے سر دھنتے۔ ایسا کمال کسی اور میں کہاں تھا۔ ہندوستان میں ایک سروے ہوا، تو انہیں دنیا کا سب سے بڑا کامیڈین قرار دیا گیا۔

عمر شریف 19 اپریل 1955 کو لیاقت آباد، کراچی میں پیدا ہوئے۔ اصل نام محمد عمر تھا۔ اداکاری کا شوق بچپن سے تھا۔ تھیٹر کا میڈیم اختیار کیا۔ کیریر کا آغاز 1974 میں فقط 14 سال کی عمر میں کیا۔ موسیقی سے شغف تھا، کچھ عرصے ایک بینڈ کے ساتھ کام کیا۔ نجی محافل میں پرفارم کیا کرتے تھے۔ بڑی محنت کی۔ ناکامیاں بھی ملیں۔ پھر سید فرقان حیدر اور معین اختر کے ساتھ کام شروع کیا۔ سائیڈ رول میں ایسے جوہر دکھائے کہ جلد ہی مرکزی کردار ان کے حصے میں آگئے، پھر جو ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ آج انہیں کامیڈی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔

اسٹیج کے علاوہ انہوں نے ٹی وی پر بھی خاصا کام کیا۔ میزبانی ان کا خاص شعبہ ٹھہرا۔ ان کا پروگرام عمر شریف شو مختلف اوقات میں مختلف چینلز سے نشر ہوا۔ انہوں نے فلموں کا بھی تجربہ کیا۔ کئی فلمیں ڈائریکٹ کیں۔ فلمی سفر 1986 سے 1999 تک جاری رہا۔ ''چاند بابو'' ان کی آخری فلم تھی۔ ان کی فلمیں بہت شوق سے دیکھی جاتیں، مگر بطور ہدایت کار انہیں وہ کامیابی نہیں ملی، جس کی توقع کی جارہی تھی۔ انہوں نے فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ان کی مقبولیت کا ایک سبب ان کے ڈراموں کا سیاسی و سماجی پہلو بھی رہا۔ وہ ملکی مسائل پر بڑی کاٹ دار تنقید کرتے۔ پولیس میں رشوت ستانی سے لے کر سیاست دانوں کی مفاد پرستی تک، انہوں نے ہر موضوع کو مزاح کا حصہ بنایا۔ اس پر [illegible] بھی ہوئے۔ بے نظیر بھٹو کے زمانے میں [illegible] نے'' کیا تھا۔ عام خیال تھا کہ اس میں میاں صاحب کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ بعد میں وہ زیر عتاب آئے۔ ان کی طلبی بھی ہوئی۔

سلام کراچی، ولیمہ تیار ہے، یہ ہے نیا تماشا، یہ ہے نیا زمانہ، یہ تو ہاؤس فل ہوگیا، لیس سر عید، نو سر عید، فلائٹ 420، ہاف پلیٹ، ہنستے رہو ہنستے رہو، ہم سے ملو، لوٹ سیل، ماموں مذاق مت کرو اور نئی امی پورا ابا ان کے مقبول ترین شوز میں سے فقط چند نام ہیں۔ یہ فہرست بڑی طویل ہے۔ بکرا قسطوں پر کے بعد میں اور بھی پارٹ آئے۔ انہوں نے کامیڈینز کی پوری ایک نسل پیدا کی۔ آج کے کتنے ہی معروف فنکاران کا دم بھرتے ہیں۔

جہاں انہیں سراہنے والے بہت، وہیں تھوڑی بہت تنقید بھی ہوتی ہے۔ کچھ کو شکوہ کہ جو طرح انہوں نے ڈالی، وہی بعد میں پھکڑ پن اسٹیج پر لائی۔ اس میدان سے اچھے لوگ دور ہوگئے۔ ایک وقت ایسا آیا، جب اسٹیج پر بے ہودہ ڈانس ہونے لگا۔ اس وقت عمر شریف نے، جو اسٹیج سے دور ہوگئے تھے، اس کی تجدید کی کوشش کی۔ کوششیں مثبت تھیں مگر زمانہ بدل رہا تھا اور اسٹیج کا دور ختم ہو رہا تھا۔

گو ان کی خاصی عمر ہوگئی ہے، بیماریوں کا بھی ساتھ ہے مگر آج بھی ویسی ہی بے ساختگی ہے، وہی پرانا انداز۔ اسٹیج پر ہوں، تو شگوفے چھوڑتے رہتے ہیں۔

احمد رشدی

وہ ایک فسوں گر تھے۔ ان کے گانے دھڑکن تیز کر دیتے۔ پیر تھرکنے لگتے۔ ان کے الفاظ سماعتوں میں رس گھلتے اور ذہنوں پر ثبت ہو جاتے۔ ان کے گائے ہوئے مقبول طربیہ، المیہ فلمی گیت اور غزلیں ان کی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کا ثبوت۔ روک اینڈ رول کے تو وہ بادشاہ ٹھہرے۔

احمد رشدی پاکستانی فلمی گائیکی کے سپر اسٹار تھے۔ ایک ورسٹائل گلوکار۔ پورے برصغیر میں ان کے نام کا ڈنکا بجا کرتا۔ پاکستان میں جدید موسیقی میں ان کا مقام یکتا ہے۔ کئی مشہور گلوکار رشدی کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً 583 فلموں کے لیے 5000 گانے گائے۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ اردو، گجراتی، بنگالی، بھوجپوری سمیت مختلف زبانوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ دراصل انہیں کئی زبانوں پر گرفت تھی۔ وہ بولتے، تو تعین ہی نہیں ہوتا کہ ان کی اصل زبان کیا ہے۔ ان کی انفرادیت یہ تھی کہ جس اداکار کے لیے گاتے، اس کا انداز

اپنا لیتے۔

حالات زندگی کھنگالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد رشدی 24 اپریل 1934 کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک قدامت پسند سید گھرانے سے تھا۔ اُن کے والد سید منظور احمد حیدر آباد دکن میں عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ کم سنی میں وہ والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ بچپن میں خاصے ذہین تھے مگر تعلیم سے زیادہ رجحان موسیقی کی جانب تھا۔ اس فن کی باقاعدہ کسی استاد سے تربیت حاصل نہیں کی۔ سمجھ لیجیے، موسیقی اور گائیکی اُن کی رگ رگ میں رچی بسی تھی۔

اس زمانے کا چلن تھا کہ آغاز ریڈیو سے کیا جاتا جو وہاں خود کو منوالیتا، اس کے لیے راہیں کھلتی چلی جاتیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ 1951 ہندوستانی فلم "عبرت" کے ایک گیت میں ان کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک وقفہ آ گیا۔ اب پاکستان چلے آئے۔ خوب محنت کی۔ صلاحیت بھی تھی۔ قسمت کا ستارہ چمکا۔ 1954 میں اُن کی آواز میں ریکارڈ ہونے والے گیت "بندر روڈ سے کیماڑی" نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ پھر پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ ان کے فن نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ ان کی آواز کی قوت کے سامنے ہر دیوار ڈھے گئی۔ ہندوستانی فلمی موسیقار سر پیٹتے تھے کہ ہم نے ایسے گوہر نایاب کی قدر نہیں کی۔ کشور کمار جیسے ممتاز گلوکار بھی ان کا دم بھرتے تھے۔ انہوں نے اپنے آئیڈیل کے گانے گا کر انہیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔

جب احمد رشدی انڈسٹری میں آئے، فلموں میں غزل گائیکی کی طرز غالب تھی۔ انہوں نے اُسے نئے رجحانات سے متعارف کروایا۔ وحید مراد کے ساتھ رشدی کی جوڑی بہت کامیاب رہی۔ لگ بھگ تمام گیت سپر ہٹ ہوئے۔ وحید مراد پر فلمائے ہوئے گیتوں میں یوں لگتا، جیسے وحید مراد خود گا رہے ہیں۔ انہیں بے شمار ایوارڈز ملے۔ کئی تو زندگی میں حصے آئے، کچھ انتقال کے بعد ملے۔ پرویز مشرف دور میں انہیں "ستارہ امتیاز" سے نوازا گیا۔ انہوں نے بطور اداکار چند فلموں میں بھی کام کیا۔

احمد رشدی جتنے بڑے گلوکار تھے، اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ وہ سیدھے سادے، ملن سار آدمی تھے۔ ہر ایک سے ہنس کر ملتے۔ مشہور ہے، انہوں نے کئی نئے موسیقاروں کے لیے بلا معاوضہ پرفارم کیا۔ ایک ناقد کے بقول تیس سالہ کیریر میں رشدی کی مترنم اور پُرتاثر آواز کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ گیت چاہے چنچل ہوتا یا پُرسوز، اونچے سروں میں ہوتا یا دھیمے سروں میں، سننے والوں سے شرف قبولیت حاصل کر کے رہتا۔ انہوں نے نامور گلوکاروں کے مقابل وقت کے معروف موسیقاروں کی دھنوں کو پوری فنی مہارت سے گایا۔ فلمی موسیقی کے زرخیز دور میں رشدی کو پسندیدہ ترین گلوکار کا درجہ حاصل رہا۔"

شاید ہی کوئی شخص مذکورہ رائے سے اختلاف کرے وہ بہت جلدی چلے گئے۔ 11 اپریل 1983 کو وہ کراچی میں 48 برس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ انہیں کراچی ہی میں دفن کیا گیا۔

اُن کے انتقال کو کتنے ہی عشرے گزرے گئے، مگر آج بھی ان کا اثر باقی ہے۔ گلوکاروں کی پوری نسل ہے، جو ان کا دم بھرتی ہے۔ آج بھی اگر ٹی وی پر ان کا کوئی گیت سنائی دے، تو دل و دماغ اس زرخیز زمانے میں پہنچ جاتے ہیں، جب بھی گلوکارہ مالا کے ساتھ ان کی آواز ملتی، تو سامعین پر سحر طاری ہو جاتا۔ اس جوڑی نے فلموں میں 100 سے زائد گانے گئے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔

اے حمید

فطری مناظر کا تذکرہ ان کی تحریروں میں نغمے کی سی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ وہ پریوں کی دنیا ہوتی۔ باغات کا بیان ہوتا تو ذہن میں پھول کھل اٹھتے، ان پر تتلیاں رقص کرتیں، چاند کا ذکر یوں کرتے کہ پڑھنے والا چاندنی میں نہا جائے۔ چائے کی خوشبو پر بات کرتے، تو پڑھنے والے کو چائے کی طلب ہونے لگتی۔ یہ تھا کمال ان کی نثر کا۔ وہ اشیاء کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے اور انہیں اسی مہارت سے پیش کر دیتے۔

ناقدین کے نزدیک اے حمید اپنے عہد کے ترجمان، جذباتی اور رومانی، فطرت سے عشق کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ ایک خاص فضا اور ماحول کے انہوں نے کئی افسانے لکھے جنہیں برصغیر کے قارئین نے بہت پسند کیا۔

عبدالحمید 25 اگست 1928 کو امرتسر، برطانوی

ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ میٹرک امرتسر سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف اے پاس کیا۔ لکھنے کا شوق بچپن سے تھا جو ریڈیو پاکستان کی سمت لایا اور وہ اسسٹنٹ اسکرپٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ باصلاحیت تو تھے کچھ ہی عرصہ بعد وائس آف امریکا سے وابستہ ہو گئے۔

صحافت اپنی جگہ، اصل میں تو ادیب تھے۔ اس جانب آنے کے بعد تیزی سے شہرت کے زینے عبور کیے۔ 1948 میں پہلا افسانہ "منزل منزل" ادب لطیف میں شائع ہوا، تو

اردو کے تمام ادیبوں کو ان کی خبر مل گئی۔ ناقدین نے کہا، وہ چھوٹے اور معمولی واقعے سے کہانی بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ بعد میں آنے والے افسانوں نے اس پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔ جزئیات اور کردار نگاری پر خوب عبور تھا۔

ان کے کردار خوش گفتار، خوش لباس ہوتے، ان میں توانائی بھری ہوتی۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے ایک عجیب نوع کی رومانی فضا تعمیر کی اور پھر عمر بھر اسی فضا کے دھندلکوں میں رہنا پسند کیا۔

آنے والی تخلیقات نے رومانوی افسانہ نگاری میں ان کی شناخت کو مستحکم کیا۔ افسانوں کا پہلا ہی مجموعہ بے حد مقبول ہوا۔ فکشن نگاری کے ساتھ وہ اخبارات کے لیے کالم بھی لکھتے رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے تواتر سے لکھا۔ ان شعبوں نے بھی ان کی شہرت کو مہمیز کیا۔

تعریف کرنے والے بہت، تو تنقید کرنے والے بھی کچھ کم نہ تھے۔ ان کی رومانویت سے کچھ بڑے ادیب نالاں نظر آتے تھے۔ ان کے ہاں ماضی پرستی کی لہر تھی، جو ترقی پسندوں کو ناگوار گزرتی۔ وہ گزرے ہوئے زمانہ کا نوحہ بیان کیا کرتے۔ اس میں کھو جاتے۔ مخالفین کے مطابق یہ نا سمجھی نہیں تھا، وہ شعوری طور پر ان موضوعات پر لکھتے تھے، انہیں علم تھا کہ قارئین اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ قاری انہیں پڑھ کر گریز اور فرار کی راہ پر چل پڑے۔ حال سے چھپ کر ماضی میں پناہ لے لیتا۔ عملی زندگی کی سچائی کو بھلا دیتا ہے اور رومانویت میں کھو جاتا۔

ایسا نہیں ہے کہ وہ معاشرتی حقائق سے لاعلم تھے، ان کے ہاں سماجی شعور تھا، مگر رومانیت غالب رہتی۔ انداز بیان اتنا سحر انگیز اور دل نشین کہ عام سی جگہ اور انسان بھی جادوئی اور ماورائی معلوم ہوتے۔ پڑھنے والا سرشار ہو جاتا۔ ان کی تخلیقات منزل منزل، ڈربے، اردو شعر کی داستان، اردو نثر کی داستان، مرزا غالب لاہور میں، دیکھو شہر لاہور، یادوں کے گلاب، گلستان ادب کی سنہری یادیں، لاہور کی یادیں، امرتسر کی یادیں کے زیر عنوان شائع ہوئیں۔ بیش تر کتب بیسٹ سیلر ثابت ہوئیں۔ آخر الذکر کو ان کی خود نوشت کہا جا سکتا ہے۔

انہوں نے بچوں کے لیے بھی بہت لکھا۔ عنبر ناگ ماریا سیریز کی بہت پزیرائی ہوئی۔ اس نے ایک عرصے تک پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ اس میں بھی بڑی گرفت اور طلسم تھا۔ آج بھی انہیں پڑھا جائے تو آدمی کھو جاتا ہے۔ یہی طلسم ان ڈراموں میں نظر آتا ہے۔

2011 میں ان پر بیماریوں نے حملہ کیا۔ انہیں سانس کی تکلیف کی شکایت پر اسپتال میں داخل کروایا گیا۔ علاج کے ساتھ تکلیف بڑھتی گئی۔ آخری دنوں میں گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ مسلسل کئی روز مصنوعی تنفس کی مشین پر رہے۔ 29 اپریل 2011 کو حالت بگڑ گئی۔ اسی روز ان کا انتقال ہوا۔ اے حمید تو چلے گئے مگر قارئین اب تک ان کے حصار سے نہیں نکل سکے۔ یوں لگتا ہے، ان کا اثر کئی برس باقی رہے گا۔

معین اختر

ہمہ جہت فنکار کسے کہتے ہیں؟ وہ جس کے فن کی کئی جہتیں ہوں۔ مگر جس کے فن کی ہر جہت لاجواب ہو، اسے معین اختر کہتے ہیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ان جیسا کوئی اور فنکار نہیں گزرا۔ اداکاری، میزبانی، نقالی... ہر ایک میں اپنی مثال آپ۔ گائیکی بھی خوب کی۔ تجربات بھی کیے۔ کئی رسک لیے اور انہیں اپنی مہارت سے کامیاب بنایا۔ معین اختر کا تذکرہ ایک شخص کا نہیں، ایک عہد کا تذکرہ ہے، جس کے لیے پورا دفتر درکار ہے۔ اس عظیم فنکار کے لیے ایک تحریر نا کافی ہے۔

معین اختر 24 دسمبر 1950 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ذہن فطین طالب علم تھے۔ محنت کر کے اپنی راہ بنائی۔ 6 ستمبر 1966 کو یوم دفاع کی تقریب میں نوجوان معین اختر پہلی بار پی ٹی وی کی اسکرین پر نظر آئے۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیائے فن کے آسمان کا درخشاں ستارہ بنے، مگر یہ بات بہت

کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اوائل میں انہیں خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔

آنے والے دنوں میں وہ ٹی وی پروگراموں کے ساتھ اسٹیج شو میں نظر آئے۔ انہیں معروف اداکاروں کی نقل کرنے میں کمال حاصل تھا، مگر وہ Mimicry تک محدود نہیں رہنا چاہتے تھے۔ انہیں ابتدا میں یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ نقالی مزاحیہ اداکاری کا پہلا مرحلہ ہے، معراج نہیں۔

وہ اداکار لہری سے متاثر تھے، خود کو بطور اداکار منوانا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے، مگر جس شے نے انہیں انفرادیت بخشی.... وہ ان کی میزبانی تھی۔ ایک زمانہ ایسا تھا، جب تمام اہم تقریبات اور ایوارڈز کی میزبانی معین اختر ہی کیا کرتے۔ ان کے سنائے ہوئے چٹکلے ہندوستان میں کاپی ہوتے رہے۔

انور مقصود، بشریٰ انصاری اور معین اختر ملے، تو ٹی وی پر تین نابغہ روزگار شخصیات کی ایسی تکون وجود میں آئی، جس نے آنے والے برسوں میں انڈسٹری کو کئی لازوال پروگرام دیے۔ جب ان تینوں کا اکٹھ ہوتا، تو مزاح اور طنز اپنے عروج پر نظر آتا۔

انہیں کئی زبانوں پر گرفت تھی۔ اردو کے علاوہ انگریزی، سندھی، پنجابی، میمنی، پشتو، گجراتی اور بنگالی میں فن کا مظاہرہ کر کے انہوں نے اپنے چاہنے والوں کے حلقے کو وسیع کیا۔ وہ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول تھے۔ ڈراموں میں انہوں نے کتنے ہی تجربات کیے، جن میں "روزی" سب سے منفرد ہے۔ اس کردار کو انہوں نے امر کر دیا۔ دیگر مقبول ڈراموں میں مرزا اور حمیدہ، آخری گھنٹی، ہیلو ہیلو، انتظار فرمائیے، مکان نمبر 47، ہاف پلیٹ، فیملی 93، عیدٹرین، بندر روڈ سے کیماڑی، سچ مچ، بے بی، نوکر کے آگے چاکر، رفتہ رفتہ، لاؤ تو میرا اعمال نامہ، سچ مچ پارٹ 2، کچھ کچھ سچ مچ، رانگ نمبر نمایاں۔

کراچی اسٹیج پر ایک عرصے وہ چھائے رہے۔ کتنے ہی کامیاب ڈرامے کیے، عمر شریف کی آمد کے بعد گو بڑے بڑے فنکار پس پردہ چلے گئے، مگر معین اختر کی انفرادیت قائم رہی۔ ٹی وی شو میں ففٹی ففٹی، شوشا، شو ٹائم، اسٹوڈیو ڈھائی، اسٹوڈیو پونے تین، یس سر نو سر، معین اختر شو بہت پسند کیے گئے۔ آخر کے برسوں میں وہ لوز ٹاک میں نظر آئے، جس میں انور مقصود سوالات کیا کرتے۔ ان پروگراموں نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے۔ جس زمانے میں یہ پروگرام نشر ہوا کرتا تھا، میڈیا نسبتاً آزاد ہوگیا تھا، پرائیویٹ چینلز آگئے تھے۔ اس باعث اس پروگرام نے سیاسی مزاح کو اپنے عروج پر پہنچا دیا۔

انہوں نے فلمیں بھی کیں۔ تم سا نہیں دیکھا، مسٹر کے ٹو اور مسٹر تابعدار میں نظر آئے، مگر اس شعبے کی جانب ان کی توجہ نسبتاً کم رہی۔ گانے کا شوق بچپن سے تھا۔ آواز بھی اچھی تھی۔ رومانوی گانے بھی گائے اور مزاحیہ گیت بھی۔ البتہ آڈیو کیسٹ کی دنیا میں ان کے مزاحیہ آئٹم زیادہ مقبول تھے۔ ان کی کیسٹ کی بڑی مانگ ہوتی۔ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔

بھارت بھی گئے۔ وہاں ان کے کام کو بہت پسند کیا گیا۔ معروف ہندوستانی اداکار رضا مراد نے معین اختر کے متعلق کہا تھا: "معین اختر اسٹیج کی دنیا میں ایسے ہی ہیں، جیسے عمران خان اور سنیل گواسکر کرکٹ کی دنیا میں اور دلیپ کمار فلم کی دنیا میں۔" کام کی آفر بھی ہوئی، مگر حالات کشیدہ ہونے کے باعث یہ ممکن نہیں ہوا۔ اس امر پر بھارتی مزاحیہ فنکاروں نے ضرور سکھ کا سانس لیا ہوگا، کیونکہ نہ تو وہاں پاکستانی فنکاروں سی بے ساختگی تھی، نہ ہی فی البدیہہ جملہ کہنے کی قابلیت۔ ایسے میں اگر معین اختر جیسا اداکار آجاتا تو ان کا بھٹا ہی بیٹھ جاتا۔

وہ عرب ممالک میں بھی بہت مقبول تھے۔ انہیں کتنے ہی اعزازات سے نوازا گیا۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی اور ستارۂ امتیاز ان کے حصے میں آئے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ عظیم فنکار ایک عرصے تک مسکراہٹیں بکھیرتا رہے گا، مگر پھر 22 اپریل 2011 کا دن آیا۔ دل کا دورہ پڑنے سے معین اختر کراچی میں انتقال کر گئے۔ یوں پاکستانی ٹیلی ویژن میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا، جس کے پُر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ایک بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدمت انسانیت میں بہت آگے تھے۔ بہت سارے بچوں کی اسکول فیس، کتابوں کاپیوں کے اخراجات پورے کرتے، غریب بیماروں کی بھرپور امداد خود بھی کرتے اور دوستوں کو بھی ترغیب دیتے اور یہ سب علی الاعلان بھی نہیں کرتے۔ خاموشی سے اپنا تعارف کرائے بغیر امداد کرتے۔

غلام فرید صابری

قوالی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ جب اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے، تو سننے والوں پر گویا سحر طاری ہو جاتا۔ ان کے کلام کی بدولت بڑی تعداد میں غیر مسلم اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ کہا جاتا ہے، درجنوں افراد ان کا کلام سن کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ انہوں نے تاجدار حرم، بھر دو جھولی، سرلا مکاں سے طلب ہوئی جیسی لازوال قوالیاں دیں۔ وہ برصغیر کے مقبول ترین قوال تھے جنہوں نے کروڑوں افراد کو گرویدہ بنایا۔ انہیں متعدد ملکی اور غیر ملکی اعزازات سے نوازا گیا۔

جب وہ بیرون ملک پرفارم کیا کرتے تو ان پر دینار اور ڈالرز کی بارش ہوتی تھی۔

اس کہانی کا آغاز مشرقی پنجاب کے علاقے کلیانہ سے ہوا، جہاں عنایت حسین کا مسکن تھا۔ موسیقی عنایت حسین کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ بہت ہی عمدہ گویے تھے، شمار اساتذہ میں ہوتا۔ لوگ دور دور سے انہیں سننے آتے۔

عنایت صابری کا خاندان مغلوں کے دور سے موسیقی کے فن سے وابستہ تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ ان کی اولاد بھی فن موسیقی میں نام پیدا کرے۔ بچوں کی تربیت بھی کی، ان میں بڑے گن تھے، مگر پھر حالات نے عجب رخ اختیار کیا۔ ملک تقسیم ہوا۔ ہجرت کی۔ ایک نئے شہر کو مسکن بنانا پڑا۔ یہاں ایک نیا سفر شروع کیا۔ ادھر عنایت حسین کے بچے محنت مزدوری کیا کرتے تھے، مگر موسیقی سے عشق ان کی رگوں میں دوڑتا تھا، باپ سے یہ شوق ورثے میں ملا تھا۔ تربیت بھی خوب ہوئی تھی۔ پہلی لائیو پرفارمنس تو یہ دونوں بھائی شہر کلیانہ ہی میں دے چکے تھے۔ یہ موقع تھا پیر مبارک شاہ کے عرس کا، جس میں بڑی تعداد میں عقیدت مند شریک تھے۔ عنایت صابری کی آرزو تب پوری ہوئی، جب چند برس بعد اس کے بیٹوں غلام فرید صابری اور مقبول صابری نے قوالی کے میدان میں نام پیدا کیا۔

بھائیوں میں بڑے غلام فرید صابری 1930 میں کلیان، مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ گوالیار میں پلے بڑھے۔ ان کے والد نے اس زمانے میں تارک الدنیا ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ 1946 میں پہلی پرفارمینس دی۔ یہ مرحلہ کامیابی سے طے ہوا۔ پہلے پہل وہ اکیلے گایا کرتے تھے، پھر ان کے چھوٹے بھائی غلام فرید صابری ان کے ساتھ اسٹیج سنبھالنے لگے۔ اس کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ پہلا البم 1958 میں ریلیز ہوا، جس کی قوالی "میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا" نے مقبولیت کی تمام حدیں توڑ دیں۔ 70 اور 80 کی دہائی ان کے عروج کا دور تھا، کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ انہوں نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بے شمار البم ریلیز ہوئیں۔ ان کی کیسٹیں ریکارڈ سیل ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے پوری دنیا میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔

اسی زمانے میں انہوں نے "بھر دو جھولی میری یا محمد" جیسی قوالی گائی جس نے لوگوں پر رقت طاری کر دیا۔ ان کی متعدد قوالیوں کو فلموں میں بھی استعمال کیا گیا، جن میں "محبت کرنے والوں" اور "آفتاب رسالت" بہت مقبول ہوئیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبان میں بھی قوالیاں پیش کیں۔

پانچ اپریل 1994 کو کراچی میں غلام فرید صابری کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ایک عرصے تک ان کے بھائی مقبول صابری پرفارم کرتے رہے مگر اب دور بدل رہا تھا۔ پہلے جیسے شائقین نہیں رہے۔ البتہ یہ داستان ابھی تمام نہیں ہوئی۔ جب تک رسول کریم ﷺ اور بزرگان دین کے چاہنے والے ہیں، صابری برادران کا نام باقی رہے گا کہ ان کی آواز، ان کا جذبہ، ان کا کلام دلوں کو یوں ہی گرماتا رہے گا۔

یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ صابری برادران کا عروج دو فنکاروں کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھا۔ مقبول صابری بھی اس کا اٹوٹ انگ تھے۔ اخبارات میں دونوں بھائیوں کے اختلافات کی خبریں بھی آتی رہیں، عام طور سے اس کا سبب مالی معاملات ہوتے۔ قوالی کے ساتھ مقبول صابری نے غزل گائیکی کا تجربہ بھی کیا مگر بعد میں غلام فرید صابری کے کہنے پر انہوں نے یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ غلام فرید صابری کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امجد صابری سامنے آئے، انہوں نے اپنے چچا سے الگ اپنی راہ بنائی۔ البتہ اختلاف کی خبریں نہیں آئیں۔ انتقال کے بعد مقبول صابری کو بڑے بھائی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

غلام محمد

وہ پاکستان کی تاریخ کے وہ سربراہ ہیں جن کے دور میں بیورو کریسی کی سازشوں کا آغاز ہوا۔ انہوں نے وزیراعظم کو برطرف کر کے مشرقی پاکستان کے عوام کو متنفر کر دیا۔ نظریۂ ضرورت کا تباہ کن فیصلہ بھی اُن ہی کے دور میں آیا، جس نے پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا۔ موقع پرستی اور مصلحت پسندی کا دروازہ کھل گیا۔

یہ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل غلام محمد کا تذکرہ ہے۔ وہ 25 اپریل 1895 کو لاہور کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ ذہین فطین آدمی تھے۔ علی گڑھ سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ سول سروس کی سمت آئے۔ خوب ترقی کی۔

کئی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ کچھ عرصے ریلوے بورڈ میں بھی ذمے داریاں نبھائیں۔ کنٹرولر آف جنرل سپلائی اینڈ پرچیز رہے۔ نواب آف بہاولپور کے نمائندے کے طور پر کام کیا۔ نظام حیدرآباد کے مشیر خزانہ رہے۔ بٹوارے سے قبل لیاقت علی خان کے معاون کی ذمے داری سنبھالی۔ بجٹ کی تیاری میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ وزیر خزانہ بنے۔ انھوں نے ہی اسلامی ممالک کا معاشی بلاک قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

انہیں صحت کے مسائل درپیش رہے۔ گرتی صحت کے باعث انہیں سبکدوش کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا مگر لیاقت علی خان کی شہادت کی وجہ سے صورتِ حال بدل گئی۔ خواجہ ناظم الدین نے وزارت عظمٰی کی ذمے داری سنبھالی۔ غلام محمد کو گورنر جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ یہیں سے بدبختی کا آغاز ہوا۔ خواجہ ناظم الدین نے اسمبلی کی جانب سے اعتماد کا ووٹ لیا مگر یہ امر گورنر جنرل کو برطرف کرنے سے نہیں روک سکا۔

بعد میں انہوں نے دستور ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا۔ سندھ ہائی کورٹ نے گورنر جنرل کا فیصلہ غیر آئینی قرار دیا، تو حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔ یوں جسٹس منیر کا وہ متنازع فیصلہ آیا جس میں گورنر جنرل کے فیصلے کو نظریۂ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا۔ غلام محمد بلڈ پریشر، لقوے اور فالج کے مریض تھے۔ آخری دنوں میں وہ بولنے سے بھی قاصر تھے۔ ان کی غوں غاں فقط ان کی سیکریٹری سمجھ سکتی تھی۔ شدید علالت کے باعث اسکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل کی ذمے داریاں دی گئیں۔ انہوں نے 12 ستمبر 1956 کو لاہور میں وفات پائی۔

ایوب خان

ان کے بارے میں آرا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک طبقہ ان کی وجاہت، ایمانداری اور ان کے دور میں ہونے والی ترقی کا تذکرہ کرتا ہے، دوسرے کا کہنا ہے، انہوں نے پاکستانی جمہوریت پر شب خون مارا۔ سیاست میں موقع پرستی اور مصلحت پسندی کو رواج دیا۔ ان ہی کے رویے نے مشرقی پاکستان میں بے چینی پیدا کی، ون یونٹ کے تصور کو ان ہی کے اقدامات نے توسیع دی۔

یہ محمد ایوب خان کا تذکرہ ہے، جو پاک فوج کے سربراہ اور ملک کے دوسرے صدر رہے۔ وہ 14 مئی 1907 کو ہری پور ہزارہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر داد خان تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے سرائے صالح کے ایک اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر ایک قریبی گاؤں کے اسکول کا حصہ بن گئے، جو گھر سے پانچ میل دور تھا۔ 1922 میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، لیکن تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ اسے زمانے میں رائل اکیڈمی آف سینڈ ہرسٹ کا حصہ بنے۔ انہیں اس وقت کی 14 پنجاب رجمنٹ شیر دل میں تعینات کیا گیا۔ جنگِ عظیم دوم میں بطور کپتان حصہ لیا۔ برما کے محاذ پر میجر تعینات رہے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد بریگیڈیئر ہو گئے۔

1948 میں انہیں مشرقی پاکستان میں فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ 1949 میں مشرقی پاکستان سے واپسی پر ڈپٹی کمانڈر ان چیف ہو گئے۔ محمد علی بوگرہ کے دور میں وزیر دفاع کے طور پر کام کیا۔ اسکندر مرزا نے 7 اکتوبر 1958 کو مارشل لا لگایا تو انہیں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ یہ ایک مہلک فیصلہ تھا، پاکستانی تاریخ میں پہلا موقع جب کسی فوجی کو براہ راست سیاست میں لایا گیا۔

اسکندر مرزا اور ایوب خان میں اختلاف بڑھنے لگے۔ سبب طاقت کا توازن تھا۔ اس کے نتیجے میں اسکندر مرزا کو اپنے ہی لگائے ہوئے آفیسر کے ہاتھوں رخصت ہونا پڑا۔ پاکستان کی بعد کی تاریخ میں بھی اس نوع کے واقعات

ہوئے۔ ایک بار ضیاء الحق نے اُس ذوالفقار علی بھٹو کو رخصت کیا، جس نے اسے آرمی چیف بنایا تھا۔ پھر پرویز مشرف کے ہاتھوں میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم ہوئی۔

اس زمانے میں جمہوریت غیر مستحکم اور سیاست داں کمزور تھے۔ اس لیے ایوب خان کے اس اقدام کے خلاف وہ تحریک جنم نہیں لے سکی، جو لینی چاہیے تھی۔ عوام کا ردِعمل بھی زیادہ شدید نہیں تھا۔ ہاں، مشرقی پاکستان میں اسے ناپسندیدگی سے دیکھا گیا۔

جلد ہی ایوب خان نے ہلال پاکستان اور فیلڈ مارشل کے خطابات حاصل کر لیے۔ 1961 میں صدارتی طرز کا آئین بنوایا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب آئین کو تحریری شکل دی گئی۔ اسی کی روشنی میں 1962 میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں صدر ایوب خان کے مدِ مقابل مادرِ ملت فاطمہ جناح تھیں، جو اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود انتخابات میں ہار گئیں۔ اس عظیم ہستی کو ہرانے کے لیے کیا کیا جتن کیے گئے، کیسے ہتھکنڈے اختیار کیے گئے، یہ الگ داستان ہے۔

بظاہر مارشل لا ہٹانے کا اعلان کر دیا مگر ایوب خان بدستور طاقت کا محور تھے۔ اگرچہ ان کے دور میں خاصی ترقی ہوئی مگر دھیرے دھیرے لوگ آمریت سے اکتانے لگے۔ اس سے ذوالفقار علی بھٹو نے فائدہ اٹھایا۔ وہ پہلے ایوب کابینہ میں وزیر تھے مگر پھر اس سے الگ ہوئے، اپنی جماعت بنائی۔ ترقی پسند حلقے ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ انہیں بے پناہ مقبولیت ملی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔ صدر ایوب نے مجبوراً عوام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے مگر اقتدار کی منتقلی کے لیے غیر آئینی طریقہ اپنایا۔ انہوں نے طاقت یحییٰ خان جیسے شخص کو سونپ دی۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ 1971 میں جب پاک بھارت جنگ ہوئی تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں، مگر ان کی عمر اور بیماری کے باعث حکومت نے انہیں آرام کا مشورہ دیا۔ بعد میں اسی جنگ نے پاکستان کو دولخت کیا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے اس سانحے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ 19 اپریل 1974 کو 66 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے گوہر ایوب اور پوتے عمر ایوب نے سیاست میں حصہ لیا اور اہم قلم دان سنبھالے۔

2007 میں ایوب خان کی ڈائری منظر عام پر آئی، جس میں ان کے دور میں جنم لینے والے بگاڑ کا ذمے دار امریکا کو ٹھہرایا گیا۔

امجد بوبی

70 کی دہائی میں جن موسیقاروں نے پاکستانی فلم انڈسٹری میں خود کو منوایا، ان میں امجد بوبی کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے انڈسٹری کا عروج بھی دیکھا اور زوال بھی۔ مشکل کے دور میں بھی انہوں نے معیار برقرار رکھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی دوسری نسل کے وہ من پسند موسیقار تھے۔ ریاض الرحمان ساغر اور عقیل بوبی کے لکھے ہوئے بہت سے گیت ان کی سریلی دھنوں کے باعث مقبول ہوئے۔

اصل نام امجد حسین خان تھا۔ وہ 1942 میں امرتسر میں استاد غلام حسین خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے نامور موسیقاروں رشید عطرے اور ناشاد کی قربت میں فنِ موسیقی کی منازل طے کیں۔ ادبی حلقوں میں بھی اٹھتے بیٹھتے تھے۔

ان کی پہلی فلم ''راجا جانی'' 1976 میں ریلیز ہوئی، جس کے ہدایت کار ایس اے حافظ تھے۔ (کچھ کتابوں کے مطابق ان کی پہلی فلم ''اک نگینہ'' تھی) انہوں نے ''آنسو اور شعلے''، ''پرورش''، ''آتش'' اور ''آگ اور شعلے'' جیسی فلموں کا میوزک ترتیب دیا۔ امجد بوبی نذر شباب جیسے ہدایت کار کے من پسند موسیقار رہے۔ ''کبھی الوداع نہ کہنا''، ''بوبی'' اور ''نادیہ'' نے انہیں مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ بالخصوص ''بوبی'' نے ملک گیر شہرت عطا کی۔

انڈسٹری کے ابتدائی برسوں میں انہوں نے مہدی حسن، مہناز، ناہید اختر، سلمیٰ آغا، غلام عباس، اے نیّر جیسے گلوکاروں کے ساتھ کام کیا اور وہ گیت بڑے مقبول ہوئے۔ دھیرے دھیرے انڈسٹری سمٹنے لگی، مگر انہوں نے معیار پر سمجھوتا نہیں کیا۔ بعد میں تحسین جاوید، حمیرا چنا، سائرہ نسیم، وارث بیگ،

ارشد محمود، فریحہ پرویز جیسے گلوکاروں نے ان کے سازوں کے ساتھ اپنی آواز کو ہم آہنگ کیا۔

آخری برسوں میں انہوں نے جاوید شیخ کے ساتھ خاصا کام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب مشکلات کے باوجود جاوید شیخ پاکستان انڈسٹری کو آگے لے جانے کی کوششوں میں جتے تھے۔ وہ ٹیکنالوجی کی اہمیت کے قائل تھے۔ پاکستانی فلموں کے لیے بمبئی جا کر گیت ریکارڈ کروانے کا آغاز امجد بوبی نے ہی کیا۔ جاوید شیخ کی فلم ”یہ دل آپ کا ہوا“ کے لیے انہوں نے بھارتی گلوکار سونو نگم اور کویتا کرشنا مورتی سے گانے گوائے۔ یہ ایک نیا رجحان تھا۔ زارا شیخ اور شان کی فلم ”تیرے پیار میں“ کا گانا ”ہاتھ سے ہاتھ کیا گیا“ ایک شاہکار تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کا زیادہ وقت ممبئی میں گزرا۔ ان کی آخری ریلیز ہونے والی فلم ”کھلے آسمان کے نیچے“ تھی۔ امجد بوبی 15 اپریل 2005 کو 62 برس کی عمر میں دل کے دورے سے وفات پا گئے۔

ناقدین کے مطابق انہوں نے پاکستان کی پس پردہ فلمی موسیقی کو نئے رجحانات سے ہمکنار کیا۔ وہ وسیع القلب فنکار تھے، نئے ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

شکور رانا

3 اپریل 1936 کو امرتسر، برطانوی ہندوستان میں آنکھ کھولنے والے شکور رانا کا شمار پاکستان کے ان امپائروں میں ہوتا ہے، جن کا بین الاقوامی سطح پر چرچا ہوا۔ بے شک اس کا سبب بطور امپائر ان کی مہارت اور قابلیت تھی مگر اس کی بڑی وجہ انگلش کپتان سے ان کا سنگین جھگڑا بنا۔

1975 میں انہوں نے ٹیسٹ امپائر کے طور پر اپنے سفر شروع کیا جو 1996 میں تمام ہوا۔ ان کی امپائرنگ میں آخری میچ پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان لاہور میں ہوا تھا۔ انہوں نے 18 ٹیسٹ میچز اور 22 ون ڈے مقابلوں میں فیصلے صادر کیے۔ کیریر دو عشروں پر محیط تھا۔

کرکٹر وہ داجی سے تھے۔ فرسٹ کلاس میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ اور یہ تھوڑا حیران کن تھا۔ کرکٹ ان کے خون میں تھی۔ ان کے خاندان سے شفقت رانا اور عظمت رانا نے پاکستان کی جانب سے ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔ البتہ انہیں میدانوں میں شدید مشکلات کا سامنا رہا۔ 1957 سے 1973 تک فقط گیارہ میچ کھیلے۔ 226 رنز بنائے، 12 وکٹیں لیں۔ اس کارکردگی کے بعد کوئی اور ہوتا، تو گمنامی کی تاریکی میں گم ہو جاتا، مگر شکور رانا کی تقدیر میں کچھ اور لکھا تھا۔

انہوں نے کھلاڑی کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ لے

لی۔ ویسٹ انڈیز اور پاکستان کے درمیان لاہور میں ہونے والے ٹیسٹ مقابلے سے شکور رانا کا کیریئر شروع ہوا، جو دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ 1987 میں فیصل آباد ٹیسٹ کے دوران وہ واقعہ ہوا، جس کی وجہ سے کرکٹ کی تاریخ میں شکور رانا کا نام جزو لاینفک بن گیا۔ کچھ لوگ اسے کرکٹ کی تاریخ کا متنازعہ ترین واقعہ بھی قرار دیتے ہیں۔

میچ کا دوسرا دن تھا۔ ایڈی ہیمنگز بولنگ کر رہے تھے۔ بولر گیند پھینکنے کو تھا کہ شکور رانا نے لیگ امپائر کی حیثیت سے کھیل رکواتے ہوئے اعتراض کیا کہ انگلش کپتان مائیک گیٹنگ نے ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فیلڈ تبدیل کی ہے۔

گیٹنگ کے پوچھنے پر انہیں بتایا۔ ”آپ بولر کے رن اپ کے دوران ہاتھ ہلا کر فیلڈ تبدیل کر رہے تھے جو غیر قانونی ہے۔“ کچھ تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ماحول کشیدہ ہوگیا۔ شکور رانا نے گیٹنگ کو دھوکے باز ٹھہرایا۔ گیٹنگ مشتعل ہوگئے۔ خاصی لے دے ہوئی۔ بعد میں شکور رانا نے کہا تھا کہ جب انہوں نے گیٹنگ کو کھیل کے قواعد سمجھانے کی کوشش کی تو گیٹنگ نے یہ متعصبانہ جملہ کہا۔ ”کھیل کے قواعد وضوابط ہم بناتے ہیں۔“

تنازعہ کی وجہ سے اس روز مزید کھیل ممکن نہ ہوسکا۔ وہ اگلے روز امپائرنگ کے لیے میدان میں نہیں اترے۔ انہوں نے گیٹنگ سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا۔ ادھر گیٹنگ کا کہنا تھا کہ وہ تب ہی معافی مانگیں گے، جب شکور رانا بھی معافی مانگیں۔ ایک ڈیڈلاک پیدا ہوگیا۔ انگلش ٹیم کچھ دیر میدان میں موجود رہی مگر پھر واپس چلی گئی۔ تیسرے روز کھیل ممکن نہ ہو سکا۔ کچھ مبصرین کے مطابق اس روز معافی نامے کا جو ڈرافٹ تیار ہوا تھا، گیٹنگ اس پر سائن کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اب دونوں ممالک کی وزارت خارجہ کو معاملے میں کودنا پڑا۔ سیریز کی منسوخی کا خطرہ ٹلا۔ اس ضمن میں انگلش بورڈ کا رویہ بہت مثبت تھا۔ میچ کے چوتھے روز مائیک گیٹنگ نے بادل نخواستہ ایک تحریری معافی نامہ شکور رانا کو تھما دیا۔ بالآخر میچ شروع ہوا۔

اس واقعہ کا ایک عرصے تک چرچا رہا۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک انگلش میگزین نے انہیں کثیر رقم خرچ کر کے انگلینڈ بلوایا، تاکہ وہ مائیک گیٹنگ سے مل سکیں۔ لارڈز کے گیٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مائیک گیٹنگ نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ”اوہ، ناٹ یو اگین“ اور وہاں سے چلے گئے۔ ویسے گیٹنگ کے علاوہ 1984 میں ہونے والے ایک ٹیسٹ میچ میں ان کا نیوزی لینڈ کے کپتان Jeremy Coney سے بھی جھگڑا ہوا تھا۔

شکور رانا کا 9 اپریل 2001 کو انتقال ہوا۔ عام خیال ہے کہ شکور رانا اور مائیک گیٹنگ تنازعہ کے باعث ہی آئی سی سی نے ٹیسٹ میچز میں نیوٹرل امپائر کی شرط عائد کی۔ پہلے ہوم سائیڈ امپائرز کا اہتمام کرتی تھی۔

ماہ اپریل میں جہان فانی سے رخصت ہونے والی چند شخصیات کا تذکرہ پہلے بھی ان صفحات میں آچکا ہے، مگر ان کی ملکی و بین الاقوامی اہمیت کے پیش نظر مختصر تعارف دیا جارہا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو

قیام پاکستان کے بعد بھٹو جیسا ذہین فطین سیاست دان شاید ہی کوئی گزرا ہو۔ اختلاف رکھنے والے بھی نام احترام سے لیتے ہیں۔ وہ 5 جنوری 1928 کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سر شاہ نواز بھٹو ایک جانی مانی شخصیت تھے۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصے مسلم لا کالج کراچی میں پڑھاتے رہے۔ 1953 میں وکالت شروع کی۔ سیاست گھٹی میں پڑی تھی، اس جانب آنا فطری تھا۔ ایوب خان کا اعتماد حاصل کیا۔ ان کی کابینہ میں وزیر رہے، مگر اختلافات نے ایوب خان سے الگ کر دیا۔ دسمبر 1967 میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1970 کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں پاکستان تقسیم ہوگیا۔ دسمبر 1971 میں جنرل یحییٰ خان نے اقتدار بھٹو کو سونپ دیا۔ دسمبر 1971 تا اگست 1973 وہ صدر مملکت رہے۔ 14 اگست 1973 کو نئے آئین کے تحت وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔ 1977 کے عام انتخابات میں ان پر دھاندلیوں کا الزام لگا۔ ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، جس کے نتیجے میں 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء

موسم بہار کے سنگ پاکیزہ کے رنگ
بہار کے دل فریب وخوشنما رنگوں سے سجا اپریل 2016ء کا سالگرہ نمبر
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
نگہت سیما کا خوب صورت ناول اختتامی پڑاؤ کے ساتھ
انجم انصار، درثمن بلال و نایاب جیلانی کے قسط وار مسحور کن سلسلے
کھوئے کھوئے لمحے...... تابندہ نعیم کی بھرپور کاوش کا خوب صورت اختتام
رضوانہ پرنس، ثمینہ عظمت علی کی خوب صورت کہانیاں خاص آپ کی نذر
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور محترمہ اختر شجاعت کی ایمان افروز حکایتیں
وہ آئے بزم میں
شیریں حیدر کی شیریں بیانیاں
عظمیٰ آفاق سعید کی کتاب کی رونمائی کی پرلطف تقریب کا احوال
اس کے علاوہ
نگہت اعظمی، شیریں حیدر، میمونہ صدف، ہاجرہ ریحان،
عقیلہ حق، ریحانہ زیدی ودیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین تحریریں......
اس کے ہمراہ جدید تفریحی معلومات ودیگر خوش بیانیاں لیے مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

الحق نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ 18 مارچ 1978 کو لاہور ہائی کورٹ نے انہیں سزائے موت سنادی۔ سپریم کورٹ نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ 4 اپریل کو انہیں راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی۔ اس قربانی نے انہیں اپنے چاہنے والوں کی نظروں میں امر کر دیا۔

علامہ اقبال

اس عظیم تخلیق کار نے امت مسلمہ میں نئی روح پھونکی۔ وہ 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ نامور عالم مولانا سید میر حسن کے شاگرد رہے۔ اسکاچ مشن اسکول سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز تب ہی ہوا۔ داغ سے اصلاح لی۔ فلسفے کے مضمون میں ایم اے کیا۔ انجمن حمایتِ اسلام سے تعلق پیدا ہوا جو آخر تک قائم رہا۔

اورینٹل کالج میں پڑھایا۔ پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ 1905 میں یورپ کا رخ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ بیرسٹری کے لیے لنکنز اِن کا رخ کیا۔ میونخ یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ”ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء“ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا۔ وطن لوٹ کر وکالت کا پیشہ اپنایا۔ تدریس سے بھی جڑے رہے۔ دھیرے دھیرے مسلم قومیت کا تصور اقبال کے سامنے واضح ہونے لگا۔ انہوں نے اپنے افکار کو اشعار اور نثر کی شکل دی۔ خیالات پھیلنے لگے۔ مسلم لیگ کو پنجاب میں منظم کرنے میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ عالمی مسائل پر ان کے تجزیے اور آراء کی اہمیت بڑھنے لگی۔ ان کے پیغام کو برصغیر کے مسلمان اہمیت دینے لگے۔ 1923 میں انہیں سر کا خطاب ملا۔

الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں انہوں نے ہندوستان کے اندر ایک آزاد مسلم ریاست کا خاکہ پیش کیا۔ اقبال ہی کی کوششوں کے طفیل قائداعظم ہندوستان لوٹے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔ ان کی شاعری نے نئی نسل میں انقلابی روح پھونکی۔ ان کی کتب کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ انہیں پاکستان میں قومی شاعر کا درجہ حاصل ہے۔ وہ 21 اپریل 1938 کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

جی ایم سید

سندھ پر ان مٹ نقوش چھوڑنے والے جی ایم سید

17 جنوری 1904 کو سن، ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔ تعلق سندھ کے صوفی بزرگ، سید حیدر شاہ کاظمی کے خانوادے سے تھا۔ اصل نام غلام مرتضیٰ سید۔ 1930 میں سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے سندھ اسمبلی میں قرارداد پاکستان پیش کی اور اسے بھاری اکثریت سے پاس کروایا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں وہ قوم پرستی کے علم بردار کے طور پر ابھرے۔

”سندھ عوامی محاذ“ کے بانیوں میں بھی شامل تھے۔ 1955 میں نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) میں شمولیت اختیار کر لی، پھر قوم پرستی کا نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے بزم صوفی، سندھ یونائیٹڈ فرنٹ اور...... جیے سندھ محاذ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ سقوط ڈھاکا کے بعد جی ایم سید نے ”سندھو دیش“ کا مطالبہ کر دیا۔ اس جرم میں ایک طویل عرصے نظر بند رہے۔

انہیں ایک دانشور کی حیثیت سے تو شناخت کیا جاتا ہے مگر وہ انتخابی سیاست میں بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ ان کی پارٹی بھی دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ تصوف، شاعری، تاریخ، اسلامی فلسفہ جیسے مضامین پر ان کی بڑی گرفت تھی۔ 60 کے قریب کتابیں لکھیں۔ ان کے تذکرے کے بغیر جدید سندھ کی تاریخ ادھوری ہے۔ 91 سال کی عمر میں 25 اپریل 1995 کو کراچی میں انتقال ہوا۔

ذرہ بنا آفتاب

انور فرہاد

اس نے نامساعد حالات میں زندگی کی ابتداء کی تھی۔ غربت کی گود میں پل کر جوان ہوا لیکن ماحول کی محبوبیت نے اس کے اندر ایک ایسا فنکار تراش دیا تھا جس نے اسے بیکل بنا دیا۔ روح میں ایسی بے چینی بھر دی کہ دل بے چین رہنے لگا۔ دل کے تار گنگنا اٹھنے کی چاہ میں اسے اکسانے لگے۔ تب اس نے روح کی اذیت کوشی سے آزادی کے لیے ایک نئی دنیا میں پناہ لے لی اور ایسی ایسی حرکتوں کو جنم دیا جو اسے امر بنانے کے لیے کافی ہیں۔

پاکستانی فلمی دنیا کے وہ واقعات جنہیں ہم بھلا بیٹھے ہیں

یہ ایک کرب ناک حقیقت ہے کہ بے پناہ ایسے لوگ ہیں جنہیں زندگی بھر ہنسنا مسکرانا نصیب نہیں ہوتا۔ ایک تبسم، ایک مسکان، ایک مسکراہٹ کے لیے ان کے لب زندگی بھر ترستے رہتے ہیں۔ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو روتے ہوئے لوگوں کو بھی ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے ہی عظیم لوگوں میں ایک رنگیلا بھی تھا۔ جسے خدائے رحیم وکریم نے یہ خوبی عطا کی تھی کہ اسکرین پر اس کی شکل نظر آتے ہی تماشائی کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے اور

جب وہ اپنی اوٹ پٹانگ حرکتیں شروع کرتا تو دیکھنے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

لوگوں کو رلانا اتنا مشکل کام نہیں جتنا ہنسانا دشوار ہوتا ہے۔ یہ فن اچھے اچھوں کو نہیں آتا۔ رنگیلا ہماری فلموں کا ایک ایسا کامیڈین تھا جس کو اس فن میں کمال حاصل تھا مگر ناقدین اور مبصرین اسے ہمیشہ اپنی تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ اس کے مزاح کو غیر معیاری قرار دیتے اس کی اداکاری کو اوور ایکٹنگ کہتے اور یہ باور کراتے تھے کہ وہ بچوں کے معیار کا مزاح نگار ہے مگر تنقید کے اس تیر و نشتر کے باوجود فلمساز و ہدایت کار اسے اپنی فلموں میں کاسٹ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسی کی وجہ سے لوگوں کا اکثریتی طبقہ فلم دیکھنے آتا ہے اور فلموں کو کامیاب کراتا ہے۔

ایک وقت تھا جب رلانے والی فلمیں کامیاب ہوتی تھیں۔ فلم میں ایسے دلگداز مناظر خاص طور پر شامل کیے جاتے تھے کہ انہیں دیکھ کر تماشائی جذباتی ہو جائیں، آنکھیں چھلک جائیں۔ خواتین تو باضابطہ رونے لگتی تھیں۔ ایسی فلمیں خواتین میں خاص طور پر مقبول ہوتی تھیں۔ وہ بڑا پرسکون اور اچھا دور تھا۔ عام طور پر لوگ خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لیے ان کی زندگی میں دکھ درد کے لمحات کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ اس دور میں بھی فلموں میں ایک کامیڈین ہوا کرتا تھا۔ جس کی انٹری عام طور پر رلانے والے مناظر کے بعد ہوتی تھی کہ رونے والے تماشائی سنبھل جائیں۔ اپنی عام حالت میں لوٹ آئیں۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ معروف فلمساز و ہدایت کار شباب کیرانوی نے ایک فلم کے لیے صحافی اور ابھرتے ہوئے فلم رائٹر علی سفیان آفاقی سے ایک کہانی لکھوائی۔ یہ مکمل کامیڈی فلم کی کہانی تھی۔ علی سفیان آفاقی نے ایک ہنستی مسکراتی اور قہقہہ بار کہانی لکھ دی۔ ان کا اور شباب کیرانوی کا خیال تھا کہ ان کی یہ فلم ''ٹھنڈی سڑک'' مکمل کامیڈی فلم ہونے کی وجہ سے بہت پسند کی جائے گی۔ ان کا یہ تجربہ کامیاب ہوگا۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی مکمل کامیڈی فلم سے لوگ بھرپور طور پر محظوظ ہوں گے۔ ''ٹھنڈی سڑک'' بنی اور ریلیز کر دی گئی۔ فلم کے پہلے شو کا فلم میکرز نے بغور جائزہ لیا۔ سینما ہالز میں تماشائی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ یہ اندازہ لگایا گیا کہ فلم کامیاب ہوگی اور ہمارا یہ تجربہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔ فلم والے جب ہال سے باہر نکلے اور باہر والوں نے ان سے فلم کے بارے میں پوچھا۔ ''کیسی فلم ہے؟''

''بکواس، بور، فلم میں ایک بھی منظر رونے والا نہیں۔ پوری فلم ہنسی ٹھٹھول اور مخول بازی میں ختم ہو گئی۔''

یہ رجحان تمام تماشائیوں کا تھا۔ فلم میں صرف ہنسی ہی ہنسی تھی۔ رونے کا کوئی منظر نہیں تھا۔ اس لیے بقول آفاقی صاحب ''اب ہمارے رونے کا وقت تھا۔''

فلم شاندار طریقے پر فلاپ ہو گئی۔

وقت سدا ایک جیسا نہیں رہتا۔ حالات بدلتے ہیں تو واقعات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ ہمارے ملک اور معاشرے میں بھی تبدیلی آئی۔ لوگوں کی زندگیوں سے سکون، چین اور آمدنی کم اور اخراجات رفو چکر ہو گئیں۔ گرانی بڑھی تو معاشی پریشانیاں بھی بڑھیں۔ آمدنی کم اور اخراجات میں اضافے کی وجہ سے گھریلو حالات غیر متوازن اور پریشان کن ہونے لگے۔ بے روزگاری بڑھی تو ناسمجھ اور ناپختہ ذہن کے لوگوں نے منفی راستوں پر چلنا شروع کر دیا۔ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت گری کے واقعات، جو کبھی کبھار ہی وقوع پذیر ہوتے تھے، آئے دن کے معمول بن گئے جن سے عوامی زندگی سے صبر و سکون، تہہ و بالا ہو گئے۔ رونے کے لیے اب سینما گھر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ بقول فیاض علی فیاض

''درد کی خوشبو پھیلی ہے۔ شہروں سے ویرانے تک''

اب ہر شخص کو اپنے اردگرد کے حالات پر رونا آتا تھا۔ ان حالات سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ سب متاثر تھے۔ زندگی اب درد اور کراہ بن کر رہ گئی تھی۔ اندھیرے میں روشنی کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے غم و الم کے اس اندھیرے میں ہنسی اور مسکراہٹ کی روشنی کی بھی ضرورت پڑی اور اس روشنی کے لیے غم کے مارے سینما گھروں کا رخ کرنے لگے جہاں رنگیلا، منور ظریف، لہری، نرالا اور اس جیسے اداکار روتے ہوئے لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلاتے تھے۔ پہلے لوگ رونے کے لیے فلمیں دیکھتے تھے۔ اب ہنسنے اور مسکرانے کے لیے فلموں سے دل بہلانے لگے۔

رنگیلا کا دور بھی ایسا ہی تھا جب عوام الناس کے غموں کا علاج ہنسنا اور مسکرانا تھا۔ تماشائی ڈھائی تین گھنٹے جب تک سینما گھر میں ہوتے اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے کھلکھلا کر ہنستے، مسکراتے رہتے اور قہقہے لگاتے رہتے۔ یہ ہنسی یہ مسکراہٹ یہ قہقہے ان کے غمزدہ وجود اور زخمی روحوں

کے لیے رحم کا اثر رکھتے تھے جس طرح پیاس کی حالت میں پانی جسم و جان کی تسکین کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح غم و الم کی تمازت میں ہنسنے مسکرانے کے یہ لمحات چھتنار درختوں کے سائے کی طرح ٹھنڈک پہنچاتے تھے۔

فلمی پنڈت چاہے رنگیلا کی کامیڈی کو کوئی بھی نام دیں، عام تماشائیوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اس کی مزاحیہ اداکاری، ناقدین اور مبصرین کی نگاہوں میں کتنی بھی غیر معیاری ہو، تماشائیوں کا بہت بڑا طبقہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے اس کی اسی اداکاری سے اپنے سوکھے لبوں کی شاخوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلانے آتے تھے۔ اس کی اوور ایکٹنگ ہی اس کی شہرت اور مقبولیت کا سبب بنی اور اندرون ملک ہی نہیں بیرون ملک بھی جہاں جہاں اس کی فلمیں دیکھی اور دکھائی جاتی تھیں اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس کا اندازہ خود اسے بھی نہیں تھا کہ وہ کتنا مقبول ہے۔ وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ بچوں کا ہی پسندیدہ کامیڈین ہے مگر ایک دن جب وہ لندن ساؤتھ کے علاقے سے گزر رہا تھا اپنی دھن میں مست کچھ گنگناتے ہوئے کچھ مسکراتے ہوئے معاً اسے احساس ہوا کہ پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی ہے۔

”منڈا...... او سوہنا منڈا......!“

اس کی رفتار پہلے ذرا مدھم ہوئی۔ ”کسی نے مجھے تو نہیں پکارا؟“

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر پکارے جانے کے لفظوں پر غور کیا۔ پھر خود کو مخاطب کر کے بولا۔ ”میں منڈا تو نہیں ہو سکتا اور اگر مجھے منڈا مان بھی لیا جائے تو سوہنا منڈا کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔ نہیں مجھے کسی نے نہیں پکارا ہے۔“ اور اس کی رفتار پھر پہلے جیسی ہو گئی اور اس نے مڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی لیکن ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا ہو گا کہ پھر پیچھے سے آواز آئی۔

”منڈا...... او سوہنا منڈا رک جا۔“

اس نے رکنے سے پہلے اپنے آگے اور دائیں بائیں دیکھا۔ کسی طرف بھی اسے کوئی منڈا نظر نہیں آیا۔ اب اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا کہ جو کوئی بھی آواز دے رہا ہے اس سے پوچھے کہ کس کو پکار رہے ہو؟ تھوڑے فاصلے پر اسے ایک سکھ نظر آیا جو اسے پُر اشتیاق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا۔

”تم مجھے تو آواز نہیں دے رہے ہو؟“

بوڑھے سکھ نے بھی گردن ہلا کر جواب دیا۔ ”ہاں ہاں تم ہی کو آواز دے رہا ہوں۔“

اس نے اندازہ لگایا اس سکھ کی عمر کسی طرح بھی سو سال سے کم نہیں ہو سکتی۔ وہ بھلا مجھے کیوں پکار رہا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ مانا کہ اس کے لیے میں منڈا ہی ہوں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بڑے میاں اس عمر میں بھی...... یہ لندن ہے یہاں تو کوئی میم مجھے آواز دیتی۔ ”ذرا سنیے......! تو کوئی بات ہوتی۔“

وہ ابھی ایسی ہی سوچوں میں گم تھا کہ بوڑھا سکھ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے کو دیکھ کر اس کے متعلق اس کو اپنا پہلا خیال رد کرنا پڑا۔ اب وہ سوچ رہا تھا یہ بوڑھا شاید مجھ سے کہے گا۔

”واگرو کی سوگند، میں بہت مصیبت کا مارا ہوں۔ میری کچھ مدد کرو۔“

ابھی اس نے یہ بات سوچی ہی تھی کہ بوڑھے نے اپنا ہاتھ اپنی جیب میں ڈالا۔ اس کا ہاتھ جب اس کی جیب سے باہر آیا تو اس میں کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ بوڑھے سکھ نے وہ ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ رنگیلا نے گھبرا کر پوچھا۔

”پانچ سو پاؤنڈ۔“

”مگر تم یہ مجھے کیوں دے رہے ہو؟“ وہ خیال جو اس نے رد کر دیا تھا ایک بار پھر وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا میں تمہیں ایسا ہی نظر آتا ہوں؟“

”نہیں ...... واگرو کی سوگند ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ...... یہ تحفہ ہے۔ نذرانہ عقیدت ہے۔“

اتنا کہنے پر ہی بوڑھے سکھ نے بس نہیں کیا آگے بڑھا اور نہایت محبت، شفقت اور پیار سے اس کا ماتھا چوم لیا اور کہا۔ ”رنگیلا! تیرا مکھڑا دیکھ لیا، وے تے انج لگدا اے زندگی دا مقصد پورا ہو گیا۔“ (رنگیلا! تیرا چہرہ دیکھ لیا لگتا ہے زندگی کا مقصد پورا ہو گیا)۔

رنگیلا کو اس موقع پر ایسا لگا جیسے وہ لندن ساؤتھ کی سڑک پر نہیں کھڑا ہے۔ اپنے بستر پر سوتے ہوئے کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں پٹ پٹا کر بوڑھے کو دیکھا۔ اس کا دل چاہا میں اسی سے پوچھوں میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں؟ مگر یہ سوال وہ اس سے نہ کر

سکا۔ بوڑھا سکھ اس سے کہہ رہا تھا۔

''میری عمر اب ایک سو دس سال ہوگئی ہے۔ موت کا ہرکارہ کب میرے دروازے پر آکر دستک دیتا ہے کچھ پتا نہیں۔ اس لیے واگرو سے میری یہی پرارتھنا تھی کہ مرنے سے پہلے اپنے بے حد پیارے اور محبوب فنکار رنگیلا کا درشن ہوجائے۔ تمہاری جو فلم یہاں آتی ہے میں اسے خاص طور پر دیکھتا ہوں اور بعض فلموں کو تو بار بار دیکھتا ہوں اور پھر یوں گنگنانے لگا۔ وے سب تو سوہنیاں، ہائے رے من موہنیاں''

بوڑھا......ایک سو دس برس کا بوڑھا سکھ اسے پیار اور شفقت بھری نظروں سے پُراشتیاق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پرستاروں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر اس انوکھے پرستار کو اور اس کے پیار کو دیکھ کر اسے اپنے رب کی بات یاد آگئی۔

''بے شک جسے چاہتا ہے اللہ ہی عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے اللہ ہی ذلت دیتا ہے۔''

چند لمحوں بعد وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ اس نے بوڑھے پرستار سے کہا۔ ''آپ کی محبت اور شفقت ہی میرے لیے بہت قیمتی تحفہ ہے۔ آپ یہ پانچ سو پاؤنڈ اپنے پاس ہی رکھیں اور سمجھیں آپ نے تحفہ دے دیا اور میں نے لے لیا۔ آپ کا تحفہ قبول کرلیا بابا جی! آپ ان پیسوں سے مٹھائی خرید کر اپنے بچوں کو میری طرف سے کھلادیں۔''

مگر بوڑھا کسی طرح نہ مانا۔ بچوں کی طرح مچل گیا۔ ''اپنے اس بوڑھے پرستار کا حقیر تحفہ سمجھ کر قبول کرلو۔ جب سے میں نے سنا ہے کہ تم لندن آئے ہوئے ہو یہ رقم اپنی جیب میں رکھ کر نکلتا ہوں کہ تم جب بھی نظر آؤ گے تمہیں پیش کردوں گا۔'' پھر بوڑھے نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میرا تحفہ قبول نہیں کرو گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

رنگیلا کو اس کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی۔ اس نے بچوں کو ضد کرتے بارہا دیکھا تھا مگر اس بوڑھے کی ضد اس کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ اسے اس بوڑھی ضد کی لاج رکھنی پڑی۔ بوڑھے نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ رقم اس کی جیب میں ٹھونس دی اور ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

''دیکھو اب بھی اگر تم انکار کرو گے تو میں رو دوں گا۔''

رنگیلا ہنسنے لگا۔ اس کی مخصوص مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس ہنسی کو دیکھ کر بوڑھا نہال ہوگیا۔ سینما اسکرین پر اس مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کے دل میں جو پھلجڑیاں پھوٹتی تھیں اس سے کہیں زیادہ خوشی اسے اپنے روبرو ہنستے ہوئے دیکھ کر ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چومی اور پھر بے اختیار اسے سینے نال لگالیا۔

''واگرو، تمہیں میری عمر بھی لگا دے۔ تم اسی طرح مسکراتے رہو اور لوگوں کو ہنساتے رہو۔'' اس نے دعا دی۔ ''شاید تم نہیں جانتے کہ تم لوگوں کو کتنی بڑی دولت سے مالا مال کرتے رہتے ہو۔ آج کے دور میں یہ ہنسی اور یہ خوشی کی دولت لٹا کر تم جو کام کررہے ہو یہ بہت بڑا پن، بہت بڑا ثواب، بہت بڑی عبادت ہے۔ انسانیت کی عظیم خدمت ہے۔''

رنگیلا ہوٹل آکر بہت دیر تک خیالوں میں گم رہا۔ اپنے بارے میں سوچتا رہا۔ ''میرے بارے میں تو عام طور پر میرے وطن میں یہی کہا جاتا ہے کہ میری کامیڈی بس بچوں کو ہنسانے اور لبھانے کے لیے ہوتی ہے۔ میری مزاحیہ اداکاری کو کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ معیاری نہیں سمجھتا۔ بس اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کہ فلم دیکھنے والے کمسن تماشائی اس سے محظوظ ہوتے ہیں لیکن آج...... اپنے وطن سے دور...... دیارِ غیر میں اپنے لوگوں کی یہ ساری سوچ غلط ثابت ہوگئی۔ ایک سو دس سالہ بوڑھے نے مجھے اپنا پسندیدہ فنکار سمجھ کر میری جو پذیرائی کی اپنی پسندیدگی کے پھول جس طرح نچھاور کیے اس سے تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ میں بچوں اور ٹین ایجرز کا ہی پسندیدہ فنکار نہیں، بڑی عمر کے سنجیدہ اور بردبار لوگ بھی میری کامیڈی کے دلدادہ ہیں۔ میرے پرستار ہیں۔

رنگیلا نے بستر پر لیٹے لیٹے کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے اطمینان سے بھرپور ایک لمبی سانس لی۔ ربّ العزت کی بخشی ہوئی اس عزت اور محبت کا دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور اپنے آپ سے کہا۔ ''بے شک جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ۔''

اس ایک سو دس سالہ بوڑھے سکھ نے رنگیلا میں یہ اعتماد پیدا کردیا تھا کہ وہ عوامی فنکار ہے۔ اس کی اداکاری سب کو متاثر کرتی ہے۔ بلا تفریق عمر لوگ اس کے پرستار ہیں۔ اس کے چاہنے والے ہیں۔ شوبز کے نقاد اور فلمی پنڈت اس کی اداکاری کو تنقید کا جو نشانہ بناتے ہیں اسے محض بچوں اور کمسن لڑکے لڑکیوں کے معیار کا کامیڈین قرار دیتے ہیں اس کی کامیڈی تو محدود دائرے تک قید کرنے کی کوشش

کرتے ہیں، اس سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس سے اس کے فن کی چکاچوند میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اگر ہر فلمساز اور ہدایت کار اسے اپنی فلم میں کاسٹ کرنا ضرور سمجھتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اسے فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھتا ہے اور کسی بھی فلم کی کامیابی تماشائیوں کے محض ایک طبقہ پر منحصر نہیں ہوتی۔ ہر عمر اور ہر طرح کے لوگوں کی پسندیدگی ہی کامیابی کا سبب بنتی ہے۔

رنگیلا کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ حقیقتاً وہ بہت بڑا فنکار تھا۔ عوامی فنکار تھا۔ اس کی اداکاری تماشائیوں کو متاثر کرتی تھی۔ اس کی کامیڈی ہر عمر کے لوگوں کو گدگداتی تھی۔ ہنسنے پر مجبور کرتی تھی۔ آج کے اس افراتفری کے دور میں ہنسنا ہنسانا تو جیسے خواب ہو گیا ہے۔ غم و آلام کے شکنجے میں جکڑے لوگوں کے لیے ایک تبسم، ایک مسکان کسی نایاب تحفہ سے کم نہیں۔ ایسے میں رنگیلا کی ذات، اس کی مزاحیہ اداکاری، اس کی ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے والی کامیڈی ایک انمول شے تھی۔ لوگ فلموں میں اس کا نام دیکھ کر ٹکٹ خریدنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اپنے وجود سے لپٹی دکھوں کی دھول جھاڑنے کے لیے سینما گھروں میں داخل ہو جاتے تھے۔ فلم ساز و ہدایت کار رنگیلا کو یونہی نہیں کاسٹ کرتے تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ تماشائیوں کی اکثریت رنگیلا سے اپنے دکھ درد کی دوا لینے آتی ہے۔ رنگیلے کی وجہ سے ہی فلم دیکھنے آتی ہے۔

رنگیلا کو یہ مقبولیت، یہ عزت، یہ شہرت یونہی نہیں ملی تھی۔ طویل عرصے کے بعد انتھک محنت اور جدوجہد کے نتیجے میں یہ مقام حاصل ہوا تھا۔ عوام کے دلوں میں جگہ بنا کر وہ فاتح زمانہ بنا تھا۔

☆......☆

سوچ کا یہ سلسلہ دراز ہو گیا ہے تو پھر کچھ اور لکھنے سے بہتر ہے کہ رنگیلا پر بات مکمل کر کے آگے بڑھا جائے۔ گو کہ وقتاً فوقتاً فلمی الف لیلہ میں رنگیلا کی زندگی پر روشنی ڈالی جا چکی ہے لیکن اس کی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے نہیں آئے ہیں۔ معروف فلمی ہفت روزہ کی ادارت میں رہتے ہوئے اس لیجنڈ فنکار سے ملاقات رہی تھی اس لیے بے شمار ایسی باتیں علم میں آتی رہیں جن کا اظہار ضروری ہے۔

تو جناب! کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ رنگیلا کو بھی نہیں معلوم تھا کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس کی زندگی میں کیا بدلاؤ آئے گا۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا وہ پاکستانی فلموں کا ایک بڑا فنکار بنے گا۔ اس کی عمر صرف چودہ سال تھی جب اس کے کچھ جاننے والوں نے اسے بطور ایکسٹرا ایک فلم میں شامل کر دیا تھا۔ اس فلم کا نام ''دشمن'' تھا۔ اس فلم پر اس کا ذاتی تبصرہ یہ تھا۔

''ایک گھنٹا فلم چلی۔ باقی وقت کرسیاں چلتی رہیں۔''

یعنی فلم سوپر فلاپ تھی۔ ایک گھنٹے تک تو تماشائیوں نے برداشت کیا اس کے بعد ان کا احتجاج شروع ہو گیا اور سینما گھر میں توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔

یہ فلم چاہے جس وجہ سے بھی فلاپ ہوئی، رنگیلا نے یہی سمجھا کہ اس فلم کی ناکامی کی وجہ اس کی موجودگی تھی۔ یہ اس کی عمر کے لحاظ سے اس کی کم فہمی تھی کیونکہ فلم کی کامیابی یا ناکامی کے ذمہ دار بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ جب کہ وہ بے چارہ تو محض ایک ایکسٹرا تھا، فالتو آدمی، مختلف لوگوں کی بھیڑ میں موجود ایک فرد۔ جس کا کوئی کردار نہیں ہوتا مگر یہ بھولا بادشاہ یہی سمجھا کہ فلم میری وجہ سے نہیں چل سکی۔ عام طور پر لوگ کسی غلطی کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرانے کی بجائے دوسروں پر الزام دھرتے ہیں مگر اس کمسنی کے دور میں بھی رنگیلا نے دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے کی بجائے خود کو ہی اس ناکامی کا سبب گردانا۔

''نہیں یہ اداکاری میرے بس کی بات نہیں۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے اپنے آپ کو سمجھایا۔ ''خواہ مخواہ ہی یار لوگوں نے مجھ سے اداکاری کروادی۔''

یہ بھولا بادشاہ اپنی ابتدائی عمر میں بہت دبلا پتلا تھا۔ گال کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ جسم پر گوشت پوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ کسی نے مشورہ دیا۔

''ارے بھئی! اپنی صحت پر توجہ دو۔ جان بناؤ۔ یوں ہڈیوں کا ڈھانچا بنے رہے تو کسی دن ہوا کا کوئی تیز جھونکا اڑا کر تمہیں کہیں دور لے جا کر پھینک دے گا۔''

یہ مفت مشورہ اسے اچھا لگا۔ ''بات تو اگلے نے غلط نہیں کہی ہے۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر بھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بغور جائزہ لینے لگا۔ اگر چہ وہ اپنے آپ کو اکثر دیکھتا تھا مگر کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

''واقعی میں تو بس ہڈیوں کا ڈھانچا ہوں۔ چلتا پھرتا ڈھانچا۔''

اب وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غور و فکر کر رہا تھا۔ اس نے خوب اچھی طرح ہر زاویے سے آئینے میں

اپنے آپ کو گھور گھور کر دیکھا۔ اس دوران اس کے ذہن میں یہ خیال کلبلایا۔ ''شاید فلم دشمن اسی لیے میرے حق میں دشمن ثابت ہوئی کہ فلم دیکھنے والوں نے مجھے محض ہڈیوں کا ڈھانچا سمجھ کر مجھ پر توجہ نہیں دی اور فلم فلاپ ہوگئی۔''

اب وہ سوچ رہا تھا۔ ''ہیرو بننے کے لیے ٹھیک ٹھاک کسرتی بدن چاہیے۔'' اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنی باڈی بلڈنگ کا خیال آیا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر کہا۔

''میں اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ میں آئینے میں ایک صحت مند اور تندرست تن و توش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

بندہ بشر جب کسی بات کا سچے دل سے ارادہ کر لے تو اس پر ضرور عمل پیرا ہوتا ہے۔ رنگیلے نے بھی جو سوچا اور جس بات کا عزم کیا اس پر عمل درآمد کے لیے اپنی پہلی فرصت میں ایک ایسے ادارہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی جہاں باڈی بلڈنگ کی تربیت دی جاتی تھی۔ وہاں جاکر اس نے داخلہ لے لیا اور پابندی سے تربیتی کورس ادا کرنے لگا۔

ایک دن وہ پہلوانوں کے ایک اکھاڑے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ جہاں سارے ہی پہلوان اسے ہٹے کٹے موٹے مسٹنڈے نظر آئے۔ اس موقع پر فطری طور پر اس کی نظر اپنے سراپے پر گئی اور اس پر گویا شرمندگی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''تف ہے اس جسم پر۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر اپنی شرمندگی پر قابو پاتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

''ارے یار! فلمی ہیروؤں کی طرح بدن بنانے کے لیے کیوں نہ پلوانی سیکھی جائے؟''

وہ جو کہتے ہیں کہ دوا کے ساتھ ساتھ دعا بھی کرنی چاہیے۔ تو کچھ ایسی ہی بات اس وقت رنگیلے کے پیش نظر بھی تھی کہ باڈی بلڈنگ کے ساتھ ساتھ پہلوانی کا نسخہ بھی آزمانا چاہیے۔ وہ بھولو اور گاما پہلوانوں کا دور تھا۔ اس زمانے میں پہلوانوں کے اپنے اکھاڑے ہوا کرتے تھے۔ جو اپنے پٹھوں (شاگردوں) کو تربیت بھی کرتے تھے۔ رنگیلا نے بھی ایسے ہی ایک پہلوان کی شاگردی اختیار کرلی۔ اکھاڑے میں خوب جی لگا کر اپنے استاد کی ہدایات پر عمل کر کے پہلوانی سیکھتا رہا اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں اپنی کوشش اور کاوش سے چھوٹا موٹا پہلوان بن گیا۔ جس طرح کرکٹ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے امتحان کے طور پر ڈومیسٹک میچز کا انعقاد کرایا جاتا ہے۔ اسی طرح نئے پلوان بننے والوں کا اکھاڑے والے مقابلہ کروا کر ان کی پہلوانی کے معیار کا تعین کرتے تھے۔ ان کے اعتماد میں اضافے کا سبب بنتے تھے اور انہیں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی راہ دکھاتے تھے۔ رنگیلا کو جب اکھاڑے والوں نے پہلوانی کا ابتدائی سرٹیفکیٹ دے دیا تو اس کی تربیت کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے میں نو آموز پہلوانوں کا آپس میں مقابلہ کرایا جاتا تھا۔ رنگیلا کو بھی اس امتحان سے گزرنا پڑا۔ نئے پہلوان ساتھیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ دو چار مقابلوں میں تو اس نے ہر مقابل پہلوانوں کو چت کردیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ یہ پہلوان اس کے مقابلے میں کمزور تھے۔ جو کچھ بھی ہوا اس طرح رنگیلے کا حوصلہ بلند ہوگیا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ وہ سچ مچ پہلوان بن گیا ہے۔ اب وہ ہر مقابلہ جیت سکتا ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ کبھی سوا سیر سے بھی پالا پڑسکتا ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کی صغیر سنی تھی یا کچھ اس کے پٹھان ہونے کی وجہ بھی تھی۔ بہرحال وہ اس سوچ اور فکر کی وجہ سے مقابلوں میں جی داری کے ساتھ حصہ لیتا رہا کہ ایک دن اس کا جوڑ ایک تگڑے پہلوان سے پڑگیا۔ جس نے جلد ہی رنگیلے کے کس بل نکال دیئے اور پھر اپنے سر سے اوپر اٹھا کر اسے اکھاڑے سے باہر پھینک دیا۔ جیتنے والے پہلوان نے اکھاڑے کے اندر ہی اس کی کم پھینٹی نہیں لگائی تھی جب کہ اکھاڑے سے باہر پھینکنے پر اس کا سر پھٹ گیا۔ اس نے چوٹ کی جگہ ہاتھ رکھا تو ہاتھ خون سے رنگین ہوگیا۔ خون دیکھ کر اس کی پہلوانی کا بخار ایک دم اتر گیا۔

''ایسی کی تیسی اس پہلوانی کی۔'' اس نے اپنے مخصوص پٹھانی انداز میں سوچا۔ ''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی پہلوانی پر جس میں بندہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے آج اس پہلوانی کے طفیل سر پھوٹا ہے۔ کل پیر بھی ٹوٹ سکتا ہے، پرسوں ہاتھ تڑوا کر لولا بھی بن سکتا ہوں۔''

اکھاڑے سے اپنے ڈیرے پر جاکر وہ سوچ رہا تھا۔ ''میں نے پہلوانی سیکھنے کا ارادہ اس لیے تو نہیں کیا تھا کہ دوسروں کو اس بات کی اجازت دے دوں کہ وہ مجھے توڑ پھوڑ کر لنگڑا لولا بنا دیں۔ میں نے تو فلمی ہیروؤں کی طرح کسرتی بدن بنانے کے لیے پہلوانی سیکھنا چاہی تھی کہ میں بھی پہلوانوں کی طرح صحت مند بن جاؤں۔ پہلوان استاد نے مجھے کس راستے پر لگا دیا؟ بس آج سے پہلوانی ختم۔''

اور اس نے سچ مچ پہلوانی سے توبہ کرلی۔ اس کے بعد وہ اکھاڑے کے قریب سے بھی کبھی نہیں گزرا۔

''میرا مقصد تو جان بنانا ہے، جس کے لیے باڈی بلڈنگ ہی کافی ہے۔'' اس سوچ کے تحت اس نے تن سازی کی تربیت ترک نہیں کی۔ پہلوانی کے شوق میں اس طرف توجہ کم کردی تھی۔ پہلوانی سے توبہ کے بعد اب پورا وقت دیانتداری کے ساتھ باڈی بلڈنگ پر دینے لگا۔

انہی دنوں کی بات ہے لاہور کے کیپیٹل سینما میں باڈی بلڈنگ کا ایک مقابلہ ہوا۔ رنگیلا بھلا اس موقع پر کیوں پیچھے رہتا۔ اب وہ پہلے کی طرح ہڈیوں کا ڈھانچا نہیں تھا۔ ہڈیوں پر گوشت کی کچھ مزید تہیں جم گئی تھیں۔ تن سازی پر کی گئی محنت مشقت کے نتیجے میں کچھ کامیابی ضرور ہوئی تھی۔ اس نے اپنے اس جسم پر خوب اچھی طرح تیل کی مالش کی اور اسٹیج پر پہنچ کر مختلف زاویوں سے اپنی باڈی کا مظاہرہ شروع کردیا۔ مقابلہ دیکھنے والے ناظرین نے اس کے ہر ایکشن پر زبردست تالیاں بجا کر اسے داد دینا شروع کر دی۔ پہلے تو وہ بہت خوش ہوا کہ لوگ اس کی پذیرائی کررہے ہیں، اس کو داد دے رہے ہیں پھر اس کی کھوپڑی نے صحیح سمت میں کام کرنا شروع کردیا۔ اسے آہستہ آہستہ یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ اسے جس طرح داد دی جارہی ہے اس میں اور دوسرے باڈی بلڈرز کو دی جانے والی داد میں کچھ فرق ہے۔ اس احساس کے بعد اس نے ہال میں موجود داد دینے والوں کو غور سے دیکھا تو اسے اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا کہ یہ اسے داد نہیں بے داد دے رہے ہیں اس کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ اس کی تعریف نہیں کررہے ہیں اس پر آوازیں کس رہے ہیں۔ اس کی ہوٹنگ کررہے ہیں۔ اسے ایک دم غصہ آگیا۔ اس کے بعد وہ اسٹیج پر مزید نہیں رکا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ناظرین نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ اس کی تعریف کرنے کی بجائے اس کا مذاق کیوں اڑایا؟ اس پر اس طرح ہنس کیوں رہے تھے؟ لہٰذا ان باتوں کے جواب کے لیے وہ اپنے استاد اقبال بٹ کے پاس پہنچ گیا اور ان سے پوچھا۔

''بٹ صاحب! لوگ میری تعریف کرنے کی بجائے میرا مذاق کیوں اڑا رہے تھے؟ مجھ پر ہنس کیوں رہے تھے؟''

بٹ صاحب اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔ اقبال بٹ اس دور کے معروف باڈی بلڈر تھے۔ بہتوں کو انہوں نے اس فن کی تربیت دی تھی۔ انہیں ہنستا ہوا دیکھ کر رنگیلے نے بڑے اداس لہجے میں ان سے شکایت کی۔ ''بٹ صاحب! آپ بھی مجھ پر ہنس رہے ہیں؟''

''ارے یار! ہنسنے کی بات ہی ہے۔'' بٹ صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ ''لوگ تیرا ٹیڑھا میڑھا جسم دیکھ کر ہنس رہے تھے۔'' پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ''خدا نے تجھے باڈی بلڈنگ کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو ہنسانے کے لیے بنایا ہے۔ میں تو تجھے یہی مشورہ دوں گا کہ تو تن سازی چھوڑ کر فلموں میں کام کرنا شروع کردے۔''

رنگیلا نے انہیں غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ ''استاد مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے ہیں؟'' لیکن انہیں بے حد سیریس دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ ''نہیں انہوں نے مذاق میں نہیں کہا ہے۔ نیک نیتی سے کہا ہے۔ میری بہتری کے لیے کہا ہے۔ مجھے اچھا مشورہ دیا ہے۔ ان کے اس مشورہ پر مجھے سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔''

اس کے استاد اقبال بٹ نے فلموں میں کام کرنے کا مشورہ دے کر اس کی ایک پرانی خواہش کو ہوا دی تھی اس کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔ اسے اداکار بننے کا شوق تو بچپن اور لڑکپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی عمر ہی سے فلمیں دیکھنے لگا تھا۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر اس کا دل بھی مچل جاتا۔ ''میں بھی اداکاری کروں گا۔ اداکار بنوں گا۔ میری فلمیں بھی سینما گھروں میں دکھائی جائیں گی۔ مجھے بھی دیکھ کر لوگ خوش ہوں گے۔'' مگر اگلے لمحہ وہ اداس ہو جاتا۔ جس طرح مور ناچتے ناچتے اپنے پیروں کو دیکھتا ہے تو اسے ایک دھچکا لگتا ہے کہ میرے پیر کتنے بھدے اور بدصورت ہیں۔ اسی طرح جب اس کی نظر آئینے پر پڑتی اور اپنے چہرے کو دیکھتا اپنے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھتا تو گویا اس کے شوق پر اوس پڑ جاتی۔ فلمی ہیروؤں کے چہرے تو بھرے بھرے، خوب صورت اور چمکیلے ہوتے ہیں جب کہ میرا چہرہ...... میرے چہرے پر تو ابھری ہوئی باہر کو نکلی ہوئی ہڈیاں ہیں۔ ان ہڈیوں کی موجودگی میں، میں فلمی ہیرو کیسے بن سکتا ہوں؟ اور پھر وہ ان بدنما ہڈیوں کو غائب کرنے کے نت نئے طریقے سوچتا۔ کم سنی کے دور میں اس کی بچکانہ سوچوں میں ایک سوچ یہ بھی تھی کہ اگر میں ان ہڈیوں پر اینٹیں رکھ کر سویا کروں تو یہ ابھری ہوئی ہڈیاں غائب ہو جائیں گی اور وہ اکثر یہ نسخہ آزماتا، اپنے چہرے پر بھاری اینٹیں رکھ کر سوتا۔ اس طرح اس کی یہ ہڈیاں غائب تو نہیں

ہوتیں۔ اس کا چہرہ زخمی ہو جاتا تھا۔ اسے اچھی خاصی تکلیف ہوتی تھی۔ کسی بڑے کی نظر پڑ جاتی تو اسے اس دیوانے پن پر ڈانٹ بھی پڑتی۔ پٹائی بھی ہوتی۔ جب اس نسخے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تو اس نے جھنجلا کر اسے ترک کر دیا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس دور کا قصہ ہے جب وہ پشاور میں رہتا تھا اور ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ ہر چھوٹے لڑکے کو بڑے بڑے کام کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ رنگیلے کو بھی اداکار بننے کا شوق انہی دنوں پیدا ہوا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا اتنا بڑا ہوا کہ لڑکیوں کو دیکھ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں یوں سے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا اور اس نے اپنے اس عشق کا اظہار بھی کر دیا اس نے کسی سے سنا تھا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اس نے سوچا پھر اس محبت کو پوشیدہ رکھنے کا کیا فائدہ؟ لہٰذا وہ اس لڑکی کے ماں باپ کے پاس گیا اور نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''خبردار! اپنی بیٹی کی شادی کسی سے نہ کرنا۔''

''کیوں!'' لڑکی کے والدین نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

''کیوں کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔'' اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں ایک دن اس کی ڈولی لے کر آؤں گا اور تمہاری بیٹی کو دلہن بنا کر اس ڈولی میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔''

لڑکی کی ماں ایک دم غصے میں پاگل ہو گئی۔ تیز لہجے میں ہاتھ ہلا ہلا کر گالیاں دینے کے انداز میں بولی۔ ''تو نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟ ارے تیری کوئی شکل نہ صورت نہ ہی تیری کوئی حیثیت اس پر میری بیٹی سے شادی کرنے، بیاہ رچانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ پہلے کچھ بن کر تو دکھا۔ پھر آنا میرے پاس میری لڑکی کا رشتہ مانگنے۔''

''ارے! یہ تو وہی بولی بول رہی ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''جو فلموں میں ہیروئن کی ماں ہیرو سے بولتی ہے۔''

اس کے بعد اس نے بھی فلمی ہیرو کی طرح اکڑ کر اور سینے پر ہاتھ مار کر لڑکی کی ماں کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے اب میں تمہارے پاس کچھ بن کر ہی آؤں گا اور تمہاری بیٹی کو اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔''

لڑکی کی ماں کو یہ فلمی انداز کا جواب دے کر تو آ گیا مگر گھر آ کر سوچنے لگا۔ کچھ بننے کا مطلب تو یہ ہے کہ میں اسے فلمی ہیرو بن کر دکھاؤں مگر فلمی ہیرو بننے کے لیے تو...... مجھے سب سے پہلے لاہور جانا ہو گا۔ یہاں پشاور میں تو رہ کر فلمی ہیرو نہیں زیرو ہی بنا رہوں گا۔''

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پشاور میں فلمسازی نہیں ہوتی تھی۔ اِکا دُکا جو پشتو فلمیں بنتی تھیں وہ کراچی یا لاہور کے نگار خانوں میں بنتی تھیں۔ اس دور میں زیادہ تر اردو یا پنجابی فلمیں انہی دو فلمی مرکزوں میں بنا کرتی تھیں۔ بہرحال اس عاشق نامراد کا قصہ سنیے۔

اپنے اظہار عشق اور اس کے نتیجے میں محبوبہ کی والدہ ماجدہ کے سلوک کے بعد وہ کئی دنوں تک عجیب کیفیات میں مبتلا رہا۔ عشق بڑی بری بلا ہے۔ بندے کو کسی کام کا نہیں رکھتا۔ دیوانہ بنا دیتا ہے اور اس دیوانگی کی حالت میں کیا کچھ نہیں کرواتا۔ اس غریب کو بھی پشاور میں چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور ایک دن وہ...... چپکے سے گھر سے نکلا اور لاہور جانے والی ٹرین پر سوار ہو گیا مگر اس کے پاس ریل کا ٹکٹ نہیں تھا۔ ٹکٹ یوں نہیں تھا کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ پیسے ہوتے بھی کیسے؟ وہ کوئی کام دھندہ تو کرتا نہیں تھا۔ گھر سے جب کبھی کبھار جیب خرچ کے طور پر کچھ پیسے ملتے تھے تو ان سے فلم دیکھ لیتا تھا یا کھٹی میٹھی گولیاں خرید کر کھا لیتا تھا۔ ریل کے جس ڈبے میں وہ سوار ہوا تھا اس میں ایک بزرگ خاتون بھی سفر کر رہی تھیں۔ ٹی ٹی جیسے ہی ٹکٹ چیک کرنے کے لیے ڈبے میں آیا اس نے فوراً ہی نماز کی نیت باندھ لی۔ ٹی ٹی نے اسے دیکھا تو وہ نماز پڑھتے ہوئے بڑا اچھا لگا۔ اس لیے اس نے اسے چھیڑا نہیں۔ لڑکا بڑا معصوم، بھولا بھولا بلکہ کسی حد تک بدھو نظر آتا تھا۔ ٹی ٹی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے دکھاوے کی نماز پڑھ رہا ہے۔ اسے جل دے رہا ہے۔ ذرا توقف کے بعد وہ چلا گیا۔ تب اس نے سلام پھیر کر اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

''پتا نہیں مجھے نماز کا خیال کیسے آ گیا۔ نماز نے تو مجھے بچا لیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز واقعی بچانے والی چیز ہے۔ مصیبتوں سے...... گناہوں سے عذابوں سے۔''

باقی سفر بخیر و خوبی گزر گیا۔ ٹی ٹی ڈبے میں نہیں آیا یا تو وہ بھول گیا تھا یا پھر کوئی اور بات تھی مگر جب وہ لاہور اسٹیشن پر اترا تو اس کی ملاقات اسی ٹی ٹی سے ہو گئی۔ ٹی ٹی نے شفقت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ ''بیٹے تمہارا ٹکٹ؟''

اس نے بڑی معصومیت سے بزرگ خاتون کی طرف اشارہ کیا جو اس سے کئی قدم پیچھے تھیں اور آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ''وہ جی! میرا ٹکٹ تو میری ماں جی کے پاس ہے۔''

ٹی ٹی جیسے ہی خاتون کی طرف بڑھا اس نے فوراً اپنی رفتار تیز کر دی اور پلک جھپکتے ہی لاہور اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر بھی وہ کچھ دیر تک اسی رفتار سے چلتا رہا مگر اب وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ پتا نہیں میرے جھوٹ بولنے سے اس نیک دل بزرگ خاتون پر کیا بیتی ہو گی۔ جب خاتون نے انکار کیا ہو گا تو ٹی ٹی کیا سمجھا ہو گا۔ ماں جی کی عزت تو خاک میں مل گئی ہو گی۔ انسان اپنی مصیبت ٹالنے کے لیے دوسرے کو مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے مگر یہ تو بہت بری بات ہے، اسے اب اپنی غلطی کا اپنے جرم کا بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر اللہ سے اپنی غلطی کی اپنے گناہ کی معافی مانگی، توبہ کی اور کانوں کو ہاتھ لگا کر اپنے گالوں پر تھپڑ مارے۔ وہ یہ واقعہ بھولا نہیں۔ جب بھی اسے پشاور سے لاہور آمد کی یاد آتی اپنی اس بات پر شرمسار ہوتا۔ کئی بار اپنے انٹرویوز میں بھی اس واقعے کا ذکر کیا، اللہ سے اپنی اس بری حرکت پر معافی مانگی۔

وہ لاہور پہنچ تو گیا تھا لیکن بہت دیر تک سڑکوں پر گھومنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ جائے تو جائے کہاں؟ کس کے پاس جائے؟ کہاں اپنا ڈیرہ ڈالے؟ وہ تو پہلی بار اس شہر میں آیا تھا یہاں اس کا رشتے ناتے کا کوئی عزیز تھا نہ کوئی جان پہچان کا بندہ۔ وہ تو بس منہ اٹھا کر لاہور آگیا تھا یہاں آکر اسے جن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا یہ تو اس نے لاہور آنے سے پہلے سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر وہ اس پریشانی کے عالم میں بھی مسکرا دیا۔ عشق دیوانگی ہی تو ہے اور دیوانہ سوچتا کہاں ہے۔ اللہ مالک ہے۔ ناخدا جس کا نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ سرکلر روڈ سے گزر رہا تھا کہ سامنے اسے ایک مسجد نظر آئی اور اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''کون کہتا ہے، میرا یہاں اس اجنبی شہر میں کوئی جاننے والا نہیں۔ یہ میرے اللہ کا گھر ہے جسے میں پہچانتا ہوں اور جو مجھے جانتا ہے۔''

اس کے بعد وہ بلا جھجک مسجد میں داخل ہو گیا۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی اور امام صاحب سے مل کر کہا۔ ''میں ایک غریب اور مسکین لڑکا ہوں اور اس شہر میں اجنبی ہوں اگر آپ اجازت دیں تو کچھ دنوں تک یہاں قیام کر لوں؟''

وہ بڑے بھلے دن تھے۔ آج کل کی طرح پُر آشوب دور نہیں تھا۔ شرپسند دندناتے نہیں پھرتے تھے۔ قتل و غارت گری نہیں ہوتی تھی، گولیاں نہیں چلا کرتی تھیں، دھماکے نہیں ہوتے تھے، خودکش حملے نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے آج کی طرح عشاء کی نماز کے بعد مسجدوں کے دروازے بند نہیں کیے جاتے تھے۔ کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے مسافروں کو مسجدوں میں شیلٹر دینے میں کوئی انکار نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا مسجد کے امام صاحب نے اجنبی نوجوان کو مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت بخوشی دے دی۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اپنے گھر میں جگہ دی۔ بے سروسامانی کے عالم میں اسے سہارا دیا۔ وہ مسجد میں قیام کے دوران اللہ کی شکر گزاری کے طور پر پانچوں وقت کی نمازیں بڑی پابندی اور صمیم قلب کے ساتھ پڑھتا اور مسجد کے امام صاحب کے احسان کے بدلے میں خلوصِ دل سے ان کی خدمت کرتا۔ کبھی کبھی وہ اس سے کہتے بھی۔ ''بیٹا! میری عادتیں مت خراب کرو، مجھے اپنا کام خود کرنے دو۔''

''آپ بیٹا بھی کہتے ہیں اور اپنی خدمت سے بھی

بحر منجمد جنوبی
(Antarctic Ocean)

یہ نام سمندر کے اس حصے کو دیا جاتا ہے، جو خطۂ قطب جنوبی کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے ہے لیکن یہ دراصل اوقیانوس، بحر الکاہل اور بحرِ ہند کے وہ حصے ہیں جو اس خطے سے قریب تر ہیں۔ اس کے اندر بحیرۂ راس، ویڈل اور بلنگ ہاسن شامل ہیں باوجود یہ کہ اس کی حرارت کبھی چالیس ڈگری فارن ہائیٹ سے زیادہ نہیں ہوئی اس میں مچھلیاں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں اور وہیل بھی بہت ہوتی ہیں۔ جاڑوں میں اس کا پانی منجمد رہتا ہے۔ گرمیوں میں بھی برف کی چٹانیں ساحلوں سے لگی رہتی ہیں۔ اس میں چند جزیرے ہیں لیکن زیادہ مشہور وہ ہیں جو جنوبی امریکا سے متصل ہیں۔ اقتصادی لحاظ سے یہ سمندر اتنا اہم نہیں ہے۔

مرسلہ: سعید احمد گوجر۔ کوئٹہ

روکتے ہیں؟''

امام مسجد اس کی بات پر ہنس دیے۔ وہ سنجیدہ بات بھی اس طرح کرتا تھا کہ اگلے کو ہنسی آجاتی تھی۔ امام صاحب کی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ اکثر اذان کے وقت اذان بھی دے دیا کرتا تھا۔ اذان دینے کی عادت اسے بچپن سے تھی کیونکہ اس کے والد بھی مسجد کے امام تھے۔ ان کی مسجد میں بھی وہ اکثر اذان دیا کرتا تھا۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ اس نے کسی بڑے کی زبانی سنا تھا۔ اذان کا مطلب ہے اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے اس کے گھر بلانا۔ اللہ ایسے بلانے والے (موذن) کو اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے۔ اذان دینے والے کے لیے بڑا اجر ہے۔ اسے ایک بار پھر اذان دینے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے اس ثواب سے بھی اپنی جھولی بھرنے لگا۔ اسی طرح ہر نماز کے بعد جب نمازی چلے جاتے تو مسجد کی صفائی ستھرائی کر دیتا۔ امام صاحب اس کی ان باتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے تو اپنی طرف سے اسے کبھی کسی کام کے لیے نہیں کہا۔ وہ خود اپنی جانب سے اپنی موجودگی کو فعال ثابت کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرتا تھا۔ مسجد میں عام طور پر مختلف گھروں سے کھانا آتا ہے۔ اس مسجد میں بھی اللہ کے نیک بندے امام صاحب کے لیے کھانا بھجواتے تھے۔ امام صاحب اللہ کے گھر کے اس مہمان کو بھی اپنے کھانے میں شریک کرتے۔ ''آؤ پتر! کھانا کھالو۔''

''آپ کھالیں، میں باہر جا کر کھالوں گا۔''

''تم باہر جا کر کیوں کھاؤ گے؟ جو کچھ اللہ نے بھیجا ہے یہ ہم دونوں کا حصہ ہے۔''

''میری وجہ سے آپ کیوں......؟''

وہ رسمی طور پر تکلف کرتا مگر امام صاحب جانتے تھے کہ وہ بے سہارا اور بے یارومددگار ہے۔ اس کی جیب میں پیسے نہیں وہ باہر جا کر کیا کھائے گا اس لیے اسے اپنے ساتھ کھانے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ ذرا دیر ناں ناں کے بعد امام صاحب کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ مل جل کر اور کھانے پینے کے بڑے فائدے ہیں۔ بڑی برکت ہے۔ جو کچھ آتا تھا اس میں دونوں پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ کوئی بھوکا نہیں رہتا تھا۔ اگرچہ وہ کھانے کے دوران تکلفاً کہہ جاتا۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اس طرح مفت کی روٹی......''

ایسے ہی ایک موقع پر امام صاحب بول پڑے۔

''پھر تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟''

امام صاحب نے یہ بات محض اس لیے کہی تھی کہ یہ لڑکا انہیں بڑا خوددار لگتا تھا۔ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ بے روزگار ہے اس لیے مفت کی روٹی کھانے پر مجبور ہے مگر اس کا ضمیر اس پر اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

''میں کیا کروں؟'' اس نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا۔ ''مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔'' اس کا جواب سن کر امام مسجد کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر کچھ یاد کر کے بولے۔

''تم ایسا کرو کہ فیروز سنز جاؤ۔''

''یہ فیروز سنز کون سی جگہ ہے؟'' امام صاحب کی پوری بات سنے بغیر ہی وہ پٹ سے بول پڑا۔

''ارے بھئی! یہ کوئی جگہ نہیں کتابوں کی بہت بڑی دکان ہے۔ دکان والے قرآن شریف بھی چھاپتے ہیں۔ ان سے کہو گے تو وہ لوگ تمہیں قرآن شریف دیں گے جو تم گھوم پھر کر لوگوں کو ہدیتاً دیا کرو گے اس کام کے عوض فیروز سنز والے تمہیں تمہاری محنت کا معاوضہ دیں گے۔''

''مگر وہ لوگ تو مجھے جانتے پہچانتے نہیں وہ مجھے کیسے......''

''چلو، میں تمہیں ایک پرچی لکھ کر دیتا ہوں۔ وہ میری ضمانت پر تم پر بھروسا کر کے تمہیں اس کام پر مامور کر دیں گے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں ضرور جاؤں گا۔''

امام صاحب نے اسے ایک پرچی لکھ کر دی اور کہا۔ ''جاؤ جا کر دیکھو۔ کوشش کرو۔ اللہ نے چاہا تو وہ تمہاری مدد کریں گے۔ محنت کرنا، جدوجہد کرنا انسان کا کام ہے اللہ اس کا اجر ضرور دے گا۔''

امام صاحب کا سفارشی خط لے کر وہ لوگوں سے فیروز سنز کا پتا پوچھتا پاچھتا منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ فیروز سنز کے مالکان کو اس نے امام صاحب کا خط دیا تو انہوں نے خط پڑھ کر پوچھا۔

''میاں صاحبزادے! آپ رہتے کہاں ہیں؟''

''اسی مسجد میں جس کے امام صاحب نے یہ پرچی دی ہے۔''

انہوں نے اور بھی کئی سوال اس سے پوچھے جن کے جواب سے انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ایک بے یارومددگار نوجوان ہے۔ امام صاحب کو یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے اس کی مدد پر رضامند ہو گئے اور اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے پتر! ہم تمہیں کلام پاک دیں گے تمہاری محنت پر منحصر ہے تم جتنی محنت کرو گے بھاگ دوڑ کرو گے اسی مناسبت سے تمہیں اس کا پھل ملے گا۔''

بس اسی دن سے اس نے یہ نیک کام شروع کر دیا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر اللہ کے نیک بندوں کو اللہ کی کتاب پہنچانے لگا۔ اس کا انداز بہت دلچسپ ہوتا تھا۔

''ماؤں، بہنو، بیٹیو! میں تمہارے لیے بڑی قیمتی چیز لایا ہوں۔ ایسی انمول شے ایسی بے بہا دولت جس کا کوئی بدل نہیں آؤ یہ دولت مجھ سے لے لو۔ یہ دنیا میں بھی کام آنے والی ہے اور آخرت میں بھی۔''

اس کی آواز سن کر گھروں سے خواتین و حضرات باہر نکلے تو اس کے ہاتھ میں کلام پاک دیکھ کر ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔

''یہ لڑکا غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر دین و دنیا کی اور کون سی دولت ہو سکتی ہے؟ واقعی یہ دنیا میں بھی کام آنے والی شے ہے اور آخرت میں بھی۔''

وہ جو کسی نے کہا ہے ''وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔''

کچھ ایسی ہی بات اس کے ساتھ بھی تھی۔ ابھی اس کے اندر کا فنکار نمودار نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ ایک عام لڑکا تھا۔ ایک معمولی آدمی تھا لیکن اس کے اندر جو فنکار پرورش پا رہا تھا اس کی جھلکیاں کبھی کبھی از خود نظر آ جاتی تھیں۔ اسے کسی نے اس طرح آوازیں لگانے اور گاہکوں کو متوجہ کرنے کا گر نہیں بتایا تھا۔ نہ امام صاحب نے نہ ہی فیروز سنز والوں نے۔ اس نے خود ہی یہ انداز اپنایا تھا جو اس کے حق میں بہت سود مند اور کارگر ثابت ہوا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ یہ نیک کام کرتا رہا اور حلال رزق کماتا رہا۔ پڑاؤ اس کا اب بھی اسی مسجد میں تھا۔ جو کچھ کماتا اس سے شام کو واپس آتے وقت کھانے پینے کی کچھ چیزیں خرید کر لاتا اور اپنے ساتھ امام صاحب کو بھی بصد اصرار اس میں شریک کرتا۔ امام صاحب اسے بڑی شفقت سے سمجھاتے۔

''پتر! جو کچھ کماتے ہو اسے احتیاط سے خرچ کرو، سنبھال کر رکھو۔ ٹھیک ہے دن کو جب تم باہر رہتے ہو، اپنی روٹی باہر کھا لیا کرو لیکن شام کو آتے وقت کچھ خرید کر نہ لایا کرو۔ ہمارا کھانا تو اللہ بھیج ہی دیتا ہے ہاں اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیا کرو۔''

اسے امام صاحب پر بڑا پیار آتا۔ ''کتنے اچھے ہیں کیسی پیاری اور اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں۔''

دوستو! یہ ساری باتیں بتانے اور لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اندازہ ہو کہ کوئی شخص یونہی کامیاب و کامران نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنے موجودہ حالات میں رہ کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں محنت اور جدوجہد کرتے ہیں وہی آگے بڑھتے ہیں، ترقی کرتے ہیں اور ایک عام آدمی سے ایک بڑے اور کامیاب انسان بنتے ہیں۔ رنگیلا کی اس جدوجہد کی باتیں خود اس کی زبانی معلوم ہوئیں۔ یہ بھی اس کی بڑائی اور عظمت کا ثبوت ہے کہ اس نے ایک بہت بڑی فلمی شخصیت بننے کے بعد بھی اپنے ماضی کی تلخ اور ناپسندیدہ باتوں کو نہ صرف فراموش نہیں کیا، یاد رکھا بلکہ دوسروں سے بھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ مختلف اوقات میں، اپنی باتوں اور انٹرویوز کے دوران بڑی جوانمردی کے ساتھ اپنی ابتدائی زندگی کی ایک ایک بات بتائی۔

انہی دنوں کی بات ہے جب وہ فیروز سنز کے کلام پاک لوگوں تک پہنچانے کا کام کیا کرتا تھا۔ ایک دن لاہور کی گلیوں میں گھومتے پھرتے اس کی ملاقات کاکے خان سے ہو گئی۔

''اوئے بدماشا تو ادھر کیا کر رہا ہے؟'' کاکے خان اس کے قریب آ کر بولا۔

کاکے خان پشاور کا ایک بدمعاش تھا۔ وہ کاکے کو پشاور سے جانتا تھا کہ یہ آوارہ گرد اور بدمعاش آدمی ہے۔ بہت سی بری عادتوں میں ملوث ہے۔ اس نے دل ہی دل میں جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتے ہوئے بظاہر بڑی بے پروائی سے کہا۔ ''یار! ان دنوں میں لاہور آیا ہوا ہوں۔''

''ایسا مکا رسید کروں گا کہ تیرا ٹیڑھا میٹرھا منہ سیدھا ہو جائے گا۔ ابے الو کی فاختہ! یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تو اس وقت لاہور میں ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ تو کیا کر رہا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟''

''اچھا تو تمہارا یہ مطلب ہے؟'' اس نے اپنی سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کاکے خان کہ میں رہتا تو ایک مسجد میں ہوں مگر کرتا دھرتا کچھ نہیں۔''

اس نے جانے کس مصلحت سے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا۔ اس کی اسے خود خبر نہیں تھی۔

''پھر روٹی کیسے کھاتا ہے؟'' کاکے خان کا یہ سوال

بڑا فطری تھا۔

"بات دراصل یہ ہے کاکے خان کہ میں مسجد کی جھاڑ پونچھ کردیتا ہوں۔ اذان دے دیتا ہوں۔ امام صاحب کے ہاتھ پیر دبا دیتا ہوں، اس کے عوض امام صاحب اپنی روٹی میں سے دو چار لقمے کھلا دیتے ہیں۔"

کاکے خان سوچ میں پڑ گیا۔ برے لوگ بالکل ہی برے نہیں ہوتے۔ ان کے دل میں بھی کچھ اچھائی ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے ان کے دل میں بھی درد ہوتا ہے۔ اس نے ذرا سوچ کر سوال کیا۔

"تو کچھ کرتا کیوں نہیں؟ میرا مطلب ہے کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟"

"میں کوئی کام نہیں جانتا۔" اس نے بڑے بھولپن سے کہا۔ "اور یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، پھر مجھے کوئی کام کیسے ملے گا؟"

کاکے خان ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا پھر ذرا سوچ کر فکر مند انداز میں بولا۔ "تو بدمعاشی نہیں کرسکتا، چوری نہیں کرسکتا، ڈاکا نہیں ڈال سکتا، ورنہ میں تجھے اپنے ساتھ ہی رکھ لیتا مگر اس طرح مسجد میں رہ کر امام صاحب کی آدھی روٹی کھانا بھی تیرے لیے اچھا نہیں تجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

"ہاں کاکے خان تو ٹھیک کہتا ہے۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بے بسی سے بولا۔ "مگر میں کیا کروں مجھے تو کچھ کرنا ہی نہیں آتا۔"

کاکے خان کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔ "آتا ہے..... آتا ہے..... تجھے آتا ہے۔"

"کیا آتا ہے؟" اس نے حیرانگی سے کہا۔ "مجھے تو کچھ پتا نہیں مجھے کیا آتا ہے۔"

"تو تصویریں بنا سکتا ہے ناں؟"

"تصویریں..... ہاں الٹی سیدھی تصویریں تو بنا لیتا ہوں۔ جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ جبھی سے مجھے تصویریں بنانے کا شوق ہے۔ میں کاغذوں، دیواروں اور سڑکوں پر کوئلے سے تصویریں بنا بنا کر اپنا شوق پورا کرتا تھا۔"

"بس بس، زیادہ بکواس نہ کر۔" کاکے خان نے اس کی تقریر سن کر بور ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے جب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے آتا ہے۔ تصویریں بنانا آتا ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ تجھے نوکری مل گئی۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" اس نے ہونقوں کی طرح کاکے خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کب نوکری مل گئی؟ کیسے نوکری مل گئی؟ کہاں مل گئی؟"

"چپ۔" کاکے خان نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "بکواس کرے گا تو ایسا مکار سید کروں گا کہ......"

"ارے یار! کر ہی دے نا ایک مکار سید کہ میرا یہ ٹیڑھا منہ سیدھا ہو جائے۔"

کاکے خان ہنس دیا۔ "تو بڑا مخولیا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر میری بات غور سے سن۔ میکلوڈ روڈ پر واقع رتن سنیما دیکھا ہے تو نے؟"

"ہاں، دیکھا ہے۔"

"وہیں ایک پینٹر کی دکان ہے۔ دکان دار میرا جاننے والا ہے۔ سیدھا ان کے پاس چلا جا۔ جا کر اس سے کہنا کاکے خان نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ تجھے نوکر رکھ لے گا۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی پینٹنگ کی دکان میں مجھے نوکری دے دے گا؟"

"ابے ہاں یہی مطلب ہے۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تیری سمجھ میں کوئی بات کیوں نہیں آتی؟"

اس نے کاکے خان کے لب و لہجے اور غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی دکان میں جھاڑو لگانے اور پان سگریٹ چائے منگوانے کے لیے؟"

"ایسا مکار سید کروں گا اسے اگر اس نے میرے یار کو ایسے کام میں لگایا تو سمجھتا کیوں نہیں تو آرٹسٹ ہے، تصویریں بنا سکتا ہے اس لیے تجھے پینٹر کی نوکری دے گا...... جا...... اب میرا مزید بھیجا نہ کھا۔"

کاکے خان اس کے لیے ایک ملازمت کا بندوبست کر کے چلا گیا۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ وہ فوری طور پر اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر یہ نوکری حاصل کر لیتا مگر کئی دنوں تک وہ اس بارے میں سوچتا رہا، کاکے خان کے بتائے ہوئے پتے پر جائے یا نہ جائے؟ کاکے خان نے بڑے خلوص اور بڑی اپنائیت کا ثبوت دیا تھا۔ اس کی بے کاری اور بے روزگاری کے بارے میں فکر مند ہو گیا تھا اور پھر اپنے خیال کے مطابق ایک نیک مشورہ دیا تھا۔ ایسا مشورہ جس پر عمل کر کے وہ باعزت روزگار حاصل کر سکتا تھا۔ کاکے خان نے غلط نہیں کہا تھا کہ یہ کام وہ بخوبی کر سکتا ہے مگر جانے کیوں اس کا دل نہ مانا کہ کاکے خان کے اس

مشورے پر عمل کرے۔ البتہ اس کی اس بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اپنی روزی روٹی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ جہاں تک کام کرنے کا تعلق ہے امام صاحب کے مشورے پر عمل کر کے وہ کچھ کر تو رہا ہے مگر اس کرنے کے دوران اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ دین و دنیا کی جو انمول شے لوگوں تک پہنچانے کا کام کر رہا ہے وہ ہے تو بہت اچھا، بہت پاک صاف اور محترم...... لیکن دنیا والے اس کے حصول کے لیے وہ دلچسپی نہیں لیتے جو لینی چاہیے۔ دنیاداری کی دیگر چیزوں کے حصول کے لیے جو دلچسپی ان میں ہوتی ہے وہ اس انمول شے کے لیے نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے یہ چیز روز روز اور بار بار حاصل کرنے والی نہیں ہے۔ اس لیے بھی اس کی دن بھر کی بھاگ دوڑ کا اسے پُرکشش صلہ نہیں ملتا اگر میں محنت کر کے روزی کمانے پر کمربستہ ہو ہی گیا ہوں تو مجھے کوئی ایسا کام کیوں نہیں کرنا چاہیے جس میں زیادہ بہتری ہو، زیادہ نفع ہو، زیادہ فائدہ ہو۔ اس سوچ بچار کے دوران اسے یہ خیال بھی آیا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں یہ شیطانی بہکاوا بھی ہو سکتا ہے۔ شیطان صفت کاکے خان سے ملاقات کے بعد ہی یہ خیال آیا ہے۔ اس نے زیادہ فائدے والی نوکری کے لیے مجھے اکسایا۔ شاید اسی لیے میرے دل و دماغ میں یہ خیال آیا۔ ایک دن امام صاحب کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے اشارے کنائے میں اس نے سوال کر دیا۔

''یہ آپ کے لاہور والے کیسے لوگ ہیں؟''

''کیوں! کیا ہو گیا لاہور والوں کو؟''

''میں انہیں آخرت سنوارنے کے لیے جو انمول شے دیتا ہوں اس میں وہ اتنی دلچسپی نہیں لیتے۔ جتنی دنیاداری کی چیزوں میں لیتے ہیں۔''

امام صاحب اس کی بات اور اس کا مسئلہ سمجھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔ ''ارے بھئی! تمہاری چیز بہت قیمتی ہے نا اور قیمتی چیزیں روز روز خریدنے والی نہیں ہوتیں۔ لہٰذا تم اپنی کوشش میں اتنے کامیاب نہیں ہوتے، جتنے ضروریاتِ زندگی کا کام کرنے والے ہوتے ہیں۔''

وہ ''ہوں'' کہہ کر خاموش ہو گیا۔

امام صاحب نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''اگر تمہارا گزارا موجودہ آمدنی میں نہیں ہوتا تو تم کوئی اور کام کر لو۔ حلال رزق کمانے کے لیے کوئی بھی محنت مزدوری کی جا سکتی ہے۔ اپنی بہتری کے لیے ہاتھ پیر مارنا، کوشش اور جدوجہد کرنا کوئی بری بات نہیں۔''

امام صاحب کی بات سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے نئے دھندے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

جس ہوٹل میں وہ اکثر دن کی روٹی کھانے جاتا تھا ایک دن وہاں ایک اطلاع نامہ لکھا دیکھا۔ ''ملازمت کے خواہش مند افراد ہم سے رجوع کریں۔''

یہاں اس کی عمر کے کئی لڑکے بیراگری کرتے تھے۔ اس نے سوچا شاید اسی نوکری کے لیے یہ اطلاع نامہ ہے۔ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر وہ کاؤنٹر پر بیٹھے مینیجر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مینیجر نے حسبِ عادت بیروں کو مخاطب کرنے کے لیے گھنٹی بجائی۔ کسی بیرے کی آواز آئی۔

''کھایا پیا کچھ نہیں جی......''

''اور گلاس بھی نہیں توڑا جی۔'' اس نے بیرے کی بات کاٹ کر کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہو؟ کس لیے میرے پاس آئے ہو؟''

اس نے انگلی کے اشارے سے ''اطلاع عام'' کی طرف مینیجر کی توجہ مبذول کرائی۔

''اچھا...... تم ملازمت کرنا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کبھی کسی ہوٹل میں بیراگری کی ہے؟''

''جی نہیں جی۔''

''یعنی بالکل کورے ہو؟''

''جی ہاں جی۔''

مینیجر نے کچھ سوچا پھر بولا۔ ''کم از کم ایک مہینا تک تمہیں ٹریننگ کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ اس دوران تمہیں دو وقت کی روٹی اور شام کی چائے ملے گی۔ ایک ماہ بعد اگر خوب اچھی طرح کام سیکھ جاؤ گے اور برتن نہیں توڑو گے تو تمہاری تنخواہ بھی مقرر کر دی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور اسی دن سے کام شروع کر دیا لیکن اسے کیا پتا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک بہت اہم بات رونما ہونے والی ہے۔ کیونکہ تلخی کے بعد ہی میٹھے کا مزہ زیادہ محسوس ہوتا ہے لیکن وہ اہم بات اس انداز میں رونما ہوگی اس بارے میں اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

(جاری ہے)

دلرُبا

شاهد جہانگیر شاہد

برصغیر میں فلم انڈسٹری ابھی گھٹنیوں چل رہی تھی کہ پردہ اسکرین پر پشاور کا ایک خوبرو ہیرو نمودار ہوا جس نے پورے برصغیر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ابھی وہ اوج پر پہنچا ہی تھا کہ اس دور کی ایک سپر اسٹار اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ عشق نکاح تک پہنچا ہی تھا کہ اخبارات چیخ اٹھے ہیرو کو ہیروئن نے زہر دے دیا۔ اس خبر میں کتنی صداقت تھی؟

فلمی دنیا کے ابتدائی ایام، دو سپر اسٹار کا تذکرہ

فلم ورلڈ کے ایڈیٹر کا کمرا خالی تھا۔ وہ سر جھکائے کام میں مصروف تھا کہ کمرے کا بند دروازہ زوردار آواز سے کھلا۔ رچرڈ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوا۔ اس کا اس طرح آنا ایڈیٹر کو برا لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ یوں بھی وہ ہندوستانیوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ بات بات پر طعنے دیتا تھا کہ ہندوستانی غیر مہذب ہوتے ہیں۔ اس کا نظریہ تھا کہ دنیا کی سب سے اعلیٰ قوم انگریز ہے۔ ریورڈ بھی اس کا ہم مذہب تھا لیکن اینگلو انڈین تھا۔ اس لیے

پیشنس کو پر کا آخری خط

میرے پیارے سرتاج!

مجھے بے حد خوشی ہوئی جب آپ کا تار مجھے ملا جس کے لیے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں لیکن آپ نے مجھے اس وقت تار کیوں نہ بھجوایا۔ جب آپ لکھنو سے جار ہے تھے؟ اگر آپ کی لکھنو سے روانگی کا علم ہوتا تو روزانہ آپ کو خطوط اور تار لکھنو کے ایڈریس پر نہ بھجواتی۔ میں اس قدر پریشان تھی کہ اس پریشانی میں آپ کو ایک ہی دن میں تار اور خط بھجوا دیے۔ اداکار نواب کاردار نے بھی آپ کو خط بھیجا جو کہ میں نے اس کے لیے لکھا۔ ان خطوط اور ڈائریوں کا کیا بنے گا؟ کیا وہ تمہیں مل جائیں گی؟

حقیقتاً یہ جان کر مجھے بے حد رنج ہوا کہ تم ابھی تک شدید بیمار ہو اور تمہیں سخت درد کی شکایت ہے۔ میری جان کیا لکھنو میں حکیم آپ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے؟ لیکن وہاں آپ نے زیادہ قیام بھی تو نہیں کیا اور پھر اچانک لکھنو چھوڑ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ جب کہ لکھنو میں تقریباً ایک ہفتہ ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔

میری جان میرے سرتاج! اب تم کیا کر رہے ہو اور گھر میں کیا علاج ہو رہا ہے؟ میں تمہارے لیے دعا کرتی رہتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ گھر میں تمہیں کچھ آرام ملے گا۔ اگر دس پندرہ یوم تک تمہیں کسی قسم کا افاقہ نہ ہو تو پھر میرے پیارے فوراً کلکتہ واپس آ جاؤ اور مجھے موقع دو کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ پیارے سرتاج آپ کے علاقہ میں تو ان دنوں شدید سردی ہو گی لیکن یہاں موسم کافی گرم ہے۔ گزشتہ روز سے بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے موسم کافی حد تک خوشگوار ہو گیا ہے لیکن کچھ زیادہ ہی سردی ہو گئی ہے یا مجھے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ شاید میری طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔

وہ اسے بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا تھا مگر مجبور تھا کہ کلکتہ میں اس جیسا کوئی اور فلمی صحافی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔

''کیا باہر طوفان آ گیا ہے یا کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔'' اس نے رچرڈ کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''خبر ہی ایسی ہے۔ طوفانی خبر ہے۔'' اس نے بازو پھیلا کر کرسی پر کمر سیدھی کی ''مس کو پر نے گل حمید کو زہر دے دیا ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ یہ بات ایسی تھی کہ ایڈیٹر گویا اچھل پڑا۔

''کیا گل حمید کو زہر دے دیا مس کو پر نے؟'' ایڈیٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔ گل حمید فلمی دنیا کی جان تھا۔ سپر اسٹار تھا اس کے نام پر فلمیں بکتی تھیں۔ مس کو پر بھی معمولی ہستی نہ تھی۔ اس وقت کی مقبول ہیروئن تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ ڈبل ایم اے تھی۔ بے پناہ کامیابی کی حامل اصول پسند فنکارہ تھی۔ فلموں سے کمائی ہوئی دولت کو علم کے پھیلانے میں خرچ کرتی تھی۔ بہت سی غریب نادار اور یتیم بچیوں کی نہ صرف کفالت کرتی تھی بلکہ اپنی عالیشان کوٹھی میں ان کی تربیت کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ بے سہارا بچیوں کی اچھی جگہ شادیاں بھی کرواتی تھی۔ بڑی بڑی فلم کمپنیوں کے مالکان، ہدایت کار اور فنکار اس کی عزت کرتے، سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ وہ اس اصول پر کاربند تھی ''عزت آپ کرو تا کہ دوسرے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔''

ایک ایسا خوبرو فلمی ہیرو جس کے غائبانہ عشق میں ہندوستان بھر کی بے شمار لڑکیاں مبتلا ہوں جو اپنے کیریئر کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہو اور اپنے وقت کے تمام فلمی ستاروں سے کئی گنا زیادہ معاوضہ وصول کر رہا ہو اور فلمی دنیا کی ہر ہیروئن جس سے شادی کے لیے بے تاب ہو، ایسے شخص کو زہر دے دیا گیا۔ یہ بات ایک دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ایڈیٹر نے اسی وقت حکم صادر کر دیا۔ ''رچرڈ ہر کام چھوڑ کر اس خبر کی تحقیق میں لگ جاؤ۔''

''ہاں میں اسی پر کام کر رہا ہوں کہ مس کو پر نہ صرف اس کی پسندیدہ ہیروئن تھی بلکہ اس سے محبت بھی کرتی تھی پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ خوش قسمتی سے گل حمید اسے حاصل بھی ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت بھی کرتے تھے اور دونوں نے کورٹ میرج کر لی تھی۔''

''یہ بات تمہیں کس کے ذریعے معلوم ہوئی۔''

مجھے اُمید ہے اور میں بار بار تمہارے لیے دعا کررہی ہوں کہ تم جلد صحت یاب ہو جاؤ اور فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پیارے سرتاج! اب تم مجھے کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے نا۔ میں اس قدر تنہا ہوں، میرا دل اور دنیا بالکل اندھیر ہوگئی ہے۔ میرے دل میں تمہاری جو چاہت ہے وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔

جان سے زیادہ عزیز، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں تمہاری چاہت میں اتنی ڈوب جاؤں گی۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہوں کہ کب تم لوٹ کر آؤ گے اور میں ایک بار پھر تمہاری آغوشِ محبت میں ہوں گی۔ میری جان جس قدر جلد ممکن ہے تم واپس آجاؤ اور میری خوشیاں مجھے لوٹا دو۔

مسٹر رام کرشن نے اپنی فلم شروع کردی ہے اور جو کہ مجھے یقین ہے یہ فلم میڈن اسٹوڈیوز میں مسٹر کاردار ان کے لیے ڈائریکٹ کریں گے۔ معلوم نہیں اس فلم کا ہیرو کون ہوگا؟ اور کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ یہاں کے حالات اب کچھ اچھے نہیں رہے۔

میں بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں تمہارے پیار میں اس قدر کھو جاؤں گی۔ مجھے ایک طویل اور پیار بھرا خط جلد تحریر کرو اور اپنی صحت کا حال بھی ضرور لکھو کہ اب طبیعت کیسی ہے اور کیا علاج ہورہا ہے اور اب سارا دن تمہاری کیا مصروفیات رہتی ہیں۔ کیا اب بھی تم اسپرین (دوا) استعمال کرتے ہو اور یہ بھی لکھنا کہ وہاں کا موسم کیسا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں چوم لوں۔ خدا تم پر اپنا فضل کرے اور تمہاری حفاظت فرمائے اور پیارے تمہیں ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں۔

ہمیشہ کے لیے تمہاری اپنی
پیشنس کوپر

''یہ بات صحیح ہے کہ سوائے چند قریبی ساتھی فنکاروں کو جو کہ گل حمید کے ساتھ اس کے بنگلے ہی میں رہائش پذیر تھے۔ کسی اور کو اس کی خبر نہیں کہ مس کوپر اور گل حمید شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہیں۔ کمپنی مالکان نے انہیں یہ بات سب سے چھپانے کو کہا ہے۔ کیونکہ کمپنی کے قواعد و ضوابط میں اس بات کی سختی سے تاکید ہے کہ کوئی بھی فنکار خاص کر ہیرو ہیروئن فلم کمپنی میں کام کرتے وقت شادی کے رشتے سے دور رہیں گے کیونکہ شادی شدہ ہیرو ہیروئن کی فلمی دنیا میں مارکیٹ ڈاؤن ہوجاتی ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

آج کے دور میں بھی اس فارمولے پر عمل کیا جاتا ہے۔ فنکار کئی بچوں کے والدین بن جاتے ہیں لیکن اس خبر کو مخفی رکھتے ہیں۔ اس دور میں بھی جب ہندوستانی فلمی دنیا پالنے میں تھی اس بات پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ گل حمید اور مس کوپر کی شادی کی اطلاع حاسدوں نے کمپنی مالکان تک پہنچا دی تھی ان کے ادارہ ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کلکتہ کے مالکان نے دونوں کو بلوا کر جواب طلبی کی تھی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے دونوں کو پابند کیا تھا کہ یہ بات اسٹوڈیوز سے باہر نہ نکلے کیونکہ وہ دونوں کمپنی کی دو بڑی فلموں ''خیبر پاس'' اور ''باغی سپاہی'' میں ایک ساتھ کام کررہے تھے اور یہ شادی خیبر پاس کی شوٹنگ کے دنوں میں ہوئی تھی جس کی کہانی اور ہدایت کاری گل حمید کی ہی تھی۔ اس خبر کو چھپانے کی سختی سے ہدایت دی گئی تو بات چھپی رہ گئی اور اب یہ خبر کلکتہ جو برصغیر میں فلمی مرکز تھا، وہاں ہر ایک کی زبان پر آگئی تھی، گل حمید کو زہر دیا گیا ہے۔ اس پر ہر ایک کچھ نہ کچھ بول رہا تھا لیکن رچرڈ کے گلے سے یہ بات اتر نہیں رہی تھی کہ مس کوپر نے گل حمید کو زہر دیا تھا۔ گل حمید اپنے وقت کا سپر اسٹار تھا۔ برصغیر میں اس کے جوڑ کا کوئی اور نہ تھا۔ انگلستان میں سب سے خوبرو ہیرو روڈلف ویلنٹینو کو مانا جاتا تھا اور گل حمید اس کی کاپی تھا۔ گل حمید کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت تھا اس لیے اس سے جڑی ہر خبر کو اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ خبر تو آگ لگانے والی تھی۔ رچرڈ تحقیق میں لگ گیا تھا۔ اس نے تحقیق کا آغاز مس کوپر سے کیا۔

مس کوپر کی پہلی شادی نہایت کم عمری میں بنگال کے چائے کے باغات کے مالک مسٹر اے ایچ اصفہانی سے ہوئی تھی۔ اصفہانی برانڈ چائے والے سے لیکن یہ شادی چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکی اور اس کی بنیادی وجہ دونوں کے مزاج

اور عمر کا فرق تھا۔

اصفہانی صاحب سنجیدہ اور دھیمے مزاج کے مالک تھے جب کہ مس کو پر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نہایت غصے والی اور ضدی مزاج کی تھی اور ہر چیز کو اپنے انداز سے دیکھنے کی عادی۔ لہٰذا معاملہ جلد ہی علیحدگی اور طلاق پر منتج ہوا۔

طلاق کے بعد مس کو پر پھر سے اپنی فلمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئی اور اسے خاطر خواہ کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔ اس مرتبہ مس کو پر نے کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی ایسٹ انڈیا فلم کمپنی سے معاہدہ کیا اور پھر اس کی زندگی میں وہ خوشگوار لمحہ آگیا جب فلم ”مرڈر“ کے سیٹ پر اپنے وقت کے خوبرو اور مقبول ترین ہیرو گل حمید سے ملاقات ہوئی۔ گل حمید ایک پارہ صفت زندہ دل، تیز و طرار اور اپنے سامنے بڑے سے بڑے فنکار کو خاطر میں نہ لانے والا بلا کا خود اعتماد فنکار تھا۔ یہ اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ لوگ اسے ہالی ووڈ کے مشہور رومانی ہیرو روڈلف ویلنٹینو کا عکس کہتے تھے جس کی موت پر یورپ کی بہت سی لڑکیوں نے خودکشی کر لی تھی۔

گل حمید سے بھی اکثر پوچھا جاتا کہ وہ کس ہیروئن سے شادی کرے گا تو وہ یہی جواب دیتا کہ وہ اپنی والدہ کی پسند سے اپنے ہی گاؤں کی کسی دوشیزہ سے شادی کرے گا لیکن جب فلم ”مرڈر“ کے سیٹ پر گل حمید اور مس کو پر کی ملاقات ہوئی تو ان دو فنکاروں نے خود کو ایک دوسرے میں تلاش کر لیا۔ دونوں کے مزاج کی تیزی طراری اور یکسانیت نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ یہ قربت رنگ لائی اور پھر جلد ہی دونوں بہت سی مخالفتوں کے باوجود رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے اور ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے لگے۔ یہ اور بات تھی کہ شادی کی خبر پر سختی سے پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ فلم مرڈر کے بعد مزید دو کامیاب ترین فلموں ”خیبر پاس“ اور ”باغی سپاہی“ میں دونوں نے ایک ساتھ کام کیا اور بے انتہا داد اور کامیابی سمیٹی لیکن جلد ہی انہیں زمانے کی نظر لگ گئی۔ فلم ”باغی سپاہی“ کی شوٹنگ کے آخری مراحل میں گل حمید کے گلے کے دونوں طرف گلٹیاں نمودار ہوئیں۔ گل حمید پہلے تو اپنے طور پر اپنے واقف کار ڈاکٹروں سے علاج کرواتا رہا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ گلٹیوں میں شدید درد اور ساتھ ہی بخار بھی رہنے لگا۔ اس دوران باغی سپاہی اور ایک نئی فلم ”سنہرا سنسار“ کی شوٹنگ بھی شروع ہوگئی۔ شدید بیماری کے باوجود گل حمید دن رات شوٹنگ کی مصروفیت میں الجھا رہا۔

باغی سپاہی ایک بڑی اور کاسٹیوم فلم تھی جس میں گل حمید کو شہسواری اور تلوار بازی دکھانا تھی۔ اس جیسے ہمہ صفت فنکار کے لیے یہ ایک عام سی بات تھی کیونکہ وہ ایک ماہر شہسوار اور شمشیر زن تھا اور باغی سپاہی کے کردار کے لیے موزوں بھی تھا جب کہ سنہرا سنسار ایک رومانی اور المیہ فلم تھی۔ گل حمید نے اپنی صلاحیتوں سے دونوں کرداروں میں جان ڈال دی تھی۔ باغی سپاہی نے ریلیز ہو کر کامیابیوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ گل حمید کی بے پناہ مقبولیت دیکھتے ہوئے بمبئی کے فلم سازوں اور تقسیم کاروں نے بھی کلکتہ کا رخ کیا اور گل حمید کو منہ مانگے معاوضے پر معاہدے کرنے کی پیشکش کی۔ گل حمید جانے کا خواہش مند تو تھا لیکن اس نے صاف دلی سے اپنی حالت کے بارے میں بتا دیا کہ موجودہ بیماری کی وجہ سے میں مزید فلمیں سائن کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ سنہرا سنسار کی تکمیل کے بعد میں اپنے گاؤں واپس چلا جاؤں گا۔

بمبئی کے فلم سازوں کی گل حمید سے رابطہ کی خبر جب ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کلکتہ کے مالک مسٹر بی ایل کھیمکا کو ہوئی تو وہ دوڑا ہوا گل حمید کے بنگلے پر پہنچا اور جب اسے معلوم ہوا کہ گل حمید نے بمبئی جانے سے انکار کر دیا ہے تو خوش ہوگیا لیکن گل حمید نے جلد ہی اس کی غلط فہمی یہ کہہ کر دور کر دی کہ میں اپنی بیماری کی وجہ سے مزید فلموں میں کام نہ کر سکوں گا۔ آپ جلد از جلد میرا کام مکمل کروائیں کیونکہ میں زیادہ دن کلکتہ میں نہیں رہ سکتا۔ یہ بات سن کر تو مسٹر کھیمکا کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی کیونکہ سونے کی چڑیا اس کے ہاتھ سے نکلنے والی تھی۔

مسٹر کھیمکا نے فوراً کلکتہ کے مشہور سرجن مسٹر ڈیون کو بلوا لیا اور اس سے گل حمید کا معائنہ کروایا۔ مسٹر ڈیون نے معائنہ کے بعد مسٹر کھیمکا کو صاف بتا دیا کہ مرض اب ناقابلِ علاج ہو چکا ہے۔ وہ بہت مایوس ہوگیا اور سنہرا سنسار کے ڈائریکٹر مسٹر دیوکی بوس کو ہدایت کی کہ وہ دن رات کام کر کے گل حمید کے حصے کا کام فوراً مکمل کرے۔ یہی خواہش گل حمید کی بھی تھی۔ چنانچہ اپنا کام شدید بیماری کی حالت میں بھی نہایت ایمانداری سے مکمل کر کے گاؤں جانے کی تیاری

کرنے لگا۔

مس کوپر، گل حمید کی بیماری سے بے حد پریشان تھی اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ سب کچھ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا اور اس کے سہانے خواب یوں کرچی کرچی ہو جائیں گے۔ اس نے بھی ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن گل حمید نے اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے فی الحال انتظار کرنے کو کہا کہ اگر حالت سنبھل گئی تو وہ اسے بلوا لے گا۔

گل حمید کو ہدایت کار کاردار نے لکھنو کے ایک مشہور حکیم کا پتا بتایا کہ گاؤں جاتے ہوئے ان حکیم صاحب سے ضرور مل لینا۔ گل حمید کو معلوم تھا کہ وقت ان کے پاس کم ہے۔ پہلے تو وہ نہیں مانا لیکن کاردار صاحب اس کے استاد تھے۔ آخر ان کی بات ماننی پڑی۔

کاردار صاحب نے اپنی کمپنی کے ایک اداکار لالہ یعقوب کو راستے میں گل حمید کی دیکھ بھال اور خدمت کے لیے ساتھ روانہ کر دیا اور ہدایت کی کہ لکھنو میں اتر کے ان حکیم صاحب سے گل حمید کا معائنہ ضرور کروانا اور ہمیں بھی اطلاع دیتے رہنا۔ چنانچہ اگلے دن اسٹوڈیو کے تمام عملے سے فرداً فرداً ملنے کے بعد گل حمید کلکتہ کے ریلوے اسٹیشن سے فرنٹیئر میل کے ذریعے پشاور جانے کے لیے روانہ ہو گیا اسے رخصت کرنے کے لیے پیشنس کوپر اور چند دیگر قریبی دوست بھی اسٹیشن تک آئے۔

فرنٹیئر میل کچھ دیر میں روانہ ہونے والی تھی۔ گل حمید ریلوے پلیٹ فارم پر اپنے دوستوں کے ساتھ الوداعی ملاقات کر کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس کی سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی تو گل حمید نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تمام دوست ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑے اداس نظروں سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پرنم تھیں۔ ایک ایسا شخص جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر عین اپنے عالم عروج میں یوں خاموشی سے رخصت ہو رہا تھا کہ سوائے چند قریبی احباب کے کسی کو پتا بھی نہ تھا۔ پیشنس کوپر کی تو آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آخر بار دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ گل حمید نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا اور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

گل حمید سوچوں میں گم اپنی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ گاڑی اب پوری رفتار سے منزل کی جانب رواں دواں تھی اور اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ گل حمید کے ذہن کے پردے پر تمام گزرے واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ وہ تمام چہرے جن کے ساتھ اچھے اور برے دنوں کی یادیں وابستہ تھیں۔ ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے اور ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے ان چہروں کو یاد کر کے گل حمید کے خوب صورت چہرے پر کبھی ایک اداس مسکراہٹ اور کبھی غم کی پرچھائیاں لہرانے لگتیں۔

لالہ یعقوب نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یادوں میں ڈوبا دیکھ کر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ فرنٹیئر میل اپنی پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی اور کھڑکی سے باہر کے تمام مناظر پیچھے کی جانب بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ گل حمید کی نگاہیں بھی پیچھے کہیں دور اپنے ماضی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ وہی فرنٹیئر میل تھی جس سے گل حمید نے کئی بار پشاور، لاہور اور کلکتہ کی جانب سفر کیا تھا صرف کامیابی کی منزل کی تلاش میں اور اب جب کہ وہ اپنی منزل پا چکا تھا اور شہرت و کامیابی کی بلند ترین چوٹی پر براجمان ہو چکا تھا تو یہی فرنٹیئر میل اسے کامیابی کی منزلوں سے کہیں دور موت کی انجان وادیوں کی جانب لیے جا رہی تھی۔

کسی اسٹیشن پر جب گاڑی رکتی تو مسافروں اور خوانچے والوں کی آوازوں سے یادوں کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو جاتا لیکن گاڑی کے چلتے ہی پھر وہی یادیں وہی ماضی، غرض یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ لکھنو کے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو لالہ یعقوب نے اسے ماضی کی یادوں سے جگایا۔ گل حمید نے آنکھیں کھول کر لالہ یعقوب کی جانب دیکھا۔ لالہ نے کہا کہ لکھنو آ گیا ہے۔ یہاں ہمیں ان حکیم صاحب سے ملنا ہے جن کے بارے میں کاردار صاحب اور دیگر دوستوں نے تاکید کی تھی۔ لالہ یعقوب کی منتوں پر بھی جب گل حمید نے گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا اور نہیں مانا تو لالہ یعقوب چہرے پر ناراضگی اور اداسی طاری کر کے سر جھکا کر ایک جانب بیٹھ گیا۔ کسی کی دل آزاری، خصوصاً دوستوں کو ناراض کرنا گل حمید کا شیوہ نہ تھا۔ اپنی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ لالہ یعقوب کے روٹھے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا۔ لالہ نے منہ دوسری طرف موڑ لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ گل حمید نے اس

چینسں کو پر کا دوسرا خط

میرے پیارے محبوب!

گیارہ روز ہوئے کہ تم یہاں سے اپنے گھر چلے گئے ہو لیکن تم نے ایک خط بھی نہیں لکھا پیارے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ یہاں سے روانگی کے وقت تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم ہر دوسرے دن مجھے خط لکھا کرو گے اور اگر تم ایسا نہ کرسکو تو اپنے بھائی سے کہو گے کہ وہ تمہاری طرف سے مجھے خط لکھے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے پیارے الفاظ کا پاس کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم جانتے ہو کہ مجھے تمہاری کس قدر یاد ستاتی ہے اور تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے کتنی بے چین رہتی ہوں۔ تمہارے خط میں میرے لیے جو حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ شاید یہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے خطوط کی راہ تکتے تکتے میں کس قدر بے چین رہتی ہوں اور اپنے آپ کو کتنی تنہا محسوس کرتی ہوں۔ اس لیے مہربانی کر کے مجھے اپنی صحت کے بارے میں ہر خط میں آگاہ کرتے رہا کرو۔

پیارے یہاں تم نے ایک مصروف وقت گزارا ہے اب گاؤں کے پُرسکون اور خاموش ماحول میں جہاں شام کو ہی رات کا گمان ہوتا ہوگا۔ وہاں سناٹے میں تمہارا وقت کیسے گزرتا ہوگا۔ پیارے یہ بتاؤ کہ جب سے تم اپنے گھر آئے ہو تمہیں کیسا محسوس ہوتا ہے مجھے فوراً لکھو۔

گزشتہ شام سردار جی اور ان کے بھائی میرے پاس کافی دیر تک بیٹھے تسلیاں دیتے رہے۔ اس نے تمہیں یہاں سے ہی ایک خط لکھا اور یقین ہے کہ آج دوبارہ بھی لکھیں گے۔ سیٹھ موتی لال چریا اس بات کے لیے بڑا بے تاب ہیں کہ وہ اپنی نئی فلم میں ایک بار پھر تمہیں کاسٹ کریں اور دولت بنائیں گے۔ وہ الفی کو بھی فلم میں لینا چاہتے ہیں اور سردار جی کو ایک قیمتی گھڑی دینے کا وعدہ بھی کیا ہے تا کہ تم دونوں کو فلم میں کاسٹ کرلیں۔ الفی بمبئی چلی گئی تھی تا کہ ”امپیریل فلم کمپنی“ میں ایک

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ چلو اٹھو اب زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کوئی مجھ سے بڑے ایکٹر نہیں ہو۔ لالہ اس بات پر مسکرا دیا اور جلدی سے سامان اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا کہ کہیں گل حمید کا ارادہ پھر نہ بدل جائے۔ گل حمید بھی گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

گل حمید نے سارے سفر کے دوران اپنے چہرے کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر بھی یہی حالت برقرار رکھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی پہچان نہ لے۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر دونوں ایک تانگے پر سوار ہو کر حضرت گنج میں گل حمید کے ایک قریبی دوست مسٹر اے حفیظ کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ گل حمید نے ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے دوست کے ہاں رکنا مناسب سمجھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہوٹل میں ٹھہرا تو اس کی آمد کی خبر پورے لکھنؤ اور گرد و نواح کے علاقوں میں پھیل جائے گی اور لوگوں کا اژدھام ہوٹل کا رخ کرلے گا۔ اس شدید تکلیف کی حالت میں وہ کسی ہجوم کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ تانگہ جب اے حفیظ کے گھر پہنچا تو مسٹر حفیظ گل حمید کی یوں اچانک آمد پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گل حمید نے اس شدید بیماری میں بھی اپنی مشہور زندہ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب کھڑے حیران ہی ہوتے رہو گے یا ہمیں اندر آنے کے لیے بھی کہو گے۔ حفیظ شرمندہ ہو کر آگے بڑھا اور گل حمید سے اور لالہ یعقوب سے گلے ملا اور انہیں اپنے مہمان خانے میں لے آیا جو کہ مکان کی اوپر والی منزل پر تھا۔ یہ مکان بازار کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ مہمان خانے کی ایک بڑی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی جہاں سے دور تک بازار کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

اے حفیظ نے جلدی جلدی مہمانوں کی تواضع مشروبات اور کھانے سے کی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد گل حمید نے حفیظ کو لکھنؤ آنے کی غرض و غایت بیان کی۔ ساری بات سن کر اے حفیظ کو گل حمید کی موجودہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ اتنا زندہ دل انسان یہ کس روگ میں مبتلا ہو گیا ہے۔ گل حمید کی خواہش پر حفیظ اسی وقت حکیم صاحب کے مطب کے اوقاتِ کار معلوم کرنے چل پڑا اور ان دونوں کو اپنے واپس آنے تک آرام کرنے اور تھکاوٹ اتارنے کا مشورہ دے گیا۔ کافی دیر کے بعد جب حفیظ واپس آیا تو یہ خبر لایا کہ جن حکیم صاحب سے ملنے آپ صاحبان تشریف لائے ہیں وہ تو چند روز قبل فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے

فلم کے لیے آڈیشن دے لیکن اب وہ واپس لوٹ آئی ہے کیونکہ آڈیشن میں کامیاب نہ ہو سکی۔
آج میں نے اس کی بہن (مسز نور الدین) کو فون کیا تھا اور اس سے ایلی کا پتا معلوم کیا۔ چنانچہ آج شام اسے خط لکھوں گی کہ وہ یہاں آجائے اور سردار جی اور مسٹر کاردار کے ساتھ تمام معاملات طے کرلے۔ مجھے یقین ہے کہ سب کچھ بخوبی طے پا جائے گا۔ اسے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے آج کل اس کا شوہر بے روزگار ہے۔
سردار جی آج شام دوبارہ آرہے ہیں اور اسی طرح اختر نواز بھی۔ اختر نواز ایک فلم جلد ہی ''میڈن تھیٹرز'' کے لیے ڈائریکٹ کرے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ شاید میرے خطوط بے جان ہیں اور ان میں تمہارے لیے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں زیادہ معلومات فلم انڈسٹری سے متعلق نہیں رکھتی خصوصاً اس وقت سے جب سے میری نوکری چلی گئی ہے۔ میں گھر سے باہر بھی نہیں نکلتی ہوں۔ گزشتہ شام میرا بھائی مجھے دیکھنے آیا تھا اور نظر آتا تھا کہ میری جانب سے وہ بہت پریشان ہے۔
اب میں اس خط کو ختم کررہی ہوں کیونکہ ذہنی طور پر پریشان ہوں اور اپنے آپ کو زیادہ ٹھیک محسوس نہیں کرتی لیکن مجھے تم سے محبت ہے جو کہ ایک فطری جذبہ ہے۔ بے حد پیارے گل حمید ہر آنے والے روز مجھے تمہارے خط کا انتظار ہوتا ہے۔ میں لمحے گن گن کر وقت گزارتی ہوں کہ کب تمہیں دوبارہ دیکھوں گی۔ مجھے ضرور خط لکھو، خدا کے لیے لکھو اور مجھے بتاؤ کہ تم کیسے ہو۔ میرے خطوط اور ٹیلی گرامز تمہیں ملے ہیں جو لکھنو کے پتے پر میں نے تمہیں بھیجے تھے، مجھے اُمید ہے کہ وہ تمہیں مل گئے ہوں گے۔
میرے محبوب! میری تمام محبت اور میری روح صرف تمہاری ہے۔

تمہاری اور صرف تمہاری
پیشنس کوپر

روانہ ہو چکے ہیں۔ البتہ ایک اور مشہور حکیم صاحب جو کہ شفاء الملک کے نام سے مشہور ہیں ان سے میں نے آپ کی ساری کیفیت بیان کردی ہے۔ انھوں نے شام میں آپ کو بلایا ہے۔
یہ سن کر گل حمید نے لالہ یعقوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب مزید لکھنو میں رہنا بے کار ہے۔ میرا خیال ہے کہ رات کی گاڑی سے پشاور کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے لیکن لالہ یعقوب اور حفیظ کے اصرار پر گل حمید، حکیم شفاء الملک صاحب سے ملنے کے لیے راضی ہو گئے لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ صبح کی فرنٹیئر میل سے ہر حالت میں روانہ ہونا ہے۔ بہر حال شام کو گل حمید لالہ یعقوب اور اے حفیظ کے ہمراہ حکیم صاحب کے مطب پہنچے۔ حکیم صاحب کو حفیظ کے ذریعے گل حمید کی شخصیت، مقام اور شہرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ گل حمید کو دوسرے کمرے میں لے گئے اور گل حمید سے ان کی بیماری کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور گلے کا معائنہ بھی کیا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ گل حمید چند دن کے لیے دواخانہ کی بالائی منزل میں مریضوں کے لیے مخصوص کمرے میں رہائش اختیار کریں تاکہ وہ اپنی نگرانی میں ان کا علاج کرنے کی کوشش کریں لیکن گل حمید اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور حکیم صاحب سے دوائیں اور ان کے استعمال سے متعلق نسخہ لے کر واپس اے حفیظ کے مہمان خانہ میں لوٹ آئے اور اپنے لیے مخصوص کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ اب رات ہو چکی تھی لیکن گل حمید کی قسمت میں آرام کہاں، لالہ یعقوب کو آواز دے کر بلوایا اور اس سے کہا کہ لالہ صبح ہر صورت میں فرنٹیئر میل کے لکھنو پہنچنے سے پہلے ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ اب تم بھی آرام کرو اور میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ لکھنو کی وہ رات گل حمید پر بہت سخت گزری ایک تو سر کا درد اور بخار شدت اختیار کر گیا۔ دوسرے بازار کا شور اس قدر تھا کہ گل حمید ایک لمحے بھی آرام سے سو نہ سکا۔ یہ لکھنو شہر تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ عام حالات میں گل حمید بھی شاید اس رونق سے لطف اندوز ہوتا لیکن اس تکلیف کے عالم میں ایک رات بھی کسی عذاب سے کم نہ تھی۔
صبح ہوتے ہی گل حمید اور لالہ یعقوب، اے حفیظ کے ہمراہ اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آچکی تھی۔ گل حمید اور لالہ یعقوب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کے چلنے تک اے حفیظ کھڑکی کے قریب کھڑا گل حمید سے باتیں کرتا رہا۔ گاڑی نے پلیٹ

فارم چھوڑا اور پہلے آہستہ اور پھر اپنی پوری رفتار سے چلنے لگی۔ اب پھر وہی فرنٹیئر میل تھی گل حمید تھا اور یادوں کی برات۔

گاڑی جب لاہور کے اسٹیشن پر رکی تو گل حمید نے ایک بار پھر اپنے چہرے کو مفلر سے ڈھانپ لیا تاکہ کوئی آشنا چہرہ پہچان نہ لے۔ گاڑی سے اتر کر وہ کافی دیر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتا رہا۔ یہ وہی لاہور تھا جہاں سے اس نے اپنے فلمی کیریئر کی ابتدا کی تھی جہاں اس کے بہت سے فلمی اور غیر فلمی دوست رہتے تھے۔ ایک لمحہ کو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ چند لمحے اپنے لاہور کے دوستوں کے ساتھ گزارے جائیں جو کہ اکثر اسے خطوط میں لاہور آنے کی دعوت دیتے رہتے تھے لیکن پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ اگر ایک بار لاہور ٹھہر گئے تو پھر دوستوں کی محبت پاؤں کی زنجیر بن جائے گی اور وقت اس کے پاس بہت کم رہ گیا تھا اس بات کا اسے بخوبی احساس تھا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ کلکتہ اور لکھنو سے روانگی کے وقت تو اس نے اپنے گھر والوں کو اپنی آمد کی اطلاع ہی نہیں دی کہیں یوں غیر متوقع اور اچانک آمد سے سب گھر والے پریشان نہ ہو جائیں یہ سوچ کر گل حمید نے اپنے چھوٹے بھائی سید جمال خان کو جو کہ اس وقت نوشہرہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس کے نام ریلوے اسٹیشن پر موجود تار گھر سے ایک مختصر سا ٹیلی گرام تحریر کیا:

”طبیعت ناساز ہے۔ آج کی فرنٹیئر میل سے پہنچ رہا ہوں۔ گل حمید 10 فروری 1937ء۔“

چنانچہ مذکورہ تاریخ پر اپنے مقررہ وقت پر ٹرین جب نوشہرہ کے ریلوے اسٹیشن پہنچی جہاں سے اس کا گاؤں پیر پیائی بے حد نزدیک تھا تو سید جمال خان گاڑی کے ساتھ اسٹیشن پر موجود تھا۔ لہٰذا گل حمید اور لالہ یعقوب اس کے ہمراہ پیر پیائی کے لیے روانہ ہو گئے۔ گاؤں پہنچ کر گل حمید نے لالہ یعقوب کو گاؤں کی روایت کے مطابق اپنے ذاتی حجرہ میں ٹھہرایا اور بھائی سے کہا کہ لالہ یعقوب کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے اور پھر خود اپنے آبائی گھر اپنی والدہ صاحبہ کے پاس پہنچ گئے۔ گھر والوں کو اطلاع مل چکی تھی قریبی عزیز رشتے دار بھی ملنے آئے ہوئے تھے۔ گل حمید فرداً فرداً سب سے ملے اور ان کی خیریت دریافت کی۔ اس اچانک آمد پر سب ہی خوش ہوئے۔ لیکن اس خوشی میں کسی کا دھیان اس طرف نہ گیا کہ وہ دیکھتے کہ گل حمید بیماری کے باعث کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ خود گل حمید نے بھی کسی کو کچھ نہ بتایا کہ وہ جان لیوا بیماری کے کس عذاب سے دوچار ہے لیکن والدہ سے بیٹے کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔ گل حمید سب سے مل کر اپنے کمرے میں یہ کہہ کر چلے گئے کہ مجھے سفر کی تھکاوٹ ہے۔ آپ آپس میں گپ شپ کریں میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لالہ یعقوب چند دن تک مہمان کی حیثیت سے ان کے حجرے میں مقیم رہے اور پھر گل حمید سے اجازت لے کر کلکتہ لوٹ گئے۔

گل حمید کے چند اسٹوڈیو کے قریبی ساتھیوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اپنے وقت کا سپر اسٹار بھرا میلہ چھوڑ کر انتہائی خاموشی سے اپنے گاؤں پہنچ گیا ہے۔ دوسرے شہروں میں رہنے والے اس کے دوستوں اور پرستاروں کے خطوط اب بھی بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کلکتہ کے پتے پر پہنچ رہے تھے جہاں سے اسٹوڈیو کا عملہ تمام ڈاک گل حمید کے پاس گاؤں کے پتے پر روانہ کر دیتا تھا۔ گاؤں میں اب گل حمید کی کوئی مصروفیت نہ تھی سوائے اس کے کہ ماں کے زانو پر سر رکھے ان سے باتیں کرتا رہتا یا کمپنی کی معرفت آئے ہوئے خطوط کا مطالعہ کرتا رہتا اور بعض انتہائی ضروری خطوط کے جواب بھی دیئے دیتا تھا۔

گھر والوں اور دیگر قریبی رشتہ داروں کے مجبور کرنے پر صرف ان کی تسلی اور دل رکھنے کی خاطر ایک بار پشاور کے مشہور لیڈی ریڈنگ اسپتال بھی چلے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد آپریشن کی تجویز پیش کی لیکن گل حمید راضی نہ ہوئے اور گاؤں واپس لوٹ آئے۔ گل حمید کو اب صرف اپنی موت کا انتظار تھا۔ موت جو کہ ایک اٹل حقیقت ہے وہ وقت کا اشارہ سمجھ چکے تھے۔ دن تیزی سے گزرتے رہے اور وقت کا سپر اسٹار موت کی جانب بڑھتا رہا اور آخر ایک دن موت کا وار چل گیا۔ گل حمید اپنی والدہ محترمہ کے زانو پر سر رکھے لیٹے تھے۔ تمام گھر والے جاگ رہے تھے۔ آج درد بھی کچھ سوا تھا۔ گل حمید اس حال میں بھی اپنی تکلیف سب سے چھپانا چاہتے تھے کیونکہ وہ ایک کامیاب اداکار تھے اور اپنے جذبات کو دوسروں سے چھپانے کا ہنر جانتے تھے لیکن ماں ایک ایسی ہستی ہوتی ہے جو اپنی اولاد کی ہر خوشی اور دکھ کی کیفیت ہر حال میں جان لیتی ہے۔ کوئی کتنا بھی بڑا اداکار کیوں نہ ہو۔ ماں سے اپنے اوپر گزرنے والی کیفیت نہیں چھپا سکتا۔ گل حمید کی ماں بھی اپنے بیٹے کی تکلیف سے

پوری طرح آگاہ تھیں۔

یہ 18 اپریل 1937ء کی رات تھی۔ گل حمید کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ والدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دیگر اہل خانہ بھی اشکبار تھے لیکن فرشتۂ اجل کو کب کسی کے آنسوؤں کی پروا تھی۔ وہ آیا اور گل حمید کی روح کو ساتھ لے کر آسمان کی وسعتوں میں کہیں گم ہوگیا۔ گھر میں سب ہی کے دل غم سے بوجھل تھے اور آنکھوں سے برسنے والی برسات تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دوسرے دن گل حمید کو اپنے والد صاحب محترم سیف اللہ خان کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔

امان گڑھ اوور ہیڈ برج کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں گل حمید کی سفید رنگ کی یہ قبر کھلے آسمان کے نیچے ہر قسم کے شدید موسموں، سیلابوں اور طوفانوں کے مقابل سینہ تانے کھڑی ہے۔ گل حمید کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے۔

ستارۂ ہند

جواں مرگ گل حمید

تاریخ وفات 18 اپریل 1937ء

ہائے گل چھین اجل کیا مجھ سے نادانی ہوئی

پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

گل حمید نے کلکتہ کیا چھوڑا مس کوپر کی دنیا اندھیری ہوگئی۔ اس نے رنگ ونور کی دنیا فلم نگری کو خیر آباد کہہ دیا۔ مس کوپر کی دولت اور شہرت کو دیکھتے ہوئے کئی موقع پرست ہاتھ اس کی جانب بڑھے لیکن اس کے دل ودماغ پر تو گل حمید کا قبضہ تھا۔ وہ زندگی بھر گل حمید کی یادوں سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکی اور اپنی جانب بڑھنے والے ہر ہاتھ کو سختی سے جھٹک دیا اور باقی کی عمر گل حمید کی بیوہ کی حیثیت سے گزارنے کو ترجیح دی۔ ''وائسرائے ریگل لاج'' سے بڑا اور خوب صورت بنگلا بیچ کر زیر تربیت لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ زخم ختم ہونے لگے پھر ایک وقت وہ آیا جب اس کے پاس کچھ نہ بچا۔ آمدنی کے تمام دروازے اس نے پہلے ہی بند کررکھے تھے۔ لوگوں کے طعنوں اور فاقوں نے اس کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ اب اسے کچھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔ کیونکہ رچرڈ جیسے چند مفاد پرست صحافیوں کی وجہ سے لوگ بے سر پیر کی خبر پر یقین کرنے لگے تھے۔ کہنے لگے تھے کہ گل حمید کو زہر دیا گیا ہے۔ پریشانی کی حالت میں اس نے اپنے سابقہ شوہر اصفہانی صاحب کو اخلاقی مدد کے لیے پکارا۔ انہوں نے مس کوپر کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی درخواست انسانی ہمدردی کی بنیاد پر قبول کرلی اور مس کوپر کو اپنے چائے کے باغات کی اسٹیٹ میں بلا کر ایک گھر دلا دیا اور گھریلو اخراجات کے لیے وظیفہ مقرر کردیا۔ وہ یہاں بھی اپنے اخراجات سے رقم بچا کر نادار بچیوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کرتی رہی۔

اصفہانی صاحب تحریک پاکستان کے ایک اہم رکن تھے۔ اس سلسلے میں مس کوپر بھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ملک کی آزادی کے بعد چٹا گانگ مشرقی پاکستان کا حصہ بن گیا۔ اصفہانی صاحب کی عزت، شہرت اور کاروبار میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا لیکن مس پیشنس کوپر سلہٹ کے ایک دور افتادہ علاقے میں واقع چائے کے باغات میں گل حمید کی یادوں کے سہارے زندگی کے ماہ وسال گمنامی میں گزارتی رہی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ سفید سوتی ساڑی میں انتہائی سادگی اور گمنامی میں رہی۔ یہ خاتون اپنے وقت کی سپر اسٹار ہے۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا۔ انسان کے ساتھ اس کی پسند کا ساتھی ہو تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا لیکن جب وہ تنہائی کا شکار ہو تو ایک ایک پل کاٹنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسا ہی شخص جان سکتا ہے جو ایسے حالات سے گزر چکا ہو۔

پھر وہ سانحہ قیامت بن کر وقوع پذیر ہوا یعنی مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ اس سانحے کا ہر محب وطن پاکستانی کی طرح مس کوپر کو بھی رنج تھا۔ اس اندوہناک واقعے کے ٹھیک 12 سال بعد یعنی 1983ء کو مس پیشنس کوپر بھی چٹا گانگ میں انتہائی گمنامی اور کسمپرسی کی حالت میں انتقال کرگئی۔ تب بنگلہ دیش کے اخبارات اور دیگر میڈیا زکو معلوم ہوا کہ کتنی بڑی فنکارہ ان کے درمیان گمنامی کی زندگی گزار کر چلی گئی اور انہیں اس کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

گل حمید سے شادی کے بعد مس کوپر نے اسلام قبول کرلیا تھا اور صابرہ بیگم نام اختیار کیا تھا جو کہ دراصل ایک لحاظ سے ان کے انگلش نام کا ہی اردو ترجمہ تھا۔

آج گل حمید اور پیشنس کوپر دونوں اس جہان فانی میں موجود نہیں ہیں لیکن اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ایک خوب صورت یاد بن کر ہمیشہ مہکتے رہیں گے۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا نواں حصہ

تاریخِ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرئہ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

گیارہ سو عیسوی سے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ عالمِ اسلام میں دو ایسے واقعات ہوئے جن کا ذکر بہت ضروری ہے۔

1111ء میں امام ابو حامد الغزالی رحلت فرما جاتے ہیں۔ آپ بہت بڑے الٰہیات دان تھے۔ انہوں نے اسلام کی تشریح و تعبیر کی اور تصوف کو مرکزی دھارے میں لائے۔

ابو حامد ابو محمد سے علم فقہ حاصل کیا۔

پہلے طوس میں علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ پھر

نیشاپور میں امام الحرمین ابواحسان کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ ایک ہزار پچیس روز کے عرصے میں کتاب احیاء علوم تصنیف کی۔

ان کی تصانیف کی تعداد چار سو کے قریب ہے۔ جن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: تفسیر یاقوت چالیس جلدوں میں، کیمیاء سعادت، خلاصہ، جواہر القرآن وغیرہ مگر علماء کا اتفاق ہے ان کی تصانیف میں سے اگر احیاء العلوم کے سوا کوئی اور کتاب نہ ہوتی تو ان کی فضیلت اور کمال علمی کے لیے وہی کافی تھی۔

بغداد کے دار العلوم نظامیہ میں پڑھاتے رہے جہاں سے ان کے علمی فیضان کے چرچے دور دور تک پھیل گئے۔

جب درس سے فارغ ہو کر گھر تشریف لے جاتے تو پورے پانچ سو فقہا کا جھرمٹ ان کے آگے پیچھے ہوتا۔

کہتے ہیں کہ جب وہ کتاب المخول تصنیف کر کے اپنے استاد امام الحرمین کے پاس لے گئے تو انہوں نے فرمایا۔ ”تمہاری تصانیف نے ہماری تصانیف کو دفن کر دیا ہے۔“

مدتوں شام میں رہے۔ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو مصروف عبادت رہتے۔ صرف پچپن برس کی عمر میں وفات پائی۔

حیرانی اس بات کی ہوتی ہے کہ صرف پچپن برس کی عمر اور اتنی تصانیف کہ جن کو صرف پڑھنے کے لیے پچاس برس چاہئیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ خدا نے ان کے وقت میں برکت عطا فرما دی تھی۔

1118ء عیسوی۔ سلجوق سلطنت ٹوٹ کر آزاد ریاستوں میں تقسیم ہوئی۔

1118ء (1258) چھوٹی چھوٹی حکومتیں عباسی خلافت کو تسلیم کرتے ہوئے آزادانہ عمل کرتی ہیں۔

(73) 1127 عیسوی۔ زنگی خاندان جس کا بانی ایک سلجوق کمان دار تھا۔ وہ صلیبیوں کے خلاف شام میں ایک لشکر اکٹھا کرنے کا آغاز کرتا ہے۔

(1269) 1130 حکمرانوں کا ایک خانوادہ امام غزالی کے اصولوں کے مطابق شمالی افریقا اور اسپین میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔

(1050) 1171 عیسوی۔ کرد جرنیل صلاح الدین کی قائم کردہ ایوبی خاندان صلیبیوں کے خلاف زنگیوں کی مہم کو جاری رکھتا ہے۔ مصر میں فاطمی خلافت کو شکست دیتا ہے اور وہاں سنی عقائد کو رائج کرتا ہے۔

(1225) 1180 عیسوی۔ بغداد میں عباسی خلیفہ الناصر زیادہ موثر حکمرانی کے لیے فتوؤں کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

1187 عیسوی۔ صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کی جنگ میں صلیبیوں کو شکست دے کر یروشلم دوبارہ حاصل کر لیا۔

1191 عیسوی۔ صوفی اور فلسفی یحیٰی سہروردی حلب میں انتقال کر گئے۔ ممکنہ طور پر انہیں ایوبیوں نے بدعت کی وجہ سے سزا دی تھی۔

1193ء عیسوی۔ ایرانی نژاد غوری دہلی کو حاصل کر لیتے ہیں اور ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔

1198ء قرطبہ میں فلسفی ابن رشد نے وفات پائی۔ مغرب انہیں Averros کے نام سے جانتا ہے۔

ابن رشد کی پیدائش 1126 عیسوی میں ہوئی تھی اور انتقال 1198 عیسوی میں ہوا۔ ابن رشد قرطبہ کے قاضی بھی تھے۔ ان کے عقلیت پسندانہ فلسفے نے اسلامی دنیا سے زیادہ مغرب کو متاثر کیا۔

(1220) 1199 عیسوی۔ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ ایک عظیم ایرانی بادشاہت کے قیام کا فیصلہ کرتا ہے۔

برصغیر میں سلطان محمود غزنوی کے بعد بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ یکے بعد دیگرے سلاطین آتے اور جاتے رہے جن کی تفصیل سے گریز کیا جا رہا ہے۔

اب ہم آتے ہیں شہاب الدین محمد غوری کی طرف جس کے بارے میں تاریخ پاک و ہند کے مصنف سید عبدالقادر شجاع نے تحریر کیا ہے۔

شہاب الدین محمد غوری کو بجا طور پر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف راجپوتوں کی سیاسی قوت کو کچلا بلکہ ان کو سطوتِ پارینہ کے کھنڈروں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

شہاب الدین غوری ایک عملی سیاست دان تھا۔ وہ نہ صرف ایک فاتح جنگجو تھا بلکہ تعمیری کام کرنے والا سیاست دان اور مدبر بھی تھا۔

اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان میں لکھا ہے۔ ”شمالی برصغیر میں اسلامی سلطنت کے توسیع کے لیے انتہائی اہم کردار ادا کرنا شہاب الدین غوری کے مقدر میں لکھا جا چکا

تھا۔"

شہاب الدین غوری کو ہم سال بہ سال آگے بڑھتے ہوئے کچھ اس طرح دیکھتے ہیں۔

1175 عیسوی۔ شہاب الدین غوری اس سنہ میں اپنے فتوحات کا آغاز کرتا ہے۔ اس وقت یہاں پر قرامطی فرقہ اقتدار میں تھا۔ ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد اس پر اپنی حکومت قائم کی۔ قرامطی حکمران فرار ہو کر اوچ چلا گیا۔ چنانچہ شہاب الدین نے اوچ پر حملہ کیا اور اس پر بھی قبضہ کرلیا۔

1176 عیسوی میں اوچ اور ملتان غوری سلطنت کا حصہ بن گئے۔

1178 عیسوی میں اس نے حملہ کرنے کی غرض سے سندھ کے صحرا کو عبور کیا مگر اسے یہاں کامیابی نہیں ہوئی۔

1179 عیسوی میں اس نے پشاور پر قبضہ کرلیا۔

1181 عیسوی میں لاہور کا محاصرہ کیا۔ اس وقت یہاں آخری غزنوی حکمران خسرو ملک حکمران تھا۔

1182 عیسوی میں اس نے سندھ کو فتح کرلیا۔

1184 عیسوی میں خسرو ملک نے خراج کی ادائیگی بند کردی تو سلطان شہاب الدین نے پھر پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔

1187 عیسوی میں اس نے سیالکوٹ پر قبضہ کرلیا۔

1189 عیسوی میں اس نے غزنوی خاندان کے تمام چیدہ افراد کو گرفتار کر کے موت کی سزا دے دی۔ پرتھوی راج سے زبردست جنگ ہوئی۔ پرتھوی راج کو گرفتار کرلیا گیا۔

1194 عیسوی میں اس نے قنوج اور بنارس کو فتح کرلیا۔

1196ء تک اس کی حکومت گوالیار تک پھیل گئی۔ سلطان شہاب الدین غوری نے قطبُ الدین ایبک کو اپنا نائب بنایا جس نے دہلی، میرٹھ اور علی گڑھ کے علاقوں کو فتح کر کے سلطنتِ دہلی کی بنیاد رکھی۔

شہابُ الدین غوری کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے قطب الدین کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔

قطب الدین ایبک نے کئی سال دہلی پر حکومت کی اور خاندانِ غلامان کی بنیاد رکھی۔

اور اب شروع ہوتی ہے 1200 سو عیسوی۔ سن 1201 عیسوی سے لے کر 1299 تک بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ یہ سو سال ہی دنیا میں افراتفری اور جنگ و بربادیوں کے تھے۔

1200 عیسوی۔ انوسنٹ سوم نے پاپائی حاکمیت کو مستحکم کیا۔

میگنا کارٹا کا معرکہ ہوا۔

چنگیز خان نے اپنا کردار ادا کیا۔

منگولیوں نے روس کو فتح کیا۔

منگولوں نے چین کو فتح کیا۔

منگول سلطنت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔

قبلائی خان۔

چنگیز خان۔ ویسے تو اس شخص کی پیدائش 1162 عیسوی میں ہو چکی تھی لیکن 1206 عیسوی میں اسے چنگیز خان کا لقب دیا گیا تھا۔

ہم نے اسی مناسبت سے اس کو 1200 سے لے کر 1299 عیسوی تک کے برسوں میں شمار کیا ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی منگول سردار تھا جس نے اپنے بیٹے کا نام ایک مفتوح حریف سردار تیموجن کے نام پر رکھا تھا۔

یہ تیموجن نو برس کا ہوا تو اس کا باپ قتل ہو گیا۔ اچھے دن دیکھنے کے لیے اس کو بہت برے دنوں سے گزرنا پڑا۔

ایک بار وہ قید ہوا تو اس کی گردن میں زنجیر باندھ کر رکھا گیا۔ ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد وہ دنیا کے انتہائی طاقت ور انسان کی حیثیت میں سامنے آیا۔

اس کی ترقی کا آغاز اس اسیری سے فرار کے بعد ہوا۔ فرار ہو کر وہ اپنے باپ کے ایک دوست طغلال سے جا ملا جو ایک سردار تھا۔

اگلے کئی برسوں تک اس نے منگولوں کو اکٹھا کرتے ہوئے گزارے۔ پھر ہولناک جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

1206 عیسوی میں منگول سرداروں کے ایک اجلاس میں اسے چنگیز خان کا لقب دیا گیا۔

یہ زبردست فوجی قوت جو چنگیز خان نے جمع کی تھی ہمسایہ اقوام پر چڑھ دوڑی۔ اس نے پہلے شمالی چین میں سہی سہی سلطنت پر پھر چینی سلطنت پر یورش کی۔ یہ مقابلے جاری تھے کہ چنگیز خان اور خوارزم شاہ محمد کے درمیان ٹھن گئی۔

1219 عیسوی میں چنگیز خان خوارزم شاہ پر چڑھ دوڑا جو اس وقت ایران اور وسطی ایشیا کی ایک بڑی طاقت تھا۔

اس نے ایران اور وسطی ایشیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ خوارزم شاہ کی سلطنت مکمل تباہ ہوگئی۔
اس کی دیگر فوجیں روس پر حملہ آور ہوئیں۔ پھر چنگیز خان نے افغانستان اور شمالی ہند پر دھاوا بولا۔
1225 عیسوی میں وہ منگولیا واپس لوٹا اور 1227 عیسوی میں اس کی موت ہوگئی۔
منگولوں نے روس کو فتح کیا۔
چنگیز خان نے اپنے تیسرے بیٹے اوغدائی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا جو ایک ذہین اور بہادر انسان تھا۔ اس نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔
اس کی زیر قیادت منگول فوجوں نے چین میں پیش قدمی جاری رکھی۔ روس کو پامال کیا اور آگے یورپ تک پہنچ گئیں۔
1241 عیسوی میں منگولوں نے جو بوڈاپسٹ تک بڑھ گئی تھیں۔ پولینڈ، جرمنی اور ہنگری کی فوجوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس برس اوغدائی کی بھی موت ہوگئی۔
سینٹ ٹاس ایکوینیز۔ اس کا زمانہ 1225 عیسوی۔ 1274 عیسوی تک کا ہے۔
یہ اطالوی فلسفی اپنی الہیاتی موضوعات پر تحریروں کے باعث مشہور ہے۔ خاص طور پر اپنی کتاب Summa Thaslogica کے سبب جو کیتھولک الہیاتی عقائد کی غالباً مستند ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اس نے اخلاقی مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔
اب ایک نظر دوڑاتے ہیں اسلامی ریاستوں کی طرف اور یہ دیکھتے ہیں کہ 1201 عیسوی سے 1299 عیسوی کے دوران اسلامی دنیا میں کیسے واقعات رونما ہوئے۔
1205 سے 1287 عیسوی۔ ہندوستان میں ایک ترک غلام خاندان غوریوں کو شکست دیتا ہے۔ (قطب الدین ایبک) اور سلطنت دہلی کو قائم کر کے گنگا کی پوری وادی پر حکومت کرتا ہے۔ تاہم جلد ہی ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو منگول خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔
1220 سے 1231 عیسوی۔ پہلا زبردست منگول حملہ شہروں کی وسیع پیمانے پر تباہی و بربادی ہوئی۔
1224 سے 1391 عیسوی۔ منگول کیپشن کے شمالی اور بحر اسود کے علاقوں پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

1225 عیسوی۔ الموحدین نے اسپین کو چھوڑ دیا جہاں مسلمانوں کا اقتدار اور آخر کار غرناطہ کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔
1227 عیسوی۔ چغتائی منگول خان ماوراالنہر پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔
1240 عیسوی۔ صوفی فلسفی محی الدین ابن العربی کی وفات۔
آپ اسپین کے تھے۔ انہوں نے اسلامی سلطنت کی خوب سیاحت کی۔ وہ انتہائی اثر انگیز مصنف تھے۔ انہوں نے ایک تکیغوری الہیاتی وژن کا پرچار کیا۔ روحانیت ان کے فلسفے میں سموئی ہوئی ہیں۔
ان کی مشہور کتابوں میں مقدس الحکم اور فتوحات کلیسا ہیں۔
1250 عیسوی۔ ایک غلام فوجی دستہ یعنی مملوک ایوبیوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ وہ مصر اور شام پر حکومت کرتے ہیں۔
(1335)۔ 1256 عیسوی۔ منگول عراق اور ایران پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔
1258 (عیسوی) منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی۔
1260 عیسوی۔ سلطان بیبرس منگولوں کو عین جالوت کی جنگ میں شکست دیتا ہے اور شامی ساحلوں پر بہت سے قلعوں کو تباہ کر دیتا ہے۔
1273 عیسوی۔ اناطولیہ میں حضرت مولانا رومؒ کی وفات ہوجاتی ہے۔
حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ایک نہایت بااثر صوفی تھے۔ ان کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں افغان درویش کہا جاتا ہے۔
1288 عیسوی۔ عثمان غازی۔ بازنطینی سرحد پر اناطولیہ میں عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔
اب آجائیں برصغیر کی طرف کہ یہاں ان سو برسوں میں کون کون سے واقعات رونما ہوئے۔
17 مارچ 1206 عیسوی کو لاہور میں قطب الدین ایبک کی تاج پوشی ہوئی۔
سلطان شمس الدین التمش نے 1211 عیسوی میں عنان حکومت سنبھالی۔
1214 عیسوی میں خوارزم شاہ پر منگولوں نے حملہ

کر دیا۔

1216 عیسوی میں التمش اور یلدرز کے درمیان ترائن کے مقام پر جنگ ہوئی۔

1228 عیسوی میں سلطان التمش کو بغداد کے خلیفہ نے سندھ کی حکومت اور خلعت سے نوازا۔

1236 عیسوی میں التمش کی وفات ہوگئی۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین تخت پر بیٹھا۔ وہ ایک نا اہل حکمران تھا۔

امراء اور دیگر لوگوں نے باہمی مشورے سے التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ رکن الدین نے بہن کے خلاف فوج کشی کی لیکن اسے شکست ہوئی۔

رکن الدین کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ 1236 عیسوی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

رضیہ سلطانہ کے خلاف آئے دن بغاوتیں ہوا کرتیں۔ 1240 عیسوی میں لاہور کے حاکم نے بغاوت کر دی لیکن پھر اس نے صلح کر لی تھی۔

ایک جنگ کے دوران وہ قید ہوگئی تھی۔ 1240 عیسوی میں اسے اس کے شوہر التونیہ کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

رضیہ سلطانہ کے بعد اور کئی حکمران آئے جیسے معز الدین بہرام شاہ، سلطان علاؤ الدین، مسعود شاہ۔

پھر 1246 عیسوی کو سلطان ناصر الدین الدین محمود نے حکومت سنبھالی۔ اس کا انتقال 1266 عیسوی کو ہوا۔ اس کی موت کے بعد غیاث الدین بلبن کو تخت پر بٹھایا گیا۔ وہ ایک ہوشیار اور بہادر انسان تھا۔

اس نے بائیس برس بڑی شان سے حکومت کی۔ اسے اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی۔ بیٹے کی جوان موت نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ آخر اس صدمے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

اس کے بعد سلطان معز الدین نے حکومت کی۔ وہ ایک عیاش اور سخت نا اہل انسان تھا۔ اس کو مار دیا گیا۔

اس کے بعد برصغیر میں خلجی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔

فیروز شاہ خلجی 1290ء کو سلطان جلال الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک نیک سیرت، خوش اخلاق اور حق گو شخص تھا۔ اس کی حکمرانی کے دور میں بے شمار واقعات رونما ہوئے جن کی تفصیل اس وقت نہیں دی جارہی ہے۔ 1292 عیسوی کو سلطان علاؤ الدین خلجی نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کی حکمرانی بیس برسوں تک رہی۔

ہم 1299 عیسوی تک آچکے ہیں لیکن آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم ایک نظر یورپ کے حالات اور وہاں کے حکمرانوں پر ڈال لیں کہ کس ملک میں کون کون سے حکمران حکومت کرتے رہے اور وہاں کی مجموعی صورت حال کیا تھی۔

یورپ کا یہ جائزہ بھی 1299 عیسوی تک کا ہوگا۔ اس کے بعد پھر آگے چلیں گے۔

یہ تفصیلات ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب "یورپ پر اسلام کے احسانات" سے حاصل کی گئی ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانے میں یورپ مختلف وحشی قبائل کا مسکن تھا۔ بحیرہ اسود کے شمال اور دریائے ڈینپر

کے دونوں طرف گاتھ آباد تھے۔
مغرب میں جہاں آج کل پولینڈ، رومانیہ اور ہنگری وغیرہ ہیں ہینز رہتے تھے۔ جرمن تین خونخوار قبائل یعنی وینڈلز، سیکسنز اور اینگلز کا وطن تھا۔
جنوبی جرمنی اور شمالی اٹلی میں لمبرڈز سکونت پذیر تھے۔فرانس میں فرانک اور برطانیہ میں سلٹ رہتے تھے۔
یورپ کے باقی حصوں میں بھی اجڈ قبائل آباد تھے۔ جن کا کام لڑنا اور ڈاکے ڈالنا تھا جب روما کی غربی سلطنت کمزور ہوگئی تو ان قبائل میں سیاسی حرکت پیدا ہوئی۔
یہ اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر دور دراز علاقوں پر چھا گئے۔ کچھ قبائل پہلے ہی حرکت میں آچکے تھے۔ مثلاً سیکنز اور اینگلز جو صدیوں پہلے جزائر برطانیہ میں پہنچ چکے تھے۔ پانچویں صدی میں غربی گاتھ اور وینڈل اسپین تک پہنچ گئے۔
اس کے بعد گاتھ، چیکوسلواکیہ اور پھر اٹلی میں داخل ہوئے۔ جب کہ ہینز کی حکومت دریائے رائن سے ایشیا تک پھیل گئی۔
تاریخ۔ یورپ کے تین دور۔
آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے یورپ میں کیا ہو رہا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم۔ قیاس یہ ہے کہ وہاں وحشی قبائل آباد تھے۔ جن کے سردار جدا جدا تھے۔ مذہباً ملحد یا بت پرست تھے۔ آٹھویں صدی کے بعد تاریخ یورپ تین ادوار میں بٹ گئی۔
پہلا دور: یہ دور آٹھویں صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب روما کی عظیم سلطنت قائم ہوئی تھی اور یونان سے علوم و فنون کے دریا بہہ رہے تھے۔
دوسرا دور: قرون وسطی، یعنی وہ زمانہ جو زوال روما سے (476 عیسوی) شروع ہو کر سولہویں صدی پر ختم ہوتا ہے۔
تیسرا دور: عصرِ حاضر، جو سولہویں صدی سے شروع ہوا۔
دوسرے دور کے پھر دو حصے ہیں۔ اس کے پہلے پانچ سو سال میں ... تاریکی جہالت، وحشت اور بربریت کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
گیارہویں صدی میں اسلامی تہذیب تمدن اور علوم و فنون مختلف راستوں سے یورپ پہنچے اور وہاں کی تاریکیوں میں ہلچل مچ گئی۔
پانچ چھ صدیوں کے بعد وہاں اجالا ہونے لگا۔ جا بجا مدارس کھل گئے۔ تالیف و ترجمے کے ادارے قائم ہو گئے۔ عربی علوم کے تراجم ہونے لگے۔
پاپائیت کا زور ٹوٹ گیا۔ مذہبی اوہام و روایات کے محل مسمار ہو گئے۔ اس دور میں برطانیہ 1688 عیسوی۔ فرانس 1789 عیسوی میں اور امریکا 1776 عیسوی میں انقلابات آئے۔
یہ تھا یورپ کا آغاز عروج۔
روم اور اٹلی
اٹلی میں ایک دریا کا نام ٹائبر ہے جو شمال کی طرف سے آتا ہے اور روم سے گزرتا ہوا بحیرۂ روم میں جا گرتا ہے۔
یہ دریا کبھی شاہراہ تجارت تھا۔ تاجر کشتیوں میں مال بھر کر فلورنس سے نیپلز اور دیگر مقامات تک آتے جاتے تھے۔ اس دریا کے کنارے ایک مقام سرسبزی اور دلکشی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ وہاں تاجر خیمے لگا کر راتوں کو ٹھہرتے اور صبح کو روانہ ہو جاتے۔
ولادت مسیح سے ساڑھے سات سو سال پہلے ان تاجروں نے چندہ کر کے وہاں ایک سرائے بنا دی جہاں رفتہ رفتہ ایک شہر بن گیا۔ یہی شہر روم کہلاتا ہے جو اڑھائی ہزار برس سے اٹلی کا دارالخلافہ ہے۔
265 قبل مسیح میں روم ایک بڑی طاقت بن گیا۔ اب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔
197 قبل مسیح میں اسپین، ایک سال بعد شمالی افریقا اور مقدونیہ۔ 64 قبل مسیح میں فرانس اور بیلجیئم۔ 9 عیسوی میں جرمن، 14 عیسوی میں برطانیہ، 105 عیسوی میں فلسطین، 114 عیسوی میں آرمینیا اور 119 عیسوی میں عراق سلطنتِ روم کا حصہ بن گئے۔
اس کے بعد کے جانشینوں کی نالائقی کی وجہ سے سلطنت روما متحد نہ رہ سکی اور کئی ریاستیں پیدا ہو گئیں۔ جیسے وینس، میلان، فلورنس، نیپلز اور پاپائے روم کی ریاست۔ یہ ریاستیں 1843 عیسوی تک باقی رہیں۔
نیپلز سے ڈھائی سو میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ سارڈینا کے نام سے واقع ہے۔ 1848ء میں یہاں امانویل دوم کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے ایک فوجی جرنل کی ترغیب پر شاہانہ اختیارات ترک کر دیئے اور جزیرے میں جمہوریت قائم کر دی۔ اس کا اثر اٹلی پر یہ پڑا کہ وہاں بھی

جمہوریت کی تڑپ پیدا ہوگئی اور وہاں کے ایک لیڈر گریبالڈی نے رضا کاروں کی مدد سے سلی، نیپلز اور پاپائی ریاست پر قبضہ کرلیا اور ہر جگہ استصواب کرایا۔ بالآخر یہ تمام چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں ایک ہوگئیں اور انہوں نے سارڈینیا کے بادشاہ امانویل کو اپنا آئینی بادشاہ منتخب کرلیا۔ اطالوی شاہوں کا یہ سلسلہ 1963 تک باقی رہا تھا۔

روم وغیرہ تہذیبوں اور علم کے گڑھ سمجھے جاتے رہے ہیں بلکہ سن ایک سے لے کر سن 2015ء تک پورا یورپ اس تبدیلی کی زد میں ہے جس کو صنعتی انقلاب کا نام دیا گیا۔

اس دوران مسلم ممالک اپنی بے پروائیوں اور کوتاہیوں سے پیچھے ہوتے چلے گئے۔

اس زمانے کی ایک دوسری مشہور اور طاقت ور ریاست یونان تھی۔ اس کا مختصر حال سن لیں۔

آرین دو ہزار قبل مسیح میں شمالی یورپ سے بلقان کی طرف بڑھے۔ ان کے ساتھ ان کے ریوڑ بھی تھے۔ ہر مر (850 قبل مسیح) ان چرواہوں کو ہیلسیز کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان کی زبان ایک تھی۔ یہ لوگ ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے بحیرہ ایجسین تک پہنچ گئے۔ بعد میں سلی، سارڈینیا، اٹلی اور فرانس تک نکل گئے۔ یونان میں ان کے مشہور شہر مقدونیہ، ایتھنز اور سپارٹا تھے۔ یہ سردار آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اس صورتِ حال سے اکتا کر یونانی سرداروں نے 600 قبل مسیح میں ایک وفاق بنایا۔ یہ وفاق تمام ریاستوں پر مشتمل تھا۔ یہ نمائندے مجسٹریٹ کہلاتے اور تمام ریاستوں کے لیے قانون بناتے تھے۔

594 قبل مسیح میں یونان کا ایک مشہور قانون دان سولن منتخب ہوا۔ اس کی دانش، علم اور انتظامی قابلیت سے متاثر ہو کر وفاقی کونسل نے اسے صدر بنا دیا اور حکومت کے تمام اختیارات اس کے حوالے کردیے۔ اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی تمام قرضے منسوخ کردیے۔ ایک دارالعلوم بنایا جس میں نمائندوں کی تعداد چار سو تھی گئی دیگر اصلاحات نافذ کیں۔ یونان کا آئین تسلیم بند کیا۔ ضابطۂ قوانین بنائے اور یونان کے باشندوں کو پیشے کے لحاظ سے چار گروہوں میں تقسیم کردیا۔

حالات یوں ہی چلتے رہے۔ یہاں تک کہ 359 قبل مسیح میں فلپ مقدونیہ کا سردار بنا۔ اس نے پہلے ایتھنز پھر ایران کو شکست دے کر سپارٹا کے سوا باقی تمام یونانی ریاستوں پر قبضہ کرلیا۔ 336 قبل مسیح میں فلپ کے قتل کے بعد سکندر تخت پر بیٹھا۔ اس کی موت کے بعد جرنیلوں میں پھوٹ پڑ گئی اور یونانی مقبوضات تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ 146 قبل مسیح میں سلطنت روما (مشرقی) نے سارے یونان اور ایشیائے سیز پر قبضہ کرلیا۔ البتہ مصر کا بطلیموس خاندان جو تاریخ میں بطالسئہ مصر کے نام سے مشہور ہے تین صدیوں تک زندہ رہا۔ اس کے چند بادشاہوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ بطلیموس اوّل۔ 323 قبل مسیح سے 309 قبل مسیح۔

2۔ فیلاڈل فس۔ 309 عیسوی سے 246 عیسوی۔

3۔ ارگیٹ اوّل۔ 246 عیسوی سے 221 عیسوی تک۔

بادشاہ کا یہ سلسلہ چلتا ہوا قلوپطرہ تک آگیا۔ اس کی حکمرانی 44 قبل مسیح سے 30 قبل مسیح تک رہی۔

انطاکیہ (Antioch)

جنوبی ترکی میں صوبہ ہاتے (Hatay) کا صدر مقام۔ اس کی بنیاد 300 ق م میں سکندر اعظم کے ایک جرنیل سیلوکس نے رکھی اور عرصہ دراز تک شام کے سلجوقی بادشاہوں کا دارالحکومت رہا۔ قدیم زمانے میں یہ شہر ہندوستان اور یونان کی تجارت اور یونانی تہذیب کا اہم مرکز تھا اور اپنی شان وشوکت کے لحاظ سے اسے ملکۂ مشرق کہا جاتا تھا۔ رومن عہد حکومت میں یہ شہر عیسائیت کا مرکز بنا رہا اور اس زمانے میں یہاں عیسائیوں کی تین بڑی مجلسیں منعقد ہوئیں۔ 526ء میں زلزلے میں تباہ ہوا تو اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ 637ء میں اسے عربوں نے فتح کیا۔ 1268ء میں مصر کے سلجوقیوں کے زوال کے ساتھ انطاکیہ کو زوال آنا شروع ہوگیا۔ 1516ء میں اس پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1919ء میں فرانسیسی فوجوں نے قبضہ کرلیا اور شام کے ساتھ فرانسیسی انتداب میں شامل کردیا گیا۔ 1939ء میں ترکوں کو واپس دے دیا گیا۔ یہ شہر متواتر زلزلوں کے باعث تباہ ہوتا رہا۔ 1872ء میں جو زلزلہ آیا وہ بہت تباہ کن تھا۔ 1935ء میں قدیم انطاکیہ کی کھدائی شروع ہوئی جس میں بڑی نادر اشیاء نکلیں۔ تمباکو، غلہ، روئی اور ریشم کی تجارت کے لیے مشہور ہے۔

مرسلہ: زرین مصطفی۔ ایبٹ آباد

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ غربی روما کے سیزر نے مصر پر حملہ کیا۔ قلوپطرہ نے خودکشی کر لی اور مصر سلطنت روما کا حصہ بن گیا۔

اب آجائیں فرانس کی طرف۔

یورپ کی تاریخ کے حوالے سے اتنا بتایا جا چکا ہے کہ یہ وحشی قبائل تھے۔ جن کا آپس میں جھگڑا ہوا کرتا۔

زوال روما (غربی) کے بعد فرانس مختلف سرداروں میں بٹ گیا تھا۔ چھٹی صدی میں ایک سردار کملارس نے سب سے پہلے اندرونِ ملک کی ریاستوں کا خاتمہ کیا۔ پھر اٹلی اور جرمنی کے کچھ علاقے ہتھیا لیے۔ اس طرح ایک اچھی خاصی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔

اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی سلطنت اس کے چار بیٹوں میں تقسیم ہو گئی اور یہ آپس میں لڑنے لگے۔ اس پھوٹ کے باوجود میئرز کی ایک کونسل اتحاد فرانس کی کوشش کرتی رہی۔

چارلس مارٹن جس نے 732 عیسوی میں اسلامی افواج کی پیش قدمی کو ٹودس کے مقام پر روکا تھا اور جس نے فرانس کے بعض باغی سرداروں کو شکست دے کر ان کی ریاستوں کو سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اس کونسل کا ممبر تھا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا پی پن پہلے اس کونسل کا ممبر بنا اور 751 میں تختِ سوختہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اٹلی کو وحشی لمبرڈز سے آزاد کرانے کے لیے پوپ کے حوالے کر دیا۔ جب 768 عیسوی میں اس کی وفات ہوئی تو رواج کے مطابق اس کی سلطنت اس کے دو بیٹوں شارلیمان اور کارلیمان میں بٹ گئی۔

771 عیسوی میں کارلیمان کی وفات ہو گئی اور شارلیمان ساری سلطنت کا واحد فرماں روا بن گیا۔ اس نے جرمن کے وحشی قبائل اور لمبرڈز کو شکست دے کر اپنی سلطنت کافی پھیلائی اور پوپ کو سارے اٹلی کا فرمانروا تسلیم کر لیا۔

اب آجائیں اسپین کی طرف کہ اسپین کی صورتِ حال کیا تھی۔

جب 711 عیسوی میں طارق جبرالٹر پر اترا۔ تو اس وقت اسپین پر گاتھ کی حکومت تھی۔ روڈرک جو اس شاخ کا آخری بادشاہ تھا طارق سے شکست کھا کر فرار ہوا اور دریائے وادی، اکبیر کو عبور کرتے ہوئے ڈوب گیا۔

اسلامی فوجیں نہ صرف اسپین پر چھا گئیں بلکہ فرانس میں ٹورس تک جا پہنچیں جو پیرس سے اندازاً 180 میل جنوب مغرب میں ہے۔

چند سردار شمالی پہاڑوں میں چھپ گئے اور وہاں انہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا لیں۔ جن میں سے اراگان اور قسطنطنیہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان ہی ریاستوں نے آٹھ سو سال بعد اسلامی حکومت کو ختم کیا تھا اور تمام مسلمانوں کو اسپین سے نکال دیا تھا۔

اب آجائیں جرمنی کی طرف کہ اس دور میں جرمن کی کیا پوزیشن تھی۔

جرمنی

جرمنی میں مختلف وحشی قبائل آباد تھے۔ جیسے وینڈل، سکیزز اور اینگلز وغیرہ۔ ان کے سردار جدا جدا تھے۔

غربی روما کے خاتمے کے بعد جرمن کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ شمال میں فرانکس کا قبضہ تھا۔ جنوب میں جوریا اور پرتھرنگیا اور شمال مشرقی علاقوں پر سیک سنز کا تسلط تھا۔ ان میں سے ایک سردار کلادس نے جوریا، تھرنگیا اور چند دیگر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جب 511 عیسوی میں اس کی وفات ہو گئی تو بعض سرداروں نے اس کے لڑکے تھیوراڈو کے (511 سے 548 عیسوی تک) سے کچھ علاقے چھین لیے۔ اس کے بعد کوئی کام کا آدمی تخت نشین نہ ہوا اور چھوٹے بڑے سردار تین سو برسوں تک آپس میں لڑتے رہے۔ جب 768 میں شارلیمان فرانس کا بادشاہ بنا تو اس نے جرمن کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے وارثین اندازاً سو برسوں تک جرمنی پر حکومت کرتے رہے۔

آخری بادشاہ لوئس ڈی چائلڈ تھا جو 911 عیسوی میں فوت ہوا۔ اس کی وفات پر جرمن امرا نے فرسینکو بنائے ایک ڈیوک کانرڈ کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور اس وقت سے جرمنی ایک الگ ریاست بن گئی جو آج تک قائم ہے۔

ہم نے مختصر طور پر 1200 عیسوی سے لے کر 1299 عیسوی تک برصغیر، اسلامی دنیا، یورپ وغیرہ کے حالات دیکھ لیے۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ کا یہ سفر عام لوگوں کے علاوہ تاریخ کے طالب علموں کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہو رہا ہوگا۔

اس قسم کی تحقیق خون جگر چاہتی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کو یہ سلسلہ پسند آرہا ہوگا اور آپ نے اس کا ریکارڈ بھی رکھا ہوگا۔

(جاری ہے)

مغرب سے درآمد ایک سبق آموز واقعہ

بیجوں کا کرشمہ

صداقت حسین ساجد

تحفہ پیش کرنا ہماری روایت کا حصہ ہے مگر ہم اسے ثانوی درجہ دیتے جارہے ہیں۔ ہمیں احساس تک نہیں کہ ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کے لیے یہ عمل کتنا ضروری ہے۔ کاش ہم صلاحِ سمرقندی کو بھلا نہ دیتے جسے اہلِ مغرب نے اپنا کر اپنی ساکھ قائم کرلی ہے۔ وہ بھی اہلِ مغرب میں سے تھا۔ اس نے مٹھی بھر بیج بطور تحفہ ایک پڑوسی کو دیا جس نے اس کی زندگی بدل دی۔

کچھ سال پہلے میں جزیرہ تاہیتی کے دارالخلافہ پپی ٹی میں رہائش پذیر تھا۔ میں مضامین اور کہانیاں لکھتا تھا، مگر ان سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ میری جمع پونجی کم ہوتے ہوتے خطرے کی حد تک آ پہنچی تھی۔ اس جزیرے کی زمین بہت زرخیز تھی۔ مختلف ملکوں کے لوگوں کا یہاں بسیرا تھا۔ مجھے بھی کئی بار یہ خیال آیا کہ اگر میں بھی ایسی سبزیاں اور پھل اگاؤں جو یہاں نہیں ملتے تو بہت سود مند رہے گا۔ ایک بار میں نے امریکا کے ایک مشہور بیج فروخت

کرنے والے ادارے سے ایسے بیج منگوا بھی لیے لیکن آگے ہمت نہ ہوئی۔ اب جو اپنی جمع پونجی کا خاتمہ ہوتے دیکھا تو گھبرایا اور یہ فیصلہ کرلیا کہ لکھنے لکھانے کے کام کو چھوڑ دوں اور شہر کی رہائش چھوڑ کر اندرونی علاقے میں کچھ زمین حاصل کرکے کسان بنا جائے۔

تلاش کرنے سے مجھے پپی ٹی شہر سے پینتیس میل دور دو ایکڑ زمین کا ایک ٹکڑا مل گیا، جس میں کسان کے رہنے کے لیے ایک کمرے کا مکان بھی بنا ہوا تھا۔ زمین اور مکان کا کرایا صرف تین ڈالر ماہانہ تھا۔ میں نے چھ ماہ کا کرایا ادا کیا کاشت کاری کے چند ضروری آلات خریدے اور شہر چھوڑ کر اس مکان میں منتقل ہوگیا۔ میں نے ٹائپ رائٹر اور لکھنے لکھانے کی تمام چیزیں ایک صندوق میں بند کر کے مکان کے ایک کونے میں رکھیں اور کاشت کاری کے آلات لے کر زمین کی صفائی اور کھدائی میں مصروف ہوگیا۔

زمین کو ہموار اور صاف کر کے کیاریاں بنائیں اور ان کیاریوں میں سبزیوں اور اعلیٰ قسم کی مکئی کے بیج بو دیے۔ تقریباً تین مہینے صبر و شکر کے ساتھ گزارنے کے بعد مجھے اپنے کھیت میں تین چھوٹے چھوٹے ٹماٹر، ایک کدو اور دو مکئی کے بھٹے ملے۔ بھٹوں کے دانے چوہے کھا چکے تھے۔ ان تین ماہ میں بیج اور آلات کی قیمت صرف بیس فرانک فی گھنٹا میری مزدوری سے جو لاگت آئی، اس حساب سے ایک ایک ٹماٹر کی قیمت ساڑھے پندرہ ڈالر رہی۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں سخت پریشان ہوا۔

میرے پڑوس میں ایک چینی کسان ہوپ سنگ کا کھیت تھا۔ اس کی زمین بہت زیادہ تھی۔ وہ غلے کی کاشت بھی کرتا اور سبزیاں بھی اگاتا تھا۔ اس نے باغ بھی لگا رکھا تھا۔ اس کا کھیت بہت سرسبز تھا۔ ہفتے میں تین چار بار وہ اپنے چھکڑے میں بڑے بڑے تربوز، کھیرے، کدو وغیرہ لاد کر شہر میں فروخت کر آتا۔ اس کے کھیت میں سبزیوں سے لدے سرسبز پودے دکھائی دیتے تھے۔ دوسری طرف میرا کھیت اجاڑ اور ویران پڑا تھا۔ مجھے اپنی ناکامی کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ بہرحال میں نے پھر کوشش کرنے کا ارادہ کرلیا۔

چھ ماہ کا کرایا تو میں پہلے ہی ادا کرچکا تھا اس لیے تین مہینے مزید اس کھیت سے کام لے سکتا تھا۔ بیج بھی بہت سے باقی تھے۔ میں نے دوسری فصل بونے کا فیصلہ کرلیا۔ نئی فصل کاشت کرنے کے لیے پہلی فصل کے بے کار پودوں سے زمین کو صاف کرنا ضروری تھا۔ میں نے زمین کو صاف کرنا شروع کردیا۔ اب مجھے پتا چلا کہ میرے کھیت میں کروڑوں کی تعداد میں چیونٹیاں موجود ہیں۔ وہ اس انتظار میں رہتی تھیں کہ نئے بیج بوئے جائیں تو ان کے پھوٹنے سے پہلے ان کا صفایا کردیا جائے۔ چیونٹیوں کے علاوہ ان گنت زمینی کیڑے دکھائی دیے، جو بیج سے پودا نکلتے ہی کھا جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر میں ہمت چھوڑ بیٹھا۔ میں نے فصل کاشت کرنے کا ارادہ ترک کردیا اور یہ فیصلہ کیا کہ مجھے لکھنے پڑھنے ہی کا کام شروع کرنا چاہیے، اس سے کچھ تو آمدنی ہو ہی جاتی تھی۔

میں نے صندوق کھول کر ٹائپ رائٹر باہر نکالا اسے زنگ لگ چکا تھا۔ میں اس کی صفائی کر رہا تھا کہ سڑک پر اپنے چینی پڑوسی ہوپ سنگ کے چھکڑے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ سبزیوں کے جو بیج میرے پاس رہ گئے ہیں انہیں چیونٹیوں کو کھلانے کے بجائے اسے کیوں نہ دے دوں۔ اس کی زمین میں یہ دشمن موجود نہیں ہیں، وہ سبزیاں اگانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہی میں نے بیجوں کا ڈبا اٹھایا اور لپک کر باہر نکل گیا۔ ہوپ سنگ کا چھکڑا پاس آچکا تھا، میں نے اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا، تو اس نے چھکڑا روک لیا۔ پاس جا کر میں نے بیجوں کا ڈبا اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور بیجوں کے چند لفافے نکال کر اسے بتایا کہ اس میں فلاں فلاں سبزی کے بیج ہیں۔ اس نے بیجوں کا ڈبا لے کر مجھ سے پوچھا۔

''کیا قیمت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''قیمت کچھ نہیں...... میری طرف سے یہ تحفہ ہے۔''

یہ سن کر وہ چھکڑے کے تختے کو پکڑ کر مضبوطی کے ساتھ بیٹھ گیا، اس کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن زبان سے شکریے کا لفظ تک نہ نکلا۔ پھر چھکڑا شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

بیج دینے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے اپنے لکھنے پڑھنے کی چیزیں ٹھیک کر لیں اور پھر اپنی باقی رقم نکال کر حساب کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک سو اٹھائیس فرانک یعنی تقریباً پانچ ڈالر باقی بچے تھے۔ اس رقم سے مجھے اتنے دن کاٹنے تھے کہ مجھے اپنے کسی مضمون کا معاوضہ مل جاتا۔ اگر میں اس جزیرے پر کوئی مضمون امریکا روانہ کرتا اور خوش قسمتی سے وہ منظور بھی ہو جاتا تب بھی اس کے معاوضے کا چیک مجھے تین مہینے بعد ملنا تھا۔ کرایا تو میں نے پہلے ہی ادا کر دیا تھا مگر ان تین مہینوں میں، میں کہاں سے کھاتا؟ ایک سو اٹھائیس فرانک میں تین

مہینے گزارنا ممکن نہیں تھا۔ سوچا کہ اس ارادے کو ختم کردوں، مگر پھر کرتا کیا؟ سوچ سوچ کر تنگ آ گیا۔ کوئی اور حل نہ سوجھا۔ تھک ہار کر یہی فیصلہ کیا کہ یہ رقم جب تک چلتی ہے، چلائی جائے اور اپنا کوئی مضمون یا کہانی جلدی سے لکھ ڈالوں۔ جب رقم ختم ہوجائے گی تب دیکھا جائے گا۔

یہ فیصلہ کر کے میں پاس والے گاؤں تک گیا۔ وہاں سے میں نے پچیس فرانک کا دیسی تمباکو خریدا، کیوں کہ اس کے بغیر مجھ سے لکھا نہیں جا سکتا۔ یہاں شکر قندی کی بہتات تھی اس لیے بہت سستی تھی۔ میں نے ڈھیر ساری شکر قندی اور کچھ ڈبے گائے کے گوشت کے خرید لیے اور پھر گھر آ کر لکھنے بیٹھ گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں نے جنوبی بحرالکاہل کے ان جزائر میں جو غیر معمولی باتیں اور یہاں کا جو طرز زندگی دیکھا ہے، اسے دل چسپ پیرائے میں لکھوں۔ میں نے لکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن لکھ نہ سکا۔ باتیں بہت سی تھیں، لیکن لکھنے کے لیے ربط اور ترتیب قائم نہیں رہی تھی۔ پہلا دن یوں ہی گزر گیا، دوسرے دن بھی میں کچھ نہ لکھ سکا۔ اب مجھے باقی بچنے والے چند فرانک کی فکر ستا رہی تھی۔ تیسرے دن میں اتنا جھنجلایا ہوا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ لکھ کر ہی رہوں گا مگر خیالات اتنے منتشر تھے کہ میں کچھ نہ لکھ سکا۔

اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں جھلا کر اٹھا، دروازہ کھولا، سامنے میرا چینی پڑوسی کھڑا تھا، وہ تین بڑے بڑے تربوز لیے کھڑا تھا۔ اس نے وہ تربوز وہیں رکھے اور چھکڑے کی طرف چل پڑا، جو سڑک پر کھڑا تھا۔ چھکڑے میں سے وہ دیسی شراب کی ایک بوتل، انڈوں کی ٹوکری اور ایک مرغی اٹھا لایا۔ یہ چیزیں رکھ کر اس نے خشک سے لہجے میں کہا۔

”میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ!“ یہ فقرہ کہتے ہی وہ جلدی سے چھکڑے میں جا بیٹھا اور اسے تیز دوڑاتے ہوئے شہر کی طرف چل دیا۔

لیکن یہ چھوٹا سا تحفہ تو میری زندگی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا!

شکر قندی اور ڈبے میں بند گائے کا گوشت کھاتے کھاتے میرا دل بھر گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو جی چاہا کہ آج تو مرغ مسلم کا مزہ اڑایا جائے، لیکن مرغی کے پکنے میں وقت لگتا تھا۔ میں نے اسے صحن میں باندھ دیا۔ اس کے آگے کچھ دانا پانی ڈالا اور چولہا جلا کر چھ انڈے تل لیے۔ گرم گرم تلے ہوئے انڈوں کو کھا کر مزہ ہی آ گیا پھر مضمون لکھنے بیٹھ گیا۔ اب تو دماغ نے اتنی تیزی دکھائی کہ میں نے چند ہی گھنٹوں میں مضمون مکمل کر لیا۔ جب مضمون مکمل ہو گیا تو اسے امریکا بھیجنے کی فکر لاحق ہو گئی۔ جہازوں کی آمد و رفت کے اوقات دیکھے تو پتا چلا کہ نیوزی لینڈ سے ہر ہفتے آنے والا جہاز کل صبح پپی ٹی کی بندرگاہ پر پہنچے گا اور پانچ چھ گھنٹے یہاں رک کر امریکا کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ مجھے اپنا مضمون اسی جہاز سے روانہ کر دینا چاہیے ورنہ پھر پورا مہینا بھر مضمون یہیں پڑا رہ جائے گا۔

میرے پاس بہت تھوڑی رقم بچ گئی تھی۔ بچت کرنے کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ پیدل شہر جایا جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں نے باقی چھ انڈے بھی تل لیے۔ ہوپ سنگ کی تحفے میں دی ہوئی شراب کی بوتل بھی پی گیا۔ کھانے پینے کے بعد میں اتنا تازہ دم ہو چکا تھا کہ شہر تک کا تیس پینتیس میل کا سفر مجھے تفریح دکھائی دینے لگا۔ اب میں نے گھر کو تالا لگایا اور چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد رات ہو گئی۔ چاند نکل آیا اور چاروں طرف چاندنی پھیل گئی۔ میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہوا میں اڑتا چلا جا رہا تھا۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے گاؤں آ رہے تھے۔ مقامی باسیوں کے گھروں سے کبھی فرانسیسی گانوں کی آوازیں آتی تھیں، کبھی ان کے اپنے گانے سنائی دیتے تھے۔ ان گانوں کے ساتھ کبھی بربط اور کبھی دوسرے باجوں کی سریلی آوازیں بھی سننے کو مل رہی تھیں۔

آدھی رات کو مجھے بھوک نے ستانا شروع کر دیا، پیاس بھی لگ رہی تھی۔ چلتے چلتے ایک گاؤں آ گیا، وہاں دور دور مکان بنے ہوئے تھے۔ ایک مقامی باسی کا مکان سڑک کے کنارے ہی بنا ہوا تھا۔ بوڑھے میاں بیوی چولھے کے پاس بیٹھ کر کوئی چیز پکا رہے تھے۔ میں نے ان سے پانی مانگا۔ بوڑھے نے مجھے اندر بلا کر کہا۔ ”پہلے کچھ کھا لو...... پھر پانی بھی پی لینا۔“

وہ دونوں انگاروں پر گوشت کے تکے بھون رہے تھے۔ انہوں نے چند تکے ایک پلیٹ میں نکال کر مجھے دیے۔ وہ بہت مزے کے تھے، مگر وہ گائے اور بکرے کا گوشت نہیں تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔

”یہ گوشت کس جانور کا ہے؟“

”یہ زمینی کیکڑے ہیں۔“

یہ سن کر میں اچھل پڑا کہ یہ تو وہی ظالم کیکڑے ہیں، جنہوں نے میرا کھیت تباہ کر ڈالا تھا۔ میں نے بوڑھے سے

کہا۔ ”یہ کیکڑے تو میرے کھیت میں بہت ہیں مگر وہ اتنی تیزی سے بھاگتے ہیں کہ انھیں پکڑنا مشکل ہے...... مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ان کا گوشت اتنا مزے دار ہوتا ہے۔“

”انھیں مچھلی کی طرح کانٹے سے پکڑا جاتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”ایک لمبی چھڑی کے سرے پر ڈور باندھ دی جاتی ہے اور کانٹے میں 'ہبی کس' پودے کا پتا لگا دیا جاتا ہے...... کیکڑا اس پتے کو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔“

مجھے یہ طریقہ بہت زبردست لگا۔ تکوں کے بعد اس بوڑھے نے کچھ بیج میرے سامنے رکھے۔ میں نے پوچھا۔

”یہ بیج کس کے ہیں؟“

”یہ میپ کے بیج ہیں۔“

”ارے! میپ کی جھاڑیاں تو میرے کھیت کے کنارے بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں...... مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ان کے بیج بھی کھائے جاتے ہیں۔“

میں نے بیج کھا کر پانی پیا۔ پھر بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے چل پڑا۔

صبح صبح میں پی پی ٹی پہنچ گیا۔ جب میں جہاز کی گودی میں پہنچا تو دیکھا کہ جہاز آہستہ آہستہ گودی میں داخل ہو رہا ہے۔ گودی کے سامنے ہی ڈاک خانہ تھا۔ میں وہاں گیا اور اپنے مضمون کے لفافے پر ٹکٹ لگائے پھر دل ہی دل میں دعا مانگ کر اسے ڈاک کے حوالے کر دیا۔

ڈاک خانے سے نکل کر میں نے بہت کفایت شعاری کے ساتھ ایک چھوٹے سے ریستوران میں ناشتا کیا اور پھر ساحل کے کنارے ٹہلتا ہوا بس کا انتظار کرتا رہا جو میرے کھیت کے پاس سے گزرتی تھی۔

اچانک ایک کوتاہ قامت چینی میرے پیچھے دوڑتا ہوا آیا اور میرے پاس آ کر پوچھا۔ ”کیا آپ ہوپ سنگ کو جانتے ہیں؟“

”ہاں...... ہاں! وہ تو میرے پڑوسی ہیں۔“

”ہوپ سنگ میرے بہنوئی ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ آپ نے انھیں سبزیوں اور پھلوں کے بہت سے بیج دیے ہیں، میرا نام لی فات ہے، یہاں میری دکان ہے، وہ دیکھیے!“ اس نے انگلی کا اشارہ کر کے مجھے اپنی دکان دکھائی اور پھر پوچھا۔

”آپ گھر کب جا رہے ہیں؟“

”ابھی، صبح والی بس سے!“

”خدا حافظ!“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔

میں بس کے انتظار میں ڈاک خانے کے سامنے پڑی ہوئی بلدیہ کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ جس دن جہاز آئے، اس دن دنیا کے مختلف ملکوں کے آوارہ گرد جو اس جزیرے پر رہتے ہیں، ان بینچوں پر آ بیٹھتے ہیں۔ انھیں اُمید ہوتی ہے کہ ان کے ملک سے آنے والی ڈاک میں رقم آئی ہو گی۔ اکثر یہ اُمیدیں غلط ہی ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے گھر سے رقم نہیں آتی۔ وہاں بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا کہ تین ماہ کے بعد میں بھی ان لوگوں کی طرح رقم کی اُمید پر ان ہی بینچوں پر بیٹھا ہوں گا۔

جب بس آئی اور میں نے بس کا کرایا ادا کیا تو میری جیب میں باقی نو فرانک بچے تھے۔ خیر میں زمینی کیکڑوں اور میپ کے بیجوں سے بھوکا نہیں مر سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں مطمئن تھا۔ اس دوران میں، میں جتنے زیادہ مضمون لکھ سکا، لکھوں گا۔ بس چلی اور جب ڈیڑھ گھنٹے بعد میرے گھر کے سامنے رکی، تو میں اتر گیا۔ بس کے ڈرائیور نے گتے کا ایک بڑا سا ڈبا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں حیرت سے بولا۔

”تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے، یہ میرا ڈبا نہیں ہے۔“

”یہ آپ کا ہی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”ایک چینی تاجر نے مجھے یہ ڈبا اور یہاں تک لانے کا کرایا دے کر یہ کہا تھا کہ جب آپ اتر جائیں تو یہ ڈبا آپ کے حوالے کر دیا جائے۔“

میں نے ڈبے کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا، اوپر ایک پرچی پڑی ہوئی تھی، جس پر لکھا تھا۔

”مسٹر ہال! آپ کے لیے...... لی فات۔“

گھر لا کر میں نے ڈبا کھولا، تو اس میں دو پاؤنڈ چاکلیٹ تھے، تھوڑی سی لیچی اور بیئر کی ایک بوتل تھی۔ دو ریشمی رومال اور ایک ریشمی پاجامہ تھا۔

میں نے بوتل ٹھنڈی ہونے کے لیے تالاب میں رکھ دی۔ اس کے بعد میں مرغی ڈھونڈنے لگا، کیوں کہ اسے میں نے صحن میں باندھ رکھا تھا۔ اس نے چونچیں مار مار کر اپنی ٹانگ سے بندھی ہوئی ڈوری کھول لی تھی اور پچھلے زینے کے نیچے انڈا دے کر اس پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے لیے گھاس کا ایک گھونسلا سا بنا دیا، اس میں ہوپ سنگ کے تحفے سے بچے ہوئے پانچ انڈے رکھ کر اسے بٹھا دیا۔ اس کا دیا ہوا تازہ انڈا میں نے اپنے کھانے کے لیے رکھ لیا۔

میں اسی دن سے کیکڑوں اور میپ کے بیجوں سے اپنی بھوک مٹانے لگا۔ پریشانیوں اور کم خوراکی کی وجہ سے میں دبلا پتلا ہو چکا تھا، لیکن اس قوت بخش غذا نے چھ ہی ہفتوں میں میرا وزن چودہ پاؤنڈ بڑھا دیا تھا۔ اس دوران میں مرغی نے پانچ چوزے نکال لیے تھے۔ کیکڑے پکڑنے، مرغی کی دیکھ بھال کرنے اور مضمون نگاری میں، میں اتنا مگن ہو گیا کہ تالاب میں پڑی بیئر کی بوتل مجھے یاد نہ رہی۔

ایک دن میرے مکان کا مالک جس کے کھیت ہوپ سنگ کے کھیتوں سے کچھ ہی فاصلے پر تھے، اپنے بچوں کے ساتھ آ گیا۔ بچوں کو دیکھتے ہوئے مجھے لی فات کے دیے ہوئے چاکلیٹ اور بوتل کا خیال آ گیا۔

میں نے چاکلیٹ تو بچوں کو دے دی اور بوتل کھول کر مالک مکان کی اچھی طرح تواضع کی۔ دوسرے دن صبح اس نے مجھے کیلوں کی ایک پھنی، آموں کا بھرا ہوا تھیلا اور سنترے بھجوائے۔ اس کے بعد سے میرے مالک مکان اور اس کی بیوی نے مجھے کبھی پھل، تو کبھی مچھلی بھیجنا شروع کر دی وہ لوگ پھل اتنے زیادہ بھیجتے تھے کہ میں انھیں ایک دن میں ختم نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اس کے بعد کوئی دن ایسا نہیں آیا کہ میرے پاس کوئی پھل نہ ہو۔ اس کے باوجود میں بہت احسان مندی کے ساتھ یہ یاد کرتا تھا کہ ان سب کی اصل وجہ ہوپ سنگ ہی تھا۔ اس نے اپنے کھیتوں میں ایک بیکری بھی لگا لی تھی۔ ہر تیسرے چوتھے دن وہ اپنے کھیت کی سبزیوں کے ساتھ اپنی بیکری میں پکی ہوئی ڈبل روٹیاں، کیک، سموسے وغیرہ بھی شہر لے جاتا تھا۔ جب وہ یہ چیزیں لے جاتا تو ایک ڈبل روٹی یا سموسہ میرے دروازے پر بھی رکھ دیتا تھا۔ میرے ان چند بیجوں کے تحفے کا وہ خود کو اتنا مقروض سمجھتا تھا کہ میرے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے ان تحفوں کا سلسلہ بند نہ کیا۔

اس کے باغ اور کھیتوں پر بہار سی آ گئی تھی۔ وہ بہت ہوشیار کسان تھا اس لیے اپنی فصل کا بہت خیال رکھتا تھا۔ میرے دیے بیجوں سے اس کے ہاں کئی نئی سبزیوں کی زبردست سی فصل تیار ہو گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے تین ماہ گزر گئے۔ میرے سودہ بھیجنے کے تین ماہ بعد جب جہاز کے آنے کا وقت آیا تو اس بار بھی میں نے شہر تک پیدل سفر کیا۔ میں نے جیسا سوچا تھا ٹھیک اسی طرح آوارہ گردوں کے ساتھ بینچ پر بیٹھ کر اس بار مجھے بھی ڈاک کی تقسیم کا انتظار کرنا پڑا۔ آخر جب ڈاک تقسیم ہونے لگی تو میں نے ہمت کی اور کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ ڈاک تقسیم کرنے والی خاتون کو اپنا نام بتا کر پوچھا۔

''کیا میرے نام کوئی خط آیا ہے؟''

اس نے سرسری طور پر خطوط کو دیکھا اور بولی۔ ''نہیں ...... تمہارے نام کوئی خط نہیں ہے۔''

میں مایوسی سے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے جانے لگا تو اس خاتون نے مجھ سے دوبارہ میرا نام پوچھا، میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے کہا۔ ''ہاں ایک خط ہے مگر......؟''

''مگر کیا؟''

''مگر بے رنگ ہے ...... تمہیں پچاس سنٹائم ادا کرنے ہوں گے۔''

جب میں نے پچاس سنٹائم ادا کر دیے، تو میری جیب میں پچیس سنٹائم کا صرف ایک سکہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ سکہ فرانس کے مقبوضہ جات میں سب سے چھوٹا سکہ مانا جاتا تھا۔ میں نے تیزی سے خط کھولا تو وہ ناشر کا تھا۔ اس میں مسودے کی منظوری اور اس کے ساتھ معاوضہ کے پانچ سو ڈالر کا چیک تھا۔

میرے لیے تو یہ ایک بھاری خزانے کی طرح تھا۔ اس رقم کے ساتھ میں تاہٹی میں کئی سال گزار سکتا تھا۔ دوسری طرف یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ میں تاہٹی کو چھوڑ کر امریکا جا سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اگر میں اس وقت نہیں گیا تو شاید پھر میرے ہاتھ میں اتنی رقم بھی نہ آ سکے کہ میں جہاز کا کرایا بھی ادا کر سکوں۔ یہ سوچتا ہوا میں بینک چلا گیا۔ چیک کیش کرا کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر جب بلدیہ کی گھڑی نے دو بجائے تو میں فیصلہ کر چکا تھا۔

فیصلہ یہ تھا کہ مجھے تاہٹی سے چلے جانا چاہیے۔

انہی دنوں نیوزی لینڈ کا جہاز آنے والا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کو روانگی کے بارے میں بتا دیا۔ جہاز پر مجھے رخصت کرنے کے لیے ہوپ سنگ میرے دیے ہوئے بیجوں کی پیداوار میں سے ایک ٹوکرا ٹماٹر اور ایک ٹوکرا مکئی کے بھٹوں کا لے آیا تھا۔ جب جہاز ساحل سے دور جانے لگا تو دونوں چینی دوستوں نے مسکرا کر مجھے خدا حافظ کہا۔

جہاز پر میں نے باورچی کو مکئی کے چھ بھٹے دے کر کہا۔ ''انھیں ابال کر دوپہر کے کھانے کے ساتھ لے آنا۔''

''ٹھیک ہے...... جناب!''

کھانے کی میز پر میرے علاوہ صرف ایک اور مسافر تھا، جو نیوزی لینڈ سے آرہا تھا۔ یہ شخص تند خو اور مزاج کا تیز دکھائی دیتا تھا۔ وہ میز پر آیا تو کھانوں کی فہرست دیکھ کر منہ بنانے لگا۔ کھانا آیا تو بڑی بے دلی سے کھانے لگا۔ اتنے میں بیرا ایک پلیٹ میں ابلے ہوئے بھٹے لے آیا۔ بھٹوں کو دیکھتے ہی اس نے اپنے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور بھٹے کھانے لگا۔ تیسرا بھٹا کھانے کے بعد اس نے باورچی سے پوچھا۔

"کھانوں کی فہرست میں مکئی کے بھٹے کیوں نہیں درج کیے؟"

"یہ بھٹے جہاز کی طرف سے پیش نہیں کیے گئے۔"

"پھر......؟"

"آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے صاحب کا تحفہ ہیں۔"

اب اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف گویا پہلی بار دیکھا اور رعونت بھرے لہجے میں کہا۔ "جناب! آپ شکریہ کے مستحق ہیں۔"

ساتھی مسافر کو اتنے شوق سے بھٹے کھاتے دیکھ کر میں نے کوئی بھٹا کھانا پسند نہ کیا۔ جہاز کا کھانا بہت مزے دار تھا۔ عرصے بعد ہنر مند باورچی کے پکائے ہوئے کھانے کھانے کا موقع ملا تھا لیکن میرا ہم سفر بھٹوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور اٹھ کر جہاز کے عرشے پر چلا گیا۔ جہاز تاہتی سے دور ہو چکا تھا، اب وہاں کے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ میں اس منظر میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ مسافر عرشے پر آیا۔ اب وہ معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"صاحب زادے! تمہارے بھٹے بہت مزے دار تھے...... بات یہ ہے کہ مجھے استسقاء کا مرض ہے...... چند ہی چیزیں ایسی ہیں جنہیں کھانے کے بعد مجھے تکلیف نہیں ہوتی اور ان میں سے ایک مکئی کے بھٹے ہیں...... میں نے تمہارے چھ بھٹے کھا لیے......"

"کوئی بات نہیں۔"

"شکریہ! اچھا! تم ذرا اپنے جزیرے کا حال تو سناؤ...... وہاں تو میں جہاز سے اتر ہی نہیں سکا...... بھلا صرف پانچ چھ گھنٹے میں کسی مقام کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟"

میں نے اس جزیرے کے حسین مناظر اور وہاں کے مقامی باسیوں کے طرزِ زندگی کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"آپ میری باتوں سے اکتا تو نہیں رہے؟"

"نہیں...... ایسا بالکل نہیں ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کا صحیح استعمال کیا ہے۔ کیا تمہیں کبھی مضمون نگاری کا خیال نہیں آیا؟"

"مضمون نگاری تو میرا پیشہ ہے، اسی کے لیے تو میں نے اس پُرسکون جزیرے میں قیام کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس چھ مضمون تیار ہیں، جو میں امریکا جا کر کسی اخبار کو دے دوں گا۔"

"کیا وہ مضامین تم مجھے دکھا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں......"

پھر میں نے اپنے صندوق سے وہ چھوٹے چھوٹے مضامین نکال کر اسے دے دیے۔ وہ اپنی آرام کرسی پر لیٹ کر انہیں پڑھنے لگا تو میں وہاں سے کھسک گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں اس کے پاس گیا۔ اس نے کہا۔

"یہ چار مضامین بڑے نہیں ہیں...... تم ان کا کتنا معاوضہ چاہتے ہو...... ہاں! میں تمہیں بتا دوں کہ میں امریکا کی ایک اخباری سنڈیکیٹ کا منیجر ہوں...... میں اسی کے ایک کام سے نیوزی لینڈ گیا تھا۔"

میں سوچنے لگا کہ ان چار چھوٹے چھوٹے مضامین کے لیے اگر میں سو سو ڈالر مانگوں تو کہیں وہ بہت زیادہ تو نہیں سمجھے گا۔ ابھی میں ہچکچا ہی رہا تھا کہ اس نے خود ہی کہا۔

"اگر ہر مضمون کے تمہیں ڈیڑھ سو ڈالر مل جائیں تو کیسا رہے گا؟"

"بہت ہی زبردست......"

جہاز کا بھاری کرایا ادا کرنے کے بعد بھی میرے پاس بہت تھوڑی سی رقم بچی تھی اور مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر امریکا میں میرے مضامین کا فوری معاوضہ نہ ملا، تو پھر کیا ہوگا؟

مگر خوش قسمتی سے مجھے جہاز ہی پر چھ سو ڈالر مل گئے تھے مگر یہ چھ سو ڈالر بھی ہوپ سنگ کی مکئی نے دلائے تھے۔ اس رات میں جہاز کے عرشے پر کھڑا یہ سوچتا رہا کہ ساری خوش نصیبیاں ہوپ سنگ کے تحفوں کی وجہ سے حاصل ہوئیں اور وہ تحفے صرف ایک ڈالر کے بیجوں کی پیداوار تھے۔ ان بیجوں نے مجھے زمین سے سبزیاں تو نکال کر نہیں دیں، مگر انسان کے دل میں ان کی جڑیں دور دور تک پھیل گئیں۔

بھید بھری زمین

سلمی اعوان

سرزمین مصر کو بھید بھری سرزمین بھی کہتے ہیں۔ یہاں جا بہ جا اسرار چھپے ہیں۔ وہ اس اسرار بھری سرزمین پر سیاحت کے لیے آئی تھی لیکن یہاں آکر اس پرکئی اہم راز آشکار ہوتے چلے گئے۔ بچپن کا ایک راز اتنے عرصے بعد عجب انداز میں اس پر عیاں ہوا۔

قاہرہ میرے گلے میں اسی طرح پھنس گیا تھا جیسے چھچھوندر سانپ کے گلے میں کہ جسے نہ اُگلے بنے اور نہ نگلے۔

چلو غزہ، اسکارہ اور میمفس اہرام، فراعنہ اور ابوالہول کے مجسموں اور اُن کی لمبی چوڑی ثقیل سی تاریخ کے ساتھ تھوڑے بہت ہضم کیے۔ پر قاہرہ کے وجود پر شریانوں کی طرح پھیلے بازار مسجدیں اور جا بجا بکھرے اسلامی تہذیب کے نشان، اُس پر طرّہ قاہرہ قدیم کے محلے گلیاں اُن میں سر اُٹھائے پرانی عمارات اور اُن سے وابستہ ہر ایک کے ساتھ

تاریخی داستانیں ہونکانے اور سانس پھلانے کے لیے بہت کافی تھیں۔

ثنا (میری بھانجی جو سفری ساتھی بھی تھی) نے اپنے خوبصورت مخروطی ہاتھ التجا کے انداز میں جوڑ کر میری ناک کی پھنگی سے مس کرتے ہوئے دھیمے سے تنبیہی انداز میں کہا۔

”آنٹی خدا کے لیے ہسٹری کے اس پٹارے کو بند کر دیجیے۔ حشر ہو گیا ہے۔ قاہرہ کی زیرِ زمین ٹرینوں بسوں ویگنوں اور ٹراموں نے رول دیا ہے۔ کروز کا پیکیج لیجیے۔ نیل کی نیلگوں لہروں پر چند دن کی یہ عیاشی بہت ضروری ہے۔“

گرینڈ پرنسس کا ایک سو نوے ڈالر کا پیکیج۔ قاہرہ سے لکسر تک ٹرین لکسر، سے آگے اسوان تک تین راتیں اور چار دن کا کروز پر قیام۔ جا بجا قابلِ دید مقامات پر ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ رنگین اور ہوش ربا پروگراموں کی تفصیل اور تصویروں سے سجا کتابچہ دیکھ کر سوچا۔ ”چلو ذرا غریبانہ سے اندازِ سفر کو شاہانہ رنگ دے کر بھی دیکھتے ہیں۔“

پر یہ کب گمان میں تھا کہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکیں گے۔ رات بھر کے سفر کے بعد صبح سویرے پیکیج کا گائیڈ ذرا سا ستانے اور نیل کے مشرقی اور مغربی کناروں پر صحرا میں اُگے جنگلی گلاب کی طرح دل کش لکسر Luxor شہر کو جسے الاقصر (محلات کا شہر) اور طیبس (قدیمی نام) بھی کہتے ہیں کو نظر بھر کر دیکھنے کی بجائے قدیم ترین تہذیبی اور ثقافتی ورثوں میں لے جائے گا جنہوں نے دنیا بھر میں مصر کو تاریخی حوالوں سے انتہائی معتبر اور منفرد گردانتے ہوئے اُس پر سیاحت کے ذریعے پیسے کی بارش کر دی ہے کہ ہر ہر قدم پر 50 اور 75 مصری پاؤنڈ کے ٹکٹ جیب سے عشوہ طراز محبوباؤں والا سلوک کرتے ہیں۔ لکسر (طیبس) کے نیچے پورا ایک شہر دریافت ہوا ہے۔ کھدائیاں جاری اور دنیا بھر سے ٹورسٹوں کے پرے حاضر اور شہر کا ہر شہری کسی نہ کسی رنگ میں سیاحت کے پیشے سے وابستہ۔

ویلی آف کنگز ویلی آف کیونز۔ ویلی آف نوبلز۔ ویلی آف ورک مین۔ کمبخت مارے شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ویلز کے سلسلے۔

سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ میں گاڑی سے نہیں اُتری تھی۔ ٹانگیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ دفعتاً میں نے باہر دیکھا۔ صحرا کی زردئی ریت سے پرے لائم اسٹون کے پہاڑوں پر تیز بارشوں اور آندھیوں نے اُن میں جو دراڑیں ڈال رکھی تھیں وہ فرعونوں کی مختلف شکلوں میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

کلوسی آف ممنون بڑے میدان میں کھڑے دیو ہیکل بیس میٹر اونچے دو میٹر لمبے پاؤں اور ایک میٹر چوڑائی والے ایمنوفس III کے وہ مجسمے تھے جن کے ٹوٹے پھوٹے لمبی دراڑوں والے خلاؤں کو دیکھ کر خوف سے بھری جھرجھری وجود کو ہلاتی تھی۔ ٹانگوں کے ساتھ دو عورتیں بندھی تھی ایک ماں اور دوسری بیوی۔ بیچاری عورتیں۔ ماضی بعید ہو ماضی قریب یا حال ہو۔ پاؤں اور ٹانگوں کے ساتھ ہی ان کے رشتے ہیں۔ یہاں ٹکٹ نہیں تھا۔ پر جس انداز میں دھڑا دھڑ کام ہو رہا تھا وہ اس رعایت کے جلد ہی چھننے کا اعلان تھا۔

یہاں ایک اور دلچسپ کہانی سُننے کو ملی کہ صبح سورج کی روشنی کے ساتھ ہی ان مجسموں سے بڑے افسردہ اور غم زدہ گیت فضا میں بکھرتے تھے۔

یونانی شاعروں کو ایسے مواقع اللہ دے۔ بھاگے اور ان گیت گانے والے مجسموں کو دیوتاؤں کا درجہ دے دیا۔ سیدھی سی بات تو اتنی تھی کہ 27 قبل مسیح میں آنے والے زلزلے نے ان مجسموں کی توڑ پھوڑ کی۔ ان میں رات بھر کی ٹھنڈک کے بعد صبح کی پہلی شعاعوں سے پیدا ہونے والی حرارت کی کپکپاہٹ جو ارتعاش پیدا کرتی تھی وہ افسردہ گیتوں کی صورت میں محسوس ہوتا تھا۔

چلو اللہ اللہ خیر صلا۔ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے۔

لنچ کروز پر تھا۔ بہت سی سیڑھیاں اُتر کر نیل کے دہانے پر لنگر انداز The Great Princess کا چہرہ مہرہ رعب داب اور شان و شوکت دیکھ کر مجھ جیسی ٹٹ پونجی سیاح دم بخود رہ گئی۔ ریسپشن روم سے بالائی حصوں کو چڑھتی چمکتے پیتل کی ریلنگ والی سیڑھیاں بہترین قالینوں سے سجے فرش، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے گورے گوریاں۔

تین جوڑے کپڑوں کے اثاثے پر مشتمل مضبوط سا شاپر میں نے سیڑھی کے دوسرے قدمچے پر ایک جانب بیٹھتے ہوئے اپنے پاس ہی ٹکا لیا۔ دائیں بائیں دھرے صوفوں پر تو چپہ برابر جگہ نہ تھی۔ غباروں کی طرح پھولے وجود براجمان تھے۔

پاسپورٹ اُن کے پاس تھے۔ معمول کی کارروائی

جاری تھی اور پیٹ میں چوہے بلیاں کود رہی تھیں۔ پر اندراج ہونے اور کمرے کی چابی ملنے سے پہلے ہمارا ڈائننگ ہال میں داخلہ ممنوع تھا۔

میری نظروں کے عین سامنے داخلی دروازہ تھا جس کے ساتھ معلق راستے hanging path پر باہر سے آنے والے جھولتے جھولتے اندر داخل ہوتے تھے۔

دفعتاً جیسے برق سی کوند جائے۔ایک بے حد دلکش خاتون، آنکھوں پر گاگلز لگائے، سی گرین چکن شیفون کی شلوار قمیص میں ملبوس داخل ہوئی۔عقب میں مرد بھی تھا۔ بڑھاپے کے باوجود ایسی جاذبِ نظر تھی کہ ساتھی مرد کو دیکھنے اور جوڑی کا موازنہ کرنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

انڈین یا پاکستانی۔میرا ذہن ابھی اسی مخمصے میں تھا جب ثنا فوری طور پر اپنا اودی رنگ اسکرٹ سنبھالتی ہوئی اٹھی۔قریب گئی۔ بات چیت کی اور پھر اپنے خوبصورت چہرے پر ہم وطنی کے خوشگوار سے مثبت اثرات بکھیر کر مجھے اُس کے پاکستانی ہونے کا سگنل بھی دے ڈالا۔

پر جونہی اُس نے parada گاگلز اُتار کر ہاتھ میں پکڑی اور تنگ آنکھوں سے گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف ہوئی۔میرے اندر جیسے بھونچال سا آ گیا۔کہاں دیکھا ہے اِسے؟ یہ دیکھا بھالا چہرہ ہے۔مانوس سا لگتا ہے۔ سوالوں کے تو جیسے تابڑتوڑ حملے ہو رہے تھے۔

کاؤنٹر سے چابی لینے کے اشارے پر ثنا نے مجھے اُٹھنے کے لیے کہا۔فرسٹ فلور پر مقامی ملبوسات اور سوتیرز سے سجی شاپ، پیانو بار اور تنگ سی راہداری رعمیس اوّل، دوم اور ملکہ نفرتیتی کی تصویروں سے مزین نے مجھے مکمل طور پر متوجہ نہیں کیا۔ذہن میں کھلبلی سی جو مچی ہوئی تھی۔

''مائی گاڈ۔''دروازہ کھولتے اور بتیاں جلاتے ہی کمرے کی اونچے درجے کی آرائش وزیبائش پر ثنا تو جیسے خوشی سے نہال ہوگئی۔پلک جھپکتے ہی اُس نے کھڑکی کے بھاری پردوں کو جھٹک جھٹک کر کناروں پر کیا اور نیل کے پانیوں کو دیکھنے لگی جو کھڑکی سے ذرا ہی نیچے مدھم مدھم سروں میں انگڑائیاں لیتے تھے۔

میں نے بیگ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔پیٹ میں بھوک کی مچی ہاہاکار بھی کہیں خاتون کے چہرے میں گم تھی۔وہ پچاس کے ہیر پھیر میں نظر آنے کے باوجود حد درجہ اسمارٹ اور تروتازہ نظر آ رہی تھی۔

ثنا باتھ روم سے فارغ ہو کر اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے حلیے کو درست کرتے ہوئے بولی۔''آنٹی واش روم سے ہو آیئے۔پھر لنچ کے لیے چلیں۔ڈھائی بج رہے ہیں۔''

ڈائننگ ہال میں وہ موجود تھی۔ہم نے پلیٹوں میں کھانا لیا اور اُسی میز کی طرف بڑھیں جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔

مرد عام سے نقوش والا پر دراز قامت تھا اور بے حد سمارٹ بھی۔سلیقے سے سنوارے گئے گرے بال اُسے سجتے تھے۔

مختصراً تعارف ہوا۔ایک بہت بڑی بے حد اچھی شہرت کی حامل کیمیکل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھا۔جرمنی میں ہونے والی کسی نمائش میں شرکت کے بعد مصر سیر سپاٹے کے لیے آئے تھے۔کیونکہ وہ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھنے ہی والے تھے جب ہم نے پلیٹیں ٹیبل پر رکھیں۔کرٹسی کے طور پر تھوڑی دیر رُک کے پھر چلے گئے۔

مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔اتنا شاندار کھانا حرام ہو رہا تھا۔یادداشت پر تو بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں گرفت میں ہو تو کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دوں۔اپنے بڑھاپے پر غصہ آ رہا تھا۔سچ تو یہ تھا کہ اس وقت جیسے میرے بھیجے میں شدید جھنجھلا دینے والی خارش نے کھلبلی مچا رکھی تھی۔جی چاہتا تھا ناک کے نتھنوں میں تیلیاں گھسیڑ کر وہ چھینکیں لوں کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں۔

کمرے میں آ کر میں نے سر تکیے پر رکھا اور ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گاڑھے اندھیرے میں ڈوبا میرا دماغی کمرا کسی کے کلک کرنے سے روشن ہو گیا ہے۔

عافیہ باجی۔آواز آئی۔

''وہ کیسے ہو سکتی ہیں؟''اندر سے سوال اُٹھا۔

ایسی بانکی نار چھیل چھبیلی سی وہ تو مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑی تھیں۔پر نہیں جیسے میرے ذہن نے کہا تھا کہ تمہیں بوجھنے میں غلطی نہیں ہوئی ہے۔

میں باہر بھاگی۔

ریسپشن پر کھڑے مرد سے میں نے اُس پاکستانی جوڑے کا کمرا نمبر پوچھا اور پھر 211 پر میرے ہاتھوں

نے دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ میں نے آرام میں خلل اندازی کے لیے معذرت کی اور ساتھ ہی سوال اور جواب دونوں داغ دیے۔

''آپ عافیہ باجی ہیں؟ میں سلمیٰ ہوں خالہ کلثوم کی بیٹی اور آپ کی دوست فاطمہ کی بھانجی۔''

''ارے تم سلمیٰ ہو۔'' اُس نے فرطِ محبت سے مجھے کھینچ کر اندر کیا اور بازوؤں کے ہالوں میں لپیٹ لیا۔

''ضیا یہ سلمیٰ ہے۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو۔''

مرد لیٹا ہوا تھا۔ ایک خاتون اور وہ بھی بیوی کی شناسا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایلیٹ کلاس سے تعلق کے باوجود اس کے انداز میں جو میرے لیے والہانہ پن تھا میں خوش ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے کی خواہشمند تھی۔ پر میں نے اُس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔ ''عافیہ باجی سکون سے بیٹھیں گے۔ کروز پر کافی دن ہیں۔ آپ بھی آرام کیجیے۔ میں بھی بڑی تھکی ہوئی ہوں۔''

اِس کمرے میں اُسے آئے ہوئے کتنی دیر گزری تھی۔ محض دو تین گھنٹے۔ پر اتنے مختصر سے وقت میں بھی ڈریسنگ ٹیبل Dior کے قیمتی کاسمیٹکس اور نینا رچی کے پرفیوم سے سجی ہوئی تھی۔

کمرے سے باہر آکر میں نے اپنی تھکن زدہ آنکھوں کے پپوٹوں کو دبایا۔ اور اپنے آپ سے پوچھا۔

''میرے اللہ یہ کون سا آبِ حیات پی رہی ہے جس نے اسے ریورس گیئر لگا دیا ہے۔ دولت اگر اس کے پاس ہے تو غریب میں بھی نہیں۔ پھر یہ اتنا فرق کیسے؟''

کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا دو جوڑوں والا میرا غریبانہ سا شاپر میرا منہ چڑاتے ہوئے فرق کی تفصیل مجھے بتا رہا تھا۔

بستر خواہ کتنا ہی آرام دہ کیوں نہ ہوتا اور فطرتاً میں چاہے جتنی مرضی بے نیاز اور بے پروا سی ہوتی۔ کیا میں سو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔

میری سماعتوں میں اُس دس سالہ لڑکی کی چیخیں تھیں جس کی چھوٹی خالہ ڈوری والا گھوٹنا ہاتھ میں پکڑے جلاّد بنی پوچھتی تھی بولو، بتاؤ، عافیہ تمہیں لے کر کہاں گئی تھی؟

گالوں پر یقیناً آنسو نہیں تھے۔ پر صورت جس خوفناک انداز میں سُتی ہوئی تھی اور اس پر جو تاثرات بکھرے ہوئے تھے وہ یقیناً آنسوؤں سے زیادہ خطرناک تھے۔

''نہیں بکوگی تو اس گھوٹنے سے ہڈیاں توڑ دوں گی۔''

چھوٹی خالہ کی آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں۔

''چھوٹی ماسی چھوٹی ماسی۔ میں گھگھیائی۔ مجھے نہیں پتا۔''

گھوٹنا میری ٹانگوں پر پڑا اور ساتھ ہی میرے نالوں نے آسمان کو جیسے چھوا۔

بڑی خالہ اوپر چھت پر تھیں۔ دہل کر بھاگی بھاگی نیچے آئیں۔

''حد کرتی ہو فہمی۔ بچی کو ذبح کرنا ہے کیا؟''

''یہ بڑی مکار ہے۔ سب جانتی ہے۔'' چھوٹی خالہ نے فتویٰ صادر کر دیا۔

میں بھاگ کر بڑی خالہ کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ ''صفو ماسی۔''

صفو ماسی نے میرا منہ دُھلایا۔ پیار کیا اور مجھ سے واقعے کی تفصیل جانی۔

''میں تو آنگن میں بیٹھی اپنا ہوم ورک کرتی تھی۔ عافیہ باجی نے کوٹھے کے جنگلے سے آواز دے کر اُوپر بُلایا اور تھوڑی دیر کے لیے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہماری ڈیوڑھی میں ہی کھڑے ہو کر اُنہوں نے برقعہ پہنا۔ پہلی سڑک پار کی، پھر دوسری، اگلے محلے کے ایک گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ اُوپر گئیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ برآمدے میں مجھے بٹھا کر وہ خود اندر چلی گئیں۔ وہ بہت دیر اندر رہیں۔ صفو ماسی مجھے تو بہت ڈر لگا تھا۔

میں بھی اوّل نمبر کی مکار لڑکی تھی۔ فہمی ماسی ٹھیک کہتی تھیں۔ وہ مجھے جانتی تھیں۔ بڑا اپکا پیٹھا چہرہ بنا کر میں نے صفو ماسی کی ہمدردی سمیٹی تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے قطعی ڈر نہیں لگا تھا۔ میں تو بڑے مزے سے سارا وقت اُس ایک روپے کے جوڑ توڑ میں پھنسی رہی جو عافیہ باجی نے راستے میں میری ہتھیلی پر رکھا تھا۔ ایک روپیا سولہ آنے والا۔ قریشی جی (اسکول کینٹین والے) کو ایک پیسا دے کر میں چلانا شروع کرتی۔''

''قریشی جی سنگترہ اور مچھیاں۔ دونوں چیزیں ہاتھوں میں تھام کر میں پھر ہانک لگاتی۔ قریشی جی تھوڑے

سے چھولے دے دونا۔‘‘
چھولے لے کر ایک دو لقموں کے لیے بھی منت طرلہ ہوتا۔
میری روزانہ کی بک بک سے تنگ آ کر ایک دن قریشی جی نے میرا پیسا گھما کر پھینکا تھا اور غرّا کر بولے تھے۔ ’’تم تو دمڑی میں ساری دکان لینا چاہتی ہو۔‘‘
ساری بریک میں روتے روتے میرے آنسو نہیں سوکھتے تھے۔ اب یہاں بیٹھ کر میں نے پکا تہیہ کرلیا تھا کہ ایک اکنی تو قریشی جی کے منہ پر ماروں گی۔
پھر گھر واپسی کے ساتھ بیان اختتام پذیر ہوا۔ صفو خالہ دیر تک چپ چاپ کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہیں پھر تاسف بھرے لہجے میں چھوٹی خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ’’بڑا شریف اور مہذب گھرانا ہے۔ اور یہ عافیہ بھی بڑی نیک بی بی لڑکی ہے پر کس راستے پر چل پڑی ہے یہ۔ بھائی غیر قوم میں رشتہ کیسے کر دیتے؟ بڑی احمق ہے۔ سمجھتی کیوں نہیں؟ ماں ویسے ہی بستر مرگ پر ہے۔‘‘
چند دنوں بعد ہمارے گھر میں گھٹی گھٹی سرگوشیوں پر محلے میں کوٹھوں کے بنیروں تک میں گردش کرتی خبر رقصاں تھی۔
عافیہ اور اس کی چھوٹی بہن دونوں رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ گئی تھیں۔
صفو خالہ نے غم کی اتھاہ گہرائیوں سے ہُوک نکالی۔
’’ارے ماں تو جیتے جی مرگئی اور بھائی زندہ درگور ہو گئے۔‘‘
اماں بے کل تھیں کہ کیسے جا کر عافیہ باجی کی امی سے افسوس کریں۔
ہائے نج جو منڈریاں نی جیناں خان نوائے (کاش وہ نہ پیدا ہوں جو خان یعنی بڑوں کو نیچا دکھاتی ہیں)
فہمی خالہ کی تو وہ گہری سہیلی تھی۔ پر فہمی خالہ بڑی ظالم اور بے رحم عورت تھی جس کے ہاں خاندانی وقار اور آن کے مقابل محبت بڑی لغو اور فضول چیز تھی۔
’’واقعی اُن کی امی چار دن بھی نہ نکالنے پائیں۔ بھائی آئے۔ لبوں پر تو پے لگائے گردنیں جھکائے ماں کے مردہ جسم اور چھوٹی بہن کو پنڈی لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مکان بھی بک بکا گیا۔‘‘
نیند تو ہرگز نہیں تھی۔ اونگھ آ گئی تھی کہہ سکتی ہوں۔
ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے سنا۔ نیچے لابی میں ہمارا گائیڈ انتظار میں تھا۔ کرنک اور لکسر ٹمپل دیکھنے جانا تھا۔
ثنا واش روم سے باہر آئی تو میں نے کہا۔ جلدی چلو بھئی۔
ہمارے ساتھ ایک نوجوان ملائی جوڑا مسٹر کول اور مسز لارا کول تھے۔
کرنک کا پہلا منظر ہی ڈراؤنی جادوئی کیفیت اور تاثر کا حامل تھا۔ جنگلی گلابوں کی کیاریوں کے عقب میں بھیڑ کے سروں سے مشابہ ابوالہول کے پچاسوں مجسمے دورویہ سجے ہوئے تھے۔ بلند و بالا سنگی اور کہیں کہیں سے شکستہ دیواروں میں لگے چھوٹے سے آہنی گیٹ سے آگے اسی ٹائپ کے تین اور انسانی سروں والے Sphinxes کی ایک قطار ننگے آسمان کی چھت تلے شام کے اس جھٹ پٹے میں خوف کی لہروں کو سارے جسم میں ایک سنسنی کی صورت میں بکھیر رہی تھی۔
ہپو اسٹائل ہال حقیقتاً مصری طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ ان بلند و بالا کالموں اور ستونوں جن پر کھدی انسانی صورتوں کے ایک دوسرے سے مکالموں کی کیفیات اور واقعات دیکھتے ہوئے انسان حیرت زدہ ہو کر بے اختیار سوچتا ہے۔ قبل مسیح دور کا انسان کسی بھی طرح اپنے ماحول اور حالات کے مطابق کم ذہین اور فطین نہ تھا۔ 23 میٹر بلند یہ ستون جنہیں دیکھنے کے لیے گردن کو بہت اُونچا کرنا پڑتا ہے کیسے تعمیر ہوئے؟ دیو ہیکل قسم کے پتھر کہاں سے لائے گئے؟ کون سی مٹی گارا چونا مسالا انہیں جوڑنے کے لیے استعمال ہوا جو صدیوں پر محیط بارشوں اور موسم کی سختیوں کے باوجود ابھی تک اُسی آن بان سے کھڑے ہیں۔
مقدس جھیل کے پاس بیٹھ کر میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ فرعونوں کی طاغوتی طاقت، قوت اُن کے جاہ و جلال، اُن کی شان و شوکت اور سطوت کے یہ کھنڈر عبرت کے نشان ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ بندے کا پتر بنو۔ اور یہ جانو کہ دنیا میں باقی رہ جانے والا سچ صرف وحدت ہے۔
یہ جھیل ایمنوفس III کے زمانے میں مذہبی رہنماؤں کے لیے تھی کہ وہ اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دینے سے قبل اس میں غسل کرتے تھے اور دن میں چار بار غسل ہوتا تھا۔ بورڈ پر لکھا یہ سب پڑھ کر مجھے ہنسی آئی۔ بے چارے اسی کام میں لگے رہتے ہوں گے۔

تیرہ سالہ ایک خوبصورت سی لڑکی کیپری پر چھوٹا سا بلاؤز پہنے ایک دیوہیکل پتھر کے پاس کھڑی تھی جس پر کمال کی کھدائی تھی اور جسے فرعونِ مصر نے کیپری دیوتا کے نام منسوب کیا ہوا تھا۔

باہر گرد و غبار کے بادل تھے۔ کرینیں اور بل ڈوزر مار دھاڑ میں لگے ہوئے تھے۔ کہیں میدان ہموار اور کہیں کھدائی ہو رہی تھی۔

بہت دور پارک کی گئی گاڑی میں بیٹھی تو عافیہ باجی یاد آئیں۔ انہیں میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ مغرب ہو گئی تھی۔ نماز کے لیے کہاں جاؤں؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''چلو رات کو عشا کے ساتھ پڑھوں گی۔''

کروز پر پہنچ کر گائیڈ اور گاڑی دونوں رخصت ہوئے۔ پر ہمارا تو موڈ سیر سپاٹے پر ابھی مائل تھا۔ نیل کے کناروں پر عالیشان بلند و بالا عمارات کی جگمگاتی روشنیوں نے اگر فضا کو بقعہ نور بنا رکھا تھا تو نیل کے پانیوں میں بھی ان کے شرارے رقصاں تھے۔

جا بجا چلتی شاندار بگھیاں اور ان کے سائیس شہر کی سیر کی دعوت دیتے تھے۔ بھاؤ تاؤ ہوا اور سات مصری پاؤنڈ میں ہم نے شہر کی سیر کی۔

ڈنر کے لیے ڈائننگ ہال جاتے ہوئے عافیہ باجی سے سیڑھیوں پر ٹکراؤ ہوا۔ شام میں وہ کہاں تھیں؟ جیسے میرے استفسار پر انہوں نے لکسر میوزیم کا بتایا۔ ساتھ ہی انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سلپ تھما دی۔ میں نے نیچے اتر کر اسے پڑھا۔ لکھا تھا۔

ضیا جلدی سونے کے عادی ہیں۔ دس بجے میں عرشے پر آ جاؤں گی تم بھی آ جاؤ باتیں کریں گے۔

چور نالوں پنڈ کالی والا حال تھا۔ میں بے اختیار مسکرا دی۔ مجھے تو جاننے کا اضطراب تھا ہی وہ سنانے اور بتانے کے لیے مجھ سے بھی زیادہ مضطرب تھیں۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔

کھانا کونٹینٹل تھا۔ بھوک زوروں پر تھی۔ گزشتہ ہفتہ بھر سے اچھے کھانے کے لیے ترسیدہ تھے۔ ایسے میں بیشتر لوگوں کے اٹھ جانے پر بھی ہمارے وہاں ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے رہنے کا جواز سمجھ میں آتا تھا۔

لاؤنج بار میں ڈسکو ڈانس تھا۔ شاد وہاں چلی گئی اور میں عرشے پر آ گئی۔ کیسا سحر انگیز سا ماحول تھا۔ گو رات تاریک تھی پر یہ تاریکی بھی بڑی رومانوی قسم کی تھی۔ چوبی راستے پر چلتی میں سوئمنگ پول کے پاس ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر نیل کو دیکھنے لگی۔ دنیا کا شاید ہی کوئی دریا اس درجہ تاریخ سے بھرا ہوا ہو جیسا یہ ہے۔

دیر بعد میں نے رُخ پھیرا۔ انگلش پب اس وقت ویران تھی۔ بیسوؤں بیچ بیڈز بھی خالی تھے۔ دو جوڑے عرشے کی بیک پر صوفوں میں دھنسے سگریٹ نوشی کرنے اور باتوں میں مصروف تھے۔

سوئمنگ پول کے اطراف میں لگے پائپوں سے پانی شرل شرل کرتا اندر گر رہا تھا۔ کنارے پر بیٹھ کر میں نے ہاتھ اندر ڈالے۔ نیم گرم پانی کس قدر فرحت بخش سا تھا۔

میرا کھیلن کو مانگے چاند جیسی خواہشوں کا اسیر دل کسی شوخ شرارتی بچے کی طرح پانی میں دھم سے چھلانگ مارنے پر مچل رہا تھا۔ پر اواخر مارچ کی یہ رات خنکی سے لبا لب بھری ہوئی تھی۔ کپڑوں کی بھی قلت تھی ننگے ہو کر ایسی خواہش کی تکمیل ناممکن تھی۔ یوں بھی جوانی والی چستی اور تیزی طراری قصہ پارینہ تھی۔ پردیس میں بیماری اور بستر میں لیٹنے کی عیاشی سے بھی ڈر لگتا تھا۔ اس لیے ایسی بے سروپا خواہش کا گلا گھونٹنا بہت ضروری تھا۔

ابھی جب میں اس ضروری کام سے فارغ ہو رہی تھی۔ سیڑھیوں سے ایک سورج طلوع ہوا اور میری یادداشتوں میں سے ایک منظر اُڑتا ہوا سامنے آ گیا۔

پورے چاند کی رات جب دونوں گھروں کی عورتیں چھتوں کے درمیان حائل پردے کی چار فٹ دیوار کے ساتھ کھڑی باتیں کیا کرتی تھیں ہم بچے بھی بنیروں پر چڑھے بیٹھے ہوتے۔ آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتی عافیہ باجی اور ان کی چھوٹی بہن سامیہ باجی کو میری نانی جو پنجابی شاعری کی بڑی دلدادہ تھیں نے دیکھتے ہوئے ان کی والدہ سے کہا۔

زینب تیری عافیہ کا حُسن تو آفتاب جیسا ہے۔ نگاہوں کو چندھیاتا اور خیرہ کرتا پر تیری سامیہ ماہتاب جیسی ہے۔ مدھم ملائم ٹھنڈک اور طمانیت سے بھری ہوئی۔ اور اُن کی ای کی ہنسی اور بات مجھے آج بھی یاد تھی۔

''ماں جی دُعا کریں ان کے نصیب بھی سُورج چاند جیسے ہی ہوں۔''

کین کی آرام دہ کرسیوں سے جب ہم نے اپنی کمریں چپکالیں۔ عافیہ باجی نے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''تو میں

اب سمجھی ہوں مجھے مصر آنے کی اتنی ہڑک کیوں اُٹھی تھی کہ میری زندگی کا وہ اہم باب جو زمانوں سے بند تھا کھلنے والا ہے۔"

"آپ کے شوہر ضیاء وہی ہیں جن سے ملنے کے لیے آپ مجھے اپنے باڈی گارڈ کے طور پر لے کر گئی تھیں اور واپسی پر مجھے چار چوروں والی مار پڑی تھی۔"

اُن کی ہنسی بھی اُن کی طرح خوبصورت تھی۔ نیل کے پانیوں پر بہت دور تک تیرتی ہوئی گئی۔ ظاہر ہے جس کا ہاتھ پکڑا تھا اُس نے لاج رکھی اور تو ڑ نبھایا۔

"بخت آور ہیں آپ۔" میں نے بس اتنا ہی کہا۔

ایسے منفی اقدام کے بالعموم تلخ نتائج سے متعلق کوئی بات کہنی اُس وقت مجھے مناسب نہیں لگی تھی۔

"تو چلو آؤ وقت کی اُس ٹنل میں چلتے ہیں جہاں جانے کی مجھے ہمیشہ بڑی تمنا ہوتی ہے۔" انہوں نے کہا تو مجھے اپنا ماضی نظروں کے سامنے تھرکتے پایا۔

محلہ گو پرانے شہر میں ہی شمار ہوتا تھا، پر اُس گھر کی گلی چوڑی اور گھر اپنی بیرونی وضع قطع کھڑکیوں دروازوں کی نسبت سے پوری گلی میں سب سے خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔

نچلی منزل کو کرائے پر اٹھوانے کے فیصلے میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے۔

پینشن اور بڑے لڑکے کی تنخواہ میں حلق تالو گیلا نہیں ہوتا تھا۔ ٹبر بہت بڑا تو نہ تھا۔ تین لڑکیاں دو لڑکے اور چھٹی ماں۔

باپ کو تو افسری برتنی نصیب نہ ہوئی تھی۔ تقسیم کے فوراً بعد کا ایم۔ اے پاس۔ مقدر نے اُونچی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ عزت پیسا رتبہ چھوٹی عمر میں ہی مل گیا۔

دل کے دورے ابھی اتنے عام کہاں ہوئے تھے۔ جانے کس منحوس کی نظر اُس کے خوبصورت اونچے لمبے سراپے اور عہدے پر پڑی کہ پتھر پھاڑ نکلی۔ ایک ہی ہلے میں معاملہ جھٹ پٹ آر پار ہو گیا۔

نجیب الطرفین سے لوگ مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر سے ہجرت کر کے آنے والے۔ ایسی چوٹ پڑی، ایسی قیامت کا منہ دیکھا کہ دنوں کیا مہینوں اوندھے منہ پڑے رہے۔

آخر کب تک؟ اٹھنا پڑا۔ ہوش سنبھالنا پڑا۔

بڑا بیٹا پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ اپنے خوابوں کو سمیٹ کر باپ کے دفتر میٹرک کے بعد ملازم ہو گیا۔ زندگی کی گاڑی جوں توں رینگنے لگی۔ باوجود یکہ خاندان مالی بحران کا شکار تھا مگر وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا بھرم رکھنے کی ہر ممکن کوشش ہوتی۔ پھر چھوٹے بیٹے کو بھی سرکاری ملازمت مل گئی۔ گو یہ دوسرے شہر میں تھی پر کچھ بہتری کی آس میں اضافہ تو ہوا۔

بڑی بیٹی عافیہ کی منگنی ماموں زاد سے ہو چکی تھی۔ ماں تو چھوٹی کے لیے بھی اسی گھر میں متمنی تھیں پر بھاوج ایک نمبر کی شاطر عورت۔ ایک رشتے پر ہی چیں بچیں۔ کجا دوسرا۔ دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔ دونوں بیٹے بھی شوہر نے اُن کی کمسنی ہی میں اپنی بہن کی بیٹیوں سے جوڑ دیئے تھے۔ نند بھی تیز طرار عورت تھی۔ بھاوج اور نند میں دور پار کی رشتے داری تھی۔

بہت ساری گھمبیر سوچیں تھیں جو ہمہ وقت خاتون خانہ کو گھیرے میں لیے رکھتیں۔ کبھی وہ خود سے کہتیں۔

"اگر عافیہ سامیہ سجاد کے گھر چلی جائیں تو میری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔ بھائی ہے میرا۔ اپنا مارے گا تو چھاؤں میں بھی بٹھائے گا۔ باقی مقدر میں لکھے گئے دُکھ سکھ تو بھوگتے ہی ہوتے ہیں۔"

دن گرم تھا۔ وقت عین دوپہر کا جب پسینا چوٹی سے ایڑی تک بہتا ہے۔ گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ چھوٹی لڑکی نے بڑے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ خاکی پتلون اور سفید قمیص میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔ لڑکے کی پیشانی پسینے سے تر تھی جسے وہ اپنے نیلے رنگ کے رومال سے صاف کرتا تھا۔ مریم نے اُلٹے پاؤں واپس جا کر ماں کو بتایا۔

"شاید کوئی مکان کے لیے آیا ہو؟"

ماں سوچتے ہوئے اُٹھیں اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئیں۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر ایک قبول شکل لڑکا کھڑا تھا۔ سلام دُعا ہوئی۔ خاتونِ خانہ نے شفقت سے کہا۔ "آؤ بیٹا اندر آؤ۔"

بیٹھک میں چار کرسیاں آنے جانے والوں کے لیے ہی رکھی ہوئی تھیں۔ ماں نے پنکھا چلا دیا۔ ذرا سکون ہوتے پر اس نے آنے کا مدعا بتایا کہ وہ مکان لینا چاہتا ہے۔ کسی نے ان کے گھر کا پتا بتایا تھا۔ اپنے بارے میں اُس نے تفصیل سے بتایا کہ اس کا نام ضیاء احمد، اُس کے بھائی کا نام عطاء احمد ہے۔ لاہور کی ایک بڑی فیکٹری میں دونوں

کیمیکل انجینئر ہیں۔ تنہا ہیں۔ ماں باپ اور بھائی بہن حیدر آباد میں ہیں، جہاں ان کے باپ کی ملازمت ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ بغور اُسے دیکھتی رہیں۔ لڑکا شریف، گفتگو سے مہذب اور نستعلیق قسم کا لگتا تھا۔

"چلو آؤ پہلے گھر دیکھ لو۔" وہ اُٹھیں اور ان کے ساتھ ہی لڑکا بھی کھڑا ہو گیا۔ کمروں میں گھوما، باتھ روم اور کچن کا جائزہ لیا۔ مکان اُسے پسند آیا تھا۔ کرائے کی تفصیلات طے کیں اور ایڈوانس ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"ماں جی مکان مجھے پسند ہے ہم جلد ہی شفٹ ہو جائیں گے۔"

وہ بھی خوش ہو گئیں کہ صاف ستھرے لوگ ہیں بڑے خاندان والوں اور چھوٹے بچوں سے وہ بہت گھبراتی تھیں۔ مکان کا ناس مار دیتے ہیں۔

آسودہ سی مسکراہٹ لبوں پر تھی جب وہ اوپر آئیں۔ عافیہ نے کچن میں سے جھانک کر پوچھا۔

"بہت خوش نظر آ رہی ہیں امی جان۔"

"ارے ہاں منی اچھے لوگ لگتے ہیں۔"

پر بڑے بیٹے نے شام کو گھر آنے پر نئے نوجوان کرایہ داروں کے بارے میں سن کر اپنے خدشے اور خفیف سے ڈر کا اظہار ضرور کیا۔ "گھر میں جوان لڑکیاں ہیں امی جان کچھ مناسب نہیں لگتا۔"

پر ماں نے یہ کہتے ہوئے "ارے نہیں بیٹے بہت بیبا اور شریف لڑکا دکھتا ہے" تسلی کر دی۔

ایک ہفتہ گزر گیا پھر ایک دن ٹرک آیا۔ سامان زیادہ تو نہ تھا مگر پھر بھی گھرداری ضرور تھی۔ صوفہ سیٹ، پلنگ، تپائیاں، کھانے کی میز اور کرسیاں۔ لڑکے غالباً اکیلے رہ کر سلیقہ جان گئے تھے۔ انہوں نے آناً فاناً سامان کمروں میں سیٹ کر لیا۔ عافیہ سے ماں نے کہا۔ "کھانا زیادہ بنانا۔ نیچے بھیجنا ہے۔ نئے آئے ہیں۔ بیچارے کہاں چولہا جھونکتے پھریں گے؟"

مریم بڑی ٹرے میں کھانا سجا کر لے گئی تو ضیاء نے فوراً اُس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ "گڑیا بھلا اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔"

اور گڑیا نے چپ رہنے کی بجائے جواب دینا ضروری سمجھا۔ پٹ سے بولی۔ "تکلیف کیسی ہم نے نہیں کھانا تھا۔"

دونوں بھائیوں نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ عطاء نے ٹرے خالی کی اور اس میں ڈھیر سارے آم ڈال کر خوان پوش سے ڈھک دیئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ جانے لگی تو اُسے ٹرے تھما دی۔ اس نے کہا بھی۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ امی جان ناراض ہوں گی۔"

"ارے نہیں ہوں گی۔ دیکھو ہم نے کھانا رکھا ہے یا نہیں۔"

مریم جب ٹرے لے کر اوپر آئی۔ ماں نے اسے دیکھا تو بولیں۔

"یہ کیوں لائی ہو تم؟"

"امی جان میں کیا کرتی۔ انہوں نے زبردستی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔"

حقیقی معنوں میں وہ خاندانی اور باکردار لڑکے ثابت ہوئے۔ مہینوں تو ان کی موجودگی کا پتا ہی نہ چلا۔ کب اُٹھتے ہیں؟ کب کام پر چلے جاتے؟ رات ڈھلے آتے اور سو جاتے۔ چھٹی کا دن گھر کے اندر ہی گزار دیتے۔ کھانا وہ غالباً باہر کھاتے تھے بس ناشتا گھر پر کرتے۔

ایک دن عافیہ صبح ناشتا بنانے کے لیے کچن میں آئی تو نیچے سے آتی ایک نسوانی آواز نے حیران کر دیا۔

"حد ہو گئی ہے۔ کتنی بے ترتیبی ہے تمہارے ہاں۔ ساری زندگی تمہاری ہوسٹلوں میں گزری اور سلیقہ تم میں پھر بھی نہیں۔ تم لوگ تو بڑے ہی پھوہڑ ہو۔ اب بتاؤ! مجھے سویرے چائے کی عادت ہے اور یہاں نہ پتی کا پتا چل رہا ہے اور نہ کیتلی کا۔"

عافیہ نے آنگن کے جنگلے سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک خوش پوش سی لڑکی چولہے کے پاس کھڑی برتنوں کی الماری میں چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی اور بولتی جاتی تھی۔ عافیہ خود صبح سویرے چائے پینے کی عادی تھی۔

"اگر پسند کریں تو اوپر آ جائیے میں اپنے لیے چائے بنانے والی ہوں۔"

آواز پر لڑکی نے اُوپر دیکھا۔ کیسی حسین اور شاندار لڑکی اُس کے سامنے جنگلے پر ہاتھ رکھے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک حیرت زدہ گنگ سی اُسے تکتی رہی اور پھر سیڑھیاں چڑھتی اُوپر آ گئی۔

چھٹی کا دن تھا گھر کے سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔
وہ ذرا جھجکتی صحن میں آکر رُک گئی۔ عافیہ نے کچن کے دروازے سے نکل کر نرمی سے کہا۔ ''رُک کیوں گئی ہو؟ آگے آؤ۔''

وہ کچن میں آگئی۔ اُس نے پیڑھی اُس کی طرف بڑھائی اور کپوں میں چینی ڈالنے لگی۔ دونوں کپ چھوٹی تپائی پر رکھے اور اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''چائے کے ساتھ کچھ لیں گی؟''

''نہیں بس خالی چائے پینے کی بُری عادت پڑ گئی ہے۔''

''اضافی عادتیں کبھی کبھی تنگ کرتی ہیں۔'' وہ مسکرائی اور کپ لبوں سے لگالیا۔

''چلیے اب تعارف ہو جائے۔'' عافیہ نے چائے کا چھوٹا سا سپ لیتے ہوئے سانولی سلونی لڑکی کو دیکھا۔

وہ ہنسی۔ ''تعارف تو بس دو لفظوں کا ہے۔ آپ کے کرایہ دار دونوں لڑکوں عطا اور ضیا کی چھوٹی بہن ہوں نام شہناز تعلیم بی ایس سی۔ ایم ایس سی میں داخلہ نہ لے سکی کہ اماں کو میرے ایڈمیشن والے دنوں میں ہی بیمار پڑنا تھا۔ لاہور کی سیر کرنا چاہتی تھی اس لیے اِن کے پاس آئی ہوں۔''

کچھ دیر عافیہ کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر جب نیچے جانے کے لیے اُٹھی تو بولی۔ ''اپنے آپ کو روکا تو بہت ہے میں نے کہ پہلی پہلی ملاقات ہے اور اتنی بے تکلفی کا اظہار مناسب نہیں، لیکن کروں کیا؟ کہے بغیر دل نہیں مانتا۔ خُدا نے آپ کو کتنی محبت اور فرصت سے بنایا ہے۔''

عافیہ کے لبوں پر بڑی مدھری مسکراہٹ بکھری اور پھر معدُوم ہوگئی۔

کاش ایسی آنکھیں اُس کی سسرال کے پاس ہوتیں۔

دوستانہ تو ہونا ہی تھا۔ ہوا اور ہر گذرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ ناشتا نیچے کرنے کی چور ضرور رہتی۔ باقی کھانے اور گلیوں میں بکتی الم غلم سب چیزوں کی منہ ماری اُن کے ساتھ کرتی۔

دن بڑے اُداس سے تھے۔ خزاں درختوں کے گرتے پتوں میں ہی نہیں موسم کی ہر شے میں اُتری ہوئی تھی۔ دھوپ کے سنہری پن میں جیسے ایک پھیکا پن در آیا تھا۔ بگولوں اور آندھیوں کے جھکڑ اِس اُداسی کو اور گہرا کرتے تھے۔

ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن جب عافیہ کی امّی عافیہ کی سُسرال گجرات گئی ہوئی تھیں۔ کچھ ٹن گن لینا چاہتی تھیں۔ کچھ جاننے کی خواہشمند تھیں۔ کیا پروگرام ہے اور کب کا ارادہ ہے؟

شہناز نے دعوت کا اہتمام کرلیا۔

انہوں نے سُنا تو کہا۔ ''لو ایک اکیلی تمہاری جان اور ہم تین۔ چھوڑو کس پراگے میں پڑنے لگی ہو۔''

پر شہناز مصر کہ ہرگز نہیں۔ روز اُوپر تو کھاتی ہوں۔

''چلو دیکھتے ہیں کیسا پکاتی ہو؟'' عافیہ ہنسی۔

دو بجے اُس نے میز لگادی اور تینوں بہنوں کو آواز دی۔ مریم اسکول سے آچکی تھی۔ تینوں نیچے اُتر گئیں۔ کھانے کی میز پر بیٹھیں تو سامیہ نے سلیقے سے سجی میز کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی رنگ رُوپ تو زبردست ہے۔''

شہناز نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''اللہ کرے اب سوادی بھی ہو۔'' اُس نے ''سوادی'' کو جس انداز میں کہا۔ تینوں بڑی محظوظ ہوئیں۔

کھانا ابھی شروع ہی کیا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلا دونوں بھائی اندر آئے۔

شہناز نے حیرت سے اُنہیں دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ لوگ کیسے؟''

''فیکٹری میں ہڑتال ہوگئی ہے۔''

اب صورت یہ تھی کہ دونوں بھائی شرمندہ شرمندہ سے دوسرے کمرے میں تھے۔ شہناز بوکھلائی ہوئی اور خود اُن دونوں بہنوں کے تھمے ان کے ہاتھوں میں۔ شہناز نے آہستہ سے ان کے پاس آکر کہا۔ ''اگر آپ بُرا محسوس نہ کریں تو بھیا لوگ بھی ساتھ بیٹھ جائیں۔''

عافیہ تو ابھی تذبذب میں تھی پر سامیہ متانت سے بولی۔ ''ہاں ہاں کوئی حرج نہیں۔ پر دیکھو ڈیوڑھی کے دروازے کو کنڈی لگا آؤ۔''

شہناز دونوں بھائیوں کو لے آئی۔ ضیاء اور عطاء نے حُسن و خوبصورتی کے اِن مجسموں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ کبھی ٹکراؤ ہی نہیں ہوا تھا۔ دنگ رہ گئے تھے۔ اُن کے آجانے سے ماحول پر گھمبیر سی خاموشی چھا گئی البتہ مریم دونوں

بھائیوں سے خاصی بے تکلف تھی وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ارے کچھ بات کیجیے نا۔ سب خاموش ہو گئے ہیں، مجھے خاموشی اچھی نہیں لگتی۔''

اُس کی معصومانہ سی بات پر بھی مُسکرا پڑے۔ ضیاء نے دھیرے سے نگاہیں اُٹھا کر عافیہ کو دیکھا اور کچھ سوال جواب کیے۔ اُس کی تعلیم اور مشاغل کے متعلق پوچھا۔

بڑا مختصر سا جواب تھا کہ میٹرک کے بعد بی۔ اے تک کی تعلیم تو ساری گھر پر ہی ہوئی۔

اور یہ سوال کہ ایم۔ اے کیوں نہیں کرتیں۔

اُس نے سادگی سے کہہ کر بات ختم کر دی۔ شاید ایم اے مُشکل ہے۔ یا پھر یہ کرنا مجھے مُشکل لگا۔

ماحول میں تھوڑی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ عطا نے بھی سامیہ کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کیں۔

تینوں بہنیں جب کھانا کھا کر جانے کے لیے اُٹھیں تو ضیاء اور عطا نے دونوں کو جس والہانہ انداز سے دیکھا اُس نے دونوں بہنوں کے سر جُھکا دیئے۔ اوپر آ کر انہوں نے مریم کو منع کر دیا کہ وہ کسی کو نیچے کھانا کھانے کے بارے میں نہ بتائے۔

وہاں تو وہی بات ہوئی تھی کہ دیکھا اور دل میں اُتر گئیں۔ شام تک وہ پلنگوں پر لیٹے سگریٹ پیتے اور دھوئیں کے مرغولوں میں اُن کے پیکر دیکھتے رہے۔ شہناز نے ضیاء سے شاکی انداز میں کہا۔ ''بھیا اب آپ مجھے کہیں سیر کے لیے بھی لے کر جائیں گے یا یوں ہی گھر کے اندر رکھ کر ایک دن حیدر آباد کی گاڑی چڑھا دیں گے۔''

دونوں سلجھے ہوئے، متین اور بُردبار سے نوجوان تھے وگرنہ ضیاء کا دل تو چاہا تھا کہ وہ کہے ''بھئی جتنی سیریں کہو کروا دیتے ہیں۔ پر اُسے ساتھ لے لو جو عافیہ ہے۔''

پر یہ تو دل نے کہا تھا اور دل کی بات ہونٹوں پر لانا اُس جیسے نوجوان کے لیے کہیں ممکن تھا۔

ماضی کے دُھندلکوں میں گم کہانی سُننے اور سُنانے کا عمل اس درجہ محویت سے جاری تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کب کوئی آیا۔

بس اِن لفظوں نے ماحول کے طلسم کو توڑا۔ ضیاء اپنی دراز قامتی کے ساتھ خفیف سے جُھکے اپنی بیوی سے کہتے تھے۔ ''عافی رات کا ایک بج رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ کوشش بسیار کے باوجود نیند نہیں آئی۔ آؤ چلو باقی باتیں کل پر رکھنا۔''

عافیہ باجی کس سُرعت سے اُٹھی تھیں۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ اس وقت بلیئرڈ روم اور لاؤنج بار بھی جگہ سناٹا تھا۔

بستر پر لیٹ کر بھی مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ سرہانے لگی روشنی نے اُکسایا کہ لکسر پر لٹریچر ہی پڑھ لوں۔ پڑھتے ہوئے بے اختیار ہی اس شہر کے مقدر پر رشک آیا جس کے قریب ہی چھوٹے سے گاؤں 'اطود' میں خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ نے جنم لیا تھا۔

اب پتا نہیں کب سوئی پر خوابوں میں بھی اطود میں ہی گھومتی پھری۔ سویرے ہی جاگ گئی۔ اوپر بھاگی کہ طلوع آفتاب کا نظارہ کروں۔ مجھے تو یہاں ایک اور کنفیوژن سے پالا پڑا تھا کہ کعبہ کا تعین غروب آفتاب کی سمت سے نہیں طلوع آفتاب کی سمت سے ہوتا ہے۔ ادھر کہ اُدھر انہی چکروں نے اُلجھائے رکھا اور پھر سامنے نیل کے پار کی پست قامت پہاڑیوں کے اوپری سرے کرنوں میں نہائے نظر آئے تو سخت مایوسی ہوئی۔

ناشتا کرنے تک میں اپنے آپ سے یہی سوال کرتی رہی۔ اگر میں اطود چلی جاؤں تو ساڑھے دس کروز کی روانگی تک واپسی ہو سکتی ہے۔ اب جواب عجیب گھمسن گھیری میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی نیل کے کنارے رعمیس دوم کا وہ محل تھا جہاں حضرت موسیٰ کی پرورش ہوئی۔ وہ چھوٹی سی لڑکی بھی میرے تصور میں تھی جو اپنے بھائی کے پانی پر بہتے صندوق کے ساتھ ساتھ کتنی دور تک دوڑتی چلی گئی تھی۔

''میرے مولا اس نیل کو بھی تو نے کتنی فضیلتوں سے نوازا ہے۔ کہیں اس نے پیغمبر کا بار امانت اُٹھایا کہیں تاریخ اسلام کی عظیم ہستی عمر نے اسے مخاطب کیا۔''

اور میں اوپرے دل سے لکسر کی گلیوں بازاروں میں گھومتی پھرتی تھی۔

ساڑھے دس کی بجائے کروز نے ساڑھے گیارہ بجے حرکت کی۔ وقت کی اِس زیادتی نے... میرے دل کو جلایا۔ ہم دھیرے دھیرے لکسر کی بلند و بالا عمارت سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ عرشے پر اس وقت مسافروں کا رش تھا۔ دھوپ بھی تیز تھی اور ہوائیں بھی ٹھنڈی تھیں۔ سوئمنگ پول کے گرد رنگین Bikni کے دھنک رنگ بکھر گئے تھے۔ تھل

تھل کرتے مردوزن کے نیم عریاں اجسام عجیب سی کراہیت کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

رفتار تیز ہو گئی تھی۔ گوٹیل کے دونوں کناروں پر مناظر کی خوب صورتیاں گرفت میں لینے والی فسوں خیزیوں جیسی تو نہ تھیں جہاں بندہ بے اختیار بول اُٹھے کہ دامنِ دل می کشد کہ فردوس ایں جا است۔

تاہم اپنے تمام تر تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے ہمراہ زردئی پہاڑیوں، گنے اور کیلے کے کھیتوں، کچے پکے مکانوں، سیاہی مائل سبز پانیوں کے ساتھ ایک خوبصورت اور دلکش تاثر کے نمائندہ تھے۔

پر ان منظروں کا حُسن دو چند ہوا جب تیز دھوپ کی کوکھ سے شام نکل کر فضا میں پھیلی۔ کھجوروں کے درختوں کے نوکیلے پتوں کی تیز ہوا کے بلھوں سے اسی طرح مانگوں نے لشکارے مارے جیسے جوان لڑکیوں کے بالوں سے لمبی لکیریں اشارے کرتی ہیں۔

عرشے پر چائے کے اہتمام نے شام کی رنگینی اور بڑھا دی۔ مغرب نے ایک اور انوکھا منظر دکھایا۔ کروز Esna سے ٹرن لے رہا تھا اور بے شمار کشتیوں نے اُس کا گھیراؤ اسی انداز میں کیا جیسے پولیس کسی مشتبہ گھر کو چاروں جانب سے گھیرے میں لے لے۔ پلاسٹک کے شاپروں میں رکھی شالیں، کشتی والے گیند کی طرح اُچھالتے ہوئے عرشے پر کھڑے لوگوں کی طرف پھینکتے۔ بھاؤ تاؤ کے لیے خوب خوب بولا جاتا۔ نہیں، ہاں ہاں کی تکرار ہوتی۔ کچھ شاپر واپس بھیجے جاتے کچھ پانی میں گرتے۔ کشتیاں انہیں پکڑنے کے لیے تیزی سے حرکت کرتیں۔ واہ کیا انداز تھا شاپنگ کا۔ انوکھا اور نرالا۔ ضرورت ایجاد کی ماں شاید اسی کو کہتے ہیں۔

میرے پاس کھڑی خاتون فوٹو کاپی کیے چند کاغذات ہاتھوں میں پکڑے ان کے مطالعے میں محو تھی۔ میں نے نظریں دوڑائیں۔ ایسنا کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ کبھی یہ بالائی مصر کا کیپیٹل سٹی تھا۔ ماضی میں Latopolis کے نام سے شہرت رکھتا تھا اور یہ نام اسے یونانیوں نے مقدس مچھلی لیٹو کے نام پر دیا تھا۔ اس کے موجودہ گاؤں میں صرف ایک ہی ٹمپل خونم دیوتا کے نام سے موسوم موجود ہے۔

رات کے کھانے پر اسموک ویل (فرائی مچھلی) گوشت اور چکن تھا۔ چاولوں سے بھی تاب یوں دمکتی تھی جیسے برتن سچے موتیوں سے بھرا ہو۔ چھ اقسام کے میٹھے اس پر طرہ کھانے کے فوراً بعد پریزنٹیشن کاک ٹیل کا شور ہوا۔ لاؤنج میں عملہ ایک کے بعد ایک تالیوں اور مدھم سی موسیقی کے شور پر بھاگا بھاگا آتا اور سامنے کھڑا ہو جاتا۔ ایک خوبصورت سا نوجوان گلا پھاڑتی آواز میں غالباً تعارفی جملے بولتا تھا۔ ہمارے تو سر سے الفاظ گزر رہے تھے۔ چھت سے منعکس رنگا رنگ روشنیوں کے جلو میں سوفٹ ڈرنک اور کیک پیش کیا گیا۔

میں جب عرشے پر آئی تو خنک اور لطیف ہواؤں میں تاروں بھرے ٹمٹماتے آسمان کی چھت اور روشنیوں سے جگمگاتے زمین کے آنگن خوبصورت منظروں کے عکاس تھے۔ مجھے ڈیڑھ گھنٹا گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ عافیہ باجی آئیں اور ہم پھر کہانی میں ڈوبے۔

لیکن جب دونوں بھائی دفتر میں اکٹھے بیٹھے تو وہ بات دونوں کے لبوں پر آ گئی جو وہ رات اور دوپہر سے ایک دوسرے سے کہہ نہ پائے تھے۔

''دو ماہ رہتے ہو گئے ہیں اس گھر میں۔ یہ چاند اور سورج کہاں چھپے ہوئے تھے؟''

عطا نے کہا ''یار کیسا نرم ٹھنڈا اور دلکش حسن تھا اُس سامیہ کا۔''

اور یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ عافیہ کی امی گجرات سے بڑی بجھی بجھی سی آئیں۔ بہت سارے لنگڑے لُولے بہانے سُننے کو ملے تھے۔

''لڑکا تو ابھی نیا نیا نوکر ہوا ہے کچھ سیٹ تو ہونے دیں اُسے اور ہاں تمہارے لڑکے بڑے ہیں پہلے اُن سے تو نمٹو۔ تمہاری نند بھی جوان لڑکیاں لیے بیٹھی ہے۔''

اب انہوں نے کہا بھی میں بیوہ عورت ہوں۔ بہوؤں کے آنے سے پہلے بیٹیوں کو وداع کرنا چاہتی ہوں۔ پر کمزور کی بات ہمیشہ سے بے وزن ہلکی اور بے وقعت ہے۔ یہی اُن کے ساتھ بھی تھا۔

اُن کے خاموش اور گہرے تفکر کو بیٹی نے سمجھا اور پوچھا تو عجیب سے یاس بھرے لہجے میں دُکھ سے بولیں۔ ''آثار اچھے نہیں لگتے۔ کھل کر اور دوبدو انکار تو نہیں کیا پر نوشتہ دیوار صاف ہے اور میں اُسے پڑھ آئی ہوں۔''

وہ صبرِ ایوب کی قائل تھیں۔ جانے کتنا دُکھ اندر سمیٹے

بیٹھی تھیں پر اُس دن بے اختیار ہی پھٹ پڑیں۔

"بیٹے تو ابھی سے پھوپی کی زبان بولتے ہیں۔ جب بیویاں آگئیں تو بات کرنے سے بھی جائیں گے۔ رشتوں کا ویسے کال پڑا ہوا ہے۔ ہوشیار چالاک میں ہوں نہیں۔ لوگوں سے کبھی کچھ میل ملاقات نہیں۔ سوچتی تھی۔ تمہاری شادی ہو جائے تو شاید سامیہ کے لیے بھی راہ نکل آئے۔ بھائی کے دل میں کوئی رحم کا احساس جاگ جائے۔ پر میں ہی احمق تھی ریت سے مکان بنانے بیٹھ گئی۔"

عافیہ نے اپنے دل میں اُمنڈتے اُس طوفان پر کیسے کیسے بند لگائے جو آنسوؤں کی صورت باہر لپکنے کو بے تاب تھے یہ صرف وہی جانتی تھی۔ پر اپنی ماں کے اندر اُمنڈتے طوفان کا تو وہ اندازہ ہی نہ لگا سکی۔ کیسا خوفناک دباؤ تھا۔ دل پر کتنی گھٹن تھی جو نصف شب کے قریب پھٹ کر دورے کی صورت باہر نکل آئی۔ ماں کا پیلا پھٹک پسینے سے تربتر چہرہ اور اس کی ابتر حالت نے اُنہیں چیخنے چلانے پر مجبور کر دیا کہ گھر میں تینوں لڑکیاں ہی تھیں۔ بڑا بیٹا تو پنڈی ٹرانسفر ہو گیا تھا چھوٹا بیٹا سہالہ میں تھا۔

آہ و بکا کی آوازیں سن کر شہناز اور عطا ضیا بھی گھبرا کر اُوپر بھاگے۔ دونوں بھائی اندر آئے۔ دیکھا۔ ایک نے دوسرے کو فوراً فیکٹری فون کرنے اور گاڑی لانے کے لیے کہا۔ کوئی پون گھنٹے میں گاڑی آگئی۔ دونوں بڑی بیٹیوں کی جان مٹھی میں آئی ہوئی تھی، چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ننگے پاؤں ہی ماں کے ساتھ چل دیں۔ جب ضیا نے دھیرے سے عافیہ کو شانوں سے تھام کر پیچھے کیا۔

"خدا پر توکل رکھیں کمرے میں جا کر دوپٹا بدلیں اور چپل پہنیں۔"

شہناز نے دونوں بہنوں کے چپل اُن کے پاؤں میں ڈالے۔ چادریں دیں اور پھر وہ گاڑی میں ماں کے دائیں بائیں بیٹھیں۔ ضیا اور عطا ڈرائیور کے ساتھ جڑ گئے۔

ایمرجنسی میں داخلہ ہو گیا۔ فوری طبی امداد دی گئی۔ ساری رات دونوں بھائیوں کی بھاگتے دوڑتے، میڈیکل اسٹور سے دوائیں لاتے، اِدھر اُدھر جاتے گزری۔ دونوں بہنوں کی رو رو کر آنکھیں سوجھ گئی تھیں۔ کبھی عطا انہیں تسلی دیتا اور کبھی ضیا۔ صبح پو پھٹی تو عافیہ نے ضیا سے کہا۔ "آپ میں سے ایک گھر چلا جائے مریم تنہا ہے اور بڑے بھیا کو فون بھی کر دیں۔"

اس کے جواب میں ضیا نے کہا۔ عطا گھر کا چکر لگا آیا ہے تسلی بھی دے آیا ہے۔ میرے خیال میں بڑے بھیا کو فون کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ وہ یہاں آ کر کیا کریں گے۔ بس اللہ سے دعا کریں۔ اِن کی حالت ذرا سنبھل جائے تو اُنہیں اطلاع کر دیں گے۔

عطا اُس وقت باہر تھا۔ وہ اندر آیا تو اُس کے ہاتھ میں تھرماس اور ٹوکری تھی۔ اس نے ٹوکری میں سے کپ نکالے۔ چائے اُن میں انڈیلی، پیکٹ میں سے چند بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور کپ اُن کی طرف بڑھائے۔

عافیہ نے دُکھ بے بسی اور شرمندگی کے جذبات سے لبالب بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

ضیا نے کپ اُسے تھمایا اور صرف اتنا کہا۔ "پریشانیوں کا مقابلہ ہمت اور حوصلے سے کرتے ہیں۔ انسان دل ہار بیٹھے تو بات نہیں بنتی۔"

پہلی بار اس سارے وقت میں سامیہ نے آنکھیں اُٹھا کر عطا کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "آپ ہمارے لیے کس قدر تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔"

"آپ چائے لیجیے۔ غیروں والی باتیں مت کریں۔"

عافیہ کو شہباز سے کبھی کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا۔ وہ اُس کی منگیتر ضرور تھی مگر منگیتر بنانے میں اُس کی ماں کا ہاتھ تھا۔ وہ چھوٹی سی تھی جب ایک بار اُس کے ماموں اور ممانی ان کے گھر آئے۔ ممانی نے اِس من موہنی صورت کو حیرت سے دیکھا اور بے اختیار بولی۔ "بانو تمہاری یہ بیٹی تو شہزادی دکھتی ہے۔"

اور ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پیاری لگتی ہے تو تم لے لونا۔"

یوں ماں نے کئی دفعہ کہہ سُن کر منگنی کروائی۔ عافیہ جب بڑی ہوئی اور اُسے یہ سب معلوم ہوا تو وہ بہت جز بز ہوئی۔ ماں نے رسان سے سمجھایا۔ "پاگل ہو بیٹی۔ باپ سر پر نہیں۔ بھائی کون سا اتنے بڑے اور سمجھدار ہیں۔ میں کہاں رشتے ڈھونڈتی پھروں گی۔ یہ اپنے تو ہیں نا۔"

دونوں بہنوں کو ممانی ناپسند تھی۔ ماموں بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ شدید قسم کے زن مرید تھے۔ بہن پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے پر مجال ہے جو کبھی انہوں نے ایک پیسا بھی

خرچ کیا ہو۔

ایک ہفتہ اسپتال والوں نے ماں کو خصوصی دیکھ بھال کے وارڈ میں رکھا۔ یہ سب ضیا اور عطا کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ وہ ڈاکٹر تو ان کے ایف ایس سی کے کلاس فیلو نکل آئے تھے۔

دونوں بہنوں کو انہوں نے اُسی دن گھر بھیج دیا یہ کہتے ہوئے کہ ہم کافی ہیں۔

وہ بس ملاقات کے وقت آتیں۔ تیسرے دن مکمل ہوش آ گیا تھا۔ ضیا ہی ان کے پاس تھا جو اُن پر جُھکا طبیعت کا پوچھ رہا تھا۔ جواب دینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

سچ تو یہ تھا کہ دلوں کے فاصلے جنہیں شریف گھروں کی نیک بخت لڑکیاں سالوں مہینوں میں طے کرتی ہیں وہ دونوں بھائیوں کے ایثار اور قربانی نے دنوں میں طے کروا دیے تھے۔ دونوں ضیا اور عطا کے لیے بہت لطیف جذبات محسوس کرنے لگی تھیں۔

اب ماں کافی بہتر تھیں۔ بیٹھ کر جوس پیتی تھیں۔ بیٹیاں آتیں تو ان سے باتیں کرتیں۔ دو تین دنوں میں اسپتال سے بھی ڈسچارج ہونے والی تھیں۔ عافیہ اُس دن ضیا کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ عطا ڈیوٹی پر تھا۔ ماں سو رہی تھیں۔ اُس نے ٹفن بکس بینچ پر رکھا اور ضیا سے مخاطب ہوئی۔

'' آپ کھانا کھا لیں۔''

اُس کی اِس بات کا جواب دینے کی بجائے ضیا نے اُسے دیکھا اور کہا۔'' عافیہ مجھے اِن دنوں پر خواب کا سا گمان گزرتا ہے۔ میں تمہیں پسند ہی نہیں چاہنے لگا ہوں۔ پر ڈرتا ہوں تمہارے میرے درمیان زبان اور معاشرت کی اونچی دیواریں حائل ہیں۔ میرے گھر والوں کو تو پنجابی گھرانے میں شادی پر اعتراض نہیں ہے مگر تمہارے گھر والے مجھے اور عطا کو قبول نہیں کریں گے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ تم کسی سے منسوب بھی ہو۔''

لہجے میں یاس گھل گیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جب وہ بولی۔'' منسوب ہونے کی تو ایک تہمت ہی ہے۔ نہ وہ لوگ میری چاہتوں میں کہیں ہیں اور نہ ہی میں اُن کی۔ جیسے کوئی زبردستی گلے مڑھ دیا جائے۔ بس یہاں بھی وہی بات ہے۔ چھوڑیئے ان باتوں کو۔ کھانا کھائیں۔''

اُس نے دیکھا تھا لقمہ ضرور ضیا کے ہاتھ میں تھا مگر اُس نے اسے منہ میں نہیں ڈالا تھا۔

کہنے کو تو اُس نے ضیا سے کہا تھا مگر خود وہ اور سامیہ انہی سوچوں سے نڈھال تھیں۔ سامیہ نے ابھی کل شام ہی کہا تھا۔

'' ہم کیسے لوگ ہیں۔ کہیں زبان، کہیں مسلک، کہیں عقیدے، کہیں معاشرت، کہیں علاقائی حد بندیوں کی زنجیروں میں جکڑے خود کو افضل و اعلیٰ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اچھے انسان کتنے نایاب ہیں؟ بڑے بخت آور ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی کی راہوں پر کہیں ایسے من موہنے لوگ مل جائیں۔ مگر یہ ہماری کتنی بدنصیبی ہو گی کہ جھوٹی اَنا اور دُنیا کی باتوں کے پیچھے اُن سے ناطہ توڑ لیں۔ عافیہ کی بات ہے میں تو عطا کے لیے جوگ لے لوں گی پر کسی دوسرے سے بیاہ نہیں کروں گی۔''

عافیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بولتی بھی کیا؟ سامیہ ٹھیک کہتی تھی انسانوں نے کیسے اپنے آپ کو لسانی گروہوں، ذات پات کے قبیلوں، فضول رواجوں خود ساختہ اصولوں اور رسوم کے تکلیف دہ شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ انسانیت کو کون دیکھتا ہے، مذہب اِن سب کا انکاری ہے مگر اس کی پروا کسے ہے؟ کون دلیر اور جری ہے جو ان کے خلاف آواز اُٹھائے، ان زنجیروں کو کاٹے۔ یہاں تو کچے کانوں والے بھائی اور کمزور دبو قسم کی پردہ نشین صلح جو قسم کی ماں جو رشتہ داروں سے حد درجہ خائف اور اِس پریشانی میں ہمہ وقت مبتلا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے کہ خاندان کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ'' دیکھا نا باپ سر پر نہیں تھا۔ بن باپ کی بیٹیاں ایسے ہی گل کھلاتی ہیں۔''

اب ایسے میں عافیہ ٹھنڈی سانس ہی بھر سکتی تھی۔

پر دل پر کسی کا اختیار نہیں تھا۔ وہ تو اُسے البیلے خواب دکھانے لگا تھا اور وہ تاریک راتوں میں یہ خواب دیکھتی بھی تھی یہ اور بات ہے کہ صبح کی روشنی میں آنکھیں مسلتی تو خواب بھی مسل دیتی۔

سامیہ اس معاملے میں زیادہ جذباتی واقع ہوئی تھی۔ اس شام جب شہناز مریم کے ساتھ بڑے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تھی دونوں غالباً باتیں کرتے کرتے سو گئی تھیں جب عطا نے نیچے سے آواز دی۔ سامیہ نے جنگلے سے جھانک کر دیکھا اور پوچھا۔'' کچھ کام تھا۔''

اُس نے آنکھیں اُوپر اٹھائیں۔ چند لمحے اُسے دیکھتا

رہا۔

پھر بولا۔ ''ہاں چائے کا ایک کپ پینا چاہتا تھا۔ اِس وقت خود بنانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔''

''میں لاتی ہوں۔'' کہتے ہوئے سامیہ چائے بنانے چلی گئی۔

چائے دانی میں چائے ڈال کر اور اُسے ٹی کوزی سے ڈھانپ کر وہ ٹرے خود ہی نیچے لے گئی۔ کپ میں چائے ڈال کر جب اس نے عطا کو دی تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سامیہ کو ہنسی آگئی۔ کچھ جھینپ بھی گئی۔

''چائے لیجیے۔ کپڑوں پر گر جائے گی۔ میرا کیا ہے، مجھے تو فرصت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

عطا اس بات پر ہنس پڑا۔ ''ارے کہاں؟ تمہاری صورت تو سب سے دیکھی جاتی ہے۔'' اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ دو گھونٹ بھرے اور بولا۔ ''سامیہ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم نہ ملیں تو خودکشی کر لوں گا لیکن میری زندگی تمہارے بغیر ایک کربناک المیہ ہو گی۔ یقین کرنا مجھے کبھی کسی لڑکی نے ایسے متاثر نہیں کیا۔''

کپ اس نے تپائی پر رکھ دیا اور خود کھڑے ہو کر سامیہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اس کے انداز میں ایک التجا تھی۔ ایک دُکھ اور ایک کرب تھا۔ ''سامیہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں تم نے میرا ساتھ دینا ہے۔''

سامیہ دونوں ہاتھ چھڑا کر اُوپر بھاگ آئی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مصیبتیں شاید کبھی تنہا نہیں آتیں۔ بہت سے دُکھوں اور پریشانیوں کے لاؤ لشکر بھی اپنے ہمراہ لاتی ہیں۔ جب لڑکیاں ماں کی بیماری سے اُلٹی ہوئی پڑی تھیں عافیہ کی پھوپی اور دونوں لڑکوں کی ہونے والی ساس اچانک ایک دن آ گئی۔ بھاوج کو دیکھنے اسپتال بھی گئی۔ بستر پر دراز جیسے موت کی دہلیز پر کھڑی عورت کی بے کسی و بے بسی دیکھ کر بھی خداخوفی اور رحم کی کوئی علامت چہرے پر نہ اُبھری۔

البتہ اس کی زندگی کو بچانے کی تگ و دو میں پریشان اور بھاگ دوڑ کرنے والے لڑکے لڑکیاں اُس کی نظروں میں کسی خار کی طرح کھٹکے۔ تھوڑی سی زہریلی گوہر افشانی اُس نے گھر میں کی۔ باقی طوفان اپنے گھر جا کر اُٹھایا۔ ہونے والے دامادوں کو نہ صرف مطلع کیا بلکہ پورے مرچ مصالحے کے ساتھ تفصیلات بھی گوش گزار کیں۔ عافیہ کے سسرال بھی اطلاع پہنچ گئی۔

دس دن بعد ضیا ہی ماں کو اسپتال سے لے کر آیا۔

محلے کی چند عورتیں مزاج پُرسی کے لیے آئیں۔ چند ایک بڑی گھاگ، شرپسند، ٹوہ میں رہنے والی سازشی فطرت کی حامل، برسبیل تذکرہ دونوں کرایہ دار لڑکوں کا ذکر چھیڑ بیٹھیں۔ عافیہ نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ بیماری نے اُن کا چہرہ تو پہلے ہی پیلا پھٹک کر رکھا تھا پر اب تو یوں لگتا تھا جیسے رہا سہا خون بھی کشید کر لیا گیا ہو۔

بات تو تھی کہ دونوں کے دفتر کی گاڑی میں ہر روز کوئی نہ کوئی اسپتال جاتا آتا تھا اب محلے کی عورتیں باتیں کیسے نہ کرتیں۔ اُن کے پاس کون سے دوسرے موضوع تھے باتیں کرنے کے۔

دونوں بیٹے اطلاع ملنے کے باوجود دس دن بعد آئے اور جب آئے تو لگا جیسے اگلے پچھلے جنموں کی تلخیوں کا حساب چکانا چاہتے ہوں۔ وہ زبان دراز بھی نہیں تھے۔ نہ بدتمیز تھے۔ اونچا بولنے کی بھی اُنہیں عادت نہیں تھی۔ ماں انگشت بدنداں تھی۔ وہ موت کے منہ سے بچ کر آئی تھی مگر انہیں تو رتی برابر پروا نہیں دکھتی تھی۔ ہاں اگر پروا دکھی تھی کسی بات کی تو وہ بس اتنی سی کہ غیر لڑکے اُن کی جوان بہنوں کو لیے لیے پھرے۔

''ارے ہم مر تو نہیں گئے تھے۔'' ماں نے منہ کھول کر انہیں بتانا چاہا کہ اِس جان لیوا بیماری نے انہیں کیسے پٹخیاں دیں۔ پر وہ تو بات سُننے کے روادار نہ تھے۔ انہیں تو خاندان میں ذلیل و رُسوا ہونے کا غصہ تھا محلے والوں کی فکر تھی وہ کیا کہتے ہوں گے۔

''آپ کو ایک لمحے کے لیے اپنی عزت و ناموس کا خیال نہیں آیا۔ کیسے آپ اور آپ کی بیٹیوں نے اُس کا جنازہ نکال دیا۔ بھائی کے گھر دوسرا رشتہ بھی جا چکی تھیں۔ انہوں نے وہ بھی نہیں کرنا جس کی آپ بات طے کیے بیٹھی ہیں۔''

میں اور سامیہ دونوں باہر بیٹھی یہ سُنتی رہی۔ سامیہ نے وضاحت اور اپنی مدافعت میں بولنے کے لیے اندر جانا چاہا پر میں نے اُسے روک دیا۔ مجھے محسوس ہوا تھا اُن کی سوچیں اُن کی باتیں اُن کی اپنی نہیں کہیں سے گروی لے کر آئے ہیں۔

ہمارا آنسوؤں پر بس تھا۔ سو وہ ہم نے فراخدلی سے بہائے۔ دونوں صرف ایک دن ٹھہرے اور اگلے دن

گاڑیوں پر چڑھ گئے اور جانے سے قبل کرایہ داروں کو الٹی میٹم دے گئے کہ فی الفور گھر خالی ہو جانا چاہیے۔

گھر خالی ہو گیا۔ تینوں بہن بھائی چلے گئے۔

کہانی کا یہ موڑ بڑا اُداس کرنے والا اور المیہ رنگ لیے ہوئے تھا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ عرشے پر ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

"چلیے عافیہ باجی! اب ذرا نیند سے باتیں کرتے ہیں۔ اِس عمر میں یہ بھی نہ کی جائیں تو ساری بشاشت اور تازگی مفقود ہو جاتی ہے۔"

کوئی نو بجے صبح ایدفو پر کروز لنگر انداز ہوا۔ کنارے پر جانے کے لیے راستہ ایک دوسرے کروز میں سے دیا گیا جو آگے کھڑا تھا۔ ایسی ہی شان و شوکت والا۔ جن کی راہداریوں میں کھڑے عملے نے پاس چیک کرنے کے بعد گزارا۔ مصر کی وزارتِ سیاحت نے ہر اہم شہر کے کناروں کو پختہ کر کے ان چھوٹے جہازوں کے کھڑا ہونے کے لیے پختہ جیٹیاں بنا دی تھیں۔ باہر لشکارے مارتے سیاہ لکڑی کے تانگے کھڑے تھے۔ اُونچے اُونچے کرایوں میں کمی بیشی کا عمل زور و شور سے جاری تھا۔ ایدفو اس لحاظ سے بہت شہرت کا حامل ہے کہ اس غیر اہم اور چھوٹے سے شہر نے مصر کے قدیم ترین ٹمپل جو کرنک کے بعد اہم ہے کو محفوظ کر رکھا ہے اور جو "دیوتا ہورس" کے نام سے منسوب ہے۔

کوچ بان نے بیٹھنے کے ساتھ ہی پوچھا۔ "انڈیا انڈیا۔"

"نہیں نہیں۔" ہم سب اس انداز میں چلائے گویا ہماری دکھتی رگ کسی نے دبا دی ہو۔ پاکستان پاکستان۔ ساتھ ہی میں نے پنجابی میں کہا۔ "کمبختو انڈیا کے سوا کچھ اور ہنیں نظر آتا ہے تمہیں۔"

زوردار لہجے میں الحمد اللہ الحمد اللہ کا ورد ہوا۔ کوچ بان محمد تھا۔ پکا مسلمان۔ جس نے پلک جھپکتے میں اپنی مسلمانی کا اظہار کھلے ڈلے انداز میں ہاتھوں کو فضا میں لہرا کر کیا۔ امریکا کو تبرّوں سے نوازا۔ حسنی مبارک کو کوسنوں سے۔ افغانستان اور فلسطین کے لیے دعائے خیر کی۔ اللہ اللہ اسلام اسلام کا بول بالا۔

ایدفو چھوٹا سا شہر جیسے بانہیں کھولو تو ایک ہی کلاوے کے دائروں میں آجائے۔

صبح کے نو بجے تھے پر بازار اپنی پوری رونقوں کے ساتھ سجا ہوا تھا۔ نور سٹول کے پرے تانگے جھولتے تھے تو بازاروں میں دکانوں کے آگے بیٹھے مصری شیشہ (حقہ) پیتے تھے۔

بالائی مصر کا یہ چھوٹا سا غیر اہم شہر اس لحاظ سے مثالی اہمیت کا حامل ہے کہ اس نے 'ہورس' دیوتا کے نام سے منسوب اس ٹمپل کی بہترین انداز میں حفاظت کی ہے۔ یہ 37 میٹر لمبا اس کا فرنٹ 79 میٹر چوڑا اور اس کا دروازہ 36 میٹر اونچا ہے۔ داخلی دروازہ خوبصورت سیاہ سنگِ خارا کے عقابی مجسموں جو ہورس دیوتا کو ظاہر کرتے ہیں سے سجا ہوا ہے۔ یہ ٹمپل پلوٹومی III نے شروع کیا۔ جس کی تعمیر آخری ملکہ قلوپطرہ ہفتم تک جاری رہی۔ اس کے بڑے ہال کی چھ کالموں پر مشتمل تین قطاریں جو عبادتوں کے مختلف نظاروں سے بھری پڑی ہیں آگے جا کر ایک اور ہیپوا سٹائل ہال جس کے دروازے دو ایسے کمروں میں لے جاتے ہیں جہاں عبادت کے لیے تیاری کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہاں سے آگے سیڑھیاں چڑھ کر ٹیرس جس کے آگے عبادت گاہ جو ابھی بھی اسی آن بان سے کھڑی ہے۔

دیواروں کے خوبصورت سین بہت دلچسپ تاریخی حوالوں کے منہ کھولتے ہیں۔ ٹمپل کی تعمیر کی رسومات دیوتا ہورس کے والد کے قاتلوں پر فتح کی کہانیاں ہورس کی پیدائش کے مناظر سب کا دیکھنے سے تعلق تھا۔

ٹمپل میں دو چیزیں نمایاں تھیں۔ اندر داخل ہونے سے قبل Mammisi کا پورشن ہے جس کا مطلب ہے بچے کی پیدائش کی جگہ۔ یہ علامتی طور پر ہورس سے متعلق ہے جہاں اس کی ہر روز پیدائش ہوتی تھی۔ یہ مقدس جگہ خیال کی جاتی ہے شیر خوار بچوں کی ماؤں اور اُن سب عورتوں کے لیے جو بے اولاد ہیں اور بچے کی تمنا رکھتی ہیں۔ کچھ آگے ان کمروں میں کھدی عورتوں کی تصویریں بچوں کو دودھ پلاتی نظر آتی ہیں۔

دو تین اور چار منزلہ عمارات والا شہر۔ ہر شہر کا ایک اپنا کلچر۔ سادہ سے لوگ چغے پہنے ہوئے۔ عورتیں برقعوں میں ملبوس کہیں چہرے ڈھپنے ہوئے اور کہیں ننگے۔ دکانیں آلو پیاز ٹماٹروں اور سیبوں مالٹوں کیلوں سے بجی ہوئیں۔

واپسی پر استقبال بڑا وی آئی پی قسم کا تھا۔ Sterlized تولیوں سے ہاتھوں کی صفائی اور لیمن ڈرنک سے تواضع کا مزہ آیا۔ اور چند لمحوں کے لیے ہم نے

بھی اپنے آپ کو اہم سمجھا۔

میں جب اوپر آئی، نیل کے خوبصورت کناؤ کے مناظر تھے۔ رنگوں کا طلسم تھا۔ کہیں کہیں کوئی ایسی جگہ جہاں دونوں اطراف کے قدرے اونچائی کے سلسلے یہ بتاتے تھے کہ کبھی ان میں زندگی ہوگی۔ ستون دروازے کہیں تنگ سی گلی شاید یہاں کچھ لوگ رہے ہوں۔

تیونس کی لطیفہ خانم جانگیہ پہنے نہار ہی تھی۔ اف اللہ یہ کیسے لوگ ہیں یہ مسلمان عورت جو گزشتہ شب قرآن کی آیات پر بحث کررہی تھی۔

کہیں کہیں بہت دور تا حد نظر افق کے کناروں سے ملتا ہوا سرمئی اور بادامی رنگ آمیز پھیلا ہوا صحرا پرندوں کی اُڑتی قطاریں۔ پانی کی لہروں پر دھیرے دھیرے حرکت کرتا جیسے بہتا کروز۔

میں گھنٹوں بیٹھی ان مناظر سے آنکھوں کو سینکتی رہی۔

جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے چند بلند وبالا خوبصورت عمارات سے مزین ایک منظر سامنے سے اُبھرا۔ نیل نے بھی اپنی سمت کا رخ بدلا۔ کئی کروز جہازوں کی قطاروں کا لمبا چوڑا سلسلہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں کناروں سے بندھی تھیں۔ کنارے پر بازار بھی سجا تھا اور ٹمپل بھی سامنے ہی تھا۔

سورج کی کرنیں راستہ بناتی تھیں۔ ایک چمکتا راستہ پیچھے اور زمینی آگے۔ تین جہازوں سے گزر کر باہر آئے۔ سیڑھیاں چڑھیں تو ایک جانا پہچانا مانوس منظر سامنے آیا۔ ایک مصری زمین پر بیٹھا ناگ اور بین کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

کہیں پس منظر میں دف اور رباب کی آوازیں تھیں۔ ڈوبتی شام کے ساتھ اس اجنبی سرزمین کا یہ منظر کس قدر دل آویز تھا۔

اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ دف کی کھنک دار آواز فضا میں بکھری ہو اور رباب کی سُریلی تانیں کانوں میں رس گھولتی ہوں۔ بلا سے مخالف سمت روشنیوں سے جگمگاتا اور مقامی مصنوعات سے سجا بازار بھی دہائیاں دیتا ہو۔ آپ تو اِدھر اُدھر جا ہی نہیں سکتے۔

کوئی ایک ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا یہ حصہ سجاوٹ اور مقامی کلچر کے رنگوں سے آراستہ اپنی مثال آپ تھا۔ آنکھوں کو لبھاتا اور تحیر کو اجاگر کرتا تھا۔

کرسیوں میزوں سے سجے ریسٹورنٹ جن کی دیواریں دوم کے پھل کی لمبی لٹکتی زنجیروں سے مزین تھیں، اس دوم کی شکل ہمارے ہاں کے دیسی خشک انار جیسی تھی۔ اور یہ مقامی درخت کا پھل تھا۔ چبوترے پر بیٹھے سانولے سلونے سازندے ساز بجاتے تھے۔ شام کے جھٹ پٹے میں اجنبی سرزمین کے اس تاریخی قصبے کی پُرفضا اور تفریحی جگہ پر خاموشی سے بیٹھ کر سازوں سے نکلتی نامانوس سی دھنوں کو سننا کس قدر لطف اندوز تھا۔

مغرب کی ادائیگی جہاں کی وہ بھی کیا خوب جگہ تھی، لوہے کے کھڑے اور بیٹھے راڈوں پر وسیع وعریض مستطیل کمرے جن کی چھتیں رنگین ڈیزائن دار اُونی دریوں سے بنی ہوئیں۔ دیواریں اور فرش سُرخ قالینوں سے سجے ہوئے۔ اطراف میں ڈیڑھ فٹ چوڑے لمبے میٹرس جن کے آگے رکھی چھوٹی تپائیاں جن پر دھرے لمبے پائپوں والے حقے اُن سیاحوں کے منتظر تھے جن کے پرے اوپر ٹمپل دیکھتے تھے۔ رنگوں کی مار دھاڑ ہوئی پڑی تھی یہاں۔ دعا مانگی اور باہر آئی۔ ٹمپل دیکھنے کے لیے دو تین سیڑھی ہی ابھی چڑھی تھی کہ بازار نے آوازدے ڈالی۔

چلو ذرا دل خوش کرآؤں خریدنی تو مجھے دھیلے کی شے نہیں تھی۔ جونہی اس کی حدود میں داخل ہوئی انڈیا انڈیا کا شور ہوا۔ ایک تو کمبخت اس انڈیا نے مارڈالا۔ جدھر دیکھو اسی نام کی آوازیں تعاقب کرتی پھرتی ہیں۔ اور جب میں ایک بک شاپ پر کتابیں دیکھتی تھی دکاندار نے میرے شانوں پر پھیلی خوبصورت کشمیری کڑھت والی اس پشمینے کی چادر کو ہاتھوں سے چھوتے ہوئے بیچنے کی بات کی۔ اس درجہ عجیب اور انوکھی سی بات پر بھوچکی سی ہو کر میں نے اس کی صورت دیکھی۔ وہ جھلاتے ہوئے پھر بولا۔

"یہ کتابیں لے لو۔" اُس نے مصر پر لکھی گئی دو کتابیں میرے ہاتھوں میں تھمائیں اور یہ مجھے دے دو۔

"ارے پاگل ہوگئے ہو۔ تمھیں کیوں دوں۔ ننگی ہونا ہے مجھے کیا۔" میں ہنس دی۔

ساتھ والی دکان سے وہ فوراً ایک چادر لے آیا۔ اب تبادلے پر پھر اصرار ہوا۔ میرے انکار پر قیمت پوچھی گئی۔ بہر حال کوئی آدھ گھنٹے اسی چکر بازی میں گزرا۔ بمشکل جان چھڑائی۔

ٹمپل دیکھنے کے لیے اُوپر چڑھی۔ رات تو تاریک تھی پر روشنیوں کی یلغار نے اس کا خم مار ڈالا تھا۔ کومبو

دراصل اسوان اور ایدفو کے درمیان واقع ہے۔ یہ پاسیق کا قدیم ترین شہر پاسیق دیوتا کا گھر جو دراصل گروکوڈائل دیوتا تھا۔ جس کی فراعنہ مصر کے دور سے قبل پرستش کی جاتی تھی۔ دراصل یہ دو ٹمپلوں پر مشتمل ایک ٹمپل ہے۔ دائیں ہاتھ والا سیق دیوتا جو دراصل دنیا کی تخلیق کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ جبکہ بائیں ہاتھ والا جنگ کا دیوتا عظیم ہورس سے معنون ہے۔ دونوں ٹمپل اس چار دیواری کے اندر واقع ہیں جس کے دروازے دریائے نیل کے پانیوں میں اُترتے ہیں۔ دونوں ٹمپلوں اور ان کے ہیو اسٹائل ہال جن میں دیو ہیکل کالموں کی قطاریں اُن پر کھدی انسانی تصویریں اور ان کے ایکشن سب کہانیاں سناتے تھے۔

میں نے مزے سے یہ سب دیکھا اور سنا۔ مجھے ذرا جلدی نہیں تھی۔

لوگ چلے گئے تھے۔ ایک میں تھی اور دو میرے جیسے اور جنونی تھے۔ بہت دیر بعد جب اُتری تو مجھے کروز کی کچھ نہیں آتی تھی کہ وہ کس نمبر پر کھڑا ہے۔ چلو خیر بھاگ دوڑ سے یہ مسئلہ حل ہوا پھر میرے لیے اسپیشل راستہ لگایا گیا۔ مزے سے میں نے ٹھپ ٹھپ کرتے ہوئے اسے طے کیا۔ ایک میں داخل ہوئی وہاں سے دوسرے میں اور پھر گرینڈ پرنسس پر قدم دھرا۔

رات ہم پھر عرشے پر تھے۔ کہانی پھر شروع ہوئی۔

شاید اب تک کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اپنی ماں کی اتنی دبو قسم کی فطرت سے مجھے نفرت محسوس ہوئی پر یہ صرف چند لمحوں کے محسوسات تھے۔ دراصل ان کی شخصیت اُن کے حالات کی اسیر تھی۔

بچپن ہی میں یتیمی اور یسیری دونوں ذائقوں سے آشنا ہوگئی تھیں۔ تیرے میرے جیسے رشتہ داروں کے ہاں پلنے بڑھنے سے شخصیت میں ڈرنا، سچ بات کا اظہار نہ کرسکنا، اندر ہی اندر اُلجھنا اور کڑھنا جیسی عادات پیدا ہوگئیں۔ بیاہ کے بعد پڑھے لکھے افسر آدمی اور تیز طرار ساس نندوں کی گرفت میں آگئیں۔

گھر تو کوئی بیس دنوں میں خالی ہوگیا۔ پر ہماری بے رنگ سی زندگی میں بہت سے اور رنگوں کا اضافہ ہوگیا۔ یہ رنگ مایوسیوں نا اُمیدیوں اور رسوائیوں کے تھے۔

مایوسی اور نا اُمیدی تو پہلے بھی تھی پر رسوائی کے دھبوں سے جیسے ہماری پیشانی سجائی گئی اس کا تو ہمیں وہم و گمان بھی

جبلیت Innatism

یہ فلسفیانہ نظریہ ہے کہ خیالات و اصول پیدائش کے وقت ہی ذہن میں موجود رہتے ہیں۔ یہ جبلی خیالات یا تو اپنی مکمل شکل میں ہو یا پھر انہیں مکمل ہونے میں تھوڑے سے اضافی تجربے کی ضرورت رہتی ہے۔ ان جبلی خیالات یا اصولوں کو ''دائمیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ ڈیکارٹ اس نظریے کا پیش رو تھا مشہور انگریز فلسفی لاک نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے۔

مرسلہ: نظیر حسین۔ شیخوپورہ

جدہ Jeddah

حجاز کی بندرگاہ آبادی مکہ معظمہ سے مغرب کی جانب 48 میل کے فاصلے پر بحیرۂ قلزم کے کنارے واقع ہے۔ پاک و ہند سے جانے والے حاجی اسی بندرگاہ پر اترتے ہیں۔ ایرانی تاجروں نے حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں اسے آباد کیا تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی سے اس کی تجارتی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ یہ اس وقت مصر اور ہندوستان کے درمیان تجارتی مرکز تھا۔ سعودی حکومت نے یہاں 208 بلین پاؤنڈ کی لاگت سے ایک بڑا ہوائی اڈہ تعمیر کیا ہے جو دنیا میں سب سے بڑی چھت رکھتا ہے۔ جس کا رقبہ 11370 ایکڑ ہے۔

مرسلہ: عائشہ بزنجو۔ راولپنڈی

جپسم Gypsum

ایک قسم کا معدنی مرکب، جس میں ہائیڈریٹ کیلشیم سلفیٹ شامل ہے۔ مصنوعی کھاد بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کیلشیم کے نمک اور پلاسٹر آف پیرس وغیرہ بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سیمنٹ کے کارخانے بھی استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کی بہت بڑی معدنی دولت ہے اور یہاں اس کے معلومہ ذخیرے ایک اندازے کے مطابق تین کروڑ ٹن کے قریب ہیں۔

مرسلہ: نصیر الدین۔ حاصل پور

نہ تھا۔ امی جان تو گم صم ہو گئی تھیں۔ یا اُن کے آنسو تھے یا اُن کی چُپ تھی۔ نہ ہم سے آنسو دیکھے جاتے اور نہ چُپ توڑی جاتی۔ آخر دلاسا دینے کے لیے تھا کیا؟ جھوٹے الفاظ جو ہونٹوں پر آنے سے قبل ہی دم توڑ دیتے۔

”یہ کس قدر اعصاب شکن ..... دن تھے۔ ان کے تصور سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔“ وہ باتیں کرتے کرتے رُک گئی تھیں۔ اُن کا لہجہ بھرّا سا گیا تھا۔

”ایک وجود بستر مرگ پر تھا اور چند دوسرے چلتے پھرتے پرچھائیوں کے عکاس تھے۔ روشنی اور ہوا کے سارے روزن بند تھے۔ پھر ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔ انہونی سی۔ انہوں نے کاغذ قلم مانگا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھیں اور کچھ لکھنے میں مصروف ہوئیں۔“ سامیہ میرے پاس کچن میں آئی۔ اس کی آنکھوں میں مچلتے بہت سے سوالات میں نے پڑھے اور دھیرے سے کہا۔

”اپنے بھائی کے منت طرلے کر رہی ہوں گی کچھ وضاحتیں، کچھ التجائیں، کچھ معافیاں کہ وہ اُن کی بیٹیوں پر رحم کرے اور انہیں قبول کرے۔“ پر تھوڑی دیر بعد مجھے انہوں نے پکارا اور پوچھا۔

”ضیا لوگ جہاں شفٹ ہوئے ہیں کچھ وہاں کا اتا پتا معلوم ہے۔“ میں نے حیرت سے لبریز آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

”میں معلوم کرتی ہوں شاید مریم کے پاس ہو۔“

ایڈریس میرے پاس تھا۔ ضیا کا خط اور ایڈریس دونوں شہناز نے مجھے دیئے تھے۔

”ایک سربند خط انہوں نے مجھے دیا۔ تمہارے گھر سے جانے اور ساتھ میں تمہارے ہی گھر کے کسی بچے کو لے جانے کی بھی تاکید کی۔ اب وہ بچہ تم بن گئیں۔“ ان کا چھوٹا سا قہقہہ فضا میں گونجا۔

ہم دونوں سے حیرت نہیں سنبھالی جا رہی تھی۔ جی چاہا تھا کہ خط کھول کر پڑھوں پر سامیہ نے منع کیا۔ ”اگر ہماری ماں کی بے بسی کا اس میں اظہار ہے تو یہ بھی ہمیں رلائے گی۔ اللہ پر چھوڑو سب باتیں۔“

تو پھر میں نے تمہیں ساتھ لیا اور ضیا سے ملی۔

یوں وہ عورت جس کا حوصلہ اور دل چڑیا کے پوٹے جتنا تھا۔ کیسے شیر جیسے کلیجے کی بن گئی۔ وہ گیلی مٹی تھیں پر اس سارے واقعے نے انہیں اگنیس روک (igneous rock) میں بدل دیا تھا۔

شب کی گہری تاریکی میں جب سارا عالم سوتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتریں ہمارے ساتھ اُس گاڑی میں بیٹھیں جو ضیا نے ملحقہ سڑک پر لاکر کھڑی کی تھی۔ اس کے دوست کے گھر رسم نکاح میں شامل ہوئیں۔ پھر ایک عجیب سی خواہش کی بھی تکمیل کی کہ نکاح نامے پر گواہوں والے خانے میں اپنے دستخط اور یہ تحریر کہ یہ سب میری مرضی سے ہو رہا ہے۔ درج کیا۔ ہماری پیشانیوں پر طویل پیار کیا۔ آنسو جو ہماری آنکھوں سے پرنالوں کی صورت بہتے تھے۔ پونچھے اور گھائل لہجے میں بولیں۔ ”پونچھ ڈالو انہیں میرے لیے۔ بہت سکون سے مرنے دو مجھے۔“

”تو بس دو تین دن ہی زندہ رہیں اور پھر مر گئیں۔ بیٹوں کی کھٹی کھٹی باتیں اور زہریلے تبصرے سُنے بغیر۔ ان کی لعن طعن اور ملامت بھرے بولوں کی کڑواہٹ کو مزید چکھے بغیر۔“

چند لمحوں تک سوگواری کی بوجھل سی فضا میں سانس لینے کے بعد میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہانی کے آخری کردار مریم اور یہ کہ وہ اپنے بھائیوں سے بھی ملتی ہیں یا نہیں کے متعلق جاننا چاہا۔

”پیسے میں بڑی طاقت ہے۔“ وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

”ہمارا خاندان پاکستان کی ٹاپ بزنس کمیونٹی میں شمار ہوتا ہے۔ جن کے تعلقات کا دائرہ بہت اُوپر تک پھیلا ہوا ہے۔ اپنے بارے میں ہم کسی حُسن ظن کا شکار نہیں۔ ایک چھوٹے سے گھر میں حسرت زدہ زندگی تھی ہماری۔ یہ یقیناً اُن دعاؤں کا نتیجہ ہے جو ہماری ماں کے دل سے نکلی تھیں اور جنہوں نے ضیا عطا کو پارس بنا دیا کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو وہ سونے کے ڈلے بن جاتی۔“

”مریم ہماری سب سے چھوٹی دیورانی ہے اور ہماری کسی بھی تقریب میں شرکت کرنا ہمارے رشتہ داروں کے لیے ایک اعزاز اور فخر کی بات ہے۔“

تو یہ اُس کہانی کا انجام تھا جو زمانوں سے میرے اندر مصر کی پُراسرار زمین کی طرح گھمبیر گُپھا ہوئی پڑی تھی۔ جس کے کرداروں کے بارے میں زندگی کی گُھمن گھیریوں میں اُلجھنے کے باوجود خیال آنے پر کچھ جاننے کا تجسس اور اضطراب بے کل رکھتا تھا۔ تو یہ بھید بھیدوں بھری زمین پر کس انداز میں میرے اُوپر کھلا۔ میں حیرت زدہ تھی۔

اولین دریافت

طارق عزیز خان

اس سیارئہ زمین پر بہت دھیرے دھیرے تہذیب نے پیر پھیلائے۔ تمدن کا ارتقاء ہوا۔ لوگوں نے کن دشواریوں کے بعد دیگر جانداروں سے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ایک نئے زاویہ سے منفرد انداز کی تحریر۔

معلومات حاصل کرنے کے شوقینوں کی مدارات

کائنات کی لامتناہیت میں کھویا ہوا کرۂ ارض، ہمارا گھر ہے۔ یہاں ہماری نوعِ حیات نے جنم لیا اور یہی وہ دنیا ہے جہاں سے ہمارے اندر اپنے سیارے اور پھر کائنات کو سمجھنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ ہزاروں سال پہلے ہمارے اجداد کے پاس کرۂ ارض کو سمجھنے کے لیے مہم جوئی سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اُن کے بحری جہاز کمزور اور جہاز رانی کے آلات ابتدائی تھے۔ جن کی مدد سے وہ اپنے لگائے گئے اندازوں کے سہارے ساحلی لکیروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے

جہاں تک جاسکتے تھے گئے۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ بہتر وسائل کی تلاش اور نئی نئی زمینیں دریافت کرنے کے عزم نے انہیں نامعلوم بحر میں سفر کرنے پر اکسایا۔ قدیم نقشہ سازوں، جغرافیہ دانوں اور ریاضی دانوں نے تحقیق کی لگن اور محض اپنے اندازوں کے بل پر کرۂ ارض کی کافی حد تک کامیاب پیمائش کی۔ جس کے بعد بہادر اور پُرعزم مہم جوؤں کو نامعلوم بحر میں سفر کرنے کی تحریص ہوئی۔ آج جدید سائنسی تحقیق کی بدولت کرہ ارض کا بغور مطالعہ کرلیا گیا ہے۔ ہم جدید خلائی تحقیق کی بدولت خلا سے زمین کا نظارہ کرنے، بُراعظموں کے خدوخال دیکھنے اور اس بات کی توثیق کرنے کے قابل ہیں کہ قدیم نقشہ سازوں، جغرافیہ دانوں اور مہم جوؤں کی زمین کو دریافت کرنے کی صلاحیت شاندار طور پر درست تھی۔ اب زمین پر کوئی نئے براعظم یا گمشدہ زمینیں ملنے کی توقع نہیں رہی۔ براعظمی پلیٹوں کے سرکنے کی رفتار پر تحقیق کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ ہم کروڑوں سال پہلے کی زمین کے بارے میں جانتے ہیں بلکہ مستقبل میں کرۂ ارض پر بننے والے نئے براعظمی نقوش کے بارے میں بھی پیش گوئی کرسکتے ہیں۔ لگ بھگ 300 سو ملین سال پہلے کرہ ارض پر صرف ایک عظیم براعظم پانگیا (Pangaea) اور اُس کے چاروں اطراف میں ایک ہی وسیع وعریض سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ 280 ملین سال پہلے پانگیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور قریب ترین اندازہ ہے کہ تقریباً 20 ملین سال پہلے کرہ ارض پر موجود سات براعظم (ایشیا، افریقا، شمالی امریکا، جنوبی امریکا، یورپ، انٹارکٹیکا) اور تین بڑے سمندر (بحرالکاہل، بحراوقیانوس، بحرہند) اُس مقام پر موجود تھے کہ جہاں آج ہم انہیں دیکھتے ہیں۔ براعظمی پلیٹوں کے سرکنے کی رفتار ہمیں یہ بتاتی ہے کہ لگ بھگ 60 ملین (چھ کروڑ) سال بعد زمین پر صرف چار براعظم ہی باقی رہ جائیں گے۔ بحیرہ روم، بحیرہ اسود، خلیج فارس اور بحیرہ احمر کا وجود یکسر ختم ہوجائے گا۔ جس کے بعد یورپ، ایشیا اور افریقا آپس میں مدغم ہوکر ایک براعظم میں تبدیل ہوجائیں گے۔ بحرہند کا رقبہ کم جبکہ نیوگنی اور انڈونیشیائی جزائر کے آسٹریلیا میں مدغم ہونے کے بعد براعظم آسٹریلیا کے رقبہ میں اضافہ ہوجائے گا۔ شمالی و جنوبی امریکا کے مغرب کی طرف کھسکنے کی وجہ سے بحرالکاہل سکڑنے لگے گا اور بحراوقیانوس کی وسعت میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس دوران انٹارکٹیکا کے ساحلوں سے برف کی چادر پگھلنے کے بعد وہاں نئے نئے شہر اور آبادیاں قائم ہوچکی ہوں گی۔

زمین پر سائنس کے مطابق بڑے خطوں کی تشکیل کے بعد تقریباً چالیس لاکھ سال پہلے افریقا میں دو پاؤں پر چلنے والے پہلے انسان کا جنم ہوا۔ مورخین کی رائے میں قریب 60 ہزار سال پہلے افریقی انسان نے بحیرہ احمر کو پار کرکے جزیرہ نما عرب پر قدم رکھا۔ 40 ہزار سال پہلے انسان نے ایشیائے کوچک کے راستے یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا کے راستے انڈونیشیا اور براعظم آسٹریلیا تک رسائی حاصل کی۔ لگ بھگ 35 ہزار سال پہلے مشرقی سائبیریا کے شکاری قبائل جمے ہوئے بحیرہ بیرنگ پر پیدل چلتے ہوئے الاسکا (شمالی امریکا) کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ زمین پر انسانی آبادیاں قائم ہوجانے کے بعد وہاں آئے برفانی ادوار کے دوران میں انسانی تہذیبیں بنتی اور مٹتی رہیں۔ ایک اندازے کے مطابق لگ بھگ 12 ہزار سال قبل از مسیح میں آخری برفانی دور کے خاتمے کے بعد شمالی نصف کرے میں خط سرطان (Tropic of Cancer) کے آس پاس کے خطوں مثلاً ایشیا میں عراق پاکستان اور شام، افریقا میں مصر اور تیونس جبکہ جنوبی یورپ میں یونان، کریٹ اور اٹلی میں موجودہ انسانی تہذیب کی ابتداء ہوئی۔ مورخین ابھی حتمی طور پر یہ طے نہیں کرپائے کہ ان تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب سب سے زیادہ پرانی ہے۔ تاہم مانا جاتا ہے کہ مصر میں تمدن، بابل، نینوا اور اطراف کے تمام علاقوں سے پہلے ظاہر ہوا۔ اسی طرح مصر کی حکومت بھی سبھی حکومتوں سے پہلے قائم ہوئی۔ مصر کے مختلف علاقوں سے ملنے والی قدیم تحریروں کے مطابق وہاں حکمرانی کررہے فراعین کے 30 خاندانوں کی حکومت کا ہونا ثابت ہے۔ ان میں سے سب سے پہلے فرعون کی حکومت کا زمانہ 5 ہزار قبل از مسیح میں جبکہ آخری فرعون کی حکومت 378 سے 340 ق م کے دوران تھی۔ مصر پر 666 ق م سے 525 ق م کے دوران عراق کی اشوری قوم سے تعلق رکھنے والے 26 ویں خاندان کی حکومت قائم تھی۔ یہ حکمران نیچو (Necho) کہلاتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق انسانی تاریخ میں کرۂ ارض کو سب سے پہلے دریافت کرنے کی کوشش مصری فرعون نیچو سوم کے عہد (610 ق م سے 595 ق م) میں کی گئی جب اُس کے بیڑے نے براعظم افریقا کی بحر پیمائی کی۔ اس زمانے میں افریقی باشندے زمین کو چپٹا یا اسپاٹ مانتے تھے۔ اُن کی دلچسپی کا محور و مرکز افریقا تھا۔ ان کے خیال میں کرہ ارض پر واقع افریقا سب سے بڑا اور واحد براعظم تھا۔ وہ

نہیں جانتے تھے کہ بحیرہ روم کے شمال (یورپ) اور مشرق (ایشیا) میں واقع دنیائیں کتنی وسیع تھیں؟ نیچو سوم نے 610 قبل مسیح میں ایک مضبوط بیڑے کی تیاری کا حکم دیا۔ لگ بھگ چھ سے سات سالوں کی تیاری کے بعد چپوؤں کی مدد سے چلنے والی چار درجن کے قریب کشتیاں تیار کی گئیں۔ یہ کشتیاں اوپر سے کھلی تھیں اور ان میں سے ہر ایک میں قریب 15 سے 18 ملاحوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

آج ہمارے پاس نیچو کے بیڑے سے متعلق کوئی مستند تاریخی تصویر موجود نہیں ہے، تاہم قدیم مصریوں کی جہاز رانی میں مہارت کا اندازہ 1954ء میں دریائے نیل کے مغربی کنارے پر واقع خوفو (Khufu) کے اہرام سے ملنے والے ایک قدیمی کشتی کے ڈھانچے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ چپوؤں کی مدد سے چلنے والی یہ کشتی لگ بھگ 2600 ق م میں تیار کی گئی اس کشتی کی لمبائی 125 فٹ اور چوڑائی 30 فٹ ہے۔ کشتی کی بناوٹ میں نرسل (Papyrus)، سرکنڈوں اور اونٹ کی کھال کا استعمال کیا گیا ہے۔ مصر میں کشتی بنانے کا فن زمانہ قبل از تاریخ سے بھی بہت پہلے موجود تھا۔ مصر میں ملنے والی غیر معلوم وقت کی قدیم تصاویر میں کشتی بھی دکھائی دیتی ہے۔ مصر میں درختوں کی کمی کی وجہ سے کشتی بنانے کے لیے لکڑی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ شام و فلسطین کے علاقے تھے۔ اس زمانے میں فراعین مصر اپنے مفتوحہ علاقوں سے جو خراج وصول کرتے تھے ان میں مضبوط اور قیمتی لکڑی نمایاں تھی۔ مصری لوگ اپنی کشتیاں شاندار اور بہت خوبصورت بناتے تھے۔

لگ بھگ 50 کے قریب کشتیاں تیار ہو جانے کے بعد ان پر سوار 500 رکنی عملے نے 600 ق م میں خلیج سویز کے کنارے سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ مصری بیڑہ، خلیج سویز اور بحیرہ احمر (Red Sea) کو پار کر کے خلیج عدن میں سے ہوتا ہوا، بحر ہند میں داخل ہوا۔ افریقا کی مشرقی ساحلی لکیر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے ان کی کشتیاں، راس اُمید (Cape Of Good Hope) کے گرد گھوم کر جنوبی بحر اوقیانوس میں داخل ہوئیں۔ مغربی افریقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف آگے بڑھتے ہوئے وہ لوگ، خط استواء پار کر کے شمالی بحر اوقیانوس میں پہنچے۔ انہوں نے افریقا کی مغربی گولائی کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ مصری بیڑے نے آبنائے جبل الطارق (Strait of Gibraltar) کے راستے بحیرہ روم (Mediterranean Sea) تک رسائی حاصل کر لی۔

بحیرہ روم میں شمالی افریقا کی ساحلی پٹی کے ساتھ مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے۔ وہ لوگ 597 ق م میں واپس مصر پہنچ گئے۔ تقریباً تین سال پر محیط اس داستانی سفر کے دوران مصری بیڑے نے افریقی براعظم کے گرد پہلا کامیاب چکر پورا کیا۔ انہوں نے اس سفر کے دوران لگ بھگ 29 ہزار کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کیا۔ انہوں نے مصر لے جانے کے لیے نایاب اشیاء جمع کیں۔ افریقی براعظم کے گرد پہلا کامیاب چکر پورا کرنے کی وجہ سے فرعون مصر نیچو کو دریافتوں کے سفر کی بنیاد رکھنے والا پہلا غیر متنازعہ مہم جو، مانا جاتا ہے۔ اس اوّلین دریافت کے بعد سو سال بعد افریقا ہی کی چھان

منافق

وہ لوگ جو ظاہر میں دوست اور باطن میں دشمن ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینے پہنچے تو جہاں انصار نے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا وہاں بعض لوگوں نے در پردہ آپ کی مخالفت بھی شروع کر دی۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی تھا جس کی سرداری آپ کی تشریف آوری سے کم ہو گئی تھی۔ یہ لوگ بظاہر مسلمانوں کے ہمدرد تھے، نماز بھی پڑھتے اور زکوۃ بھی دیتے تھے لیکن ان کے دلوں میں بغض تھا۔ فرائض میں سستی کرنے کے علاوہ جنگ کے موقع پر بددلی پھیلاتے اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جنگ احد کے شروع ہونے سے پہلے ہی عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ غزوۂ خندق اور تبوک کے موقع پر بھی کچھ ایسی ہی حرکتیں کیں۔ مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک غیر شریفانہ تھا۔ غرض ان لوگوں کی اسی قسم کے حرکات پر خدا نے وحی کے ذریعے مسلمانوں کو ہوشیار کر دیا۔ اب انہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ایک مسجد ضرار بنائی۔ جس کا علم بھی حضور کو وحی کے ذریعے ہو گیا چنانچہ وہ مسجد مسمار کر دی گئی۔ قرآن میں ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم بتایا گیا ہے۔

مرسلہ: ذیشان اصغر نقوی۔ سیالکوٹ

بین کے لیے ایک اور مہم ترتیب دی گئی۔ جس کا پس منظر کچھ یوں ہے۔

لگ بھگ 900 ق م میں بحیرہ روم کے مشرقی ساحلی علاقوں (مغربی شام اور لبنان) کی کم چوڑی پٹی پر مشتمل فونیشیائی سلطنت (Kingdom of Phoenicia) قائم تھی۔ بحیرہ روم کے جنوب میں افریقا کی شمالی ساحلی پٹی پر مشرق میں الجزائر سے لے کر مغرب میں کوہ اٹلس (شمالی مراکش) تک واقع چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں اور شہر اسی فونیشیائی سلطنت کے زیرِ اثر ایک خود مختار وسیع وفاق (Federation) کا حصہ تھے۔ یونان کی شہری ریاستوں کی طرح ان افریقی شہروں میں بھی ایک رنگ، نسل اور زبان بولنے والوں کی اکثریت تھی، تاہم یہ شہر کبھی بھی ایک متحد ریاست کے طور پر قائم نہیں رہے۔ لگ بھگ 800 ق م کے زمانے میں موجودہ تیونس کے دارالحکومت کے مقام پر کارتھیج (Carthage) اور اسپین کی مشرقی ساحلی پٹی پر نیو کارتھیج (New Carthage) نام سے ایک دوسرے کی اتحادی دو فونیشیائی ریاستوں کے وجود سے متعلق ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ اٹلی اور یونان کی شہری ریاستیں اور جزائر ان فونیشیائی ریاستوں کے فطری حریف اور بحیرہ روم کی دنیا ان کی تجارتی اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ ایک اندازے کے مطابق تیونس کے فونیشیائی حکمرانوں نے اپنے بحری جہازوں کو محفوظ اور لمبے سفر کے قابل بنانے کے لیے نت نئے تجربات کیے۔ ان کے کاریگروں نے کھلے سمندر میں چل رہی تجارتی ہواؤں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی کشتیوں پر بادبان لگائے اور سامانِ تجارت کو محفوظ رکھنے کے لیے لکڑی کے مضبوط کیبن اور تہہ خانے تیار کیے۔ بحیرہ روم میں چلنے والے یہ بادبانی بحری جہاز گالے (Galley) کہلاتے تھے۔ ایک منزل پر مشتمل ان بحری جہازوں کی لمبائی 80 فٹ اور چوڑائی 35 فٹ تک تھی۔ بحری جہاز کے درمیان میں چوڑائی کے رخ پر ایک بادبان لگانے کی گنجائش تھی جبکہ اس کی دونوں اطراف ایک قطار میں بیٹھے 20 کے قریب ملاح چپو چلانے کا کام کرتے تھے۔ عام طور پر ایک بحری جہاز کو رواں دواں رکھنے کے لیے کم از کم تین درجن ملاحوں کی ضرورت پڑتی تھی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق لگ بھگ 500 قبل از مسیح میں کارتھیج ایک طاقتور اور امیر ریاست کے طور پر قائم تھی۔ اس زمانے میں مراکش کے کوہ اٹلس میں ملنے والی چاندی اور سیسہ خشکی کے راستے اونٹوں کے ذریعہ اور سمندری راستے سے کشتیوں کے ذریعہ تیونس میں واقع کارتھیج کی بندرگاہ تک لایا جاتا اور پھر یہاں سے یونان، اٹلی اور بحیرہ روم کے جزیروں مالٹا (Malta)، سسلی (Cicily) اور سارڈینا (Caridina) برامد کردیا جاتا تھا۔ کارتھیج کے حکمران کی کوشش تھی کہ وہ اپنی حریف ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ افریقی ساحلوں پر کنٹرول حاصل کرکے وہاں ملنے والے ہر قسم کے خام مال پر اپنی اجارہ داری قائم کرلیں۔ کارتھیجی حکام جانتے تھے کہ افریقی براعظم کے اندرونی حصے میں واقع وسیع و عریض صحرائے اعظم میں سوائے ریت اور ویرانی کے کچھ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی اُن کی دلچسپی کا مرکز افریقا کی سرسبز ساحلی لکیریں اور دریائی دہانے تھے۔ یہی وہ پس منظر تھا کہ جس میں کارتھیج (موجودہ تیونس) کی بحریہ سے تعلق رکھنے والے ملاح ہنو (Hanno the Navigator) نے افریقا کی مغربی ساحلی گولائی کو دریافت کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک اندازے کے مطابق شمالی تیونس میں 505 ق م کے آس پاس ہنو کی پیدائش ہوئی۔ اس کے بچپن اور ابتدائی دور کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

البتہ یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ نوجوانی میں ہنو کا شمار کارتھیج کی بحریہ میں شامل ایک لائق فوجی افسر کے طور پر ہوتا تھا۔ 480 ق م میں کارتھیج کے حکمران نے 60 گالے جہازوں اور ان پر سوار 1500 سے زیادہ فونیشیائی ملاحوں کے ساتھ ہنو کو افریقا کی مغربی ساحلی پٹی کی دریافت کا حکم دیا۔ ہنو کے بیڑے نے کارتھیج (تیونس) سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اُن کے بحری جہاز الجیریا کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مغرب کی طرف بڑھے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر رکتے ہوئے اگلے دو ماہ کے دوران تقریباً 1600 کلومیٹر کا سفر طے کیا اور آبنائے جبل الطارق میں سے ہوکر شمالی بحر اوقیانوس میں داخل ہوگئے۔ ہنو نے چند ہفتے شمالی مراکش میں گزارنے کے بعد اپنے سفر کے دوسرے مرحلے کا آغاز کیا۔

اس نے اگلے دو ماہ کے دوران مراکش کی ساحلی پٹی پر سات ایسی جگہوں کا انتخاب کیا جہاں نئے شہر بسائے جانے تھے۔ بعض مؤرخین کے مطابق ہنو نے اپنے عملے میں شامل سو سے زیادہ ملاحوں کو بعض منتخب مقامات پر اتارا اور انہیں وہاں نئی آبادیاں قائم کرنے کا حکم دیا۔ اگلے چھ ماہ کے دوران ہنو نے مغربی صحارا، موریطانیہ، سینی گال اور گیمبیا کے ساحلی علاقوں کو دریافت کیا۔ اس نے چند ایک مقامات پر قیام کیا اور درجنوں

مقامی ماہی گیروں کو بطور راہنما اپنے ساتھ لے لیا۔

تیونس سے روانہ ہونے کے لگ بھگ ایک سال بعد ہنو نے خط استواء سے 12 ڈگری شمال اور 16 ڈگری مغرب کے خط پر گنی بساؤ کے ساحلوں سے متصل جزائر کے ایک سلسلے بیجاگوس (Bijagos Archipelago) کو دریافت کیا۔

گنی بساؤ کے زیرِانتظام 15 بڑے اور درجنوں چھوٹے سرسبز ان جزائر کا کل رقبہ 1500 سو مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی 10 ہزار کے قریب ہے۔ ہنو نے گنی بساؤ کے مقامی باشندوں سے منوں کے حساب سے مونگ پھلی کا لین دین کرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا۔ اندازہ ہے کہ اگلے ایک سے ڈیڑھ ماہ کے سفر کے بعد ہنو نے خط استواء سے 4.21 ڈگری شمال اور 7.36 ڈگری مغرب پر موجودہ لائبیریا کے جنوب میں واقع راس پالماس کی براعظمی نوک کو دریافت کیا۔ ہنو نے پایا کہ اس مقام پر افریقا کی مغربی ساحلی لکیر کا رخ بجائے جنوب کے مشرق کی طرف ہورہا تھا۔

بعض ذرائع کے مطابق فونیشیائی جہازوں کا عملہ مہم کو مزید جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھا، تاہم ہنو نے انہیں سفر کرنے پر قائل کرلیا۔ اس نے اپنے سفر کے آخری مرحلے کے دوران میں مغربی افریقا کے جنوبی ساحلوں پر مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے آئیوری کوسٹ، گھانا، ٹوگو، بے نن اور نائیجیریا کی ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔ اندازہ ہے کہ 478 قبل از مسیح میں ہنو کے بحری جہاز خلیج گنی (Guinea) کو پار کرکے کیمرون کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے۔ کیمرون میں دریائے ساناگا (Sanaga) کے دہانے اور اس سے متصل جزائر پر ہنو نے دو پاؤں پر چلنے والی حیرت انگیز جنگلی مخلوق کو قریب سے دیکھا۔ اوسطاً پانچ فٹ قد اور ڈیڑھ سو کلو وزنی ان سیاہ فام جنگلیوں کے جسم، کالے سیاہ روئیں دار بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کے سر بڑے، ناک چوڑی، ہاتھ لمبے اور ہاتھ پاؤں کے پنجے بڑے بڑے تھے۔ ہنو کے پوچھنے پر اس کے راہنماؤں نے ان جنگلیوں کو گوریلا (Gorilla) کہہ کر مخاطب کیا۔ ہنو کے سپاہیوں نے درجنوں گوریلوں کا شکار کیا۔ انہوں نے کارتھیج کے حکمران کے لیے تین مادہ گوریلوں کو مضبوط رسوں سے باندھ کر قید کرلیا اور چند ایک نر گوریلوں کی کھالیں اتار کر محفوظ کرلیں۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران ہنو نے کیمرون کے جنوب میں عین خط استواء پر واقع استوائی گنی کو دریافت کیا۔ اس مقام پر افریقا کی جنوبی ساحلی لکیر کا رخ مشرق کی بجائے جنوب کی جانب ہو رہا تھا۔ ہنو نے محسوس کیا کہ ابھی وہ افریقی براعظم کے انتہائی جنوبی سرے سے بہت دور تھا۔ وہ افریقا کے جنوب تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا، تاہم اب کی بار جہازوں کے عملے نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ ہنو نے اپنے ساتھیوں کی بات مان لی اور تیونس واپسی کے سفر کا آغاز کیا۔ ان کے بحری جہاز شمالی بحر اوقیانوس سے ہوتے ہوئے آبنائے جبل الطارق کے راستے بحیرہ روم میں داخل ہوئے اور 477 قبل از مسیح کے آخر میں بالآخر تیونس واپس پہنچ گئے۔ وطن واپس پہنچ کر ہنو نے کارتھیج کے حکمران سے ملاقات کی اور اسے اپنی دریافتوں کے بارے میں بتایا۔

اندازہ ہے کہ ہنو سے ملنے والی معلومات کی بنیاد پر کارتھیج کے بادشاہ نے مراکش، سینی گال اور کیمرون میں اپنی عملداری میں لینے کے لیے وہاں پے درپے کئی مہمات روانہ کیں۔ ہنو نے اپنی باقی زندگی میں اور کن کن مہمات میں حصہ لیا۔ اس بارے میں مستند معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ اندازہ ہے کہ 420 قبل از مسیح کے آس پاس ہنو کا بحیرہ روم کے کسی جزیرے پر انتقال ہوگیا تھا۔

ہنو کی مہمات سے متعلق ابتدائی مضامین پہلی صدی عیسوی کے دوران میں یونان میں منظر عام پر آئے۔ آنے والی صدیوں میں یونانی اطالوی اور انگریز مورخین نے ہنو کی مہمات کا ذکر کیا۔ دور حاضر میں ہنو کی افریقی ساحلوں پر مہمات کے بارے میں سب سے بہتر معلومات برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے تحت 1979ء میں شائع ہونے والی کتاب The Cambridge History of Africa اور مشہور آرٹش مورخ ڈونالڈ ہارڈن بینجمن (Donald Harden Benjamin) کی 1962ء میں شائع ہونے والی کتاب The Phoenicians میں شامل مضامین میں ملتی ہیں۔ مورخین کے مطابق ہنو کی افریقا میں مہم کا دورانیہ تقریباً ساڑھے تین سال کے قریب تھا۔ اس مہم کے دوران میں اُس نے لگ بھگ 20 ہزار کلومیٹر کا سفر کیا اور افریقا کی 8 ہزار کلومیٹر طویل ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔ ہنو نے مراکش کے ساحلوں پر چند نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ لائبیریا میں راس پالماس کی دریافت کے علاوہ اس نے کیمرون کے ساحل پر واقع ماؤنٹ کیمرون (بلندی 4095 میٹر) کا نظارہ کیا۔ وہ پہلا مہذب انسان تھا جس نے کیمرون کے ساحلوں پر استوائی جنگلوں میں رہنے والے وحشی گوریلوں کو قریب سے دیکھا۔

سراب

راوی : شہباز ملک

قسط : 108

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ھمیں دیکھو، مسخر کرو اور ھمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذھن ودل کو بھٹکاتا ھے، جذبوں کو مھمیز دیتا ھے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ھے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ھے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نھیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رھی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ھوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرونگی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرونگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرونگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر۔ آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ''شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔'' ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ''کنور ہوشیار'' سادی کو لے کر چیمبر...... '' مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا ''پاپا'' تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کررکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا.... ہم چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیلی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کردیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے

گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد کیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ”اعلانِ جنگ“ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا کبھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے مریک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ... ساشا ملی جو کیرٹ کی بیٹی تھی۔ کیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑک کے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی، ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایرٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شامین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شامین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شامین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔

اب آگے پڑھیں

میں سب کچھ دیکھ رہا تھا محسوس کر رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی قوت نہیں تھی کہ اٹھ سکتا۔ ہاتھ اور پیر سلامت تھے لیکن ذہن منجمد تھا۔ اس لیے صرف آنکھیں دائیں بائیں گھما سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوت موجود تھی۔ اس لیے سوچ بھی رہا تھا۔ غور بھی کر رہا تھا۔ گیس کا اثر تو کب کا ختم ہو چکا تھا تبھی تو میں نے شامین کو واصلِ جہنم کیا تھا مگر اب اس نئی افتاد نے مجھے چکرا دیا تھا۔ یعنی ہر بات کا ادراک تو ہو رہا تھا لیکن کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ ملک الموت کی صورت میں باسو سر پر کھڑا تھا۔

”اس کا کیا کریں۔“ باسو کی دہاڑتی آواز سنائی دی تو میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایسی ہی نظروں سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کے حکم کے بغیر اسی طرح بت بنا کھڑا رہے گا اور میرا خون خشک ہوتا رہے گا۔ تبھی بپ کی آواز ابھری۔ یہ آواز میری داہنی جانب سے آئی تھی۔ میں اگر چاہتا تو گردن موڑ کر ادھر دیکھ سکتا تھا لیکن اسی طرح پڑا رہا۔ ویسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کسی طاقتور وائرلیس سیٹ پر کسی نے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کون ہو سکتا ہے میں نے اپنے ذہن سے پوچھا جو جواب دینے سے قاصر تھا۔ عین اسی وقت باہر سے پھر فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ میری نظر ڈیوڈ شا کی طرف گھوم گئی تھیں۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز اور سخت لہجے میں کہا ”اسے شوٹ کر کے جلدی آؤ، ہمیں نکلنا ہے۔“ پھر وہ زینی اور آئی زور کے

ساتھ سامنے والے کمرے کے کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔

میں نے نظریں موڑ کر باسو کی طرف دیکھا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں پستول تھا اور اس نے میرے سینے کا نشانہ لے رکھا تھا مگر اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ تھی۔ جیسے وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے کئی موقعوں پر میری جان بچائی تھی۔ میری بھرپور مدد کی تھی۔ میری نظروں میں وہ منظر آ گیا جب موت نے مجھے اپنی حصار میں لے لیا تھا۔ میں مرشد کی خانقاہ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اور تب باسو ہی تھا جس نے مجھے موت کے جبڑے سے کھینچ لیا تھا۔ ایک دو اور موقعوں پر بھی اس نے میری جان بچائی تھی اور آج وہ جان لینے کے درپے تھا۔ یقیناً اسے بھی یاد ہوگا کہ یہاں آتے ہوئے وہ ایک کھائی میں گر رہا تھا۔ اگر میں مدد نہ کرتا تو وہ گہری کھائی میں گر کر مر چکا ہوتا۔ شاید انہی باتوں نے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ پہلے اس نے میری جان بچائی پھر میں نے اس کی جان بچائی اور اب وہ میری جان لینا چاہتا تھا۔ گویا حساب بے باق ہونے کے بعد نیا کھاتا کھول رہا تھا۔ ایک لمحے میں میں نے کیا کیا سوچ لیا۔ اب تمام سوچ ہمیشہ کے لیے خاموش ہونے والی تھیں۔ اس کی ہچکچاہٹ دم توڑنے والی تھی۔ اس لیے کہ وہ تو مشینی انداز میں کام کرنے کا عادی تھا۔ ڈیوڈ شا نے جو حکم دیا تھا وہ اسے پورا کرنا ہی تھا۔ میں مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں اس کی انگلیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ٹریگر پر انگلیوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ مگر بہت آہستہ آہستہ جو اس کی اندرونی کیفیت کا غماز تھا۔ یعنی وہ ہاں اور نہیں کے درمیان جھول رہا تھا۔ تبھی داہنی جانب جو سلوپ تھا اس پر آہٹ ہوئی جیسے کوئی تیزی سے اوپر آ رہا ہو۔ آہٹ پاتے ہی باسو بھڑک اٹھا۔ اس نے پھرتی سے پستول کی نال کا رخ موڑا اور اوپر آ رہے بندے پر فائر جھونک مارا۔ سماعت شکن دھماکے نے کانوں کے پردے کو جھنجھنا دیا۔ اوپر آنے والا ہوشیار تھا۔ جس تیزی سے اوپر آ رہا تھا اسی تیزی سے نیچے کی طرف پلٹ گیا تھا۔ باسو بلی کی طرح پیر دبا کر ادھر بڑھا تھا کہ سلوپ سے رائفل کی نال ابھری اور پھر برسٹ چلا۔ آٹومیٹک رائفل کی نال سے نکلنے والی گولیوں نے میری پشت... کی دیوار کو ادھیڑ دیا۔ باسو اگر ہوشیار نہ ہوتا تو گولیاں اس کو چھلنی کر دیتیں۔ اس نے بھاری بدن کو کمال پھرتی سے موڑا تھا اور دوسرا فائر اسی جانب کیا تھا۔ گولیاں چلاتے ہی اس نے اس کمرے کی جانب دوڑ لگا دی تھی جس میں ڈیوڈ شا اور زینی آئی زور کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ ابھی وہ دروازے پر بھی پہنچا نہ تھا کہ سلوپ سے پھر نال ابھری اور دوسرا برسٹ چلا۔ باسو ہوشیار تھا۔ اس نے چھلانگ لگا دی۔ دروازے کو پار کرتا ہوا اندر غائب ہو گیا تھا۔ اسے راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر میں نے چیخ کر کہا ''فائر مت کرو۔''

سلوپ پر دبکا شخص تھم گیا۔ اس نے میرے حکم کی بجا آوری کی تھی۔ دوسرا فائر نہیں کیا تھا۔ مگر میں ابھی بھی مخمصے میں تھا۔ آنے والا کون ہے؟ کس پارٹی کا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ دوست ہے یا دشمن ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس پارٹی کا ہو جسے ڈیوڈ شا نے بلوایا ہے اور وہ باسو کو پہچانتا نہ ہو۔ میری آواز میں کنفیڈنس تھا جس کو محسوس کر کے اس نے فائرنگ روک دی تھی۔ وہ جو بھی تھا اپنی جگہ دبکا ہوا تھا۔ باہر نہیں آیا تھا۔ ادھر سے میں نے توجہ ہٹائی تو باہر کی آوازوں نے متوجہ کر لیا۔ باہر سے متواتر فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھمسان کا رن پڑا ہے۔ طرح طرح کے اسلحے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میرے وہ ساتھی جو اب تک میرے شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔ جن میں ایرٹ، رینیک، ایز ارٹ، شاٹ، ایمار مارٹ، رائٹون شامل تھے، ان سے مطلق امید نہ تھی کہ وہ ان میں سے کوئی ایک ہتھیار بھی چلا سکتے کیونکہ زیادہ تر آواز آٹومیٹک ہتھیاروں کی تھی۔ ان سب کے لیے یہ ہتھیار عجوبہ سے کم نہ تھے۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ جب میں سرنگ میں تھا اور خفیہ راستہ تلاش کر رہا تھا تو سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے میں نے اپنی رائفل روبیر کو تھمانی چاہی تھی۔ وہ رائفل کو دیکھ کر ایسے ڈر گئی تھی جیسے وہ گن نہ ہو پھنکارتا سانپ ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہلکے ہاتھوں سے اٹھانا چاہا تھا کہ وزنی گن کی وجہ سے لڑکھڑا گئی تھی۔ اس نے رائفل کو بھی تیر جیسا ہلکا سمجھا ہو۔ جنہوں نے خواب و خیال میں بھی ایسا اسلحہ نہ دیکھا ہو ان کے لیے تو عجوبہ ہوا ناں۔ وہ ایسے ہتھیار کیسے چلا سکتے تھے۔

فائرنگ کی آوازیں بتا رہی تھیں اسے چلانے والے ماہر گنر ہیں۔ اس کا استعمال جانتے ہیں۔ لیکن یہ ہیں کون اس کا اندازہ میں لگا نہیں پا رہا تھا۔ سلوپ پر دبکا شخص بھی ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ اسے مخاطب کروں یا نہیں۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ عقب میں دھمک سنائی دی۔ جیسے کوئی اونچی جگہ سے کودا ہو۔ میں نے گردن کو موڑا۔ اتنی دیر میں دوا کا اثر شاید کم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ

گردن کچھ حد تک میں نے موڑی تھی۔ گردن مڑتے ہی میں نے کودنے والے کو دیکھ لیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس کی دو وجہ تھی۔ ایک تو کودنے والا وجود اور دوسرے یہ کہ یہ معبد ہے یا عجائب خانہ۔ عقبی دیوار کے اوپری حصے میں ایک بڑا سا روشندان کھل گیا تھا۔ کودنے والا اسی کے ذریعہ اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تیر اور کمان تھا۔ ان حالات میں تیر کمان بچوں کے کھلونے جیسی اہمیت رکھتا تھا۔ مگر مقامی لوگوں کے لیے یہی سب سے خطرناک ہتھیار تھا اسی لیے وہ اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ترکش کو پیٹھ پر باندھ رکھا تھا جب کہ کمان ہاتھ میں تھی۔ اس نے کودنے کے ساتھ عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جہاں کودا تھا وہیں دبک گیا تھا۔ سر بالکل زمین سے متصل کرلیا تھا۔ گو کہ آتشی اسلحے مقامیوں کے لیے بالکل نئی چیز تھی مگر اس کی ہلاکت خیزی دیکھ کر انہوں نے بچنے کا طریقہ وضع کرلیا تھا۔ نیچے جھک جاتے تھے تاکہ گولیاں اوپر سے گزر جائیں۔ اسی لیے وہ سر زمین پر رکھے ہوئے تھا۔ ادھر سلوپ پر بھی اب تک خاموشی تھی۔ جس نے فائر کیا تھا وہ بھی خاموش تھا۔ شاید اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ کودنے والے کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ جب کافی دیر تک ادھر سے کسی قسم کی آہٹ سنائی نہ دی تو میں نے آواز دی ''ادھر کون ہے؟ باہر آئیے۔ ہم دوست ہیں۔''

میں سلوپ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ادھر ہنوز خاموشی تھی۔ تبھی کودنے والے نے سوال کیا'' آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

میں نے گردن کو مزید موڑ لیا۔ اب وہ میری نگاہوں کے دائرے میں تھا۔ اس کے لباس سے میں دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ ایرٹ ہے مگر وہ روبیر تھی۔ مردانہ لباس میں ملبوس۔ میں نے سلوپ کی طرف دیکھتے ہوئے روبیر کو جواب دیا۔'' ہاں میں ٹھیک ہوں۔ زمین پر لیٹے لیٹے میری طرف بڑھو۔''

میں نے جواب دیتے ہوئے گردن موڑ لی تھی۔ اب میری نظریں سلوپ پر ٹھہری گئی تھیں۔ ایسا اس لیے کیا تھا کہ اگر سلوپ پر دبکا بندہ حرکت کرے تو میں فوراً دیکھ لوں مگر ادھر خاموشی تھی جیسے کوئی ہے ہی نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بندہ بہت چالاک ہے۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے روبیر کا جائزہ لیا۔ وہ کھسکتی ہوئی میرے بالکل قریب آگئی تھی۔

''تمہیں یہ راستہ کیسے ملا؟'' میں نے روبیر سے پوچھا۔

''آپ نے جو راستہ استعمال کیا تھا وہ آپ کے جاتے ہی بند ہوگیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی تھی مگر کھلا نہیں تھا۔ تب میں نئے راستے کی تلاش میں لگ گئی۔ یہاں خفیہ راستوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بس انہیں تلاش کرنے والا کوئی ہو۔''

''پھر تمہیں یہ راستہ کیسے ملا؟'' میں نے اکتا کر پوچھا۔

''میں وہاں سے نکل گئی تھی۔ باہر آنے کے بعد ایک دوسری خفیہ سیڑھیوں کا رخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ ان خفیہ سیڑھیوں کے بعد کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور ہوگا۔ اسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ پھیر رہی تھی کہ ایک چوکور ٹکڑا نظر آیا اور میں نے اسے دبایا تو یہ روشندان کھل گیا اور میں اندر کود گئی۔''

''اور اگر اس وقت دشمن وہاں موجود ہوتے تو کیا ہوتا۔ ایسی اندھی چھلانگ کبھی نہیں لگانا چاہیے۔'' میں نے سرزنشی انداز میں کہا۔

''میں نے آپ کو دیکھ لیا تھا اسی لیے خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ مجھے معلوم تھا کہ جب آپ ہیں تو کوئی خطرہ مجھے چھو نہیں سکتا۔'' اس نے جذبات سے بھرپور انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے دل کی آواز کو زبان دے رہی ہے۔

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اس لیے کہ اس جیسی کئی پاگل لڑکیوں سے میں پہلے بھی مل چکا ہوں۔ اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی جانب سے توجہ ہٹا کر سلوپ کی جانب بڑھا۔ کرولنگ کرتے ہوئے میں سلوپ کے منڈیر کی طرف طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اب تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ فرشتۂ رحمت بن کر آنے والا کون ہے۔ اس نے مجھے باسو سے کیوں بچایا۔ یہ کام انجانے میں اس سے سرزد ہوا یا وہ مجھے جانتا ہے۔ دوست ہے یا دشمن۔ مگر یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ مقامی نہیں ہے اس لیے کہ مقامی ہوتا تو میرے الفاظ اس کے لیے بے معنی ہوتے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ زبان کا مسئلہ آڑے آجاتا۔ یہ تو برف والے کا کرشمہ تھا کہ میں مقامی زبان سمجھ لیتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ کسی درمیانی بندے کے بغیر اپنی بات کسی کو سمجھا ہی نہیں سکتا تھا' پھر اس بندے نے میری بات کیسے سمجھ لی۔ یقیناً وہ مقامی نہیں ہے۔ اگر مقامی نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اگر باہر سے کوئی

پارٹی آئی ہے تو وہ کس ملک کی ہے؟ ہماری دنیا میں دو طاقتیں مسلسل ٹکرا رہی ہیں۔ یہ دو عالمی طاقتیں ایک دوسرے کی جاسوسی بھی کرتی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈیوڈ شا نے کسی بڑے ملک سے معاہدہ کرلیا کہ وہ آکر اس سے یہ علاقہ خرید لے۔ یہ خبر کسی دوسری پارٹی تک پہنچ گئی اور اس نے اپنے فوجی وادی میں اتار دیئے۔ اگر ایسا ہوگیا ہے تو یہ بہت برا ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک پُرامن علاقہ ہے۔ باہر کے لوگوں کی وجہ سے یہ وادی سازشوں کا گڑھ بن جائے گی۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں سلوپ کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا.... اب میں سلوپ کے منڈیر تک آ گیا تھا۔ اس لیے کرولنگ روک لی اور مڑ کر روبیر کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے ترکش سے ایک تیر نکالا پھر وہیں پڑا ایک کٹورا اٹھایا جو اہرام کے تالاب میں بھرے ارغوانی شراب کو پینے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اسے تیر کے سرے پر رکھ کر نہایت احتیاط سے سلوپ کی جانب بڑھاتے ہوئے ایک ہاتھ اونچا کیا۔ دور سے اسے انسانی سر سمجھا جا سکتا تھا اور دیکھتے ہی نیچے دبکا شخص فائر کرسکتا تھا مگر ادھر خاموشی ہی رہی جیسے نیچے کوئی نہیں ہے۔ تب سلوپ کے نزدیک پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا۔ نیچے جب کوئی نظر نہیں آیا تو میں کھڑا ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کون تھا جو کسی فرشتہ کی طرح نمودار ہوا اور مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچا کر اپنی راہ لگ گیا۔ لیکن سوچنے اور غور کرنے کا وقت بالکل نہیں تھا اس لیے کہ باہر سے لگاتار فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ باہر میدان جنگ ہے اور دو پارٹیوں نے قسم کھالی ہے کہ فتح صرف انہیں حاصل کرنا ہے۔

وہ دونوں ہیں کون یہ جاننا بھی ضروری تھا اور یہاں چھپ کر بیٹھے رہنے سے مجھے الہام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے باہر نکلنا ضروری تھا۔ اور برستی ہوئی گولیوں میں ایک دم سے باہر نکلنا بھی عقلمندی نہ تھی۔ کہاں اور کس طرف سے نکلا جائے یہ جانچنے کے لیے میں نے اس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے جس کمرے میں ڈیوڈ شا، زینی، آئی زور اور باسو داخل ہوئے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے لیے میں نے پھر وہی طریقہ آزمایا۔ تیر پر کٹورا رکھ کر پہلے اسے اندر کیا اور جب کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تو کٹورے کو فرش پر گرا دیا۔ کٹورا گرنے سے زوردار آواز پیدا ہوئی مگر کسی قسم کا ردِعمل سامنے نہیں آیا تو میں نے اندر قدم رکھا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ اندر جاتے ہی اپنی جگہ بدل لی۔ لیکن وہ کمرا خالی تھا۔ دوسری جانب کا دروازہ پاٹو پاٹ کھلا ہوا تھا۔ میرے پیچھے روبیر بھی اندر آگئی تھی۔ اسے میں نے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا اور اس دروازے سے باہر جھانکا۔ جس عمارت میں ہم تھے۔ اس کے برابر برابر میں دو اور عمارتیں بھی تھیں۔ گوکہ یہ معبد کی مرکزی عمارت تھی لیکن وہ دونوں بھی اہم ہوں گی تبھی تو اتنی نزدیک بنائی گئی ہیں۔ میں اسی بات پر غور کرتا ہوا اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا۔ ان دونوں عمارتوں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان میں سے ایک پر ڈیوڈ شا کا قبضہ ہے اور دوسری پر اس کی مخالف پارٹی کا مگر مخالف پارٹی ہے کون یہ ابھی تک راز تھا لیکن یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ڈیوڈ شاہ کی مخالف پارٹی میری حلیف ہے اسی لیے تو ان میں سے کسی ایک نے مجھے باسو کے ہاتھ سے بچایا تھا۔ وہ پارٹی کس عمارت میں ہے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ جس طرح دونوں پارٹیاں ایک دوسرے پر فائرنگ کر رہی تھیں ایسے میں اس عمارت سے باہر جانا بھی خطرناک تھا مگر میں ایسے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والا بھی نہیں تھا۔ باہر جانے کے راستے کو دیکھا۔ عمارت زمین سے تقریباً چھ فٹ کی بلندی پر بنائی گئی تھی۔ اندر آنے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اگر میں سیڑھیوں پر جاتا تو اللہ کو پیارا ہو جانا یقینی تھا۔ کیونکہ سیڑھیاں گولیوں کی زد پر تھیں۔ دونوں جانب کی گولیاں پندرہ سولہ فٹ چوڑی سیڑھیوں پر سے گزر رہی تھیں۔ میں واپس کمرے میں آگیا اور پھر سلوپ کی طرف دیکھا جو بالکل ویران پڑا تھا۔ اب میں نے سلوپ پر اترنا شروع کر دیا۔ سنبھل سنبھل کر نیچے اترتا چلا گیا۔ نیچے پہنچ کر دیکھا ایک کھڑکی ہے جو کھلی ہوئی ہے۔ اس کھڑکی میں کسی دھات کی بنی سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ جنہیں توڑے بغیر باہر نکلا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ یہ کھڑکی عین سیڑھیوں کے نیچے کھل رہی تھی جن سیڑھیوں کے ذریعہ اس عمارت میں داخل ہوا جاتا تھا۔ یہ کھڑکی داہنی جانب کی عمارت سے نزدیک تھی لیکن مسئلہ وہی تھا کہ باہر گولیاں بارش کے قطروں کی طرح برس رہی تھیں۔ دونوں طرف سے آٹومیٹک گنز کا استعمال ہو رہا تھا اگر کھڑکی توڑ کر باہر جاتے بھی تو زندگی کی ضمانت نہ تھی۔

"کیا تم اس عمارت میں جانا چاہتے ہو۔" روبیر نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"باہر تو آگ والے تیر چل رہے ہیں۔ کیسے جاؤ گے؟" روبیر نے گولیوں کو آگ والے تیر کا نام دیا تھا۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک میں نے یہی دیکھا ہے کہ معبد میں جگہ جگہ خفیہ راستے بنے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں بنانے والوں کا مقصد کیا تھا۔ شاید ان راستوں کو اس لیے بنایا گیا ہوگا کہ باہر والوں کی نظروں میں آئے بنا پجاری آمد و رفت رکھ سکیں۔''

''ہاں یہ بات بھی ہوسکتی ہے۔''

''ایک وقت میں یہاں کئی کئی بڑے پجاری 'پروہیت' رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ انتظام اس لیے بھی کیا گیا ہو کہ کسی پروہیت کی عبادت میں خلل نہ پڑے۔'' روبیر نے اپنا خیال پیش کیا۔

''ہوسکتا ہے تمہارا قیاس صحیح ہو۔ ویسے تمہاری یہ بات پسند آئی کہ ہر دو عمارت میں جانے کے لیے خفیہ راستہ بھی ہوگا۔ ایسا کرتے ہیں کہ اس راستے کو تلاش کرتے ہیں۔'' کہہ کر میں نے نیچے کی دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر ایک ہاتھ کے بعد میں دیوار پر گھونسا مارتا پھر کان لگا کر آواز سنتا۔ اگر دیوار میں کہیں خلا ہوتا تو گونج کی بازگشت سنائی دے جاتی۔ تمام کی تمام دیواریں ٹھوس محسوس ہوئیں تو واپس اوپر آ گیا۔ سلوپ سے اوپر جاتے ہوئے میں نے پوچھا ''تم نے وہ والا راستہ کیسے تلاش کیا جس سے کود کر نیچے آئی تھیں۔''

''اتفاقاً دیوار پر ایک ابھرا ہوا پتھر نظر آ گیا تھا۔ میں نے اسے دبایا تو سامنے تین فٹ چوڑا خلا نظر آیا۔ اس خلا میں اتنی جگہ تھی کہ کوئی بھی شخص لیٹ کر کھسکتا ہوا آگے جاسکتا تھا۔ بس میں اس خلا میں داخل ہوگئی۔ باہر نکلنے سے پہلے اندر جھانکا تو آپ نظر آ گئے اور میں نے اندر چھلانگ لگا دی۔''

''اب تم بھی دیوار پر نظریں دوڑاتی رہو۔ کہیں بھی ویسا ابھار نظر آئے تو بتا دینا۔''

''جی اچھا۔'' کہہ کر وہ مجھے کراس کرتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ میں جب اس ہال نما کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اہرام کے سامنے والی دیوار پر ہاتھ پھیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ میں بھی جا کر اس کے برابر میں کھڑا ہوگیا۔ خود میں بھی دیوار کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ تبھی میری نظر ایک ابھار پر پڑی۔ وہ ابھار ایسا نہیں تھا کہ دیکھتے ہی نظروں میں آ جاتا۔ دیوار کے ہم رنگ تھا مگر چوکور سا ابھار تھا۔ میں نے روبیر سے کہا ''غور سے دیکھو کیا ایسا ہی ابھار ادھر جو ابھار نظر آیا تھا وہ ایسا نہیں تھا۔ مگر اسی طرح ابھرا ہوا تھا جو آسانی سے نظروں میں نہ آئے۔'' روبیر کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

''ٹھہرو میں اسے دبا کر دیکھتا ہوں۔'' کہہ کر میں آگے بڑھا اور بہ غور جائزہ لیا پھر اس پر دباؤ ڈالا۔ دباؤ ڈالتے ہی اس جگہ کی دیوار میں ایک خلا سا بن گیا۔ جہاں روبیر کھڑی تھی وہاں کی دیوار سلائڈنگ ڈور کی طرح ایک طرف سرک گئی تھی۔ میں نے خلا میں جھانک کر کہا ''میں اندر جا رہا ہوں۔ تم یہیں ٹھہر کر میرا انتظار کرو۔ جب تک میں باہر سے اندر آنے کا اشارہ نہ دوں اندر داخل نہ ہونا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

میں... ہٹ گئی سلائڈنگ دیوار کو ہٹانے کے لیے سرکانے کی کوشش کی تو وہ بڑی آسانی سے مزید سرک گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں مخصوص قسم کے بیرنگ لگے ہوں۔ اب اتنا راستہ بن گیا تھا کہ ایک فربہ آدمی بھی بہ آسانی گزر سکے۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک زینہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ مگر زینے کے نچلے حصہ میں تاریکی تھی۔ جب کہ سیڑھیوں کی دیوار میں عجیب قسم کے دو پتھر لگے ہوئے تھے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ جواہرات میں سے کوئی خاص قسم کا پتھر تھا۔ میں بہت احتیاط سے نیچے اتر گیا۔ ابھی ایک دو سیڑھیاں ہی طے کی تھیں کہ عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ روبیر میرے پیچھے آ گئی تھی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں نے کچھ کہا نہیں اور نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ مزید نیچے جانے کے بعد جائزہ لیا۔ مگر کہیں کوئی سن گن نہ تھی۔ باہر سے آتی ہوئی فائرنگ کی آواز بھی بہت ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھی۔ پھونک پھونک کر مزید نیچے اترا۔ کئی سیڑھیاں طے کیں تو یکایک نیچے کا حصہ بھی روشن ہوگیا۔ شاید سیڑھیوں میں ایسا کوئی میکنیزم تھا کہ پیر پڑتے ہی وہاں کی دیوار میں نصب پتھر روشن ہو جاتا تھا۔

اس وقت ہم دونوں ہی موت اور حیات کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ کسی بھی وقت نیچے نظر آنے والا بند دروازہ کھل سکتا تھا اور کوئی بھی اوپر آ سکتا تھا۔ میرے پاس ایسا کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا کہ میں اسے روک سکوں۔ ہمیں پشت کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ سلوپ پر اترتے ہوئے میں باہر والا دروازہ بند کر آیا تھا۔ اب اگر کوئی خطرہ تھا تو نیچے والے دروازے سے ہی تھا۔ اس لیے میری پوری توجہ

جلال الدولہ

(383ھ/94-993ء۔435ھ/9مارچ1044ء)

ابوطاہر بن بہاء الدولہ بویہی سلطنت کا تاجدار۔ جب بہاء الدولہ کے بعد اس کے بیٹے سلطان الدولہ کو امیر الامراء چنا گیا تو اس نے اپنے بھائی جلال الدولہ کو بصرے کا والی مقرر کیا۔ چنانچہ وہ کئی سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ 415ھ/1024ء میں سلطان الدولہ کی وفات کے بعد اور اس کے اگلے سال مشرف الدولہ کی وفات کے بعد اس کو امیر الامرا بنایا گیا لیکن وہ اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے بغداد نہ گیا تو اس کے بھتیجے ابوکالیجا بن سلطان الدولہ کو یہ عہدہ پیش کیا گیا لیکن اس نے بھی اس عہدے کو قبول نہ کیا۔ جب جلال الدولہ نے یہ سنا کہ اب بغداد میں اس کے نام کا خطبہ نہیں پڑھا جاتا تو اس نے بغداد پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور وہ بصرہ لوٹ گیا۔ 418ھ/1027ء میں ترکوں کی درخواست پر وہ دارالخلافہ میں داخل ہو گیا، مگر اگلے برس ہی چند لوگوں کی شرارت پر بغداد میں مسلکی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ جلال الدولہ نے بڑی مشکل سے امن بحال کیا۔ اس دوران میں اس کے بھتیجے نے بصرے پر قبضہ کرلیا۔ 420ھ/1029ء میں اس نے واسط پر بھی قبضہ کرلیا۔ 421ھ/1030ء میں ابوکالیجار نے جلال الدولہ کے خلاف لشکر کشی کی لیکن تین دن جنگ لڑنے کے بعد اس نے فرار کی راہ اختیار کی۔ جلال الدولہ نے واسط پر قبضہ کرلیا اور پھر بغداد میں داخل ہوا۔ بصرہ بھی فتح ہو گیا لیکن ابوکالیجار کی فوجوں نے اس پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ اس زمانے میں دارالخلافہ میں ترک سپاہیوں کی خودسری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس لیے امیر الامراء کو اپنے مزید اختیارات سے دستبردار ہونا پڑا۔ 423ھ/1032ء

اسی بند دروازے کی طرف تھی ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہوئے ہم بالآخر نیچے پہنچ ہی گئے۔ ہمیں اس زینے پر آئے ہوئے صرف ڈھائی سے تین منٹ ہوئے تھے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈھائی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر میں نے روبیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے دروازے میں کوئی درز یا سوراخ تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ دوسری جانب کا منظر دیکھ سکوں مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ وہ دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا۔ جس طرح کی لکڑی ہمارے یہاں بلوط کی لکڑی کہلاتی ہے اسی قسم کی لکڑی سے بنا دروازہ تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازے کے مختلف حصوں پر دباؤ ڈال کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کہاں سے بولٹ ہو سکتا ہے جسے کھول کر باہر نکلا جائے مگر وہ اس مضبوطی سے بند تھا کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک پٹ کا دروازہ صرف اس معنوں میں تھا کہ وہ لکڑی سے بنا ہوا تھا مگر اس طرح دیوار میں فٹ تھا کہ وہ دیوار کا حصہ لگ رہا تھا۔ زینے پر اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ پیچھے ہٹ کر اس پر چوٹ ماری جا سکتی۔ بھرپور ضرب کے لیے جگہ بنانا ضروری تھا۔ اس لیے میں واپس سیڑھیوں پر آ گیا۔ اور چند لمحوں تک غور کیا کہ کس رخ سے دروازے پر لات ماری جائے۔

میں نے چند لمحوں تک سوچا اور پھر تیار ہو گیا کہ یہاں سے اچھل کر دروازے پر لات ماروں گا تبھی میری نظر سیڑھیوں کی چھت پر پڑی اور میں رک گیا۔ چھت میں ایک چھوٹا سا کنڈا نظر آ گیا تھا۔ یہ کنڈا اسی قسم کا تھا جیسے ہمارے یہاں چھت میں سیلنگ فین کے لیے لگاتے ہیں۔ مگر وہ کنڈا اتنا چھوٹا تھا کہ صرف ایک انگلی اس میں داخل ہو سکتی تھی۔ مجھے اس کنڈے کی وہاں موجودگی پر حیرت ہو رہی تھی۔ بھلا اس تنگ زینے پر کنڈے کا کیا کام یہاں روشنی کے لیے چراغ یا مشعل اٹکانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ دیوار پر روشنی دینے والے جواہر لگے ہوئے تھے۔ ان پتھروں سے اتنی تیز روشنی پھوٹ رہی تھی کہ کسی چراغ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سیڑھیاں اترنے والا شخص با آسانی سیڑھیاں اتر سکتا تھا۔ پھر یہ کس لیے ہے۔ غور کرنے کے بعد بھی سمجھ نہیں آیا۔ تب میں نے اس کنڈے میں انگلی پھنسا کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہا تھا کہ ایک ہلکی سی آواز سنائی دی جیسے کوئی چیز اپنی جگہ سے کھسکی ہو۔

''کھل گیا۔'' روبیر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں امیر الامراء کا محل لوٹ مار کا نشانہ بنا چنانچہ جلال الدولہ نے عکبرا کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ ترکوں نے ابو کالیجار کو امیر الامراء بنانے کا اعلان کر دیا لیکن چونکہ اسے امارت میں کوئی خاص دل چسپی نہ تھی۔ اس لیے جلال الدولہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد دوبارہ اپنے دارالخلافہ میں آ گیا۔ اگلے سال اس کے محل پر دوبارہ حملہ ہوا۔ اب بویہی امیر کو جو قوت و اختیار سے بالکل محروم ہو چکا تھا۔ دوسری مرتبہ پھر راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اس نے کرخ میں پناہ لی۔ بعد میں باغیوں نے اسے بغداد واپس بلا لیا۔ اسی سال ابوالقاسم والی بصرہ نے ابو کالیجار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کیوں کہ وہ اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔ ابوالقاسم نے جلال الدولہ کے لڑکے عبدالعزیز کو بصرے بلایا لیکن 425ھ/1034ء میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا اور شہر کے لوگوں نے دوبارہ ابو کالیجار کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ 428ھ/1037ء میں جلال الدولہ کو ایک بار پھر بغداد سے نکال دیا گیا لیکن قرداش بن المقلد الموصلی اور دبلیس بن علی الخی کی حمایت حاصل ہو جانے پر وہ ایک بار پھر دارالخلافہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابو کالیجار نے آخر کار جلال الدولہ سے صلح کر لی اور جب اس کے لڑکے ابو منصور کی شادی جلال الدولہ کی لڑکی سے ہو گئی تو اس صلح پر آخری مہر ثبت ہو گئی۔ اس موقع پر جلال الدولہ نے ''شاہ شاہان'' کا لقب اختیار کیا جو قدیم ایرانی لقب تھا۔

431ھ/1040ء میں اسے ایک بار پھر دارالخلافہ میں ترکوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار بویہی سلطنت کو انتہائی زبوں حالی میں چھوڑ کر جلال الدولہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

مرسلہ: نعمت اللہ پھلواردی۔ کراچی

میں نے مڑ کر دیکھا۔ روبیر کے چہرے پر خوشی کی جھلک تھی۔ اس کی نگاہوں کے زاویئے پر نظریں موڑیں اور ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا۔ جہاں میں کھڑا تھا اس کے دو اسٹیپ نیچے داہنی جانب کی دیوار میں ایک درز سا کھل گیا تھا۔ کسی سلائیڈنگ ڈور کی طرح دیوار کا قدآدم حصہ سرک گیا تھا۔ شاید دیوار میں جگہ بنی ہوئی تھی۔ جس میں ایک مخصوص حصہ سرک کر چلا گیا تھا۔ میں نے اس ادھ کھلے در پہ ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ مزید سرک گیا۔ اب اتنی جگہ بن چکی تھی کہ ایک آدمی بہ آسانی اس سے گزر سکتا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی فائرنگ کا شور اندر تک آنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دو پارٹیاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں کوشاں ہیں۔

''چلو دروازے کی دوسری طرف چل کر دیکھتے ہیں۔'' روبیر نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

اس کی تیز سانسوں کا لمس میری گردن پر محسوس ہوا۔ میں غیر محسوس انداز میں اس سے کچھ دور ہو گیا اور بولا ''مگر ہمیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کوئی اس طرف گھات لگائے بیٹھا ہو۔ ہمیں ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔'' یہ کہہ کر میں محتاط انداز میں تیزی سے دوسری جانب آ گیا۔

دروازے کی دوسری جانب ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے خود کو زمین پر گرا لیا تھا تاکہ اگر کسی کی نال میری طرف اٹھی ہوئی ہو تو گولی مزاج نہ پوچھ لے۔ پھر لیٹے لیٹے میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں کوئی سامان نہیں تھا۔ شاید وہاں عبادت کے لیے لوگ فرش پر بیٹھتے ہوں گے یا پھر یوں ہی خالی پڑا رہتا ہوگا۔ کمرے کا فرش صاف ستھرا تھا۔ گرد کی ہلکی سی تہ بھی نہیں تھی۔ شاید ہر روز صفائی ہوتی ہوگی۔ مجھے آگے بڑھنا ضروری تھا۔ میں نے سینے کے بل سرکنا شروع کر دیا۔ سرکتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ روبیر بھی میری تقلید میں کرولنگ کرتی ہوئی بڑھی چلی آ رہی تھی۔ میرا رخ باہر والے دروازے کی جانب تھا۔ یہ اقدام حفظ ماتقدم کے طور پر تھا کہ کوئی دور سے ہمیں دیکھ نہ لے۔ پھر ایک بات اور بھی تھی۔ مقابلہ ڈیوڈ شا جیسے عیار سے تھا جو الیکٹرونک آلات سے کام لینا بخوبی جانتا تھا اور پتا نہیں کیسے کیسے آلات ساتھ لے کر آیا ہو۔ اس کا ہلکا سا مظاہرہ میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے کس چالاکی سے خودکار گن عمارت کے باہر لگائی تھی جس کا خودکار نظام اپنے سینسر کی مدد سے سامنے آ جانے والے

جاندار کی موجودگی کا پتا فوراً لگا لیتا تھا اور فائرنگ شروع کر دیتا تھا۔ ایسا ہی کوئی نظام اس نے یہاں بھی لگا رکھا ہو۔ اگر میں کھڑا ہوتا تو اس کا سینسر پتا لگا لیتا۔ ان نادیدہ آلات سے نکلنے والی شعاعوں سے خود کو محفوظ رکھنے کی ایک کوشش تھی اور اب تک ایسا کچھ ہوا نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ ہمیں کہیں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہم بڑے آرام سے سرکتے ہوئے۔ کرولنگ کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ دروازے کے نزدیک پہنچتے ہی میں تھم گیا۔ میرے پیچھے روبیر تھی۔ وہ بھی ٹھٹک گئی۔ اس نے میرے بازو کو سختی سے پکڑ لیا تھا۔ اس کی پکڑ اتنی مضبوط تھی کہ انگلیاں گوشت میں دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اگر اور تھوڑا سا ہم آگے بڑھتے تو ان کی نظروں میں آ جاتے۔ اس کمرے کا دروازہ باہر کھل رہا تھا۔ یہ عمارت بھی زمین سے کچھ اونچائی پر بنی ہوئی تھی اور اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کے اختتام پر دو آدمی کھڑے تھے۔ ان کی پیٹھ ہماری جانب تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں آتشی اسلحے تھے مگر وہ فائر نہیں کر رہے تھے۔ بس خاموش کھڑے تھے۔ شاید ان کی کوئی پلاننگ ہو۔ ان کے لباس کی تراش خراش بتا رہی تھی کہ وہ مقامی نہیں ہیں۔ یقیناً ان کا تعلق ہماری دنیا سے تھا۔ وہ کس پارٹی کے ہیں۔ ڈیوڈ شا کے لوگ ہیں یا اس کے مخالف اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پہلا شخص تو قریب تھا مگر یہ شخص ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا تھا اگر اس کے کندھے آڑ سے باہر نہ ہوتے تو پتا ہی نہ چلتا کہ کوئی دوسرا ابھی وہاں موجود ہے۔

''اب کیا کیا جائے؟'' روبیر نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں کوئی جواب دیتا کہ عقب سے ہلکی سی آواز آئی۔ میں کسی چوٹ کھائے سانپ کی طرح پلٹا تھا اور عقبی دروازے کی طرف دیکھا۔ ادھر کوئی نظر نہیں آیا لیکن میری چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ ادھر کوئی ہے۔

''آڑ میں ہو جاؤ'' کہتے ہوئے میں نے الٹی طرف کرولنگ شروع کر دی۔ اب جدھر سے میں آیا تھا ادھر ہی واپس جا رہا تھا۔ نہایت تیزی سے کرولنگ کرتا ہوا واپس دروازے میں داخل ہوا اور سلوپ سے اوپر کی طرف بڑھنے لگا۔ بالکل اوپر پہنچ کر نہایت احتیاط سے تھوڑا سا سر اٹھا کر دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔ اطمینان بھری سانس خارج کر کے میں کھڑا ہو گیا، وہ ایرٹ تھا۔ پتا نہیں اس نے کیسے یہاں، اس عمارت میں آنے کا سوچا ورنہ تو میں اسے اپنی جگہ چھوڑنے سے منع کر آیا تھا۔

''تم کیسے آ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''جب آپ واپس نہیں آئے اور نہ آپ کی کوئی خبر ملی تو مجھے تشویش ہوئی اور میں آپ کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ عمارت سامنے تھی۔ پھر آپ نے کہا بھی تھا کہ آپ مرکزی عمارت میں داخل ہوں گے اس لیے میں سیدھا اسی میں آیا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دوسروں کا کیا حال ہے؟''

''سب پریشان سے بیٹھے ہیں۔ ایسی گڑگڑاہٹ ایسی آوازیں انہوں نے پہلی بار سنی ہیں۔'' وہ ہاتھ پیر جھاڑ کر بدن میں چستی لانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ شاید سرنگ میں جسم سکیڑ کر آگے کھسکنا پڑا ہوگا اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر جام محسوس ہو رہے ہوں گے اسی لیے وہ بار بار اپنے ہاتھ پیر جھٹک رہا تھا۔

''یہ گڑگڑاہٹ نہیں اسلحہ چلنے کی آواز ہے۔ اسے فائرنگ کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو جو کام تم لوگ تیر سے لیتے ہو وہی کام یہ لوگ اس ڈنڈے سے لیتے ہیں کہ دور کا دشمن بھی زخمی ہو جاتا ہے۔ مر جاتا ہے۔'' میں نے سمجھانے کے لیے کہا۔

''اس کا اندازہ تو ہو چکا ہے۔ میں نے دیکھا تو تھا کہ آواز ہوتے ہی ایک آدمی کے جسم میں سوراخ ہوتا چلا گیا تھا۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''بالکل۔ یوں سمجھ لو کہ انتہائی چھوٹا سا تیر ہوتا ہے جو اس ڈنڈے میں جسے گن کہتے ہیں لگا ہوا ہوتا ہے۔ جیسے ہی اس تیر کو پھینکنے کے لیے نیچے لگا ایک بٹن دبایا جاتا ہے۔ زور سے آواز نکلتی ہے اور وہ تیر جا کر شکار کے جسم میں بہت اندر تک زخم ڈال دیتا ہے۔''

''ان تیروں سے میں نے دیواروں کو بھی چھلنی ہوتے دیکھا ہے۔''

''ہاں... وہ مضبوط سے مضبوط چیز میں سوراخ کر دیتا ہے۔ ایسا ہی تیر ہوتا ہے۔''

''بہت خطرناک ہتھیار ہے۔ اگر میں زندہ بچ گیا تو ایسے کئی ہتھیار اپنے پاس رکھا کروں گا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

میں... بھی ہنس دیا پھر کچھ سوچ کر بولا'' کچھ اندازہ ہے۔ یہ ٹکرانے والے کون ہیں؟''

''ایک تو وہ لوگ ہیں جو آپ کے دشمن کے ساتھ اوپر سے آئے۔ پھر ان کا ایک آدمی اس طرف والے میدان میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں وہی والا ایک پرندہ جسے آپ نے

مار گرایا تھا آسمان سے اترا۔"

میں سمجھ گیا کہ اس نے سگنل دے کر کسی جہاز کو اتارا ہوگا۔

"وہ بڑا سا بغیر پر ہلائے اڑنے والا دھاتی پرندہ اترا تھا۔ اس سے چھ سات آدمی باہر آئے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں وہی ہتھیار تھے جن سے چھوٹے چھوٹے تیر نکلتے ہیں۔ ان کے پیٹھ پر بڑے بڑے تھیلے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سب اس اڑنے والے پرندے سے نکل کر ادھر آرہے تھے کہ ایک اور پرندہ آگیا۔ وہ سب اسے دیکھ کر رک گئے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ پھر وہ بھی اسی میدان میں اتر گیا۔ اس کے اندر سے بھی چھ سات آدمی باہر نکلے جوان لوگوں جیسے کپڑوں میں نہیں تھے۔ ان کو دیکھتے ہی پہلے والوں نے چیخ کر کچھ کہا۔ جواب میں نئے آنے والوں نے کندھوں سے لٹکے ہوئے ڈنڈے اتار کر ہاتھ میں لے لیے اور پھر گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔ وہ سب زمین پر لیٹ گئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف ڈنڈے سیدھے کر کے دھماکا کرنے لگے تھے۔ پہلے آنے والے اس والی عمارت میں داخل ہو گئے اور بعد میں آنے والے ادھر ہی دوڑے تھے۔ درمیان میں برابر والی عمارت آگئی تھی اس لیے میں دیکھ نہ سکا کہ کون کدھر گیا۔"

اس نے جو کچھ بتایا اس سے سمجھ تو یہی آرہا تھا کہ ڈیوڈ شا کے تعاقب میں کوئی دوسری پارٹی بھی وادی میں داخل ہو گئی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ دوسری پارٹی کون ہے؟ کس مقصد سے آئی ہے۔ اس کا پتا لگانا ضروری تھا۔ لیکن کیسے لگایا جائے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ سامنے کی بات تھی اور اسے اب تک آزمایا نہیں تھا۔ جب میں باہر گیا تھا تو دو تین لوگ نظر آئے تھے جن کا رخ ایک خاص سمت میں تھا اور وہ ہتھیار تھامے مستعد کھڑے تھے۔ مجھے باسو کے ہاتھ سے بچانے والا بھی ادھر ہی گیا تھا۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی ایک ہو جس نے باسو پر فائر کیا تھا۔ ایرٹ نے بتایا تھا کہ جہاز سے پہلے اترنے والے چست کپڑوں والے تھے یعنی وردی پوش تھے۔ ان کی پیٹھ پر وار بیگ بھی تھے۔ جب کہ بعد میں اترنے والے عام لباس میں تھے۔ میں نے جن دونوں کو دیکھا تھا وہ بھی عام لباس میں ملبوس تھے۔ یقیناً وہ دشمن نہیں ہیں ورنہ مجھے بچاتے نہیں۔ اور مجھے پہچانتے بھی ہیں اسی لیے تو باسو کے جاتے ہی وہ میدان جنگ کی طرف لوٹ گئے۔ اس وقت باہر کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ میدانِ جنگ کا سماں ہے اسی لیے میں نے یہ لفظ استعمال کیا۔

اس خیال کے آتے ہی میں پھر سے سلوپ کی طرف چل پڑا۔ اب میرے ساتھ دو لوگ تھے۔ ان دونوں کے ساتھ میں نیچے پہنچا مگر باہر والے دروازے پر جانے سے پہلے ان کو ہدایت دی۔ "تم دونوں یہیں پیچھے کھڑے رہنا۔ پتا نہیں وہ دوست ہیں یا دشمن۔ پہلے میں ان سے معلوم تو کرلوں۔"

"جی اچھا۔" ایرٹ نے جواب دیا مگر مجھے شک ہوا کہ وہ اس طرح خاموش کھڑا نہیں رہے گا۔ اگر میرے پیچھے آگیا تو کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔ گولی بندوق اس کے لیے نئی چیز ہے۔ کہیں وہ جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ اس خیال کے آتے ہیں میں نے پلان بدل دیا اور ان سے کہا:

"نہیں تم دونوں اوپر جا کر میرا انتظار کرو۔ جب میں آواز دوں تبھی نیچے آنا۔"

میرا حکم پاتے ہی وہ دونوں سر جھکائے سلوپ سے اوپر چڑھتے چلے گئے۔ ان دونوں کے اوپر جاتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس لیے کہ اب وہ جگہ خالی تھی۔ دور دور تک کسی بندے کا نام ونشان نہ تھا۔ کہیں میں نے جاگتے میں خواب تو نہیں دیکھا۔ کیونکہ گولیاں ہنوز چل رہی تھیں۔ یہ چند منٹ میں کہاں چلے گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر برابر والی عمارت پر پڑی۔ اس عمارت سے دوسری عمارت پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا اس عمارت تک اگر میں جاہوں تو جا سکتا ہوں کیونکہ گولیاں جس زاویہ سے آجا رہی تھیں وہ کافی دور تھا۔ اگر میں کرولنگ کرتا ہوا چلوں تو اس عمارت تک بہ آسانی جا سکتا ہوں۔ یہی بات دوسری عمارت پر بھی صادق آرہی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور داہنی جانب والی عمارت کی سمت میں زمین پر لیٹ کر رینگنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ کچھوے کی رفتار سے بڑھتا ہوا میں اس عمارت تک پہنچ ہی گیا۔ اب جو مسئلہ تھا۔ وہی سب سے اہم اور خطرناک تھا۔ اس عمارت کے سامنے بھی چوڑی سیڑھیاں تھیں اور ان سیڑھیوں پر قدم رکھنے کا مطلب تھا نشانہ بن جانا۔ سیڑھیاں دونوں طرف کی فائرنگ کی زد میں تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ایک اور مسئلہ بھی تھا کہ کہیں روبیر یا ایرٹ میرے حکم کو ٹھکرا کر میری محبت میں باہر نہ آجائیں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آج میری موت لکھی ہوئی ہے تو کوئی بھی مجھے بچا نہیں سکے گا اور اگر میری موت کا وقت یہ نہیں ہے تو کوئی میرا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکے گا۔ اب جو بھی قسمت میں

ہو۔موت یا زخمی ہونا جو ہوگا دیکھا جائے گا یہ سوچ کر میں نے سیڑھیوں کی جانب رخ کر لیا۔

بالآخر سیڑھیاں بھی آ گئیں۔اب ان پر چڑھنا تھا۔کچھ دیر تک میں اسی حالت میں ساکت لیٹا رہا پھر میں آگے کی جانب سرکا پہلی سیڑھی عبور کی ہی تھی کہ اندر سے کسی نے فائر کیا جو میرے اس ہاتھ سے صرف ایک انچ کے فاصلے پر سیڑھی کے کنارے کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔میں پہلی سیڑھی پر دبک گیا۔سمجھ گیا تھا کہ اندر والوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔تبھی کسی کی چیختی ہوئی آواز آئی ”خبردار فائر نہ کرنا۔یہ شہباز صاحب ہیں۔“

آواز جانی پہچانی لگی لیکن صاف سنائی نہیں دی تھی اس لیے میں پہچان نہیں سکا تھا کہ کس کی آواز ہے۔اندر سے کسی نے پکار کر کہا ”شہباز صاحب ہوشیاری سے اوپر آجائیں۔کیونکہ سامنے سے آنے والی گولیاں آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔“

میں نے اونچی آواز میں جواب دیا ”میں احتیاط کے ساتھ اوپر چڑھتا جا رہا ہوں صرف تم مجھے کور دو۔فائرنگ کا رخ کچھ دیر کے لیے موڑلو تا کہ سامنے والے مغالطے میں آجائیں۔“

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔یکایک فائرنگ کرنے والے نے میرے داہنے ہاتھ پر برسٹ چلایا جس کا اثر فوراً ہوا۔اب سامنے سے آنے والی گولیوں کا رخ اسی جانب ہو گیا تھا۔شاید دوسری عمارت والوں نے یہی سوچا ہوگا کہ ادھر بھی کوئی ہے۔اس وقفے کا فائدہ اٹھا کر میں نے سیڑھیوں پر رینگنا شروع کر دیا۔نہایت تیزی سے اوپر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔یہ سات یا آٹھ سیڑھیاں تھیں مگر اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے کئی منزل اوپر جانا ہے۔اوپر چڑھتے ہوئے موت کا تصور آنکھوں میں سمایا رہا۔کسی بھی وقت دوسری عمارت سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔مگر یہ پل صراط بھی عبور ہو گیا۔میں بہ آسانی آخری سیڑھی عبور کر کے برآمدے پر پہنچ گیا مگر اب تک لیٹا ہوا تھا۔اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اور جب میں برامدہ پار کر کے اندر والے ہال میں پہنچا تو میرے دیوتا کوچ کر گئے۔پوری بازی الٹ چکی تھی۔میرے سامنے پستول تھامے باسو کھڑا تھا۔یہ وہی تھا جس نے پہلے بھی مجھے زچ کیا تھا۔مجھے دیکھ کر وہ مسکرا رہا تھا۔”ہیلو ینگ مین۔مجھے دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

اس وقت مجھے سفیر بری طرح یاد آیا ایسے موقع کے لیے اس نے ایک نہایت شستہ گالی ایجاد کر رکھی تھی۔مگر یہ موقع اسے دوہرانے کا نہیں تھا اس لیے میں خاموش رہ گیا۔”شا اس وقت یہاں نہیں ہے ورنہ وہ بہت خوش ہوتا۔وہ اپنی بیٹی زیتی کو لے کر سمیرا کے قلعے کی طرف گیا ہے۔وہاں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ان کے درمیان آخری بازی کھیلنے گیا ہے تا کہ فیصلہ جلد ہو جائے۔“

”اس عمارت میں تو تم لوگ ہو۔اس عمارت میں کون ہے؟“میں نے اس کی بات کو نظرانداز کر کے پوچھا۔

”یہ تو تم بتاؤ گے۔تم نے اپنی مدد کے لیے کسے بلایا ہے۔یاد رکھو ڈیوڈ شا نے اس پروجیکٹ پر لاکھوں ڈالر لگا دیے ہیں۔کئی ممالک سے بات چل رہی ہے۔اربوں ڈالر کا گیم ہے اور شا کبھی نہیں چاہے گا کہ یہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔اس کے لیے چاہے کتنی ہی گردن کیوں نہ کٹ جائے۔“

”اوہ..یہ بات ہے۔“میں نے ہونٹ کو گول بنا کر جواب دیا ”گویا امریکا سمیت کئی ممالک سے اس وادی کا سودا کر لیا ہے۔“

”ابھی سودا ہوا نہیں ہے اسی لیے تو میں نظر آ رہا ہوں۔سودا ہوتے ہی میں اپنا حصہ لے کر چلا جاؤں گا۔ایک ارب ڈالر کا کھیل کھیلا ہے اس بار میں نے۔“

”ڈیوڈ شا کو چھوڑ جاؤ گے یہ ناممکن ہے۔پھر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کسی ایسے ملک نے جو سودا کرنے کی بجائے قبضہ کرنے کے موڈ میں ہو اس نے اپنے کمانڈو شا کے آدمیوں کے تعاقب میں بھیج دیا ہو۔“

”یہ ناممکن بات نہیں ہے اسی لیے تو شا کا حکم ہے کہ جو بھی راستے میں آئے اسے اڑا دو۔“

”تو ٹھیک ہے مجھے بھی اڑا دو۔“

”مجھے اگر اڑا دینے کا اختیار ہوتا تو کب کا اڑا دیتا لیکن کچھ ہی دیر قبل ڈیوڈ شا نے خود ہی کہا ہے کہ شہباز پر نظر رکھو وہ جیسے ہی کہیں نظر آئے اسے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرو۔“

”اچھا تو گویا وہ مجھے چارا بنا کر حملہ آوروں سے نمٹے گا؟ ٹھیک ہے میں بھی دیکھتا ہوں۔اگر مجھے زندہ اس تک پہنچا سکتے ہو تو کوشش کر لو۔“کہتے ہوئے میں نے اپنی داہنی آنکھ دبا دی۔وہ تو تھا ہی موٹے دماغ کا اس لیے میں اسے یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ ان حالات میں بھی میں اس سے کمزور نہیں ہوں۔حالانکہ میں اس کی فطرت سے واقف تھا۔جانتا تھا کہ وہ کسی کوڑیالے سانپ سے کم نہیں۔انتہا درجے کا کینہ پرور ہے اور اپنی شکست کو بھولتا نہیں

ہے۔ پچھلی شکست کو بھی نہیں بھولا ہوگا۔ اس سے نمٹنا اتنا بھی آسان نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے کوشش کرنے کی ٹھان لی تھی۔

''شہباز یاد رکھو میں اس وقت ڈیوڈ شا کی وجہ سے نرمی برت رہا ہوں اس لیے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔'' اس نے میری حرکت کو نظرانداز کر کے جواباً کہا ''تم اس قسم کی اوچھی حرکت تبھی کرتے ہو جب سامنے والے کو الجھانا چاہتے ہو۔ میں تمہارے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ اپنے ہاتھ آگے کر دو تا کہ میرا آدمی تمہارے ہاتھ باندھ سکے۔''

''یہ لو، میں نے منع کب کیا ہے۔ میں تو خود ڈیوڈ شا سے ملنا چاہ رہا ہوں۔ وہ ہے کہاں؟''

''اس وقت وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے ان بندوں سے ملنے گیا ہوا ہے جو اترے تو یہاں تھے لیکن بھٹک کر سامرا کے ایریا میں چلے گئے ہیں۔ وہاں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہیں۔ کہیں غلطی سے وہ لوگ ان سے نہ الجھ جائیں اسی لیے ڈیوڈ شا وہاں گیا ہے اور اب آتا ہی ہوگا۔''

''تو چلو مجھے باندھو....'' کہتے ہوئے میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھا باسو اور میرے درمیان آیا میں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کے پستول پر ہاتھ مارا اور قلابازی کھا کر پلک جھپکتے میں باسو کی پیٹھ پر پہنچ گیا۔ وہ سنبھلتا کہ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ یقیناً میری برق رفتاری پر وہ بھی اش اش کر اٹھا ہوگا۔ میں نے اپنے بائیں بازو کا حلقہ اس کی گردن میں ڈالا اور اسے لے کر ایسے رخ پر گھوم گیا جہاں سے کوئی میری پشت سے حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

''تم میں سے کوئی ہلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ تمہارے اس سورما کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔'' میں نے کرخت لہجے میں دھمکی دی۔

میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ چہرہ لال ہو گیا تھا۔ اس کے سرخ چہرے پر نظر ڈال کر میں نے کہا۔

''تم سب اپنی اپنی گنیں پھینک دو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں حکم دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا ہے۔ اگر دوستی چاہتے ہو تو میرا گلا چھوڑ دو۔''

''اور اگر نہ چھوڑا تو؟''

''تم اکیلے ہو اور میرے جسم میں تم سے زیادہ قوت ہے۔ تم کتنی دیر تک مجھے یرغمال بنا کر کھڑے رہو گے۔ یہاں سے باہر نکلتے ہی سامنے والوں کی فائرنگ کی زد میں آ جاؤ گے۔ اس لیے عقل سے کام لو۔''

''اب تم نے عقل کی بات کی ہے۔ میں گردن تو چھوڑ دوں گا مگر تمہیں بھی ضمانت دینی ہوگی کہ مجھے جانے دو گے۔''

''اس وقت وادی پر ہمارا قبضہ ہونے والا ہے اور تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ اگر میں نے تمہیں ڈیوڈ شا کے سامنے پیش کر دیا تو میرا بھلا ہوگا اور تمہاری زندگی بھی بچ سکتی ہے۔ اس لیے کہ ڈیوڈ شا تمہیں مارے گا نہیں۔ اگر اسے مارنا ہوتا تو بہت پہلے مار چکا ہوتا۔ وہ تم سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ گویا تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔''

''ڈیوڈ شا مجھے مارے گا یا زندہ رکھے گا یہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو میری بات پر عمل کرو اور اندر بڑھنا شروع کر دو تا کہ اکیلے میں تم سے مذاکرات کر سکوں۔''

''اچھا۔'' کہہ کر وہ مڑا۔ مڑنے کی وجہ سے میرے بازو کا حلقہ کچھ کمزور ہوا اور اسی موقعے کا اس نے فائدہ اٹھا لیا۔ وہ اندر کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے میں بھاگا اور میرے پیچھے اس کا ساتھی دوڑا۔ دوڑتے ہوئے میں نے گولی چلا دی۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔ میں نے یوں ہی فائر کیا تھا اس لیے نشانہ چوک گیا۔ اس نے پھرتی سے ایک آرائشی کھمبے کے پیچھے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ میں اس تک پہنچتا کہ پیچھے سے فائر ہوا۔ یہ فائر بھی پستول کا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس عمارت سے بھی میں نے آٹومیٹک گنز کی فائرنگ سنی تھی مگر اس وقت مجھ پر جس اسلحہ کا استعمال ہوا تھا وہ پستول جیسا معمولی ہتھیار تھا۔ شاید گھبراہٹ میں ان دونوں نے اسے آزمایا نہیں تھا اور باسو خالی ہاتھ تھا۔ عقب سے ہونے والے فائر سے میں اتفاقیہ بچا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی یا اس شخص کا نشانہ کچا تھا کہ گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ شرٹ کی آستین پر جلنے کا دھبا ثبت ہو گیا تھا۔ بازو سے رسنے والا خون میری پسلیوں پر پھیلتا محسوس ہوتا تھا لیکن اس وقت اس پر توجہ دینے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے خود کو موڑا پھر پستول کی نال سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ سنسناتی ہوئی گولی نکلی اور سیدھے جا کر عقب والے کے پستول پر پڑی۔ پستول چھنک کر دور جا گرا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ میں نے دوسرا فائر کیا۔ یہ فائر بھی نشانے پر لگا۔ پستول مزید آگے پھسل گیا۔ مرشد سے ٹکرانے کی وجہ سے میرے لیے پستول کھلونا بن گیا تھا۔ ہر روز اس سے کھیلنا

بڑھ رہا تھا۔ گولی اور بارود کے اس کھیل میں ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میرا نشانہ پختہ ہو گیا تھا۔ جس کا ایک ثبوت سامنے تھا۔ مگر اب میں نے اپنا رخ پھر سے باسو کی طرف کر لیا تھا کیونکہ اسے موقع ملتا تو وہ بھرپور وار کر دیتا۔ اس کی طرف مڑنے کے بعد میں نے پستول کو انگلیوں پر نچاتے ہوئے کہا ''اگر میں چاہتا تو یہ گولیاں تمہارے سینے میں بھی اتر سکتی تھیں مگر میں خون خرابہ پسند نہیں کرتا جب تک جان پر نہ بن آئے۔''

''مگر میں پسند کرتا ہوں۔'' کہنے کے ساتھ باسو نے گولی چلا دی۔ شاید اس نے ایک اور پستول جسم پر کہیں باندھ رکھا تھا۔ اگر میں اتفاقی طور پر ایک سیکنڈ پہلے اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو وہ گولی میرے سر میں دھنس جاتی۔ اب میں دوطرفہ حملے کی زد میں تھا۔ گو کہ عقب والے کے پاس اب پستول نہیں تھا۔ مگر کسی اور ہتھیار سے بھی حملہ کر سکتا تھا۔ میں پوری طرح ہوشیار تھا کہ باسو نے پھر فائر کیا۔ اور میں بندر کی طرح اچھل کر داہنی جانب ہٹ گیا۔ باسو اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور اس کی جانب سے فائر بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی میں ہوشیار تھا۔ فائر نہ ہونے کی وجہ پستول کا خالی ہو جانا بھی ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دل ہی دل میں اس کے فائر گنے۔ اس نے کل پانچ فائر کیے تھے۔ آخری گولی اب بھی اس کے پستول میں ہو گی۔ میں اس آخری گولی کے انتظار میں تھا کہ دھم کی آواز آئی۔ عقب والا جمپ لگا کر مجھ کے قریب آ گیا تھا۔ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ میں نے نال کا رخ اس کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا مگر ہلکی سی کلک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ یہ ہلکی سی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔ بصارت و سماعت ذہن و دل پر اثر انداز ہوتی ہے، دل میں خوف اور دماغ میں فکر پیدا کرتی ہے۔ کلک کی آواز نے اس شخص کے چہرے سے خوف کے آثار مٹا دیے تھے۔ جب خوف مٹ جائے تو بھیگی بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔ وہ دونوں بھی شیر بن گئے تھے اور بے خوفی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ گیلری والے شخص نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔ شاید میرا اندازہ غلط تھا اور اس کے پستول میں گولیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں یا پھر اسے آخر میں آزمانے کے لیے محفوظ رکھ لیا تھا۔ وہ دونوں دو اطراف سے میری جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے ہویدا تھا کہ وہ مجھے پیس کر رکھ دیں گے۔

''آ تو گئے ہو اب تمہیں یہاں سے کوئی دوسرا گھسیٹ کر لے جائے گا کیونکہ تم زندہ تو بچو گے نہیں جو اپنے پیروں پر چل کر جا سکو۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھا۔ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ ایک دو قدم چلا ہو گا کہ اس نے ہوا میں اپنے جسم کو اچھالا اور اڑتا ہوا میری جانب آیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جمناسٹک کا ماہر ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عام طور پر کرایہ کے فوجی جمناسٹک کے ماہر ہوتے ہی ہیں۔ ڈیوڈ شا ایسے ہی لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے جو ہر فن مولا ہوں۔ اسے اپنی طرف اڑ کر آتے دیکھ کر میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ خود کو روک نہ سکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اڑتا ہوا باسو سے جا ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا نیچے گر پڑا۔

''ارے واہ کیا اڑان بھری ہے۔ ذرا پھر ایک بار کوشش تو کرنا۔'' میں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

وہ جھلا کر کھڑا ہوا اور پھر ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ یہ انداز خاصا خطرناک تھا۔ وہ جسم کو نپے تلے انداز میں گھماتا ہوا تیر کی طرح آ رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے ہٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی اور وہ اپنے ہی زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا یہ داؤ بھی خالی گیا تھا۔ فن حرب کے ماہروں کا کہنا ہے کہ لڑائی کے وقت دماغ کو پرسکون رکھو ورنہ اپنا سکون ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں نے اسی بات پر عمل کرتے ہوئے اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی ''بیٹے کسی اچھے استاد سے ٹریننگ لے لیتے۔ ابھی بھی موقع ہے۔ میرے شاگرد بن جاؤ۔''

تبھی میری کمر پر لات پڑی اور عقب سے باسو کی آواز سنائی دی ''اور یہ لات کیسی ہے استاد محترم۔''

لات پڑتے ہی میں کافی دور تک پھسلتا چلا گیا تھا کیونکہ لات کسی ایرے غیرے کی نہیں تھی باسو کے جسم میں کسی عفریت جیسی قوت تھی۔ ڈاکٹر کے تجربے کا وہ شہکار تھا۔ اس کے جسم میں کئی گھوڑوں کی قوت تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ لات کی ضرب کھا کر کھلے دروازے کے باہر جا گرتا اور کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ مگر میں نے فوراً ہی مدافعتی قوت کو آزماتے ہوئے خود کو پھسلنے سے روکنے کی پوری کوشش کی تھی پھر بھی کئی فٹ تک پھسلتا چلا گیا تھا۔ پھر میں پھرتی سے اٹھا تھا اور میں کسی زخمی ناگ کی طرح پلٹا داہنے ہاتھ کا مکا ٹھگنے کے سینے پر اور گھٹنا اس کی داہنی ران پر مارا۔ وہ کراہتا ہوا الٹ گیا تھا۔ میں نے اس پر سے توجہ ہٹا کر باسو کی طرف رخ کر لیا مگر عقب میں آہٹ محسوس ہوئی تو دوبارہ ٹھگنے کی طرف گھوم گیا تھا اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی

تو میں چاروں خانے چت گر جاتا۔ ٹھگنا ہوا میں اپنے جسم کو گردش دیتے ہوئے میری طرف آیا تھا۔ میں بڑی سرعت سے داہنی جانب ہٹ گیا تھا۔ پھر وہ اپنے ہی ساتھی پر جا پڑا تھا۔ اب انہیں موقع دینا خطرے کو بلانا تھا۔ میں نے ان پر چھلانگ لگائی۔ وہ دونوں بھی کم پھرتیلے نہیں تھے دونوں ہی بیک وقت مخالف سمت میں سرک گئے تھے۔ میں فرش پر اوندھے منہ گرا لیکن ابھی میں اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ٹھگنے قد والے نے میری کمر پر لات جمادی۔ کمبخت کی لات اتنی زبردست تھی کہ میں کراہ کر رہ گیا۔ اس نے پھر وار کرنا چاہا تھا کہ میں نے خود کو بچانے کے لیے داہنی طرف سرکنے کی کوشش کی مگر میری کوشش ناکام ہوئی۔ باسو نے فوراً ہی آگے بڑھ کر کک ماری تھی۔ میں پھر ٹھگنے کے قدموں میں آ گیا تھا۔ اس نے لات مارنے کے لیے پیر اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کا پیر پکڑ لیا اور زوردار جھٹکا دیا تو وہ اوندھے منہ گرا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب بازی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے مشینی انداز میں باری باری دونوں کی دھنائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں لہولہان ہو گئے۔ میں آخری راؤنڈ کرنے والا تھا۔ میرا آخری راؤنڈ کھڑی ہتھیلی کا گدی پر وار تھا۔ اس کے بعد دونوں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ میں نے ٹھگنے کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا ہی تھا کہ ایک دھماکا سا ہوا اور سنسناتی ہوئی گولی میرے سر کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک نیا بندہ ہاتھ میں ریوالور پکڑے کھڑا تھا "بہت ہو گیا۔ اب ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے حکم دیا تھا۔

جیتی ہوئی بازی پلٹ گئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے ٹھگنے کو فرش پر پٹخا۔ اس کا چہرہ زمین سے ٹکرایا۔ وہ چیخ اٹھا تھا۔ اس کی ناک کا بھرتا بن گیا تھا۔ چہرہ خون سے بھر گیا تھا۔ منہ سے بھی خون بہنے لگا تھا۔

"خبردار اب حرکت کی تو گولی سینے کے پار ہو گی۔" اس نے چیخ کر کہا۔

میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں ہاتھ اٹھا کر۔ کھڑا ہو جاؤں۔ میں نے وہی کیا۔ مجھے ہاتھ کھڑا کرتے دیکھ کر باسو آگے بڑھا۔ اور پوری قوت سے میرے سینے پر اپنے سر سے ٹکر ماری۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر پیروں نے ساتھ نہ دیا اور میں الٹ گیا۔ میرا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پل بھر کے لیے اندھیرے کی چادر تن گئی تھی۔ میں دونوں ہاتھ کو ٹیک کر پھر کھڑا ہونے لگا۔ تبھی باسو نے لات چلا دی۔ میں دوبارہ گر پڑا۔ میرے نچلے ہونٹ میں جلن ہو رہی تھی۔ شاید وہ پھٹ گیا تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ کی پشت سے ہونٹ پونچھا تھا اور جھٹکے سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ٹھگنا دوڑتا ہوا میری جانب لپکا۔ ایک بار میں نے موقع گنوا دیا تھا۔ اس بار میں نے سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ جیسے ہی باسو میرے اور ٹھگنے کے درمیان آیا، میں باسو سے لپٹ پڑا۔ اس کی آڑ لے کر کہا "اپنا پستول پھینک دو۔ ورنہ اس کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

"باسو نہ میرا بھائی ہے نہ پھوپا۔ اس پر بھی گولی چلا سکتا ہوں۔" نئے بندہ نے چیخ کر کہا۔

اور واقعی اس نے گولی چلا دی۔ ابھی باسو کی موت کا وقت نہیں تھا۔ نشانہ چوک گیا۔ اتنی دیر میں باسو کو دھکیلتے ہوئے میں اس کے قریب لے آیا تھا۔ اب ہمارے اور اس کے درمیان صرف چھ فٹ کی دوری رہ گئی تھی۔ اس بار اگر وہ گولی چلاتا تو باسو کا جسم سوراخ دار ہو جاتا۔ اگر پستول کی مار صحیح تھی تو گولی باسو کے پہاڑ جیسے جسم کو چھیدتی ہوئی مجھ تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ باسو میری جکڑ سے نکلنے کے لیے متواتر کوشش کیے جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں شیطانی قوت تھی۔ اگر میں ... گردن کے مخصوص حصے کو دبائے ہوئے نہ ہوتا تو اب تک وہ مجھے اچھال چکا ہوتا لیکن اس کے ہر جھٹکے پر گردن کا منکا دب جاتا جس کی تکلیف اسے زیادہ زور لگانے نہیں دے رہی تھی پھر وہ فائر کے بعد تو بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ادھر نیا بندہ بھی سخت ہیجان میں لگ رہا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ اور میری نظریں اس کی انگلیوں پر۔ تبھی باہر سے ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور عقب سے اس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گر کر تڑپنے لگا۔ اسے گرتے دیکھ میں سمجھ گیا تھا کہ روبیر یا کوئی اور یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے اسے گرتے دیکھ کر باسو سے کہا "میرے آدمیوں نے اس پوری عمارت کو گھیر لیا ہے۔ اس لیے میں جو کہہ رہا ہوں۔ اس پر عمل کرو۔"

وہ کوئی جواب دیتا کہ روبیر تیر کمان سنبھالے اندر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں نے کہا "گرے ہوئے بندے کی تلاشی لو۔ پستول نکال لو۔"

روبیر تو جیسے موقع کی منتظر تھی۔ اس نے کمال پھرتی سے اس کی تلاشی لی پھر وہ باسو کی طرف بڑھی تھی کہ میں نے اسے منع کیا "خبردار۔ اس کے قریب بھی نہ آنا۔"

وہ تھم کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ میں نے باسو سے

جعفر

ایک عددی علم، اس میں احوال غیب کا علم معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں اس علم میں مخفی معانی کی مدد سے واقعات، خصوصاً آنے والے واقعات کی تعبیر یا ان کی اطلاع حاصل کی جاتی ہے۔ اس علم کی بنیاد نیومرولوجی یعنی یونانیوں کے قدیم علم الاعداد پر ہے۔ سب سے پہلے عبرانیوں نے اپنی ابجد کے بائیس حروف کو اعداد میں منتقل کر کے ان سے طرح طرح کی تاویلات اخذ کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ عربوں نے اسی ابجد میں چھ حروف کا اضافہ کیا۔ اس طرح عربی ابجد کے کل اٹھائیس حروف وضع ہوئے جن کے مساوی اعداد مقرر کر کے عربوں نے ان اعداد کی گنتی کو ہزار تک پورا کر لیا۔

عربی ابجد کے حروف اور ان کے مساوی اعداد حسب ذیل ہیں۔

ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط	ی
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر
۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰
ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ		

کہا ”اب تم اندر والے کمرے کی طرف بڑھنا شروع کر دو۔“

باسو مڑا، جیسے وہ میرے حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔ مڑنے سے میرے بازو کا حلقہ کچھ ڈھیلا پڑا اور اسی موقع کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اتنی دیر سے وہ خاموش کھڑا تھا اس لیے میں کچھ حد تک بے پروا ہو گیا تھا۔ یہ انسان کی نفسیات ہے اور اس نے اسی بات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ پہلے اس نے جھٹکا مارا اور ساتھ ہی ساتھ باہر کی سمت اچھال بھری تھی۔ وہ جمپ لگا کر برآمدے میں پہنچا اور زندگی کی پرواہ کیے بغیر اس نے میدان میں دوڑ لگا دی تھی۔ اسے دوڑتے دیکھ دوسری عمارت سے پھر فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ باسو پاگل ہو گیا ہے۔ وہ اپنی جسامت، تن و توش کو بھلا کر دوڑتے ہوئے ایک دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔ اسے فرار ہوتے دیکھ کر ٹھگنا بھی میدان میں دوڑ گیا تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ باسو کے بچ نکلنے کی وجہ سے فائر کرنے والے ہوشیار ہو گئے تھے پھر ایسی فائرنگ میں ٹھگنے کو اپنے آپ کو زمین پر گرا لینا چاہیے تھا مگر وہ دوڑا تھا اور یہی اس کے حق میں برا ہوا تھا۔ تیسرا برسٹ اس کے جسم کو چھلنی کر گیا تھا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تھا۔ اس کے جسم سے نکلنے والا خون مٹی کو رنگین کر رہا تھا۔ جس کی عیاری مکاری اور بہیمانہ کارروائی سے ایک عالم دہشت زدہ تھا وہ عالم بقا کو کوچ کر گیا۔ انسان تمام عمر جلاد بنا رہتا ہے مگر جب قضا آتی ہے تو کہیں کا نہیں رہتا، قبر میں جا سوتا ہے۔

اس کی موت پر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا مگر میں رنجیدہ تھا۔ اس نے دانستہ موت کو گلے لگایا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اب وہ کسی طور بھی زندہ بچ نہیں پائے گا اس لیے کہ اس نے روبیر کو دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ مقامی لوگوں نے اسے گھیر لیا ہے۔ مقامیوں کی مدد میرے آدمی کر رہے ہیں جو دوسری عمارت میں ہیں۔ مگر اس دوسری عمارت میں کون لوگ ہیں اس کی خبر خود مجھے بھی نہیں تھی۔ میں گرے ہوئے بندے کی لاش کو پھلانگتا ہوا باہر کی سمت بڑھا۔ گولی باری تقریباً رک چکی تھی اس لیے خطرہ بھی کم ہو گیا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے باہر جھانکا۔ تبھی روبیر بولی ”شہباز تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟“

”نہیں... ایرٹ کہاں ہے؟“

”وہ ابھی اسی عمارت میں خفیہ دروازے ڈھونڈ رہا ہے۔ میں نے جب باہر چلنے کو کہا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر

		۱۰۰۰	۹۰۰	۸۰۰	۷۰۰	۶۰۰	۵۰۰	۴۰۰	۳۰۰

ان اٹھائیس حروف ابجد کو چاند کی اٹھائیس منازل پر منطبق کر کے ہر منزل کا ایک الگ حرف مقرر ہوا اور ہر حرف کی ایک خاص تاثیر متعین کی گئی۔ انہی تاثیرات کے علم پر جفر کی مشہور و معروف شاخ علم الآثار کو استوار کیا گیا۔ اوراد و نقوش علم الآثار کے اصول و قواعد کے مطابق ہی ترتیب پاتے ہیں۔ اوراد میں وہ وظائف بھی شامل ہیں جو کلام پاک کی آیات سے لے کر علم الآثار کے مطابق مختلف تاثیرات پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بعض آیات قرآنی کے حروف کی ابجدی قدریں مجمل کر کے نقوش ترتیب دیے جاتے ہیں اور مختلف مطالب کے حصول اور اخذ کرنے کے کام آتے ہیں۔ علم الاخبار علم جفر کی دوسری بڑی اور مشہور شاخ ہے۔ اس علم کے اصول و قواعد کے مطابق حروف سوال سے حروف جواب پیدا کر لیے جاتے ہیں اور اس طرح ماضی حال مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔ علم جفر کے بارے میں جو تحقیق کی گئی ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی ابتداء عبرانیوں سے ہوئی ہے۔ وہی اس علم کے مؤجد تھے لیکن جس نوعیت میں یہ موجودہ دور میں رائج ہے اس کے بانی عرب ہیں۔ بعض حضرات اسے آنحضورؐ، حضرت علیؓ اور حضرت امام جعفرؒ صادق جیسی شخصیات سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے دو رسائل ''جفر'' اور ''جامع'' نام سے تصنیف کیے تھے۔ جن میں ماضی، حال اور مستقبل کے حالات مندرج تھے۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی۔ مانسہرہ

دیا تھا کہ جب ہمیں اندر رہنے کے لیے کہا گیا ہے تو میں باہر نہیں جاؤں گا۔ اس بات پر میں غصے میں اکیلی ہی باہر آ گئی۔''

''یہ بات ہے تو غلط ہے کہ میرے منع کرنے کے باوجود تم باہر آ گئیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن تمہارے آنے سے مجھے مدد مل گئی اور میں نے اپنے ایک بڑے دشمن کو مرتے ہوئے دیکھ لیا۔''

''اچھا یہ وہی ڈیوڈ شا تھا...... مبارک ہو۔''

''نہیں۔''

''اوہ...... وہ ابھی تک بچا ہوا ہے۔''

''فکر کی بات یہ ہے کہ وہ سمیرا کے قلعوں کی طرف گیا ہوا ہے۔ مجھے یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ کہیں وہ کوئی بدمعاشی نہ کرے۔''

''وہاں سمیرا کی پوری فوج ہے۔''

''اس کے پاس جو ہتھیار ہیں ان کی تباہ کاریاں تو تم نے بھی دیکھی ہوں گی... اب بتاؤ کیا سمیرا کی فوج ان کا مقابلہ کر پائے گی؟''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی ''اس والی عمارت میں تو یہ لوگ تھے۔ اس والی میں کون ہیں؟ ان کی خبر لی؟''

اس کے یاد دلانے پر مجھے خیال آیا کہ اس عمارت کی بھی خبر لینا ضروری ہے۔ اس عمارت میں ہے کون؟ انہوں نے میری مدد کیوں کی؟

''تم ایرٹ اس کے پاس جاؤ میں اس عمارت کو چیک کرتا ہوں لیکن خدا کے لیے میرے پیچھے مت چلی آنا۔ پتا نہیں اس عمارت میں کون لوگ ہیں۔'' کہہ کر میں سیڑھیوں سے نیچے کی جانب چلا۔ اب فائرنگ رک چکی تھی۔ پھر بھی میں احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی بہ مشکل دس قدم چلا ہوں گا کہ ادھر سے فائر ہوا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی یا میری موت ابھی نہیں تھی۔ میری نظریں اس عمارت پر تھیں اور میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ زمین میں گڑے ایک اونچے پتھر سے پیر الجھ گیا اور میں گرتے گرتے بچا اور یہی ٹھوکر کام آ گئی۔ گولی سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے اسی وقت خود کو زمین پر گرا دیا اور چیخ کر بولا ''میں دوست ہوں۔''

''کوڈ نیم؟'' ادھر سے سوال ہوا۔

اب میں کوڈ نیم کیا بتاتا کیوں کہ خود مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ہیں کون۔ اس لیے میں نے چیخ کر کہا ''پہلے تم بتاؤ کون

ہو؟‘‘

’’ہم تمہاری موت ہیں۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے پھر گولی چلا دی۔ میں پہلے ہی ہوشیار تھا۔ جیسے ہی رائفل کی نال بلند ہوتے دیکھی فوراً ہی خود کو زمین پر آگے کی سمت گھسیٹ لیا اور یہی حکمت عملی کام کر گئی۔ گولی کافی اوپر سے گزر گئی۔ اب یہ اور بات تھی کہ دوسری بار گولی چلانے والا اس رخ پر فائر نہیں کرتا اور نال کا رخ زمین کی طرف رکھتا تاکہ میں بہ آسانی ملک عدم کوچ کر جاؤں۔ مگر مجھے مرنا نہیں تھا اس لیے تیزی سے کرولنگ کرتا ہوا اسی جانب بڑھا۔ وہ عمارت قریب آ گئی تھی۔ میں اس میں داخل ہوتا کہ ادھر سے ایک بار پھر گولیوں کا مینہ برسا۔ ایک ساتھ دو گن کا استعمال ہوا تھا۔ دونوں نے برسٹ چلایا تھا۔ اگر میں سیڑھیوں کے عین نیچے نہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی میرے جسم میں روشندان کھول چکی ہوتی۔ فائر کرنے والے عمارت کے اندر تھے اور عمارت کی کھڑکیاں اونچائی پر بنی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہاں سے نال کا رخ اس رخ پر مڑ نہیں سکتا تھا جہاں میں کسی بھیگے چوہے کی طرح دبکا ہوا تھا۔ گولیوں کی باڑ میرے عقب میں صرف دو ہاتھ کی دوری پر برسی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اگر میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو گولیاں ضرور میرے جسم کے مختلف حصوں کو چومیں گی اس لیے میں جہاں تھا وہیں دبکا رہا۔ اگلے قدم کے بارے میں غور کرتا رہا۔ یہاں آ کر میں کسی چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ اب نہ آگے جا سکتا تھا اور نہ پیچھے مڑ سکتا تھا۔ اب کروں تو کیا کروں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظریں گھما کر فرار کا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ جہاں چاہ وہاں راہ۔ مجھے سیڑھیوں کے پیچھے والی جگہ زیادہ محفوظ نظر آئی اور میں نے ادھر کھسکتے جانے کی سوچ لی۔

سوچنا بہت آسان ہے مگر اس سوچ کو حقیقت کا روپ دینا اتنا ہی مشکل ہے۔ میں اگر مڑتا تو مجھے پیر سیدھا کرنا پڑتا اور اس طرح میں نچلی سیڑھی کے نیچے والی جگہ سے باہر آ جاتا۔ جب باہر آتا تو اوپر سے گولیوں کی صورت میں شاباشی ملتی جو موت کا پیغام دیتی۔ مگر رسک تو لینا ہی تھا۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ میرے جسم کا کوئی بھی حصہ زیادہ نہ پھیلے۔ اس کوشش میں کافی وقت نکل گیا۔ چیونٹی کی رفتار سے میں نے جسم کو موڑا اور پھر اسی سمت میں رینگنے کی کوشش کی۔ ایک ایک انچ کر کے میں نے تقریباً دو ہاتھ کا فاصلہ طے کیا۔

اوپر بالکل خاموشی تھی۔ یا تو میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا یا پھر وہ میری تنگ ودو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بات جو بھی ہو لیکن فائر نہیں ہو رہا تھا۔ اسی وقفہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں دس ہاتھ چوڑی سیڑھیوں کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ یہ وقت اتنا بھاری تھا کہ ہر انچ کے بعد مجھے لگتا جیسے ابھی گولی چلی کہ چلی۔ سیڑھیوں کے آخری سرے پر پہنچ کر میں نے خود کو موڑا اور پھر سرعت سے اس کونے کی طرف بڑھا جو عمارت کے عقب کی طرف جانے کا راستہ تھا۔

میں تیزی سے اس طرف بڑھ رہا تھا جو مجھے اس عمارت کے عقب میں لے جاتا۔ مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اندر والے اتنے بے پروا کیوں ہیں کہ عقب کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ادھر بھی کسی نہ کسی کو ہونا چاہیے تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ ادھر نظر رکھنے والا خاموشی سے میری کارگزاری دیکھ رہا ہو کہ میں اب کیا کرتا ہوں پھر جب میں اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا تبھی وہ فائر کرے گا۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں عمارت کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ہنسی آ گئی۔ جد وجہد بیکار گئی تھی۔ ادھر ایک اونچی دیوار کھڑی تھی۔ یہ دیوار اس عمارت سے متصل تھی جس میں ڈیوڈ شا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ دیوار اس انداز میں تعمیر ہوئی تھی کہ دونوں عمارتوں کے درمیان کی جگہ بند گلی بن گئی تھی۔ میں نے متلاشی نظروں سے عمارت کا جائزہ لیا۔ صرف ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی جو کافی بلندی پر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ کھڑکی کمرے میں عام اونچائی پر بنی ہوئی ہو لیکن عمارت اونچائی پر تعمیر ہوئی تھی اس لیے کھڑکی بھی زمین سے کافی اونچائی پر تھی۔ وہاں تک پہنچنا ناممکن سی بات تھی۔ میں نے واپسی کا سوچا تھا کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دوسری عمارت کی دیواروں میں آرائشی پتھر لگے ہوئے تھے مگر اس ترتیب سے کہ ان کا سہارا لے کر کوئی بھی اوپر جا سکتا تھا۔ میں نے سہارا لیا اور اس پر چڑھتا چلا گیا۔ میرے لیے یہ کام بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ شاید بنانے والے نے اسی مقصد سے اسے بنایا ہو کیونکہ بالکل سیڑھیوں کی طرح پتھر ابھرے ہوئے تھے اور ان پر بہ آسانی چڑھا جا سکتا تھا۔ سہارے کے لیے اس سے اوپر کے پتھر کو پکڑا جا سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں دیوار تک پہنچ گیا اور پھر دیوار سے ہوتا ہوا اس کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اب صرف اس دیوار سے کھڑکی کے اوپر بنے چھجے پر کودنا تھا۔ اندر مسلح افراد تھے۔ وہ دھمک سن کر ادھر متوجہ ہو سکتے تھے۔ لیکن رسک تو لینا ہی تھا۔ وہ میں نے لے لیا۔ ایک ہی چھلانگ میں چھجے پر اتر گیا۔ اندر اب تک خاموشی تھی۔ فائرنگ کرنے والے پتا نہیں کیوں خاموش

تھے۔شاید وہ دروازے کی پہرے داری میں مشغول تھے۔ان کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی کھڑکی سے بھی آسکتا ہے۔کچھ دیر تک میں دم سادھے چھجے پر بیٹھا رہا۔جب کسی قسم کی کوئی آہٹ محسوس نہ ہوئی تو میں نے سر جھکا کر کھڑکی میں جھانکا۔کمرا بالکل خالی تھا۔اطمینان ہوتے ہی میں نے دونوں ہاتھ سے چھجے کو تھاما اور ہاتھوں کے سہارے لٹک گیا پھر جسم کو موڑ کر پیر کو کھڑکی کے کگار پر جمایا اور اندر کود گیا۔اس موقع پر جمناسٹک کا تجربہ کام آگیا تھا۔

اندر پہنچنے کے بعد میں نے سن گن لینے کی کوشش کی مگر ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی ذی روح موجود نہیں۔میں نے اندر کا مکمل جائزہ لینے کی ٹھانی کہ فائر کرنے والے کس کمرے میں ہیں۔انہیں ڈھونڈنے کے لیے میں دبے پاؤں اندر کی طرف بڑھا۔

کمرے میں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔کمرے کا دروازہ بند تھا۔میں نے اس دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔دروازہ کھل گیا۔وہ کمرا بھی خالی تھا مگر اس میں پہلے کمرے کی نسبت زیادہ اندھیرا تھا۔اگر کوئی کھڑکی ہوتی تو شاید روشنی اندر تک آتی۔اس کمرے کو پار کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا کہ ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔کسی کے حرکت کرنے کی آواز۔اس آواز نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔میں نے کان آہٹ پر لگا دیے تھے۔اس وقت میرے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔اتنے میں وہی آواز پھر سنائی دی۔میں نے خود کو ایک ستون کی آڑ میں کر لیا۔اور پھر وہ پستول نکال لیا جو باسو سے چھینا تھا۔آواز وقفے وقفے سے آرہی تھی۔میں اضطراری کیفیت میں کھڑا سنتا رہا۔چند ثانیے بعد ہی وہ آواز اس کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔دروازہ نیم وا تھا لیکن گزرنے والا اتنی تیزی سے گزرا تھا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کون ہے۔عورت ہے کہ مرد ہے۔

میں نے کچھ توقف کیا پھر دروازے کو تھوڑا سا کھولا اور گردن نکال کر نیم اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔باہر گلیارا تھا جو خالی پڑا تھا۔میں خالی گلیارا دیکھ کر حیران رہ گیا۔اگر کوئی شخص تھا تو کہاں گیا۔اتنی جلدی غائب ہو جانا خلاف عقل بات تھی۔اتنی جلدی اتنے بڑے گلیارے کو پار کرنا آسان نہ تھا۔اس کے معنی یہی تھے کہ وہ جو کوئی بھی تھا۔سامنے کے دونوں کمروں میں سے کسی ایک میں داخل ہو کر چھپ گیا تھا۔شاید وہ میرے لیے پھندا بن جانا چاہتا تھا۔میں نے باہر قدم نکالا۔اس نیم تاریک گلیارے میں آگے بڑھا تھا کہ اچانک کسی نے جست بھری اور مجھ پر آپڑا۔اس نے میری گردن کے گرد شکنجہ سا کس لیا تھا۔

وہ اچانک ہی حملہ آور ہوا تھا اس لیے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔میں جھونک میں نیچے گر گیا تھا۔لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ میری گردن آزاد ہو گئی تھی۔میں نے جھٹکا دے کر خود کو آزاد کر لیا تھا۔مگر ابھی اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ وہ پھر مجھ پر آپڑا تھا۔لیکن اس بار میں غافل نہیں تھا۔وہ جیسے ہی میری گردن کو پکڑنے کے لیے جھکا میں نے ٹانگوں کا زور لگا کر اسے اچھال دیا۔وہ بھد سے فرش پر گرا تھا مگر اتنی ہی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہم پھر سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔

اندھیرے میں ہماری یہ کشتی خاصی عجیب تھی۔اس لیے کہ وہ بہت پھرتیلا ثابت ہو رہا تھا۔بار بار میری پکڑ میں آکر نکل جا رہا تھا۔ابھی میں خود کو آزاد کرانے کے بعد سانس بھی نہ لے پایا تھا کہ یہ افتاد آپڑی تھی۔اس نے الٹ کر اپنی پیٹھ پر مجھے لاد لیا تھا۔اور ہاتھ الٹا کر کے میری گردن پھنسا لی تھی۔مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کیونکہ یہ داؤ خاص میری ایجاد کردہ تھی۔اس سے نمٹنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی ''اف کیسا سخت جان ہے تُو۔''

یہ ایک ایسی آواز تھی جسے سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔میں نے الٹے ہاتھ کی انگلی اس کی پسلیوں پر مار کر کہا۔''تیرا بیڑا غرق......چھوڑ مجھے یہ میں ہوں۔''

میری آواز سنتے ہی اس نے مجھے چھوڑ دیا لیکن چند سیکنڈ کے لیے۔اس نے فوراً ہی سیدھے ہو کر مجھے جکڑ لیا اور چلایا ''بیڑا تو میں تیرا غرق کروں گا۔صبح سے تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہوں۔''

''تجھے آنے کا کہا کس نے تھا۔کیا میں نے دعوت نامہ بھیجا تھا۔'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''تجھ پر رحم کھانا حرام ہے مجھے تو سویرا بھابی پر رحم آگیا تھا اسی لیے چلا آیا۔''

''اب اگر آہی گیا ہے تو یہ بتا تیرے ساتھ اور کون کون ہے اور مجھ پر فائر کس نے کیا تھا؟''

''کب....تم پر کب فائر ہوا تھا؟''

''کچھ دیر پہلے جب میں دروازے سے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''مگر ادھر تو تیرے پرانے یار ڈیوڈ شا کے لوگ تھے۔''

''وہ تھے...اب سب جہنم میں ڈنر کی تیاری کر رہے

ہوں گے۔"

"گویا حضرتِ مغالطہ نے کام دکھا دیا۔ دو گھنٹے سے میں اور احمد شاہ ادھر بیٹھے گندی نالی کے کیڑوں سے نمٹ رہے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے میں اسے مورچے پر بٹھا کر خود باتھ روم آیا تھا، شاید اسی درمیان تم نے اندر آنے کی کوشش کی ہو گی۔ احمد شاہ تمہیں پہچانتا نہیں ہے۔ وہ سمجھا ہو گا کہ تم بھی ڈیوڈ شا کے آدمی ہو.... آؤ میں اس سے ملواتا ہوں۔" کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور میں کھنچتا چلا گیا۔

دوسرے کمرے میں ایک اونچی ٹیبل پر رائفل لیے ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر میدان میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ سفیر نے اسے آواز دی "او شاہ کے بچے یہ تو کیا کرنے جا رہا تھا۔"

"کیا ہوا جی؟" اس نے سر موڑ کر سوال کیا اور مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"جانتا ہے یہ کون ہے؟ ابھی کچھ دیر پہلے تُو اسے اوپر پہنچانے کے لیے گولیاں برسا رہا تھا..... ابے تجھے خبر نہیں یہ موت کا جگری دوست ہے۔ یہ شہباز ہے۔"

"شہباز...." اس نے ایسے کہا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ پھر وہ دوڑتا ہوا میرے قریب آیا اور بولا۔ "آپ کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی جی.... میں صرف آپ کو قریب سے دیکھنے کے لیے عبداللہ صاحب کی منتیں کر کے یہاں آیا ہوں... یقین کریں جی میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں... اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دیں جی۔"

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا "خوش رہو یار... عبداللہ کہاں ہے؟" میں نے آخری جملہ سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ..!" اس نے ہنستے ہوئے کہا "اس وقت خدمت کے لیے محبوب محبوبہ کے حضور دست بستہ کھڑا ہو گا۔"

"کیا؟ راجا صاحب بھی آئے ہوئے ہیں؟" میرے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"جی ہاں اور اس وقت راجا صاحب گانا گا رہے ہوں گے، بچپن کی محبت کو دل سے نہ بھلا دینا... اب یاد میری آئے تو مجھ کو سلا دینا.. سر میرا دبا دینا... تھپکی دے کے سلا دینا۔" اس نے واقعی گانے کی تان لگائی تھی۔

اس کے اس انداز پر میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اس کا مطلب ہے، راجا صاحب بھی وادی میں آچکے ہیں۔"

"وہ آچکے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی..... وہ بنفسِ نفیس موجود ہیں بلکہ عشق کے امتحان کا پرچہ حل کر رہے ہیں۔ سامیرا کی مہمان نوازی کا مزہ لے رہے ہیں۔"

"لیکن ان کی تو طبیعت خراب تھی۔" میں نے پوچھا۔

"یہ بات غلط نہیں ہے۔ واقعی ان کو کینسر ہے اور شاید آخری اسٹیج پر ہے۔ گھر والے نکلنے نہیں دے رہے تھے لیکن یہ فرار ہو کر پہلے اسلام آباد گئے اور پھر وہاں عبداللہ کو بلا کر سب کو جمع کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ بستر پر مرنے سے بہتر ہے کہ میدانِ عمل میں مرا جائے۔"

"یعنی وہ خودکشی کے لیے نکلے ہیں۔ اس حالت میں انہیں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

"یہ بات سب نے سمجھائی مگر راجا صاحب اڑ گئے کہ شہباز وہاں اکیلا ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ انہیں یہ حکم برف والے نے دیا ہے۔ پتا نہیں یہ برف والا، قلفی والا کہاں سے پیدا ہو گیا۔" سفیر اپنے رو میں بولتا چلا گیا۔

"برف والا نے اگر انہیں بھیجا ہے تو یقیناً وہ کسی مقصد سے ہی آئے ہیں۔"

"اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"جب آئے تھے تو بہت خراب تھی لیکن اب محبوبہ دلنواز کی صورت دیکھ کر۔ نظروں سے نظریں ملا کر خاصے بہتر ہو چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ایک دن میں ہی صحت یاب ہو گئے ہیں... یقین کرو رات میں ملاقات ہوئی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔"

"اب شاید یہاں ڈیوڈ شاہ کا کوئی بندہ رہا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی سب سیمرا کی طرف چلے گئے۔ اب ہمیں بھی ادھر جانا ہو گا۔"

"اگر ایسا ضروری ہے تو چلو۔ ویسے بھی یہاں صرف ہم دو ہیں۔ آرگون شہر کے فصیل پر وسیم اور عبداللہ کا ایک بندہ ہے۔ اسے بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

"عبداللہ کتنے ساتھیوں کے ساتھ آیا ہے؟"

"اس کے ساتھ صرف دو بندے ہیں۔ ایک یہ احمد اور ایک فتح دین باقی ہم سب ہیں۔"

میں نے قلعے کی طرف جانے کا فیصلہ تو کر لیا تھا مگر یہاں آرگون میں جو لوگ میرے ساتھ آئے تھے ان کی خبر گیری بھی ضروری تھی۔ ایرٹ...... ریک...... ایزارٹ...... ایمار...... مارث...... رائٹون اور روبیر کو بتانا بھی تھا کہ میں قلعے کی طرف جا رہا ہوں۔ پھر یہاں کے انتظامات بھی

سنبھالنا تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بڑا پجاری تو بھاگ گیا ہے لیکن چھوٹے پجاریوں کی ایک بڑی تعداد ابھی بھی معبد میں ہے۔ ان کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا تھا۔

یہ کچھ سوچ کر میں نے سفیر سے کہا ''ایسا کرو تم یہیں ٹھہرو اتنی دیر میں میں ایک دو لوگوں سے ملاقات کر لوں۔ شہر میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو یہاں کے بادشاہ ریناٹ اور مہا پجاری سے نفرت کرتے ہیں۔ ان معصوم لوگوں کا بھی کچھ انتظام کرنا ہوگا۔ جہاں اچھے لوگ ہوتے ہیں وہاں بدفطرت بھی ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ کہ عام لوگ ریناٹ کی شکست کا سن کر لوٹ مار کرنے لگیں۔''

''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو اس لیے کہ اب وسیم اور دیگر ساتھیوں سے دور رہا نہیں جا رہا ہے۔''

سفیر کو احمد شاہ کے پاس چھوڑ کر میں اس عمارت سے باہر نکلا اور اس والی عمارت میں داخل ہو گیا جس میں روبیر کو چھوڑا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ روبیر سامنے والے کمرے میں نہیں تھی۔ اس کی تلاش ضروری تھی۔ وہ عجیب فطرت کی تھی۔ کہیں اس نے پھر کوئی فیصلہ نہ کر لیا ہو۔ مجھے تلاش کرنے نہ نکل پڑی ہو۔

یہ سوچتا ہوا میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں بھی وہ نہیں تھی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ اس لیے کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں نہ پڑ گئی ہو۔ باہر گولیاں چل رہی تھیں۔ ایسے وقت میں اسے نکلنا نہیں چاہیے تھا مگر جس پاگل پن کا اس نے تھوڑی دیر قبل مظاہرہ کیا تھا اور باسو سے مقابلے کے وقت منظر نامے میں گھس آئی تھی۔ ایسا وہ دوبارہ بھی کر سکتی تھی۔ اسے ڈھونڈنا ضروری تھا اور میں اس کمرے اس کمرے میں بھاگتا رہا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں آخری کمرے میں چلا آیا اور وہاں پہنچ کر میرے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ سامنے کی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ عقبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ وہ کھڑکی تینوں عمارت کے عقب میں کھل رہی تھی۔ اگر ایک کھڑکی سے باہر نکلا جاتا تو دوسری عمارت تک بہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔ اور اہم بات یہ تھی کہ درمیانی عمارت کے عقبی طرف اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اس عمارت کی کھڑکی کمرے کے حساب سے زیادہ اوپر نہیں تھی لیکن دوسری طرف کی زمین کافی نیچے تھی کیونکہ عمارت زمین سے کچھ کم بلندی پر تعمیر کی گئی تھی۔ اگر روبیر یہاں سے کسی طرح نیچے اتری ہوگی تو بہ آسانی دوسری عمارت میں داخل ہو گئی ہوگی۔ ایرٹ بھی اس عمارت میں ہے۔ کہیں دونوں مل کر مجھے تلاش کرتے ہوئے باہر نہ آ جائیں اور سفیر کو دشمن سمجھ کر الجھ نہ پڑیں اس خیال کے ساتھ ہی میں نے ادھر سے ہی اترنے کی ٹھان لی مگر کھڑکی کافی بلندی پر تھی۔ کود کر نیچے اترا نہیں جا سکتا تھا۔ کسی چیز کا سہارا لینا ضروری تھی۔ ایسی کسی چیز کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مگر وہاں ایسی کوئی شے نہیں تھی جس کا سہارا لیا جا سکتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے اللہ کا نام لیا اور کھڑکی سے لٹک گیا پھر ہاتھ چھوڑ دیا۔

چوٹ آئی ضرور لیکن اتنی شدید نہیں کہ میں چل نہ سکوں۔ لنگڑاتے ہوئے میں اس عمارت کی طرف چل پڑا۔ چکر دار گول سیڑھیاں طے کر کے میں اوپر پہنچا۔ اوپر جاتے ہی دل خوش ہو گیا۔ وہ دونوں بیٹھے کسی قسم کا مشروب پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایرٹ نے کہا ''آپ کو کامیابی مبارک ہو۔''

اس کے مسکراتے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے جواب دیا ''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''روبیر نے بتایا کہ آپ کا ایک بڑا دشمن مارا گیا۔ پھر باہر سے دھماکے بھی سنائی نہیں دے رہے ہیں۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ نے دوسری عمارت کے لوگوں کو بھی قابو کر لیا ہے۔ آپ جادوگر ہیں جادوگر۔''

اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے میں نے ہنس کر کہا۔ ''تمہارا اندازہ صحیح ہے کہ حالات اب ہمارے قابو میں ہیں۔ دوسری عمارت میں موجود افراد ہمارے اپنے لوگ تھے۔ چلو ہم ان کی طرف چلتے ہیں۔''

''پہلے آپ یہ تو پی لیں۔ یہ نہایت مقوی مشروب ہے اور اسے صرف امیر کبیر لوگ ہی پی سکتے ہیں۔ بہت قیمتی ہوتا ہے لیکن یہاں اس کے بے شمار مرتبان رکھے ہیں۔'' کہتے ہوئے روبیر نے پیالہ میری طرف بڑھایا۔

''یہ ہے کیا؟'' میں نے پیالہ لے کر مشروب کو سونگھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ایک خاص پھل کا رس ہوتا ہے جسے دودھ میں ابالا جاتا ہے۔''

میں نے مشروب کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔ نہایت ذائقہ دار اور دل خوش کن مشروب تھا۔ دو پیالہ پینے کے بعد میں نے کہا۔ ''اب چلو۔''

وہ دونوں میری تقلید میں باہر والے دروازے کی

طرف بڑھے۔ مجھے اب ڈر نہیں تھا کہ باہر کوئی خطرہ ہے اس لیے بلا جھجک میں باہر نکل آیا۔ اور پھر دوسری عمارت میں داخل ہوا۔ سفیر اور احمد شاہ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سفیر نے کہا ''بڑی دیر لگا دی۔ اب جلدی کریں۔ وسیم کو بھی ساتھ لینا ہے۔''

''یہاں سے ہم وسیم کی طرف جائیں گے پھر تم سمیرا کے قلعہ کی طرف چلے جانا۔ مجھے اب ان ساتھیوں کو جمع کرنا ہے جو آرگون میں ادھر ادھر چھپے ہوئے ہیں۔ ان بہادروں نے میرا بھرپور ساتھ دیا ہے پھر ان سے مزید کام بھی لینا ہے اس لیے انہیں جمع کرنا ضروری ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے باہر کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

آگے آگے میں تھا اور میرے پیچھے سفیر، احمد شاہ، ایرٹ اور روبیر۔ ہم سب اب کارخانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہاں جن لوگوں کو چھوڑا تھا انہیں ساتھ لینا ضروری تھا۔ ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ کارخانے کی عمارت سے نکل کر کوئی دوڑتا ہوا آتا نظر آیا۔ تھوڑا قریب آیا تو میں نے پہچان لیا کہ وہ مارٹ ہے۔ شاید اس نے مجھے آتے دیکھ لیا تھا اسی لیے تیزی سے دوڑتا ہوا قریب آرہا تھا۔

''یہ اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہا ہے۔ کہیں کچھ غلط تو نہیں ہوگیا؟'' ایرٹ نے خیال ظاہر کیا۔ اس کی بات غلط بھی نہیں تھی۔ یہاں پل پل حالات بدل رہے تھے۔ ڈیوڈ شا جہاں ہو وہاں ہر پل ایک نئی کہانی ہی جنم لیتی ہے۔ اب میں بھی شکوک میں گھر گیا تھا۔

''ایرٹ کی بات غلط نہیں ہے۔ ابھی بھی شہر میں رینالٹ کے جاں نثار بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ بھی میدان میں آسکتے ہیں۔''

روبیر کی بات نے میرے اندر ہیجان سا پیدا کر دیا۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ اب میں اپنی جگہ تھم گیا تھا اور اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مارٹ اب میدان کو پار کر رہا تھا۔ کچھ اور قریب آیا تو دل کو تھوڑی سی تقویت ملی کہ اس کے چہرے پر پریشانی نہیں تھی۔ وہ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے قریب آتے ہی کہا ''شہباز آپ کہاں تھے۔''

''کیوں.. کوئی خاص بات ہوگئی ہے کیا؟''

''بہت خاص... ہم نے جن لوگوں کو معصوم سمجھ رکھا تھا وہ سب خطرہ ثابت ہوئے ہیں۔'' مارٹ نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

''ہوا کیا جلدی بولو؟'' روبیر نے ٹوکا۔ اس وقت سفیر بالکل خاموش تھا۔ اس لیے کہ ایسے مقامی زبان کی سمجھ نہیں تھی۔ یہ تو برف والے کی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے کچھ ایسی قوت دے دی تھی کہ میں مقامی زبان کا مفہوم سمجھ لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی بات مقامیوں تک پہنچانے کے لیے مجھے کسی اور کا سہارا لینا پڑتا تھا کیونکہ مقامی زبان بول نہیں پا رہا تھا۔

''ہونا کیا ہے.... اندر والے کمرے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ اس میں معبد کے کچھ اہم لوگ چھپے ہوئے تھے۔ ہم سب کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کمرے میں کوئی خفیہ دروازہ بھی ہے اس لیے مطمئن تھے۔ وہیں ایک کمرے میں ہمیں خوراک کی بڑی مقدار مل گئی تھی۔ ایزارٹ کے کہنے پر ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر کھانا کھا رہے تھے کہ اندر والا دروازہ کھلا اور بھرا مار کر بہت سارے مسلح بندے باہر نکلے اور انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ وہ سب تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ موت اور زندگی کا سوال تھا اس لیے ہم سب مقابلہ کرنے لگے۔ کافی دیر تک یہ جنگ چلی اور ہم کامیاب ٹھہرے۔ وہ لوگ شکست کھا کر دوبارہ اسی راستے سے اندر چلے گئے۔ لیکن ہمارا بہت بڑا نقصان کر گئے۔''

''پہلیاں نہ بجھاؤ۔ سیدھے سیدھے بتاؤ نقصان کیا ہوا۔ ہم ایامِ جنگ میں ہیں۔ نقصان پر حیرت کیسی۔'' روبیر نے کہا۔

''ایمار اور شارٹ اب ہم میں نہیں رہے۔'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ وہ دونوں بہادری کی مثال تھے۔ اپنے وطن سے محبت کرنے والے۔ اپنی آزادی کی خاطر انہوں نے خود کو قربان کر دیا۔ ان کے بچھڑ جانے کا مجھے افسوس تھا لیکن جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''اب وہاں کون کون ہے؟''

''رائٹون اور ربیک نے اس کمرے میں مورچہ بندی کر رکھی ہے۔ ایزارٹ دروازے پر ہے۔ ہم سب آپ کے آنے کی دعا کر رہے تھے۔ آپ ہوتے ہیں تو ہمارے حوصلے سوار رہتے ہیں۔ جلدی سے اندر چل کر ان لوگوں کو تسلی دیں اور تہہ خانے کا دروازہ کھول کر ان غداروں کو باہر نکالیں۔''

''چلو۔'' کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیئے۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر میں انہیں باہر نکالنے میں لگ جاتا ہوں تو ادھر

ڈیوڈ شا اور اس کے گرگے جو پتا نہیں کون سا کھیل کھیلنے کے لیے سامیرا کی سرحد پر جمع ہیں۔ کہیں وہ کوئی ایسا تماشا نہ لگا دیں اور سامیرا کے نہتے لوگ موت کا شکار ہو جائیں۔ گوکہ وہاں عبداللہ بھی ہے اور راجا صاحب بھی لیکن راجا صاحب یقیناً بستر پر ہوں گے۔ عبداللہ سمیرا کے لوگوں کی زبان سمجھ نہیں پائے گا اور نہ انہیں کنٹرول کر سکے گا۔ سامیرا کے فوجی ڈیوڈ شا کے آتشی اسلحوں کا مقابلہ بھی نہیں کر پائیں گے۔ اگر میں تہہ خانے میں چھپے لوگوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں تو یہ پیچھے سے حملہ کر کے ڈیوڈ شا کو مضبوط بنا دیں گے۔ یعنی کہ دونوں محاذ میرے لیے اہم تھے۔ ان دونوں میں سے کس پر توجہ پہلے دوں یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں اس عمارت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اب کارخانہ بہت نزدیک آ چکا تھا۔ اس کے سامنے ہی معبد کا وہ حصہ تھا جہاں میں نے ایک خونی جنگ لڑی تھی۔ کارخانے میں داخل ہوتے ہوئے میرے ذہن میں ایک گونج سی ہوئی اور میں نے پلٹ کر سفیر کو دیکھا۔ وہ چاروں جانب دیکھتا ہوا۔ احتیاط بھری نظروں سے جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر بولا ”تم نے یہ عمارت دیکھ لی.... یہ ہمارا ہائیڈ پلیس ہے یا یہ سمجھ لو کہ اس وقت ہیڈ کوارٹر ہے۔ اور وہ والی عمارت بہت اہم ہے۔ اس عمارت کے نیچے جو تہہ خانہ ہے اس میں پتا نہیں کتنے لوگ چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں یہاں کے تقریباً تمام اہم شخصیات شامل ہیں۔ ان کو باہر لانا بھی ضروری ہے۔“

”جو لوگ اندر بند ہیں انہیں آپ کیسے باہر لائیں گے۔“

”ابھی سوچا نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ تم وسیم کے پاس چلے جاؤ۔ اس کو بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں اور یہ خبر سامیرا کے یہاں بھی پہنچا دو۔ ان سے نمٹ کر میں ادھر ہی آؤں گا۔“

سفیر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔ پھر وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔ میں جناب محترم کو یہاں اکیلا چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اماں میاں میں تو تمہیں قبر میں بھی اکیلا اترنے نہیں دوں گا۔ گورکن سے ریکوئسٹ کروں گا کہ مجھے بھی پائینتی میں سلا دے۔“

”یار سمجھنے کی کوشش کرو۔ دونوں محاذ اہم ہیں۔ اگر میں ان لوگوں کو چھوڑ دیتا ہوں تو یہ بعد میں کوئی نہ کوئی پھڈا کھڑا کریں گے۔ کیونکہ ان میں رینالٹ اور اس کی کابینہ کے لوگ بھی ہیں جنہوں نے ڈیوڈ شا کو پناہ دے رکھی ہے۔ اور ادھر خود ڈیوڈ شا ہے۔ خطرہ دونوں جانب یکساں ہے اس لیے عقلمندی کا تقاضہ ہے کہ ہمیں دونوں جانب یکساں توجہ دینا چاہیے۔ بس تم دیگر ساتھیوں کو میرے مل جانے کی خبر کر دو۔ اور ہاں... وسیم سے کہنا وہ اپنا مورچہ کسی حال میں نہ چھوڑے۔ ڈیوڈ شا کو وہیں الجھائے رکھے۔“

میری بات معقول تھی۔ سفیر کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا ”ٹھیک ہے میں ایسا کرتا ہوں کہ ان کو خبر کر کے یہیں لوٹ آؤں گا۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال میری جان چھوڑو اور جا کر ان لوگوں کو خبر کرو تاکہ وہ سب مطمئن ہو جائیں۔“ میں نے لہجے کو کرخت بنا کر حکمیہ انداز میں اسے مشورہ دیا۔

”ٹھیک میں جا رہا ہوں مگر یاد رکھنا ابھی تمہارے ساتھ یہ جو محترمہ ہیں ان کی تصویر میں نے اتار لی ہے۔ راجا صاحب کے پاس جو فون ہے وہ سیٹ لائٹ قبیل کا ہے۔ اس کا ایک بوسٹر وہ اوپر لگا کر آئے ہیں اس لیے اس سے باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔ اس فون کے ذریعہ یہ تصویر سویرا کو واٹس اپ کر دوں گا۔“

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سویرا کے پاس دو ہزار روپے والا فون ہے جس پر واٹس اپ تو دور رہا کیمرے کی سہولت بھی نہیں ہے۔“

حضور کے لیے اطلاعاً عرض ہے کہ سویرا کے پاس کوئی اور بھی ہے جس کو ہر روز میں واٹس اپ کرتا رہتا ہوں۔

”سویرا تمہاری باتوں کو تو ہوا میں اڑا دے گی لیکن میں نے صرف زبانی بھی اطلاع دے دی تو کون سا طوفان آئے گا اس کا اندازہ تمہیں بخوبی ہوگا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ اس نے سر ہلا کر معصوم سے انداز میں کہا ”پتا نہیں دوسروں کی بیگمات تمہاری باتوں پر اندھا اعتماد کیوں کر لیتی ہیں۔ واپس جا کر میں اس پر ریسرچ ضرور کروں گا۔ اچھا خدا حافظ میں وسیم کی طرف جا رہا ہوں۔“

”یہاں کے راستے، گلیاں تمہارے علم میں نہیں۔ بھٹک سکتے ہو اور یہاں قدم قدم پر خطرہ ہے۔ کوئی ہمارا حامی بھی زبان کی وجہ سے دشمن سمجھ کر الجھ نہ پڑے اس لیے اپنے ساتھ ایرٹ کو لے جاؤ۔ یہ مترجم کا کام بھی کرے گا۔“ پھر میں نے ایرٹ سے کہا کہ وہ سفیر کے ساتھ چلا جائے۔ اس کا ایک ساتھی کسی جگہ مورچہ بنائے بیٹھا

ہے۔اس کے پاس اسے جانا ہے۔

''چلیں۔'' ایرٹ فوراً راضی ہو گیا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر سفیر کی گن لینا چاہی تھی کہ سفیر اچھل کر دور ہو گیا۔

اس کی اس حرکت پر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے میاں بھائی یہ تمہارا وزن ڈھونے کی خواہش میں آگے بڑھا ہے۔اسے یہ ہتھیار بہت پسند آیا ہے۔یہ اس کے کندھے پر ٹانگ دو۔اس سے یہ ہوگا کہ اس کا حوصلہ بھی بڑھے گا اور یہ خود کو دوسروں سے برتر بھی سمجھے گا۔تم اپنی حفاظت کے لیے ریوالور ہاتھ میں پکڑ لو۔''

''او اچھا۔'' کہہ کر سفیر نے اپنی آٹومیٹک گن ایرٹ کے کندھے پر ٹانگ دی۔اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

اس کی خوشی دیکھ کر میں نے کہا ''ایرٹ یہ ہتھیار اب تمہارا ہوا لیکن اسے ابھی چلانا نہیں۔میں سکھاؤں گا تب چلانا۔ابھی اگر ضرورت پڑی تو ان صاحب کو ہی چلانے دینا۔''

''جی اچھا۔'' ایرٹ نے جواب دیا اور وہ دونوں فصیل کی جانب بڑھتے چلے گئے۔

میں نے بلند آواز میں ایرٹ سے کہا کہ وہ شہر سے کچھ لوگوں کو تیار کر کے ویم کے پاس پہنچا دے تا کہ پہرے داری میں اسے مدد ملے۔

''جی بہتر۔'' ایرٹ نے جواب دیا اور اپنی رفتار بڑھا دی۔

میں نے روبیر اور ہارٹ کی طرف دیکھا اور دوبارہ سے کارخانے کی جانب قدم بڑھا دیے۔میں وہاں موجود لوگوں سے ایک بار اور مشورہ کرنا چاہتا تھا کہ معبد کے تہہ خانے میں چھپے ہوئے لوگوں کو باہر نکالا جائے ورنہ یہ لوگ بڑی مصیبت کھڑی کر سکتے تھے۔کارخانے میں موجود باغی اور ہمارے ساتھی میری رائے کے خلاف نہیں جاتے پھر بھی میں اپنے طور پر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ان کے مشورے پر ہی ان غداروں کو سزا دینا بہتر تھا تا کہ کوئی الزام مجھ پر نہ آئے۔راجا صاحب کے آجانے کی وجہ سے مجھے تقویت ملی تھی۔مجھے یقین سا آ گیا تھا کہ میں اس دنیا سے بہ آسانی نکل جاؤں گا اور اپنی دنیا میں پہنچ کر مرشد سے نمٹوں گا اور پھر سے نارمل زندگی گزاروں گا۔اس لیے بھی میں جلد سے جلد اس قضیے کا اختتام کر دینا چاہتا تھا۔انہی سوچوں میں گم میں کارخانے تک آ گیا۔

اندر پہنچا تو وہ لوگ جو ابھی تک یہیں تھے اور شہر نہیں گئے تھے انہوں نے مجھے گھیر لیا۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سوچ لیا تھا کہ آنے والی نسلوں کے لیے ریناٹ جیسے ظالم شخص سے نجات حاصل کرنا ہے۔یہاں وہ لوگ بھی تھے جو حریت پسند تھے اور آزادی حاصل کرنے کی خاطر جان بھی دینے پر تیار تھے۔ان سب سے مل کر اپنے خاص دوستوں کی طرف بڑھا۔رائٹون نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''شہباز باہر کے حالات کیا ہیں؟ سامیرا کی فوج کب تک آ جائے گی؟''

''بہت جلد میرے دوست بہت جلد۔ظلم کا سورج غروب ہونے کو ہے۔ریناٹ اپنے خاص لوگوں کے ساتھ محل کے تہہ خانے میں چھپ گیا ہے۔اب ہمیں ان سب کو نکالنا ہے۔عوام کی عدالت میں انہیں پیش کرنا ہے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی۔چلو ہم سب اسے باہر نکالیں۔انہوں نے بڑا نقصان پہنچایا ہے ہمارے دو اہم ساتھیوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔اب اور زیادہ صبر نہیں ہوتا ہے۔سامیرا کو ہم تخت پر بیٹھا دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ غریبوں کو ان کا حق مل جائے۔''

اس وقت کمرے میں بہت سے افراد تھے۔یہ سب کے سب ریناٹ سے نجات چاہنے والے تھے۔ان سب کی خواہش تھی کہ سامیرا کو اس کا حق مل جائے۔ریناٹ جیسا حکمران تخت و تاج چھوڑ کر جان بچانے کے لیے تہہ خانے میں جا چھپا تھا۔ان لوگوں کے خیال میں اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر میں سمجھ رہا تھا کہ اصل خطرہ تو باقی ہے۔ایسا خطرہ جو ریناٹ سے کئی سو گنا بڑا ہے۔بلکہ ریناٹ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔وہ خطرہ ڈیوڈشا کی صورت میں وادی میں اتر چکا ہے۔ابھی اس سے نمٹنا باقی ہے۔وہ کوئی بکری کا بچہ بھی نہیں ہے کہ دوڑے اور اسے پکڑ لیا۔ڈیوڈشا سے نمٹنے میں دانتوں پسینا آنے والی بات تھی۔اس سے کیسے نمٹا جائے میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ رائٹون نے ٹوکا ''کس خیال میں ڈوب گئے۔بولو اب کیا کرنا ہے۔ریناٹ کو تہہ خانے سے کیسے باہر لایا جائے؟''

''یہ بتاؤ آگ لگانے والے روغن کے کتنے پیپے موجود ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً دس تو ہوں گے ہی۔''

''بس کافی ہے۔کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر محل میں چلو۔ریناٹ کو اس کے بل سے نکالنا ہی ہوگا۔''

''تو کیا آپ محل میں آگ لگائیں گے؟''

''بس دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔''

میں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک نیا طریقہ سوچا تھا۔گو کہ یہ مشکل تھا لیکن کامیابی کے چانس

زیادہ تھے۔ کیونکہ چوہے کو اس کے بل سے نکالے بغیر مارا نہیں جا سکتا۔ ریناٹ کو بھی اس تہہ خانے سے نکالنا ضروری تھا اس لیے کہ وہ یہاں کا راجا تھا۔ اب بھی اس کے حکم پر بہت سے لوگ سر کٹانے پر تیار ہو سکتے تھے۔ وہ کوئی بڑی مصیبت بھی کھڑی کر سکتا تھا پھر وہ ڈیوڈ شا کا ساتھ دے رہا تھا اور ڈیوڈ شا مجسم مصیبت تھا۔ اس کی جب تک گوشمالی نہ ہوتی کچھ بھی بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل کی طرف بڑھنے لگا۔

میرے ساتھ روبیر اور مارٹ تھے۔ ان کے پیچھے تقریباً دس افراد روغن کا پیپا پکڑے چل رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ آج ہر حال میں محل کے تہہ خانے سے ریناٹ اور اس کے لوگوں کو باہر نکالنا ہے۔ انہیں پابند سلاسل کرنا ہے، اسے کھینچتے ہوئے سامیرا کے پاس لے جانا ہے تا کہ وہ اسے عوام کے سامنے پیش کرے۔ دبے کچلے لوگ پہلے ہی سامیرا کے ساتھ تھے۔ مراعات یافتہ طبقہ جو اپنے مفاد کی خاطر ریناٹ کا ساتھ دے رہے ہیں وہ بھی اس کا انجام دیکھ کر دم سادھ لیں لیکن سوال یہی تھا کہ اسے باہر کیسے لایا جائے؟

محل پر قبضہ کے بعد میں نے ایک ایک کمرے کی تلاشی لی تھی۔ اس جگہ کو بھی دیکھا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہیں تہہ خانہ ہے۔ اس کمرے کا بڑی باریک بینی سے معائنہ کیا تھا لیکن اس کا فرش اس قسم کا تھا کہ اس پر گمان ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کمرے میں کوئی چور دروازہ بھی ہے۔ روغن اسی لیے لایا تھا کہ اس کے ذریعہ اگر فرش میں کہیں رخنا ہو گا تو پتا چل جائے گا۔ رخنا ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہاں دروازہ ہے۔ دروازے کے مقام کا تعین ہو جانے پر اسے کھولنے کا طریقہ کار ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ پھر روغن کی مدد سے انہیں ڈرادوں گا کہ تہہ خانے میں آگ لگا رہا ہوں۔ وہ اس دھمکی پر خوفزدہ ہو کر باہر آجائیں گے۔

جس وقت ہم محل میں داخل ہوئے وہاں موجود باغی سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ جہاں میں نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی وہ وہاں موجود تھے۔ ان میں وہ شخص جس کو میں نے وہاں کا سربراہ مقرر کیا تھا وہ ہمیں دیکھتے ہی نزدیک آگیا۔ میں نے اس سے کہا "یہ روغن کے پیپے باہر ہی رکھو۔" پھر میں اندر داخل ہو گیا۔

اندر بھی جس کی ڈیوٹی جہاں لگائی تھی وہ وہیں کھڑا تھا۔ سربراہ نے پیپے باہر رکھوا دیے تھے اور اب دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے مارٹ سے پوچھا "اب تک نہ تو تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے اور نہ ہی کسی اور طرف سے مزاحمت ہوئی ہے۔ قیدی سپاہی تعاون کی بار بار پیشکش کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔"

"ان کے بارے میں بھی فیصلہ جلد ہو جائے گا۔ سامیرا اپنے عظیم لشکر کے ساتھ آرگون آرہی ہیں۔ وہی ان کا فیصلہ کرے گی۔"

اس شخص نے سر تائید میں جھکایا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ یہاں کا فوجی آداب تھا۔ اپنی جگہ کھڑے ہو کر بولا۔ "ایک بات پوچھنی تھی۔"

"بولو۔" مارٹ نے رعبدار آواز میں کہا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے باہر سے عجیب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ کیسی آوازیں تھیں؟"

"ہماری آزادی کے دشمن۔ ظالم و جابر ریناٹ کے ایسے ساتھی جو باہر سے آئے ہیں۔ ان کے پاس آگ اگلنے والے ہتھیار ہیں۔ وہ اس سے ہمارے مظلوم عوام کو قتل کر رہے تھے کہ برف والے کے بھیجے ہوئے اس شریف انسان نے ان کا ہتھیار چھین کر ان پر حملہ کر دیا۔ یہ آواز اسی لڑائی کی تھی۔ دونوں اسی چنگھاڑنے والے ہتھیار سے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔"

"اچھا اسے برف والے نے بھیجا ہے۔ یہ تو ہمارے لیے مقدس ہوا۔ اب سمجھا، اسی لیے اس نے اکیلے ہی ریناٹ کو اتنی آسانی سے اس کی اوقات بتا دی۔" اس شخص کے چہرے پر خوشی چھا گئی تھی۔ یہاں والوں کے لیے برف والے کا نام ہی کافی تھا جسے سن کر ان کے سر جھک جاتے تھے۔

"ہمیں تہہ خانے کا دروازہ ہر حال میں کھلوانا ہے۔ آپ میں سے جس نے بھی اس دروازے کو دیکھا ہے وہ نشاندہی کر دے۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

میری بات سنتے ہی دو بندے بھیڑ سے نکل کر سامنے آگئے۔ ان میں ایک تو وہ سپاہی تھا جس نے ریناٹ کے فوجیوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا تھا۔ وہ پتھر گورسی میں باندھ کر لڑنے کا ماہر تھا۔ اس کا یہ فن میں نے جنگ کے وقت دیکھا تھا۔ جس پر حملہ کرتا تھا وہ اپنا دفاع کرنا بھول جاتا تھا۔ بڑی بے جگری سے لڑنے والا تھا اور دوسرا اس مقام کا محافظ تھا۔ پہلے وہ ریناٹ کی فوج کا سپاہی تھا پھر ہمارے ساتھ آملا۔ ایرٹ نے اس کی سفارش کی تھی۔ اس لیے اس پر سب نے اعتماد کر لیا تھا۔ اب تک اس کی کارگزاری بہتر تھی۔ میں نے اس سے کہا "بتاؤ کس جگہ وہ دروازہ کھلا

تھا۔''

''اس جگہ۔'' اس نے کمرے کے درمیان ایک جگہ کی نشاندہی کی۔ میں نے اس جگہ کا معائنہ کیا۔ فرش پر کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک بڑے سے پتھر کو کمرے کے فرش کے سائز پر کاٹ کر فٹ کیا گیا ہے۔ کہیں کوئی جوڑ یا رخنے کا نشان نہیں تھا۔ میں نے اس بندے کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس سے کہا۔ ''ایک پیپا اٹھا لاؤ۔''

دوڑتا ہوا گیا اور اسی تیزی سے پیپا اٹھا لایا۔ پھر میرے اشارے پر اس نے پیپا اتار کر وہاں رکھا۔ میں نے پیپے کا ڈھکن کھول کر ایک چلو روغن نکالا۔ اسے زمین پر پھینک کر بغور فرش کو دیکھا۔ سفید فرش پر سیاہ روغن پھیلتا جا رہا تھا۔ میری طرح دوسرے بھی اس روغن پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ تبھی میں نے وہ دیکھ لیا جو دیکھنا چاہتا تھا۔ روغن فرش پر بہتے ہوئے دور تک جا رہا تھا مگر ایک جگہ لکیر کی صورت میں جمع ہو گیا تھا۔ یعنی وہاں رخنہ تھا۔ فرش کو اس صفائی سے گھسا گیا تھا کہ وہ جوڑ کھلی آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا تھا مگر جب سیاہ تیل فرش پر گرا تو اس جوڑ پر جمع ہو گیا۔ اس نشان کو باری باری سے سب دیکھ رہے تھے اور میری عقلمندی کی تعریف کر رہے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ تہ خانے کے خفیہ دروازے کو کھولا کیسے جائے۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر مارشٹ نے مجھے مخاطب کیا ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''اسے کھولا کیسے جائے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ اتنے سارے روغن کے پیپے کس دن کام آئیں گے؟ آپ انہیں فرش پر گرا دیں۔ رخنے سے یہ اندر بھی گرے گا۔''

''اس کمرے کے فرش کو ڈبونے کے لیے کم سے کم دس پیپے کا روغن گرانا پڑے گا۔''

''جی ہاں...... اتنا تو گرانا ہی پڑے گا پھر اس میں آگ لگا دیں۔''

''اور یہ سوچا ہے کہ اس روغن میں جب آگ بھڑ کے گی تو کیا ہوگا؟ پوری عمارت جل اٹھے گی۔ کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ پھر وہ ہمارے دوست تو ہیں نہیں کہ ہمیں ان کی فکر ہو۔''

ہم ابھی بحث کر ہی رہے تھے کہ اوپر چوبارے سے آواز آئی ''بس شہباز ہم یہی چاہتے تھے۔ اسی لیے یہاں سے باہر نکل کر دور چلے گئے تھے کہ تم مطمئن ہو کر اپنے تمام آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر لو۔''

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ اوپر چوبارے میں آڑ لے کر زینی کھڑی تھی۔

''ڈیڈ کا حکم ہے کہ تمہیں فوراً ختم کر دیا جائے۔'' زینی نے ہنستے ہوئے ایسے کہا جیسے میرے مرنے کا مژدہ نہیں خوش خبری سنا رہی ہے۔

''مجھے مار دو گی، تم مارو گی، مگر کیسے؟'' میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

''میں اور میرے آدمی تمہیں ختم کریں گے بلکہ کہانی ختم ہونے ہی والی ہے۔ ادھر دیکھو.... دروازے سے روغن اندر بہتا ہوا آ رہا ہے۔ بس اس میں جلتی ہوئی مشعل پھینکوں گی اور کہانی ختم۔ اس لیے کہ چاروں دروازے پر میرے آدمی مشین گن لے کر کھڑے ہیں۔ جو جلنے سے بچ کر باہر نکلے گا اسے تحفہ میں گولیاں ملیں گی۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ باہر کے دروازے سے روغن بہتا ہوا اندر آ رہا تھا۔

[illegible] آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ جب سراب شروع ہوئی تھی اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کاشف زبیر اس کا اختتام نہیں کر پائیں گے۔ انہوں نے جو ابتدائی نوٹ بنا کر دیا تھا۔ کہانی اس سے کافی مختلف ہو گئی۔ جس کی وجہ سے بہت سے قارئین متواتر خطوط لکھنے لگے تھے کہ سراب کو ختم کر دیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ادارے سے ہوئے معاہدے کے مطابق انہیں کم سے کم تین قسط اڈوانس دینی تھی اور ابتدا میں وہ دیتے رہے تھے لیکن تقریباً ایک سال سے ماہ بہ ماہ قسط آنے لگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زیر نظر قسط کسی اور قلمکار سے لکھوانی پڑی۔ تمام قارئین کے لیے یہ قسط ایک چیلنج ہے۔ یہ قسط ایک ایسے مصنف سے لکھوائی گئی ہے جس کی بہت کم تحریر ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے کسی پرچے میں چھپی۔ قارئین ذہن پر زور دیں کہ یہ کس مصنف کی ہے۔ صحیح جواب دینے والے کو ادارہ مبلغ 5000 بطور انعام دے گا۔ اگر ایک سے زیادہ افراد نے صحیح نام بتائے تو انعامی رقم قرعہ اندازی سے تقسیم کر دی جائے گی۔

(نجمی رحمن برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

نوشین صدیقی............حیدر آباد

اس کی بیٹی کی بچ رہے عصمت
بیچتی پھرتی ہے جو اپنا تن

اسلم آرائیں............ایبٹ آباد

اپنی مٹی کا دیا توڑ نہ دینا یارو
جب کبھی چاند کو آنگن میں اترتا دیکھو

نسرین امتیاز علی............فیصل آباد

اب تک تری سرگوشیاں بجتی ہیں لہو میں
اب تک ترے بوسے مجھے تنہا نہیں کرتے

زویا اکبر............لاہور

انشاجی یہ اور نگر ہے اس دھرتی کی ریت یہی ہے
سب کی اپنی اپنی آنکھیں سب کا اپنا اپنا چاند

(نوشین صدیقی حیدر آباد کا جواب)

زنگی خان............پشاور

بہت عجیب روایت ہے یہ بزرگوں کی
کہ پگڑیوں کو سروں سے عزیز تر رکھنا

فراز احمد............شاہ جنگ

بعد از نماز مانگ رہے تھے زر و زمیں
سجدہ گزار لوگ بھی مطلب پرست تھے

زرینہ شاہ............بھیڑ کنڈ مانسہرہ

بوجھل نظر آتی ہیں بظاہر مجھے لیکن
کھلتی ہیں بہت دل میں اتر کر تری آنکھیں

(محمد مہتاب کوئٹہ کا جواب)

ظہیر علی سید............لاہور

پہرے میں ماہتاب کے شہر گلاب سے
موج ہوا نے شاخ کے زیور چرا لیے

(عبدالجبار انصاری لاہور کا جواب)

نزہت فراز............کراچی

وہی دست جنوں کی شکل میں پہنچی گریباں تک
وہی دیوانگی جو تیرے دیوانوں کے ہاتھ آئی

(زوبیہ الماس کراچی کا جواب)

امتیاز حسین............لاہور

مشکل کے مسافر کو آتا ہے یہ ہنر بھی
جگنو کی تمنا میں پوروں کو جلا دینا

عبدالجبار رومی............لاہور

ماں عمر بتا دیتی ہے اولاد کی خاطر
جیسے کہ مشقت کی سزا کاٹ رہی ہے

نجمہ علی گل............شیخوپورہ

مجھے یہ زعم کہ میں حسن کا مصور ہوں
اسے یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے

نرجس زیدی............لاہور

میرا سکوں یہی ہے کہ میں بے سکوں رہوں
میرے لیے نہ کوئی پریشاں ہوا کرے

افروز ملک............چنیوٹ

میں آج اس کے تصور میں مسکرا تو دیا
مگر فکر ہے کہ کس کس کا دل جلا ہو گا

انتخاب عالم زیدی............لاہور

میں نظر سے پی رہا تھا تو دل نے یہ دعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

(سید امتیاز حسن بخاری سرگودھا کا جواب)

اظہر بخاری............ملتان

یہ وصال ہے کہ فراق ہے دل مبتلا کو پتا ہے
جو یہ پھول ہے تو کھلا رہے جو یہ زخم ہے تو ہرا رہے

نوشین شیخ............حیات آباد

یہ آئی ہے کس محفل ناز سے
خراماں خراماں صبا جائے ہے

اکبر خان............پشاور

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال

(آفاق سیال جھنگ کا جواب)

نوشین حجاب.........شہر سلطان

تم رنگ ہو خوشبو ہو دھیان سے رہنا
صحرائے محبت کی ہوا تیز بہت ہے

(فلک شیر ملک رحیم یار خان کا جواب)

نجم الحسن.........رحیم یار خان

داستانِ انساں کا اک حساب چہرے ہیں
خواہشوں کی حدت سے آب آب چہرے ہیں

محمد شکور.........کراچی

دل کے نگر تک کرنیں کیا آنے دیتے ہیں
جن کے بس میں چاند ستاروں کا خرمن ہے

(عارف علی سید ملتان کا جواب)

وحید الحسن.........ملتان

رونقِ شہر کی خاطر یوں جنوں زار نہ بن
میں اسی شہر کے پہلو میں ہوا گرد و غبار

بازق باسط.........کراچی

ربطہ باہم پہ ہمیں کیا نہ کہیں گے دشمن
آشنا جب تیرے پیغام سے جل جاتے ہیں

نازیہ نسرین محبوب.........لاہور

راہِ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
ہجوم ہم سفراں ہے قریب آجاؤ

(امیمہ فاروقی کراچی کا جواب)

نسرین نکہت.........کراچی

زندہ لاشوں کی ایک بھیڑ چاروں طرف
موت سے بھی بڑا حادثہ زندگی

(عائشہ اعوان رحیم یار خان کا جواب)

رضا احمد اعوان.........دریا خان بھکر

ہے آج بھی ہماری انا کا وہی مزاج
مشکل ہے اپنے درد کا اظہار آج بھی

(ارم سیال جھنگ کا جواب)

عروبہ ناز.........حیدر آباد

پاپوش کی فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

(عنایت مسیح کراچی کا جواب)

سیف اللہ.........ملک وال

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

مائیکل ادریس.........کراچی

کبھی کوئی روٹھ جائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے
سہارے چھوٹ جائیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے

(رضی الدین رحیم یار خان کا جواب)

سعدیہ شاد.........رحیم یار خان

وفا میں اب یہ ہنر اختیار کرنا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرنا ہے

(امبرین حنا فیصل آباد کا جواب)

نمرہ سلطان.........پتوکی

پچھلے برس تھا خوف تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو

(حریم ناز کوٹ ادو کا جواب)

فاطمہ بھٹی.........وہاڑی

بنا رہا تھا پرندہ میں ایک کاغذ پر
کہ خود بھی اڑنے لگا اس کے پر بناتے ہوئے

(احمد توحید فاطمی مظفر گڑھ کا جواب)

انیقہ ناز صدیقی.........کراچی

ہمارا ساتھ نہ چھوڑا سیاہ بختی نے
قدم قدم پہ ملی اور بار بار ملی

(رخشی جھنگ کا جواب)

زینب علی آفریدی.........سیالکوٹ

آجائے اچانک جو تیری یاد کسی شب
روتی ہے شب غم بھی مرے ساتھ بہت دیر

بیت بازی کا اصول ہے۔ جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
124
30 اپریل 2016ء
میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔
نام
پتا
انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی سسپنس پاکیزہ سرگزشت بھجوایا جائے
کسی ایک پر نشان لگائیں
کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات 30 اپریل 2016ء تک علمی آزمائش 124 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی
قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ایک نیا سلسلہ بیت بازی شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔
نام
پتا
محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
84
مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو
شکایت فیکس کریں
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اپریل 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

فیض عام اسکول میرٹھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر بمبئی چلا گیا اور چار فلموں میں اداکاری کی۔ راج کپور نے اپنی فلم ''جاگتے رہو'' میں اداکاری کے لیے منتخب کیا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے۔ وہ پاکستان ہجرت کر آیا۔ کئی ایک فلمیں کیں لیکن صحیح کامیابی نہ ملی مگر 1962ء میں اس نے جس فلم میں اداکاری کی وہ سپرہٹ ثابت ہوئی اور وہ پاکستانی فلمی دنیا کا نامور اداکار بن گیا۔ اپنے منفرد انداز کی وجہ سے وہ منفرد ہیرو کہلاتا تھا۔

علمی آزمائش 122 کا جواب

1980ء کی دہائی میں نازیہ حسن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ جہاں جہاں بھی اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی اس کے گانے سنے اور پسند کیے جاتے تھے۔ اس کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی لیکن شہرت غیر ممالک سے ملی۔ ایک بزنس مین سے شادی ہوئی لیکن ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہو سکی۔ نہایت کم عمری میں وہ انتقال کر گئی۔

انعام یافتگان

1-اظہر یونس۔ ملتان 2- مسز رضیہ خان۔ لاہور 3-حیات حسن زئی۔ کوئٹہ
4- فرقان علی۔ کراچی 5-اشتیاق حسن خان۔ سرگودھا

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عبدالحکیم شمر، محمد ارشد اسماعیل، کیپٹن فواد خان، ایم عمران جونانی، مسرت حسین رضوی، فرزانہ پروین، رضوانہ فاطمہ، رومانہ عزیز، خادم حسین، ناعمہ تحریم، فہیم الدین صدیقی، ابریز سلطان، شفاعت حسین، نیاز احمد، ظہیر الدین، فہیم اختر، ولی الرحمن، ثاقب زیدی، عنایت مسیح، افتخار حسن خان، نواز علی۔ لاہور سے میاں عمران شوکت، عبدالجبار رومی،

شوکت رحمن، خضر حیات، نوشین آرائیں، سیدہ کنیز کبریٰ، واثق حسن ترمذی، ظفر حیات، رفیق مغل، تاثیر حسن خان، توصیف اختر، ارمغان علی۔ حیدرآباد سے ماہ رخ۔ ملتان سے صدف اشرفی، نصرت ملک، عزیز الدین، کاظم علی سعید، عدنان احمد، کاشف مرزا، فہد الحسن، نعمان بشیر، میاں افتخار الدین سیالکوٹی، ابرار احمد، سلطان فتح الدین، نصیر اختر۔ رحیم یار خان سے عائشہ اعوان، فلک شیر ملک۔ پشاور سے وحیدہ خان، امتیاز احمد، نصیر الدین، فہیم شاہ، داوغا خان، زبیر شاہ، ناہید خان، بنیاد الدین خان، زنگی شاہ، بلتیت خان، ناصر حسن، نوروز حسین شاہ، اختر علی، واصف خان۔ راولپنڈی سے راجپوت سلیم اختر، ملک محمد احسن، سعادت علی خان، مجاہد علی، مہوش نیاز، استراحی احمد، انعام الحسن، نور احمد، فیاض ہاشمی، دردانہ حیات علی، سردار داراب خان۔ مانسہرہ سے بی بی شہناز۔ اسلام آباد سے نازیہ راشد، انور یوسف زئی، محمد ریاض راحیل، رسول بخش کادوانی، عنایت جعفری سید، طارق اسماعیل، توصیف احمد، ارباز خان، زین علی زین۔ کوہاٹ سے عجب خان، فرقان خان، انور شاہ۔ اوکاڑہ سے سیدہ شبنم احسن، محمد انور، تاثیر احمد، ضیاالاسلام، فہد محمد خان۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد، زاہد علی زاہد، عنایت شیخ، عباس شیخ۔ فیصل آباد سے حامد امین ایڈووکیٹ، احسان الٰہی۔ میرپور سے عابد علی عطاری، معیز علی خان۔ ساہیوال سے صوفی مبارک علی نقشبندی، محمد سعید انصاری۔ بہاولپور سے محمد لئیق۔ میانوالی سے ملک رفاقت مسکین، احسان سحر۔ چکوال سے ملک طارق رشید، محمد جہانگیر منیر۔ کشمور سے رخسانہ مغل، فیض الحسن۔ جہلم سے محمد خلیل چودھری، میاں رب نواز، اقرار الحسن۔ کوٹ ادو سے محمد احمد رضا انصاری، محمد ثاقب، ابرار احمد، نیاز حسن نیاز۔ خانیوال سے فرہاد قریشی، طارق محمود جٹ، مصطفیٰ محمود، خلیل اللہ تھاور۔ واہ کینٹ سے نور افضل، نسرین اقرار، حمزہ علی سعید، ماہ رخ۔ مظفر گڑھ سے سیف اللہ خان، پیر علی، انور عنایت، زاہد خان، تبریز، محمد افضل۔ وہاڑی سے فرقان احمد۔ میلسی سے جنید الیاس رضوی۔ لالہ موسیٰ سے صفدر ملک، ارشد محمد ولی، الیاس بٹ۔ آزاد کشمیر سے ام رباب، فہیم الدین فہیم، اعجاز نہرو، غیاث الدین، فرخندہ جبیں۔ خانیوال سے اسماء توحید، اعجاز حسین۔ نوشہرو فیروز سے اکبر خان، زینب توحید ملک، ریاض خان اچکزئی۔ میانوالی سے انیس احمد، رفیق علی۔ سرگودھا سے نوشین شاہ، فقیر امتیاز، عباس زریون، کنول علی، اروس خان۔ منڈی بہاؤالدین سے ادریس خان، سلطان احمد، شعیب علی، احمد اعجاز، توفیق ساہیوالی، تنزیلہ فاطمہ، ادریس احمد، بختار حسن، آفاق حسن خان، عباس حیدر، زاہد علی شیخ، ممتاز الدین۔ چونیاں سے فرحین علی، شمیم حیدر۔ بہاولنگر سے احسان علی احسان، ضیاء عباس، اختر الحسن، سمیرا احمد۔ لیہ سے ماسٹر محمد رفیق، فرخندہ، اسرار احمد، عنایت احمد، یونس خان۔ پاک پتن سے نعمان چشتی، افتخار احمد۔ حافظ آباد سے سراج الحق۔ کھلابٹ ٹاؤن سے ادریس احمد۔ ہری پور ہزارہ سے ناہید اختر، دلشاد حسن خان۔ لاڑکانہ سے مہر عباسی، ضیاء الحق، نجمہ ناز۔ نگر گلگت سے ناز شاہ، علی ضیائی، عطا شاد، فیض الحسن۔ مظفرآباد، آزاد کشمیر سے: حبیب الرحمن حبیب، جاوید قادری عطاری، اختر شیرازی، فرحت زیدی۔ گوجرانوالہ سے: سعدیہ شیریں عظیمی (قلعہ دیدار سنگھ) سہیل اشرف، ساجد اسلم، نیتا ممتاز، فرحت عباسی۔ مسلم باغ سے: رحمت اللہ خان (قلعہ سیف اللہ) فرحت خورشید، سمعیہ اشرف، غلام بدر الدجیٰ، شبیر ملک۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ) ڈاکٹر عبدالغفار، کوکب سلمان، فریحہ سلطان۔ شیخوپورہ سے: قاسم نصیب (صفدر آباد) طاہر الدین، سلمٰی مہر، ثاقب علی، خورشید حسن، طالب مولی۔ صوابی سے: ضیاالرحمن، مولوی شفیق الرحمن (زروبی، ٹوپی) محمد منظور۔ لیہ سے: خالد یوسفی، امروز اسلم مغل، سیمیں ناظر، عبدالقادر، رابعہ مبین۔ برہ زئی چھچھ سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، سہیل احمد، ثاقب شاہ۔ اوکاڑہ سے: صاحب جان، اشعر محمد، سعید احمد، حسن ابرار، نعمت خان، زاہد جان، صالح الدین، زین الاسلام، بشیر احمد سلطانی، حافظ فیروز الدین اوکاڑوی، سید احسن محمد محمود، محمد سلام، چوہدری سلمان ملک، زرگل خانزادہ، فرحت جہاں، نوشین اختر، محمد فیروز۔ واہ کینٹ سے: بشریٰ افضل، نصیب الاسلام بخاری، خالد خان، محمد ذیشان، نصرت اللہ، سلیم الدین احمد، فیصل چشتی، عطا الجلیل، فیصل ملک، کائنات فیصل، ملک صغیر۔ پشاور سے: سمندر خان، سعید الدین، سلطان شاہ، ملک فیروز، تقی طوری بنگش، صاحب جان، ابرار الحسن، ثنا علی (یونیورسٹی) عباس علی سید، خضر حیات۔ قصور سے: مظہر علی، ذیشان شاہ، ارشاد علی بٹ، مشتاق تقی، عمران وردک۔ خوشاب سے: زرولی خان، کمال ترک، ہارون جہانگیر، آصف محمد۔ خیرپور میرس سے: فرخندہ تاثیر، الدیار جمالی، بنت شبیر گلابدی، احسن نقوی۔ ہوتی مردان سے: معراج الدین (صوابی روڈ پار)

بیرونِ ملک سے: اطہر حسین، تافقان (ایران) ذوہیب حسن (بیڈفورڈ)، زاہد خان، کمال حسن (دبئی)، نثار حسن جوکھیو (العین)، روبی (کویت)، سلطان فتح علی (سلطنت اومان)، نیاز راہی (ٹورنٹو کینیڈا)۔

جناب معراج رسول صاحب

السلام علیکم

میں نے سرگزشت ابھی ابھی ختم کیا ہے۔ اس ماہ کے سرگزشت میں ایک ایسی سچ بیانی پڑھی جسے پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ میں اپنی آپ بیتی بھی لکھ دوں گو کہ میری آپ بیتی میرے لیے تو درد بھری ہے کیونکہ ان حالات کا مقابلہ میں نے کیا ہے لیکن دوسروں کے لیے شاید اتنی دلچسپ نہ ہو کیونکہ خوب صورت الفاظ میں اسے پیش کرنے کا فن مجھے نہیں آتا اگر پسند آجائے تو پلیز اسے کسی اچھے رائٹر سے ری رائیٹ کرا لیں۔

سونیا ایان

(اسلام آباد)

میرا امی کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو صرف ان ہی کو دیکھا تھا۔ میرے ابو کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میں امی کے پیٹ میں تھی۔ ابو سرکاری ملازم تھے اور انہیں سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا۔ میں اسی کوارٹر میں پیدا ہوئی۔ میری امی بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی تھیں اور اتفاق سے ان کا بھی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا کیونکہ میرے نانا اس وقت انتقال کر گئے تھے جب امی صرف چار برس کی تھیں۔ نانی نے بہت محنت اور مشقت کر کے انہیں پالا اور میٹرک تک پڑھایا تھا۔ وہ بہت غریب تھیں اور غریب کی لڑکی خوب صورت اور سلیقہ شعار ہو تو بھی اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ پچیس کی ہو گئی تھیں اور کوئی رشتہ نہیں تھا۔ نانی ساری عمر کام کر کے بیمار ہو گئی تھیں اس لیے گھر کی گاڑی امی نے سنبھال لی۔ پہلے انہوں نے گھر میں سلائی شروع کی اور پھر ایک سلائی کے کارخانے میں ملازم ہو گئیں۔

ابو کا رشتہ ایک رشتہ کرانے والی کے توسط سے آیا۔ ابو امی سے بارہ برس بڑے تھے۔ صورت شکل کے بھی خاص نہیں تھے اور کلرک تھے۔ صرف ایک خوبی تھی کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور ان کا اپنا گھر تھا۔ اسی وجہ سے جب امی بیوہ ہوئیں تو ان کے سر پر چھت تھی۔ نانی ابو کی زندگی میں ہی ساتھ آ گئی تھیں۔ اس لیے امی بالکل ہی اکیلی نہیں تھیں۔ اس مشکل وقت میں نانی نے صرف انہیں ہی نہیں مجھے بھی سنبھالا کیونکہ میری پیدائش کے بعد امی کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی اور وہ کئی مہینے بیڈ پر رہیں۔

ابو کے انتقال کے بعد ان کی پینشن اور فنڈ وغیرہ سب امی کو ملے کیونکہ ان کا اور کوئی رشتے دار نہ تھا یا تھا تو امی کو اس کا علم نہیں تھا۔ ابو کے دفتر والوں نے اس موقع پر بہت ساتھ دیا اور پینشن و فنڈ کے ساتھ مکان کو امی کے نام منتقل کرانے میں بھی مدد دی کیونکہ امی کو تو ان معاملات کا پتا ہی نہیں تھا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اس میں دو بیڈ روم، ایک لاؤنج اور ایک بڑا کمرا تھا۔ پیچھے چھوٹا سا اور سامنے کسی قدر بڑا صحن تھا۔ پورا مکان پانچ مرلے پر تھا۔ ایک کمرا پہلے امی ابو کا تھا پھر وہ میرا اور امی کا ہو گیا۔ دوسرا کمرا نانی کو دیا گیا تھا۔

جب امی کی طبیعت سنبھلی اور انہوں نے حساب کتاب کیا تو انہیں نظر آ گیا کہ صرف پینشن میں گزارا ممکن نہیں تھا۔ فنڈ کی رقم اگرچہ کم تھی کیونکہ ابو نے کل انیس سال ہی ملازمت کی تھی اور اس زمانے میں یہ رقم زیادہ بھی نہیں ہوتی تھی۔

مگر زمانہ سستا تھا۔ امی نے اس رقم سے مکان کے اوپر دو کمرے بنوائے۔ ہم اوپر آ گئے اور نیچے والا حصہ

کرائے پر اٹھا دیا۔ یوں کرائے کی رقم اور پینشن سے گزارا ہونے لگا مگر جب میں ذرا بڑی ہوئی تو امی نے محسوس کیا کہ اب اضافی آمدنی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میری تعلیم کے اخراجات بھی پورے کرنے تھے۔ امی نے گھر میں سلائی شروع کردی۔ اگر وہ نوکری کرتیں تو سارا گھر نانی پر آجاتا اور اب ان کی صحت ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی ذمے داری سنبھال سکتیں۔ شروع میں کام ذرا کم تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا رہا کام بڑھتا چلا گیا۔ امی بہت صفائی سے اور نئے فیشن کو مدنظر رکھ کر کپڑے سیتی تھیں اور ٹیلرز کی نسبت پیسے بھی کم لیتی تھیں۔ اس لیے آس پاس کی عورتیں کپڑے سلوانے امی کے پاس آنے لگیں۔

چند ہی مہینوں میں اتنا کام ملنے لگا کہ امی کو بعض اوقات انکار کرنا پڑتا تھا۔ امی نے شروع سے ایک اصول اپنایا ہوا تھا کہ وہ سارے دن میں سلائی کو چار گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں دیتی تھیں۔ یہ چار گھنٹے بھی دو دو گھنٹے کر کے دن میں دو دفعہ دیتی تھیں۔ یہ اصول اس لیے اپنایا کہ وہ گھر کے سارے کام کر سکیں۔ مجھ پر توجہ دیں اور اپنی صحت پر ایک حد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ وہ فٹ رہیں گی تو یہ سب کر پائیں گی۔

امی صبح فجر کے وقت اٹھ جاتی تھیں۔ نماز پڑھ کر وہ دو گھنٹے سلائی کرتی تھیں۔ اس کے بعد سب کے لیے ناشتا بناتیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کچن اور گھر صاف کرتی تھیں۔ مجھے تیار کرتیں۔ اگرچہ مجھے کہیں جانا نہیں ہوتا تھا مگر امی مجھے یوں تیار کرتیں جیسے کہیں جا رہی ہوں۔ دوپہر کا کھانا نانی بناتی تھیں۔ دوپہر میں امی سلائی کا دوسرا اسیشن کرتی تھیں۔

شام کے قریب وہ باہر کے کام نمٹاتی تھیں۔ جیسے مارکیٹ سے سامان لانا یا کوئی اور کام جس کے لیے باہر جانا ضروری ہوتا تھا۔ ہفتے میں دو دن ہم تینوں نزدیکی پارک جاتے تھے اور میں ان دو دنوں کا بے تابی سے انتظار کرتی تھی۔ رات کا کھانا امی بناتی تھیں۔ عام طور سے سالن ایک ہی وقت بنتا تھا اور دونوں وقت چلتا تھا۔ وہ رات میں سلائی نہیں کرتی تھیں۔ صرف دن میں سیتی تھیں۔ رات کو کھانے کے بعد کا وقت میرے لیے مخصوص تھا۔ نانی عشا پڑھ کر سونے چلی جاتی تھیں۔ امی مجھے تمام معمولات سے فارغ کرا کے اور رات کا لباس پہنا کر بستر پر لے آتیں پھر مجھ سے باتیں کرتیں۔ مجھے کہانیاں واقعات سناتیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا جب تک میں سو نہیں جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے میں شاید دو سال کی تھی کہ امی نے میری تربیت شروع کر دی تھی۔

مجھے دعائیں یاد کرائیں۔ صبح اٹھنے کے بعد کی دعا، باتھ روم میں جانے اور آنے کی دعا، کھانا کھانے اور

کچھ پہننے سے پہلے کی دعا، کھانے کے آداب، کپڑے، جوتے پہننے اور اتارنے کے آداب، بڑوں سے بات کرنے اور کسی محفل میں جا کر بیٹھنے اٹھنے کے آداب۔ یہ سب امی نے مجھے اسکول میں داخل کرانے سے پہلے سکھا دیا تھا۔

جب میں چار سال کی ہوئی تو امی نے مجھے اردو، انگریزی اور حساب سے ابتدائی واقفیت کرائی تھی۔ یعنی مجھے حروف تہجی یاد کرائے تھے۔ اسی طرح سو تک گنتی آتی تھی مگر امی نے اس سے زیادہ سکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

آج کل رواج ہے کہ ابھی بچہ دو سال کا ہوا کہ مائیں اس کے ذہن میں تعلیم ٹھونسنا شروع کر دیتی ہیں مگر میری امی کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ مجھے بتاتی تھیں کہ کون سا کام کیسے کرنا ہے۔ اسی طرح جب ہم گھر سے باہر جاتے تو امی مجھے راستے میں آنے والی چیزوں کے بارے میں بتاتی تھیں۔ پھر ان سے متعلق اصول و قواعد بتاتی تھیں۔ جیسے سڑک کیا ہوتی ہے اور اس کی کتنی اقسام ہوتی ہیں۔ سڑک پار کرنے کے اصول کیا ہیں۔ سڑک کے کس طرف چلنا چاہیے۔ سگنل کیا ہوتے ہیں اور ان کی روشنیوں کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ دکانوں اور مارکیٹ کے بارے میں بتاتیں۔ جب ہم پارک جاتے تو امی مجھے مختلف کھیل بتاتیں۔ وہاں بچوں کے لیے جھولے تھے۔ جب میں بھرپور تفریح کر لیتی تو امی مجھے پھول پودوں کا بتاتیں کہ ان کے نام کیا ہیں اور ان پر کیسے پھول یا پھل آتے ہیں۔

آج سے تیس سال پہلے اسلام آباد ایک چھوٹا سا اور خاموش شہر تھا۔ یہاں دوسرے شہروں کی طرح لوگوں اور ٹریفک کا ہجوم نہیں تھا۔ دن کے اوقات میں بھی بڑی شاہراؤں پر بہت کم گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ البتہ پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب تھی۔ پارک اور تفریح کے لیے بہت سی جگہیں تھیں مگر لوگ کم تھے۔ امی مجھے مہینے میں ایک بار سارے دن کے لیے کہیں لے جاتیں۔ ہم ماں بیٹی صبح سے شام تک گھومتے پھرتے تھے۔ وہ بہت اچھا اور محفوظ دور تھا۔ ہمیں کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔ امی نے اس کے باوجود ایک اصول رکھا تھا اور سب سے پہلے خود پر لاگو کیا تھا کہ وہ مغرب کے بعد گھر سے نہیں نکلتی تھیں اور اگر کہیں جاتیں تو مغرب سے پہلے پہلے گھر واپس آ جاتی تھیں۔ یوں امی نے اپنے اوپر اصول لاگو کر کے مجھے عملی تربیت دی اور میں نے اسے دل سے قبول کیا۔

شروع میں ابتدا اتنی سہولتیں نہیں تھیں۔ کھلا ہوا شیڈ والا کچن اور ایک ہی واش روم تھا۔ مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مکمل کچن، ایک واش روم اور برآمدہ بنا لیا۔ چند سال بعد اوپر کا فلور بھی مکمل بن گیا تھا۔ جب امی کے پاس کچھ رقم آتی وہ کام کرا لیتی تھیں۔ وہ اس بات کی قائل تھیں کہ انسان سادگی میں ضرور رہے لیکن اپنے لیے ہر ممکن سہولت بھی حاصل کرے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھر میں اشیائے تعیش نہیں تھیں۔ جیسے ٹی وی، کیسٹ پلیئر، اے سی، قیمتی فرنیچر اور دوسرا سامان جو ہمارے آس پاس کے گھروں میں موجود تھا مگر سہولتیں تھیں جیسے ہمارے ہاں گیزر تھا۔ اسلام آباد میں چھ مہینے گیزر کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ درمیانے سائز کا فریج تھا۔ شدید گرمیوں کے لیے ایک چھوٹا روم کولر تھا۔ جب گرمی زیادہ ہوتی تو ہم سب ایک ہی کمرے میں آ جاتے تھے۔ سردیوں کے لیے ہر کمرے میں گیس ہیٹر لگا ہوا تھا۔ کمروں اور نشست گاہ میں اچھی کوالٹی کا فرنیچر تھا۔

اسی طرح ہماری ذاتی استعمال کی اشیا کم تعداد مگر معیار میں اچھی ہوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے امی کے پاس پانچ چھ اچھے سوٹ ہوتے تھے۔ اسی طرح گھر میں پہننے والی سوٹ کی تعداد درجن سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اس میں گرمی سردی دونوں کے ملبوسات شامل تھے۔ سوئیٹرز، کوٹ، جوتے اور دوسرے لوازمات کم تعداد میں لیکن اچھے معیار کے تھے۔ تقریباً اتنے ہی ملبوسات اور دوسری چیزیں میرے پاس تھیں۔ امی نے مجھے سکھایا تھا کہ چیزوں کو کیسے سنبھال کر استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ عرصے چلیں اور درست حالت میں رہیں۔ ہمارے گھر اور ذاتی چیزوں میں کبھی خرابی یا ٹوٹ پھوٹ نظر نہیں آئی۔ اس صورت میں امی ان چیزوں کو پھینک دیتیں یا کسی کو دے دیتی تھیں۔ میرا ایک جوتا بہت پسند کا تھا اس کی ایڑی نکل گئی اور وہ ٹھیک سے مرمت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں دکھی ہو گئی جب امی نے اسے پھینک دیا۔ پھر امی نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

''سونیا کبھی خراب چیز مت استعمال کرو۔ بے شک کم رکھو مگر اپنے پاس ہمیشہ صاف اور درست چیز رکھو۔''

امی کی یہ نصیحت بھی میں نے اپنی گرہ میں باندھ لی۔ پانچ سال کی ہوئی تو امی نے مجھے اسکول میں داخل کرایا۔ یہ ایف جی اسکول تھا جو معیار میں آج کے کسی اچھے نجی اسکول سے کم نہیں تھا۔ شروع میں مجھے ذرا پریشانی ہوئی کیونکہ مجھے کچھ نہیں آتا تھا جب کہ میرے ساتھ آنے والی

بچیوں اور بچوں نے بہت کچھ سیکھا ہوا تھا۔ میں نے امی سے کہا تو انہوں نے جواب دیا۔ "بالکل فکر مت کرو صرف ایک چیز پر توجہ دو۔ تمہیں اسکول میں جو کام ملے اسے اسی دن کرو۔ اگلے دن پر نہ چھوڑو۔"

میں نے امی کے کہنے پر عمل کیا۔ مس مجھے جو کام دیتیں۔ اگر اسکول کا ہوتا تو میں اسی وقت کرتی اور اگر گھر کا ہوتا تو اگلے دن میرا کام مکمل ہوتا تھا۔ اسکول میں داخل کرانے کے بعد بھی امی نے تعلیم کے سلسلے میں مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا کہ میں اتنا پڑھوں یا اگلے اسباق کی پہلے سے تیاری کروں۔ وہ صرف اتنا دیکھتی تھیں کہ میں نے ہوم ورک کرلیا ہے یا پوچھ لیتی تھیں کہ آج اسکول میں کیا پڑھایا مگر خود سے وہ مجھے سکھانے یا پڑھانے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔

اسکول سرکاری تھا مگر یہاں زیادہ تر سرکاری افسران کے بچے پڑھتے تھے۔ ان کے پاس ڈھیروں پیسے ہوتے تھے اور ان کی ہر چیز اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ میں بہت آسانی سے احساسِ کمتری کا شکار ہوسکتی تھی۔ مگر بچپن کی تربیت نے مجھے محفوظ رکھا۔ چیزوں کے بجائے میں نے اپنی پڑھائی پر توجہ دی اور ایک سال بعد جب پہلی کا نتیجہ آیا تو میں اپنی کلاس میں اوّل آئی تھی۔ دوسرے کیا میں خود حیران رہ گئی تھی کیونکہ میں بہت زیادہ نہیں پڑھتی تھی۔ بس امی نے جو سکھایا تھا کہ آج کا کام آج ہی کرنا ہے تو میں وہی کرتی تھی۔ ہاں ٹیسٹ اور امتحان سے پہلے میں روائز کرلیتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں فرسٹ آئی ہوں۔ صرف ایک امی تھیں جنہیں تعجب نہیں ہوا تھا۔ وہ نتیجے والے دن میرے ساتھ اسکول آئی تھیں اور واپسی پر انہوں نے مجھ سے کہا۔

"میں جانتی تھی کہ تم فرسٹ آؤ گی۔"

"آپ کیسی جانتی تھیں؟"

"کیونکہ میں جانتی ہوں تم بہترین سے کم پر راضی نہیں ہوسکتی ہو۔" امی نے کہا تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس وقت میں چھ سال کی تھی لیکن جب بڑی ہوئی تو یہ بات سمجھ میں آنے لگی۔ میں کسی سے مقابلہ نہیں کرتی تھی مگر اپنی طرف سے کوئی کمی بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی سے لے کر آٹھویں تک میں اکثر اپنی کلاس میں اوّل آئی۔ ایک دو بار دوسری پوزیشن آئی تھی مگر کبھی تیسری پوزیشن نہیں آئی تھی۔ نویں جماعت میں میرا اے ون گریڈ آیا تھا۔ میٹرک میں، میں نے پچاسی فیصد نمبر لیے تھے۔ اگرچہ بورڈ میں کوئی پوزیشن نہیں لے سکی تھی مگر اسکول میں میرا نمبر دوسرا تھا۔ ایف جی پبلک اسکول انٹر تک تھا مگر میں پہلے ہی سوچ چکی تھی کہ گورنمنٹ کالج فار وومین میں داخلہ لینا ہے۔ اس لیے میٹرک کے بعد یہ اسکول چھوڑ دیا۔

اس دوران میں ہمارے گھر میں تبدیلی آئی تھی۔ نانی کو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد بیمار ہی دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ ہمت سے کام لیتی تھیں اور اپنی تکلیف اور بیماری صبر سے برداشت کرتی تھیں۔ بلکہ جس حد تک ہوسکے امی کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں مگر رفتہ رفتہ ان کی بیماری بڑھتی چلی گئی اور جب میں آٹھویں میں تھی تو اچانک ہی ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور وہ دو دن تک اسپتال میں رہنے کے بعد انتقال کر گئیں۔ طبیعت خرابی سے چند منٹ پہلے وہ مجھ سے اور امی سے بات کر رہی تھیں۔ ہمیں اپنے بچپن کے قصے سنا رہی تھیں اور ہنس بول رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے اپنا سر تھاما اور صوفے پر ڈھے گئیں۔ امی نے انہیں ہلایا جلایا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ ایک پڑوسی کی گاڑی میں امی انہیں اسپتال لے گئیں۔ وہاں ڈاکٹروں نے انجائنا کا شدید حملہ بتایا تھا۔ اس کے بعد نانی کو ہوش نہیں آیا۔ دو دن بعد بے ہوشی میں انہیں دوسرا اٹیک ہوا اور وہ اسی حالت میں انتقال کر گئیں۔

میں اور امی صدمے میں تھے۔ پھر ہمارا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا اس لیے سب محلے والوں نے دیکھا اور سارے انتظامات بھی انہوں نے کیے۔ عجیب بات تھی کہ نانی کے جنازے میں ان کا ایک بھی رشتے دار نہیں تھا۔ میں اور امی قبرستان جا نہیں سکتے تھے۔ نانی بیمار تھیں اور ان کی عمر بھی خاصی ہوگئی تھی۔ امی بتاتی ہیں کہ جب وہ پیدا ہوئیں تو نانی چالیس کے پاس تھیں اس لحاظ سے ان کی عمر بہتر تہتر کے پاس بنتی تھی۔ پھر مسلسل بیمار تھیں اس لیے ان کی وفات ناگہانی نہیں تھی۔ مگر صدمہ اس کے باوجود تھا۔ ہمیں سنبھلنے میں وقت لگا تھا۔ نانی کے بغیر گھر عجیب سا لگتا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم خود کو سمجھا سکے تھے کہ اب گھر میں بس ہم دو ماں بیٹی ہی ہیں۔ ایک مہینے بعد امی نے نانی کی تمام چیزیں ان کی طرف سے صدقہ کردیں کہ ان کا ثواب بھی ان کو پہنچے۔ امی نے کچھ نہیں رکھا تھا سوائے نانی کی تسبیح اور جائے نماز کے جو انہوں نے اپنے لیے رکھی تھیں اور انہیں استعمال کرتی تھیں۔ باقی ایک ایک چیز دے دی تھی۔ حد یہ کہ فرنیچر

تک دے دیا تھا۔

پھر امی نے نانی کا کمرا مجھے دے دیا اور اس میں نئے سرے سے تمام چیزیں ڈلوائیں۔ میرے لیے ایک بیڈ، الماری اور ڈریسنگ ٹیبل لی تھی۔ ایک رائٹنگ ٹیبل اور چیئر تھی۔ کتابوں اور شوپیس کے لیے ایک ریک لیا تھا۔ کمرے میں نیا رنگ کرایا تھا۔ نیا قالین اور پردے لگوائے تھے۔ شاید امی نے جان بوجھ کر کمرے کو نانی کے کمرے سے بالکل مختلف کیا تھا۔ انہوں نے فرنیچر بھی نئے ڈیزائن کا لیا تھا۔ الگ کمرے میں آنے سے یہ ہوا کہ اب مجھے رات تک پڑھنا ہوتا تھا تو اس سے امی ڈسٹرب نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ جب مجھے دیر تک پڑھنا ہوتا تھا تو امی ڈرائنگ روم میں چلی جاتی تھیں۔ اب سکون سے اپنے کمرے میں مطالعہ کرتی تھیں۔

پہلے امی لاؤنج میں سلائی کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی سی جگہ تھی۔ جب میں نانی کے کمرے میں شفٹ ہوئی تو امی نے سلائی کا سیٹ اپ اپنے کمرے میں لگا لیا۔ شروع میں امی سب کے لیے کپڑے سیتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ امی نے چند بڑے گھرانوں کی خواتین کو مخصوص کر لیا تھا اور ان ہی کے کپڑے سیتی تھیں۔ ایک تو انہیں بیک وقت خاصے سوٹ سلائی کے لیے مل جاتے تھے۔ پھر پیسے بھی اچھے ملتے تھے۔ یعنی کم وقت میں وہ اچھا کما لیتی تھیں۔ پہلے امی محلے سے بھی کام لیتی تھیں مگر رفتہ رفتہ انہوں نے اس سے کنارہ کشی کر لی۔ ان کے خیال میں محلے والوں سے پیسے کا کوئی تعلق رکھنا درست نہیں تھا۔ امی سے کپڑے سلوانے والیاں سب محلے سے باہر کی تھیں۔

میں امی کو دیکھتی اور ان سے سیکھتی تھی۔ پھر اسے اپنی زندگی میں اپلائی کرتی تو مجھے حیرت انگیز نتائج ملتے تھے۔ جیسے کالج میں ایک اچھی لڑکی سے میری دوستی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد انکشاف ہوا کہ اس کی امی میری امی سے کپڑے سلواتی ہیں۔ اسی وقت میرے ذہن میں آیا کہ مجھے اس سے دوستی محدود کر لینی چاہیے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ عرصے بعد میں اس لڑکی کو ایک دوسری لڑکی سے لڑتے دیکھا اور وہ اسے جتا رہی تھی کہ اس کے گھر والے اسے خیرات دیتے ہیں تو ان کا گزارا ہوتا ہے۔ لڑنے والی لڑکی بے چاری اس ذلت پر آنسو بہاتی ہوئی گئی تھی اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب میری اس سے بس سلام دعا کی حد تک بات تھی۔ ورنہ شاید کسی موقع پر وہ مجھے بھی اسی طرح سنا سکتی تھی۔

اگرچہ امی اپنی محنت کا کماتی تھیں کسی کا ایک روپے کا احسان نہیں لیتی تھیں۔ جتنی سلائی طے ہوتی تھی اتنی ہی لیتیں اور اگر کوئی زیادہ دینے کی کوشش کرتی تو شکریے کے ساتھ انکار کر دیتی تھیں۔ اسی طرح اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اس سوٹ کی سلائی نہیں لیتی تھیں یا اپنی جیب سے غلطی کی تلافی کرتیں۔ یعنی کسی کو موقع نہیں دیتی تھیں کہ وہ ان پر کبھی کسی طرح کا احسان جتا سکے۔ امی کا یہ اصول میں نے بنا سکھائے ہی سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی مثال نہیں دی تھی کہ وہ ایسا کرتی ہیں اس لیے میں بھی ایسا ہی کروں۔ یہ کام میں نے خود سے کیا تھا۔ کالج میں بہت سی ایسی لڑکیاں تھیں جو پیسے والے گھرانوں سے تھیں یا ان کے ہاں مال حرام آتا تھا۔ جیسے ہی مجھے ان کے بارے میں پتا چلتا میں ان سے دور ہونے لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے جیسے طبقے سے تعلق اور اپنی جیسی سوچ رکھنے والی لڑکیوں سے دوستی کر لی۔

ہم کل تین لڑکیاں تھیں۔ اسما کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے والد سترہ گریڈ کے لیکن ایمان دار سرکاری ملازم تھے۔ اس کی دو بڑی بہنیں شادی شدہ تھیں اور وہ آخری تھی۔ رحمانہ کے والد جنرل اسٹور چلاتے تھے۔ دین دار گھرانا تھا۔ وہ برقع میں کالج آتی جاتی تھی۔ کوئی غیر مرد اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پردے کی اس سختی کے باوجود وہ پڑھ رہی تھی اور اس کی ایک بہن ایم بی بی ایس بھی کر رہی تھی۔ اسٹیٹس اور مزاج کے اعتبار سے ہم تینوں ایک جیسی تھیں۔ صورت شکل کی تینوں ہی اچھی تھیں لیکن رحمانہ سب سے خوب صورت تھی۔ جب ہم کالج میں آئے تو اور لڑکیاں بھی ملی تھیں مگر رفتہ رفتہ وہ الگ ہو گئیں یا ہم ان سے الگ ہو گئے اور بالآخر ہمارا گروپ ہم تینوں پر مشتمل رہ گیا۔ سب نے ایف اے لیا تھا۔

انٹر میں میرا گریڈ پھر اے ون بنا تھا اور میں نے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ آگے بی اے میں، میں نے ایجوکیشن گروپ لیا تھا۔ رحمانہ نے ہوم اکنامکس اور اسما نے ایڈوانس اردو لی تھی۔ اسے شعر و شاعری کا شوق تھا اور کالج میگزین کے لیے اکثر نظمیں لکھتی تھی۔ اب تک ہم ایک ساتھ تھے مگر یہاں سے ہماری کلاسز الگ ہو گئیں۔ اس کے باوجود کالج کا بیشتر وقت ساتھ ہی گزارتے تھے۔ جیسا کہ کالج اور اسکول میں رواج ہے کہ ٹاپ کرنے والے طلبہ سے سب ہی دوستی کرنے یا ان کے پاس آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ بہت سی لڑکیوں نے مجھ سے دوستی

کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جب میرا رویہ دیکھا تو خود پیچھے ہو گئی تھیں۔ سچی بات ہے سوائے رحمانہ اور اسما کے کوئی ہم مزاج لڑکی ملی ہی نہیں تھی۔ بی اے کے پہلے سال کے آخر میں جب امتحان قریب تھے۔

چند دن بعد امتحانات کی چھٹیاں آ گئیں اور ہم گھر پر ہی تیاری کرنے لگ گئے۔ امتحان ہوئے اور اس کے بعد تھکن یا موسم کی تبدیلی سے میں بیمار پڑ گئی۔ ایک ہفتے بعد کالج جا سکی تھی۔ کلاسز ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں اور لڑکیاں اپنا زیادہ وقت لان یا کینٹین میں گزار رہی تھیں۔ میں نے رحمانہ اور اسما کو تلاش کیا تو وہ ایک لڑکی کے ساتھ کینٹین میں پائی گئیں اور ان کے قہقہے باہر تک آ رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کم سے کم رحمانہ اس طرح ہنسنے والی لڑکی نہیں تھی اور آج اس کی آواز سب سے بلند تھی۔ ہم بہت کم کینٹین میں بیٹھتے تھے۔ اگر کچھ کھانے پینے کا موڈ ہوتا تو کینٹین سے لے کر لان میں آ جاتے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچی تو انہوں نے مجھے دیکھا اور ان کے قہقہوں کو بریک لگی تھی۔ اسما نے جلدی سے کہا۔ ”سونیا اس سے ملو یہ روزینہ ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”نائس ٹو میٹ یو اور تم لوگ کس لطیفے پر اتنے بلند قہقہے لگا رہی تھیں۔ مجھے بھی تو سناؤ۔“

”لطیفہ نہیں ہے۔“ رحمانہ نے جھینپ کر کہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم لان پر بیٹھ کر بے ساختہ ہنس دیئے تو رحمانہ نے ہمیں ٹوکا تھا کہ اس طرح آواز غیر مردوں تک جاتی ہے اور وہ آج کینٹین میں بیٹھ کر ہنس رہی تھی جہاں کم سے کم تین مرد تھے جو کینٹین کا کام کرتے تھے۔ ”روزی بہت جولی ہے۔ اس کی باتیں ہنسا دیتی ہیں۔“

”چلو کوئی تو ہے جس کی بات پر تم بے ساختہ ہنس سکتی ہو۔“ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ روزینہ ایک ماڈرن اور خوب صورت لڑکی تھی۔ یونیفارم تو کالج کا تھا مگر اس نے بہت فٹنگ کا سلوایا ہوا تھا۔ ہیئر اسٹائل بنایا ہوا تھا۔ ہلکا میک اپ تھا۔ دوپٹا اس نے بے پروائی سے گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”تم کو پہلے کبھی دیکھا نہیں۔“

اس نے بے پروائی سے شانے ہلائے۔ ”سائنس ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔ پہلے ایم بی بی ایس کا سوچا تھا مگر ایف ایس سی میں اتنے نمبر نہیں آئے اس لیے اب بی ایس سی کر رہی ہوں۔“

”کبھی تم سے کبھی سامنا نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

سائنس کی طالبات کے لیے عمارت الگ تھی اور ذرا فاصلے پر تھی۔

”لیکن میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔“ روزی نے بے تکلفی سے کہا۔ ”اگر میں تمہارے گروپ میں شامل ہونا چاہوں تو؟“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”ضرور لیکن پہلے تم کچھ وقت ہمارے ساتھ رہ کر دیکھ لو کہ ہم سے مزاج ملتا ہے یا نہیں۔“

”ڈونٹ وری میں کمپرومائز کرنا جانتی ہوں۔“

ان تینوں کو دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے ان میں پرانی دوستی ہو۔ رحمانہ اور اسما کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے دوست کے طور پر قبول کر چکی تھیں۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔ گروپ میں ہم تینوں شامل تھے اور سب کی مرضی سے ہی کوئی نئی لڑکی اس میں شامل ہو سکتی تھی۔ یہ بات ہم نے بہت پہلے طے کر لی تھی مگر ان دونوں نے مجھ سے پوچھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا اور اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا۔ بہر حال میں نے اس پر اپنا ردِعمل محدود رکھنے کا فیصلہ کیا۔ روزینہ نے سموسے منگوائے تھے۔ اس نے میرے لیے بھی منگوائے۔ جواب میں میں نے سب کے لیے چائے منگوالی۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ اسما نے بتایا کہ کالج شیڈول تاخیر کا شکار تھا اور باقاعدہ کلاسز کل سے شروع ہوں گی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر کلاسز ہو چکی ہیں تو ان کے نوٹس لینا پڑیں گے اور مجھے کسی دوسرے کے نوٹس استعمال کرنے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ اس تاخیر کی وجہ سے میں اب اپنے نوٹس بنا سکتی تھی۔

بی اے کے پہلے سال کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے اور ابھی رزلٹ آنے میں وقت تھا۔ مگر مجھے اُمید تھی کہ میں اسّی فیصد نمبروں کی حد برقرار رکھوں گی۔ امی نے مجھ سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں مزید آگے پڑھنے کے بارے میں سوچوں۔ یعنی ماسٹر کا سوچوں۔ سچی بات ہے کہ میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے میں اپنے حالات دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میری آگے تعلیم میں معاون تھے یا نہیں۔ ابو کی پنشن اور مکان کا کرایہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا تھا۔ اسی طرح امی سوٹ کی سلائی بھی بڑھاتی رہی تھیں لیکن مہنگائی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اسلام آباد ویسے ہی مہنگا شہر ہے جو چیز راولپنڈی میں دس کی ملتی وہ یہاں بیس کی ملتی تھی۔ اس لیے یہاں کے اکثر رہنے والے مہینے کی خریداری راولپنڈی جا کر کرتے

تھے۔ امی بھی مہینے میں ایک بار جا کر سارے مہینے کا سودا لے آتی تھیں۔

اب تک میں سرکاری اسکول اور کالج میں پڑھ رہی تھی جس میں فیس برائے نام ہوتی ہے۔ یونیفارم اور کاپی کتابوں کا خرچ برداشت کرنا ہے۔ آنے جانے اور کالج کے کچھ خرچے ہوتے ہیں جو ابھی تک قابل برداشت تھے۔ امی اس کم آمدنی میں سے بھی بچت کرلیا کرتی تھیں۔ وہ بچت سے پرائز بونڈز خرید لیتی تھیں۔ امی نے کبھی بتایا نہیں اور نہ میں نے پوچھا کہ انہوں نے اب تک کتنی رقم جمع کی تھی۔ اگر میں کسی یونیورسٹی سے ماسٹر کرتی تو اس میں خرچے زیادہ ہی ہوتے۔ اس لیے میں نے ابھی سے اپنا ذہن نہیں بنایا تھا کہ مجھے لازمی یونیورسٹی میں جا کر پڑھنا ہے۔ ماسٹر میں کسی اچھے کالج یا اوپن یونیورسٹی سے بھی کرسکتی تھی۔ بہرحال ابھی ایک سال کا وقت پڑا ہوا تھا۔ اس پر آرام سے سوچا جا سکتا تھا۔ ابھی میں اپنی ساری توجہ آخری سال پر دینا چاہتی تھی کہ بہتر پوزیشن حاصل کرسکوں۔

کیونکہ میں نے اعتراض نہیں کیا تھا اس لیے روزینہ عرف روزی خود بہ خود ہمارے گروپ کا ایک حصہ بن گئی۔ بعض اوقات ایک انسان بھی محفل کا رنگ بدل دیتا ہے یہ بات میں نے روزی کی آمد سے جانی۔ اس نے ہمارے گروپ کا انداز بدل دیا تھا۔ پہلے ہم لان یا کہیں بیٹھے آپس میں زیادہ تر سنجیدہ گفتگو کرتے تھے۔ ایسی گفتگو کم ہوتی تھی جس پر ہنسایا یا مسکرایا جاتا۔ ٹی وی کا شوق ہم تینوں کو نہیں تھا اس لیے ڈراموں اور شوز کی بات نہیں ہوتی تھی۔ زیادہ تر ہم پڑھائی یا اپنی پرسنل لائف کے بارے میں بات کرتے تھے۔ ادب، شاعری، معاشرہ، سیاست اور مذہب بھی زیرِ بحث آتے تھے۔ اس طرح معاشرے کی بے لگام ترقی پر بھی بات ہوتی تھی۔ روزی کے آنے کے بعد غیر محسوس انداز میں گفتگو کے موضوع بدلنے لگے تھے۔

اسما اور رحمانہ کے گھر ٹی وی تھا۔ روزی ان سے ڈراموں اور شوز پر بات کرتی تھی۔ اس پر انہوں نے بھی دیکھنا شروع کردیئے۔ کچھ دن بعد وہ تینوں آپس میں محوِ گفتگو ہوتی تھیں اور میں خاموش بیٹھی سن رہی ہوتی تھی۔ ڈراموں کے بعد فیشن، پھر فلموں اور ماڈلز پر بات ہوتی تھی۔ آخر میں جیولری اور میک اپ کی باری آتی تھی اور مجھے ان چیزوں سے خاص دل چسپی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ میں ان سے پیچھے ہٹنے لگی۔ ان کے پاس کم بیٹھتی اور کبھی تو دن دن بھر ملاقات نہیں ہوتی تھی کیونکہ خالی پیریڈ میں میں لائبریری چلی جاتی تھی۔ باتوں کے بعد رحمانہ اور اسما پر روزی کی صحبت کا اثر بھی ہونے لگا تھا۔ رحمانہ جو کالج میں برقع نہیں اتارتی تھی اور اگر مرد ٹیچر کی کلاس ہوتی تو اس کے چہرے پر نقاب بھی ہوتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ کالج میں آتے ہی اس کا برقع اتر جاتا تھا۔ دوپٹا بھی سر سے شانوں پر آگیا تھا۔

مجھے دیکھ کر افسوس ہوتا۔ انسان اتنی جلدی اپنی اقدار چھوڑ سکتا ہے یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔ اسما بھی بدل گئی تھی۔ ان تینوں بلکہ دونوں نے مجھے نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا۔ روزی شروع سے مجھے نظر انداز کرتی آئی تھی۔ مجھے دکھ ہوا مگر پھر میں نے اسے بھی زندگی کا ایک سبق سمجھ لیا۔ پہلے سال کا رزلٹ آیا تو میں نے توقع کے مطابق اسی فیصد سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ بی اے کے فائنل امتحان میں چھ مہینے رہ گئے تھے اور میں نے خود کو پڑھائی میں گم کرلیا۔ کالج میں تو سارا وقت کلاس یا لائبریری میں گزرتا تھا۔ میں گھر آکر بھی پڑھتی تھی۔ پہلے امی کو وقت دیتی تھی مگر اب گھر میں اپنی ذمے داریاں نمٹا کر پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ امی سمجھتی تھیں کہ میں اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے وہ مجھے ڈسٹرب نہیں کرتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد ایک چھٹی والے دن جب ہم اتوار بازار سے سامان لینے جارہے تھے تو میں نے راستے میں امی کو رحمانہ اور اسما کے بارے میں بتایا۔ امی نے ٹھنڈی سانس لی۔

''بیٹا اس دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو انسان کو اس کی ذات اور کردار پر تولتے ہیں ورنہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو انسان کو اس کے خاندان اور دولت پر تولتے ہیں۔''

''مگر امی رحمانہ اور اسما سے میری اتنی اچھی دوستی رہی ہے۔''

''رہی ہے مگر اب انہیں ایک ایسی دوست مل گئی ہے جو پیسے والی ہے اور گلیمرس ہے۔ اس میں انہیں زیادہ کشش محسوس ہورہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ شروع سے ایسی تھیں میرے ساتھ پوز کرتی تھیں اور اب انہیں موقع ملا تو انہوں نے بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔''

''وہ تمہارے ساتھ نہیں اپنے ساتھ بھی پوز کرتی ہوں گی۔'' امی نے پتے کی بات کی۔ ''انسان دھوکے کی ابتدا ہمیشہ اپنی ذات سے کرتا ہے۔''

''اس لیے امی میں نے خود کو پڑھائی میں گم کر لیا ہے۔''

''یہ سب سے اچھی پناہ ہے جو ایک انسان حاصل کر سکتا ہے۔''

بازار سے واپسی پر امی نے چائے بنائی۔ ہم سموسے اور پکوڑے لائے تھے۔ چٹنی کے ساتھ انہوں نے مزہ دیا۔ سرما کا آغاز تھا اور صبح بارش بھی ہوئی تھی۔ ہم خوب انجوائے کر رہے تھے۔ اس دن امی نے پہلی بار مجھ سے میرے مستقبل کے بارے میں بات کی۔ ''سونیا میں نے تم سے کبھی کہا نہیں لیکن اب تم اس مرحلے میں آگئی ہو کہ میں تم سے بات کر لینا چاہتی ہوں۔''

''کس بارے میں امی؟''

''تمہاری آگے کی تعلیم کے بارے میں۔'' امی نے کہا۔ ''اصولاً تو مجھے تمہاری شادی کی فکر ہونی چاہیے۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ پہلے تم اپنا کیریئر بناؤ اور اس کے بعد تمہاری شادی کسی اچھی جگہ ہو۔''

میں نے امی کی بات پر غور کیا۔ ''اچھی جگہ سے کیا مراد ہے؟ دولت یا اچھا خاندان؟''

''دونوں۔'' امی نے کہا۔ ''ہم متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بے شک مکان ہمارا ہے مگر ہمارا طرز رہائش سادہ ہے اور یہ پُرکشش نہیں ہے۔''

''آپ چاہتی ہیں کہ پہلے میں اپنا کیریئر بناؤں؟''

''بالکل، اس کے لیے تمہیں آگے پڑھنا ہوگا۔ ماسٹر کرو اس کے بعد تم سول سروس کا امتحان دے سکتی ہو۔ تم میں صلاحیت ہے۔''

میں کسی قدر پریشان ہوگئی۔ ''مگر امی اس میں تو کئی سال درکار ہوں گے۔''

''ظاہر ہے کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے میں وقت تو لگتا ہے۔'' امی نے کہا۔

''امی ماسٹر کرنے میں خاصا خرچ آئے گا، خاص طور سے کسی یونیورسٹی سے کرنے میں۔''

''تم فکر مت کرو، ابھی میں مضبوط اور صحت مند ہوں۔ پانچ چھ سال میں اسی طرح محنت کر سکتی ہوں۔'' امی نے جواب دیا۔ ''میں نے کچھ رقم الگ سے تمہاری تعلیم یا جہیز کے لیے رکھی ہے۔ اگر یہ ناکافی ہوگی تب بھی میرے پاس مزید رقم جمع کرنے کا وقت ہے۔''

''امی یہ آپ کی خواہش ہے؟''

''ہاں میری بچی، یہ میری خواہش ہے کہ جس طرح میں نے سادہ اور عام سی زندگی گزاری ہے ایسی زندگی تمہیں نہ گزارنی پڑے۔ تم شادی کرو یا نہ کرو لیکن مالی لحاظ سے مضبوط رہو اور تمہارے پاس سرکاری جاب ہو۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ تم ایسا سوچو۔ اگر تم چاہو تو میں بی اے کے بعد تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ متوسط طبقے میں اچھا رشتہ مل جائے گا۔''

میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''امی میں بی اے فائنل کے پیپرز دینے کے بعد ہی اس بارے میں سوچوں گی۔''

امی کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے اور مجھے اُمید ہے تم اچھا فیصلہ کرو گی۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ خوشی سے منظور ہوگا۔''

میں کچھ عرصے سوچتی رہی مگر میرے ذہن میں کوئی واضح جواب نہیں آیا تھا۔ سچی بات ہے کہ میں آگے پڑھنا چاہ رہی تھی۔ مگر میں نے سول سروس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ پھر امتحان نزدیک آئے تو میں نے تمام سوچیں ذہن سے جھٹک دیں اور امتحان کی تیاری میں لگ گئی۔ کالج میں اب رحمانہ اور اسما سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کا شکوہ بھی نہیں کیا کیونکہ وہ میرے بغیر خوش تھیں۔ پیپرز ہوئے اور اس بار بھی میں نے بہت اچھے پیپرز دیئے تھے۔ آخری پیپر دے کر آئی تو سارا دن سوتی رہی تھی کیونکہ کئی ہفتوں سے نیند پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ دو دن بعد امی کی سالگرہ ہے اور میں ہر سالگرہ پر امی کو کوئی اچھا سا سوٹ گفٹ کرتی تھی۔ میں نے اپنی جمع پونجی کا جائزہ لیا اور یہ اتنی تھی کہ اس میں ایک اچھا سوٹ آ سکتا تھا۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی اور میں نے امی کے لیے ویلوٹ کا سوٹ لینے کا سوچا۔

اگلے دن ناشتے کے بعد میں مقامی مارکیٹ کے لیے نکلی۔ مارکیٹ میں کئی دکانیں تھیں جہاں غیر ملکی کپڑا اچھے داموں مل جاتا تھا۔ میں نے ایک شاپ سے امی کے پسندیدہ بلو گرے رنگ کا سوٹ لیا۔ یہ بہت اچھی اور گرم ویلوٹ تھی۔ میں سوٹ لے کر باہر آئی اور سڑک کراس کر کے دوسری طرف آئی۔ تب میں نے فٹ پاتھ پر ایک سفید بالوں اور داڑھی والے بزرگ کو یوں کھڑے دیکھا کہ وہ ڈگمگا رہے تھے اور خود کو سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے سادہ پتلون کے ساتھ شرٹ اور اوپر گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

میں ان کے پاس آئی۔ ''انکل آپ ٹھیک ہیں؟''
وہ چونکے اور آہستہ سے کہا۔ ''نہیں میرا شوگر لیول گر گیا ہے۔''
''آپ یہاں آیئے۔'' میں نے ان کا بازو پکڑا اور نزدیک ہی موجود بینچ تک لے آئی۔ انہیں بٹھا کر میں دوبارہ سڑک پار کر کے دکانوں کی طرف گئی اور ایک جنرل اسٹور سے شکر والی ٹافیاں لیں۔ وہ ان بزرگ کو لا کر دی تو انہوں نے ایک ٹافی کھول کر منہ میں ڈال لی اور ایک منٹ بعد ان کی حالت بہتر ہونے لگی۔ انہوں نے دوسری ٹافی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
''میں ساتھ رکھتا ہوں لیکن آج واک کے لیے نکلتے ہوئے لینا بھول گیا۔ یہاں تک آیا تو اچانک ہی شوگر لیول گر گیا۔'' وہ سرخ و سفید اور اچھی پرسنالٹی والے آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور بولے۔ ''تمہارا شکریہ بیٹی کہ تم نے ایک بوڑھے کی مدد کی۔''
''آپ بزرگ ہیں۔'' میں نے ادب سے کہا۔ ''بزرگوں کی خدمت فرض ہوتی ہے۔''
''جیتی رہو، مگر آج کل کی نسل ایسا کہاں سوچتی ہے۔''
''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''
''بہتر ہوں۔'' اس نے ایک ٹافی اور منہ میں ڈالی۔ وہ میٹھے کے شوقین لگ رہے تھے۔ اسی وجہ سے تو شوگر ہائی ہوئی تھی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''
''سونیا حمید۔'' میں نے جواب دیا۔
''پڑھتی ہو؟''
''جی ابھی بی اے فائنل کے پیپر زدیے ہیں۔''
''ماشاءاللہ۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔ ''تمہارا گھر پاس ہی ہے؟''
''جی ہم سی سب سیکٹر میں رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''
''ان کا انتقال ہو گیا تھا جب میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔''
''اوہ۔'' انہوں نے افسوس کیا۔ ''تب یقیناً یہ اس خاتون کی تربیت ہے جو تمہاری ماں ہیں۔''
میں خوش ہوئی اور فخر سے کہا۔ ''جی میری امی نے اکیلے میری پرورش اور تربیت کی ہے اور میں آج جو کچھ ہوں ان ہی کی وجہ سے ہوں۔''

''بے شک...... بے شک۔'' انہوں نے سر ہلایا۔
''تمہارے اور بہن بھائی ہیں۔''
''میں ایک ہی ہوں۔''
''اللہ تمہیں خوش رکھے اور تمہارا مقدر جگمگائے۔'' وہ دعا دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ''میں یہاں اے سب سیکٹر میں رہتا ہوں۔''
وہ چلے گئے اور میں گھر آ گئی۔ امی کو اس بارے میں بتایا تو امی نے بھی سراہا۔ ''یہ تم نے اچھا کام کیا۔ مشکل میں کسی کے کام آنا سب سے بڑی نیکی ہے۔''
''امی وہ مجھے اچھے لگے۔ بالکل کسی باپ کی طرح محبت کرنے والے۔ مجھ سے بیٹا کہہ کر بات کر رہے تھے۔''
''وہ یقیناً اچھے آدمی ہوں گے۔''
اگلے دن تک یہ بات میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ آرام کر لیا تھا اور تھکن اتر گئی تھی اس لیے میں نے گھر کی مکمل صفائی کا پروگرام بنایا۔ آغاز اپنے کمرے سے کیا۔ بیڈ کا گدا ہٹا کر اور الماری و ڈریسنگ کے پیچھے سے صفائی کی۔ قالین صاف کیا۔ ریک سے کتابیں اور چیزیں ہٹا کر انہیں صاف کیا۔ اس زمانے میں متوسط گھروں میں ویکیوم کلینر کم ہی پایا جاتا تھا مگر امی نے لیا تھا۔ اس سے صفائی میں بہت آسانی ہو جاتی تھی خاص طور سے جب کونے کھدروں سے گرد مٹی صاف کرنی ہوتی تھی۔ اگلے دن امی کا کمرا صاف کیا۔ پھر نشست گاہ اور آخر میں کچن اور لاؤنج کی باری آئی۔ اوپر چھت پر ایک کمرا بنوایا تھا جو اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سب سے آخر میں اس کی صفائی کر رہی تھی کہ نیچے کال بیل بجی۔ نچلے فلور سے ہمارا آنے جانے کا راستہ بالکل الگ تھا اور اگر کوئی آتا یا جاتا تو ہمیں ہی دروازہ کھولنا اور بند کرنا پڑتا تھا۔ امی نے ہی دروازہ کھولا۔ شاید کوئی آیا تھا۔ کچھ دیر بعد امی نے مجھے آواز دی۔ ''سونیا نیچے آؤ۔''
میں نیچے آئی تو امی نے آہستہ سے کہا۔ ''کوئی واحد منان صاحب آئے ہیں کیا تم ان کو جانتی ہو؟''
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔''
''وہ اپنی بیگم کے ساتھ آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم نے ان کی مدد کی تھی کہیں یہ وہی تو نہیں ہیں۔''
میں امی کے ساتھ نشست گاہ میں آئی تو وہ وہاں ایک خاتون کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ سلام کے بعد میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''انکل آپ...... ہمارے گھر آئے ہیں......

مگر آپ کو گھر کیسے ملا؟"

"دیکھ لو بیٹا ڈھونڈنے والے پہنچ جاتے ہیں۔" انہوں نے ہنس کر کہا مگر خاتون سنجیدہ رہی تھیں۔

"انکل یہ میری امی ہیں۔"

"دیکھنے میں بھی لگ رہا ہے کیونکہ تم ہو بہو بہن کے نقوش رکھتی ہو۔ ان سے ملو یہ میری بیگم رضیہ ہیں۔ مگر میں رضیہ سلطانہ کہتا ہوں۔ حاکمانہ مزاج رکھتی ہیں۔"

"کیا ہے آپ ہر جگہ شروع ہو جاتے ہیں۔" وہ جز بز ہو کر بولیں۔

امی نے میری طرف دیکھا۔ "بیٹا چائے کے ساتھ کچھ تیار کر لو۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" خاتون نے جلدی سے کہا۔

"بات ضرورت کی نہیں گھر آئے مہمان کی عزت کی ہے۔" امی نے کہا۔ "آپ نے یہاں آ کر ہماری عزت افزائی کی ہے تو کیا جواب میں ہم ایسا نہ کریں۔"

"یہ بات کی آپ نے۔" واحد انکل خوش ہو کر بولے۔ میں کچن میں آئی۔ کچھ چیزیں تیار کیں۔ امی گھر میں بھی سموسے اور اسی قسم کی چیزیں بنا کر رکھ لیتی تھیں کہ کوئی آئے تو باہر سے نہ منگوانا پڑے۔ یہ نشست گاہ میں پہنچائیں۔ صفائی کرتے ہوئے میں خود مٹی زدہ ہو رہی تھی مگر مجھے خیال نہیں آیا کہ میں منہ ہاتھ دھولوں یہ کام میں نے چائے رکھ کر کیا اور جب چائے تیار ہوگئی تو نشست گاہ میں لائی۔ خلاف توقع وہاں کچھ خاموشی تھی۔ واحد انکل نے کھایا تھا مگر آنٹی کے سامنے کوئی پلیٹ نہیں تھی گویا انہوں نے کچھ نہیں لیا تھا۔ میں نے چائے واحد انکل کے سامنے رکھی۔ "اس میں شکر نہیں ہے۔"

"بیٹا تم بھی پھیکی چائے پلاؤ گی۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"انکل صحت کے لیے پرہیز لازمی ہے۔"

انکل ہم سے بات کرنے لگے جب کہ آنٹی بہت خاموش تھیں اور چائے کے سپ لے رہی تھیں۔ وہ پندرہ بیس منٹ بیٹھے ہوں گے اور پھر اٹھ گئے۔ انکل نے باہر نکلنے سے پہلے امی سے کہا۔ "بہن سوچئے گا ضرور۔"

"جی بھائی۔" امی نے آہستہ سے کہا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے امی سے پوچھا۔ "انکل کس بارے میں سوچنے کا کہہ رہے تھے؟"

"بتاؤں گی۔" امی نے کہا۔ "تم نے اسٹور صاف کر لیا ہے؟"

"بس تھوڑا سا باقی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کر لو کچن میں دیکھ لوں گی۔"

"نہیں وہ میں اسٹور کے بعد دیکھ لوں گی۔"

رات کے کھانے کے بعد جب میں کچن صاف کر کے چائے رکھ چکی تو امی نے کہا۔ "چائے لے کر میرے کمرے میں آنا۔"

میں سمجھ گئی تھی کہ امی مجھ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ میں چائے بنا کر لے گئی تو وہ سوچ میں تھیں خاصی دیر بعد انہوں نے کہا۔ "واحد صاحب تمہارے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئے تھے۔"

میں چونکی تھی مگر مجھے لگ رہا تھا کہ شاید اسی قسم کی کوئی بات سننے کو ملے گی۔ اس لیے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے کہا۔ "جی امی۔"

امی نے گہری سانس لی۔ "لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ یہ رشتہ صرف واحد صاحب کی خواہش ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ان کی بیگم اس رشتے پر راضی نہیں ہیں؟"

"راضی تو ہیں ورنہ وہ آتی ہی کیوں۔" امی نے کہا۔ "وہ خوش نہیں ہیں۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ویسے تو میری شادی سو فیصد آپ کا معاملہ ہے لیکن امی شادی خوشی کا رشتہ ہے۔ یہ ناخوشی کے ساتھ ہوا اس کا اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔"

"یہی سوچ میری بھی ہے۔" امی نے کہا۔ "مگر واحد بھائی اچھے آدمی ہیں۔ سی ڈی اے کے ریٹائرڈ انجینئر ہیں۔ ان کے تین بیٹے ہیں دو بڑوں کی شادی کر چکے ہیں تیسرے ایان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ ایان سول انجینئر ہے اور ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتا ہے۔ مذہبی رجحان رکھتا ہے۔"

میں سمجھ رہی تھی کہ امی کو کچھ اچھا لگا تھا اسی لیے وہ فیصلہ کرنے میں ہچکچا رہی تھیں ورنہ انکار کا فیصلہ کر چکی ہوتیں۔ واحد انکل بیٹے کی تصویر بھی لائے تھے۔ ایان خوش شکل نوجوان تھا عمر پچیس تھی اور چہرے پر درمیانی سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی تھی۔ اس زمانے میں داڑھی رکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ جو رکھتا اسے لازمی مذہبی سمجھا جاتا تھا۔ امی نے مجھے دکھائی اور بولیں۔ "بیٹا یچی بات ہے میں

کنفیوژ ہو رہی ہوں۔ مجھے بیگم واحد کا رویہ کھٹک رہا ہے مگر دوسری طرف فیملی بہت اچھی ہے۔ خاندان کے لحاظ سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی سوچو اور اگر تم مناسب سمجھو گی تو میں ہاں کر دوں گی۔"

"امی میرا فیصلہ آپ نے ہی کرنا ہے مگر آپ خود مجھ سے کہہ رہی ہیں اس لیے میں سوچوں گی۔"

"وہ ایک ہفتے بعد آنے کا کہہ گئے ہیں۔ ان کا کہنا اگر میں نے ہاں کی تو اس رشتے کے حوالے سے ہر ممکن تسلی کرائیں گے۔"

سب سیکٹر اے میں سارے ایک کنال والے بنگلوز تھے۔ اگرچہ یہ بھی سرکاری تھے مگر پلاٹ کی صورت میں بڑے گریڈ کے افسران کو ملے تھے اور اب لوگوں کی ذاتی ملکیت تھے۔ واحد انکل خود انجینئر تھے، ایان بھی انجینئر تھا تو باقی بیٹے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی پوسٹ پر ہوں گے۔ یعنی وہ مالی طور پر ہم سے کہیں آگے تھے۔ امی جس مقام تک مجھے تعلیم کے ذریعے پہنچانا چاہ رہی تھیں وہ مجھے ایسے ہی مل رہا تھا۔ جہاں تک ذاتی مضبوطی کی بات تھی تو ہمارے ہاں عورت ذاتی طور پر کسی مقام پر بھی پہنچ جائے اسے بہرحال مرد کا زیرنگیں بن کر رہنا پڑتا ہے۔ اسے اپنی زندگی آسان بنانے کے لیے مرد کو اپنا بنانا پڑتا ہے۔ مجھے خود پر اعتماد تھا کہ میرا شوہر اگر ذرا الگ مزاج کا بھی ہوا تو میں اسے اپنا بنا لوں گی۔ اس لیے جیسے جیسے میں اس رشتے پر غور کر رہی تھی مجھے یہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس بارے میں اپنا ذہن بنانے سے گریز کیا کیونکہ اصل فیصلہ امی نے کرنا تھا۔ تین دن بعد میں نے امی سے کہا۔

"امی مجھے یہ رشتہ مناسب لگ رہا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے آپ ہاں کریں یا ناں میں دونوں صورتوں میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

امی نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ "جیتی رہو تم نے میرے لیے فیصلہ کرنا آسان کر دیا ہے۔"

اس لمحے مجھے لگا کہ امی شاید انکار کرنے والی تھیں۔ وہ اس لحاظ سے پہلے ہی مائنڈ بنا چکی تھیں اور اب صرف میرے فیصلے کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے فیصلے کا اختیار واپس انہیں سونپ کر ان کے لیے آسانی کر دی تھی۔ اس رات میں سونے کے لیے لیٹی تو مجھے اندر سے ہلکا دکھ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ بے شک امی نے میری تربیت عام لڑکیوں سے خاصی مختلف کی تھی اس کے باوجود میں تھی تو ایک لڑکی ہی۔ جس کے ارمان ہوتے ہیں، خواہشیں ہوتی ہیں کہ اس کا چاہنے والا شوہر ہو جس کا اپنا گھر اور بچے ہوں۔ ماں باپ کا محل بھی لڑکی کا نہیں ہوتا ہے صرف شوہر کا گھر اس کا ہوتا ہے چاہے وہ ایک کوٹھری کیوں نہ ہو۔ جوانی کے ساتھ ایسے خواب میں نے بھی دیکھنا شروع کیے تھے۔ اس لیے امی کے متوقع انکار کا سوچ کر میرا دل ابھی سے بوجھل ہونے لگا تھا۔

یہ بوجھل پن اگلے دن بھی رہا تھا مگر میں اسے چھپائے گھر کے کاموں میں مصروف رہی تھی۔ کئی دن بعد کھل کر دھوپ نکلی تھی اور میں نے چادریں اور دوسرے بڑے کپڑے دھوئے۔ ہمارے پاس ایسی واشنگ مشین تھی جو دھونے کے ساتھ کپڑوں کو خشک بھی کرتی تھی۔ اس میں گھومنے والا ڈرائیر تھا جو پانی نکال دیتا تھا اور معمولی سی نمی رہ جاتی تھی جو کچھ دیر دھوپ دکھانے یا موسم ابر آلود ہو تو استری سے خشک ہو جاتی تھی۔ سارا دن اسی میں گزر گیا۔ شام تک میں بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ امی میرا گفٹ کیا ہوا سوٹ سی رہی تھیں۔ اپنے اور میرے لیے سارے کپڑے وہی سیتی تھیں۔ مجھے نہیں یاد کہ ہم نے کبھی ٹیلر سے کوئی سوٹ سلوایا ہو۔ اسٹور کی صفائی کرتے ہوئے میں نے پرانے کپڑے نکالے تو اس میں امی کا ایک پرانا گرم کوٹ تھا۔ اس کا کپڑا بالکل ٹھیک تھا مگر بٹن نکل گئے تھے۔ میں نے امی سے کہا۔

"امی یہ میں لے لوں؟"

"ہاں مگر پرانا ہو گیا ہے۔"

"امی ٹھیک ہے۔ میں اسے ڈرائی کلین کرا لیتی ہوں اور پھر اس پر بٹن لگا لوں گی۔ دیکھنے میں نیا ہی لگتا ہے۔"

امی نے اجازت دے دی۔ اگلے دن میں فارغ تھی اس لیے سوچا یہی کام کر لوں۔ میں کوٹ لے کر مارکیٹ تک آئی پہلے بٹن والی دکان سے اس کے جدید طرز کے فینسی بٹن لیے اور پھر اسے ڈرائی کلین ہونے کے لیے دے دیا۔ میں رسید لے رہی تھی کہ واحد انکل کی آواز آئی۔ "آہا ہماری بیٹی آئی ہے۔"

میں نے مڑ کر سلام کیا تو انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ وہ اپنے کپڑے دینے آئے تھے وہ دے کر انکل واحد نے کہا۔ "اگر تمہیں جلدی نہیں ہے تو کچھ واک کرتے ہیں۔"

مجھے جلدی نہیں تھی اس لیے میں مان گئی۔ ہم نزدیکی

پارک تک پہنچے۔ ہم اس کے واک وے پر ٹہلنے لگے۔ واحد انکل نے کہا۔ ''بیٹا اچھا تو نہیں لگ رہا مگر اب تم مل گئی ہو تو پوچھ رہا ہوں۔ تمہاری امی کا اس رشتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''انکل میں بے خبر ہوں۔''

''انہوں نے تم سے پوچھا تھا؟''

''جی مگر میں نے فیصلے کا اختیار انہیں سونپ دیا۔''

وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ ''اس کا مطلب ہے ہمیں دو دن اور انتظار کرنا ہوگا۔''

''جی انکل۔''

انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''خدا نے مجھے بیٹی نہیں دی۔ بس یہی تین بیٹے ہیں۔ دونوں بہویں اچھی ہیں مگر بہویں ہیں۔ تم میں مجھے بیٹی کی جھلک دکھائی دی اور میری خواہش ہے کہ تم میری بیٹی بن کر آؤ۔''

میں شرمائی۔ ''انکل آپ بھی مجھے اچھے لگتے ہیں بالکل باپ کی طرح شفیق مگر انکل اصل فیصلہ کرنے والا تو اللہ ہے۔ آپ اس سے دعا کریں۔''

''بہت کی ہیں اور کر رہا ہوں۔ کل رات نماز پڑھ کر یہی دعا کی تھی۔''

سچی بات ہے کہ مجھے ان کی بات اور بے تابی اچھی لگی تھی۔ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ آنٹی کا مزاج الگ تھا۔ اسی طرح ان کے دو بڑے بیٹوں کا مزاج الگ تھا۔ ایان ان کے زیادہ نزدیک تھا جس سے وہ دل کی بات کر لیتے تھے ورنہ باقی گھر میں ایسا کوئی نہیں تھا۔ ایان کی بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں محبت آجاتی۔ ''سچی بات ہے کہ اگر ایان بھی اپنی ماں اور بھائیوں جیسا نکلتا تو شاید میں اب تک اس دنیا سے گزر چکا ہوتا۔''

''اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔'' میں نے جلدی سے کہا پھر گھڑی دیکھی۔ ''انکل دیر ہو رہی ہے امی پریشان ہوں گی۔ اب میں جاؤں؟''

''ہاں بیٹا، اللہ تمہیں خوش رکھے اور آباد رکھے۔ کوئی غم نہ دے اور ہر خوشی تمہارے دامن میں آئے۔''

میں ان سے دعائیں لے کر خوشی خوشی گھر آئی تھی۔ امی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''کیا بات ہے سونیا بہت خوش نظر آرہی ہو۔''

''امی واحد انکل ملے تھے اور بہت دعائیں دے رہے تھے۔ امی وہ بہت اچھے ہیں۔ آج انہوں نے مجھ سے اپنے دل کی باتیں بھی کیں۔''

میں نے امی کو بتایا تو وہ بھی متاثر نظر آنے لگیں۔ مگر آنٹی اور دو بڑے بیٹوں کا سن کر امی فکر مند بھی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''سونیا ایسے لوگوں کے ساتھ گزارا کرنا آسان نہیں ہے۔''

''جی امی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ امی کی بات سے لگ رہا تھا کہ انہوں نے اپنا ارادہ بدلا نہیں تھا۔ میں بچپن سے دیکھتی آئی تھی کہ امی حساس تھیں اور واقعات، باتوں سے اور لوگوں سے متاثر بھی ہوتی تھیں لیکن اس کی وجہ سے وہ اپنے فیصلے نہ کرتی تھیں اور نہ بدلتی تھیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں وہی فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے جو انسان جذبات سے متاثر ہوئے بغیر سوچ سمجھ کر کرے۔ میں نے امی سے اگلے دن کالج جانے کی اجازت چاہی۔ کالج کھلا ہوا ہی تھا صرف فائنل والے فارغ تھے کہ اب سوائے رزلٹ کے انتظار کے اور کچھ نہیں کرنا تھا۔ رحمانہ اور اسما نے آخری پیپر کے ایک ہفتے بعد کالج میں آنے کا کہا تھا تاکہ سب مل سکیں۔ وہ بدل گئی تھیں مگر ہماری اتنی طویل رفاقت تھی اور میں انہیں چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ امی نے اجازت دے دی۔ میں اگلے دن کالج گئی۔ سب آئی ہوئی تھیں۔ آپس میں گپ شپ کی اور مستقبل کے ارادوں پر بات ہوئی۔ روزی ماسٹر کے لیے یونیورسٹی میں اپلائی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ رحمانہ اور اسما کا بھی یہی ارادہ تھا۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا۔ ''شاید میں بھی یہی کروں مگر ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔''

''وجہ؟'' اسما نے پوچھا تو میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

''ایک رشتہ آیا ہوا ہے اگر امی نے شادی کا فیصلہ کر لیا تو ظاہر ہے آگے پڑھنا مشکل ہوگا۔''

''ریکلی تو نے بتایا نہیں۔''

''یار ابھی چھ دن پہلے تو آئے تھے وہ لوگ۔''

''تیری امی کا کیا ارادہ ہے؟''

''میں نے پوچھا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ روزی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہاری زندگی کا اہم ترین فیصلہ ہو اور تمہیں ہی علم نہ ہو۔''

''کیونکہ مجھے اپنی امی پر پورا بھروسا ہے۔ وہ میرے بارے میں جو فیصلہ کریں گی وہی بہتر ہوگا۔ اس لیے مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

روزی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم کچھ زیادہ ہی بے نیاز ہو۔''

میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے خاموش رہی۔ کالج میں دو گھنٹے رکی تھی پھر گھر آگئی۔ اگلے دن امی نے دوپہر کے کھانے کے بعد کہا۔ ''تم گھر صاف کر لو میں ذرا مارکیٹ سے ہو کر آتی ہوں۔''

میرا ماتھا ٹھنکا مگر امی تیار ہو گئی تھیں اس لیے میں نے پوچھا نہیں۔ وہ چلی گئیں تو میں نے صفائی کی۔ امی ایک گھنٹے بعد آئی تھیں۔ وہ کیک اور بیکری سے ریفریشمنٹ کا سامان لائی تھیں۔ میٹھے اور نمکین دونوں میں کئی چیزیں تھیں۔ ان کے ساتھ امی نے میوے والی کشمیری چائے بنانے کو کہا تھا۔ اس بار میں نے دبے لفظوں میں پوچھ لیا۔ ''امی کیا یہ سب واحد انکل لوگوں کے لیے ہے۔''

''ظاہر ہے وہ ہمارے گھر مہمان آرہے ہیں۔'' امی نے جواب دیا۔ مگر اس سے یہ واضح نہیں تھا کہ امی نے فیصلہ کیا کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ انکار کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں گی تب بھی اسی طرح خاطر تواضع کرتیں۔ واحد انکل، آنٹی اور ان کی بڑی بہو شازمہ بھی آئی تھی۔ شازمہ کے ساتھ اس کا تین سال کا بیٹا تھا جو ابھی اسکول میں داخل ہوا تھا اور وہ ان بچوں میں سے تھا جو ایک لمحے کو سکون سے نہیں بیٹھتے ہیں۔ امی نے حیرت سے کہا۔ ''بچے کو اتنی جلدی اسکول داخل کرا دیا۔''

''جی آنٹی آج کل بچے کو جتنی جلدی اسکول میں داخل کرایا جائے وہ تعلیم کو اتنی جلدی پک کرتا ہے۔ آنے والا وقت تعلیم کا ہے۔''

''اس عمر میں بچے کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' امی نے رسانیت سے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ان کی عادت تھی کہ اپنی بات کہہ کر آگے بڑھ جاتی تھیں۔ واحد انکل خوش ہو کر بولے:

''بہن میں بھی یہی کہتا ہوں۔''

میں کمرے میں نہیں گئی تھی مگر لاؤنج میں سب سن رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد امی نے مجھے آواز دی۔ ''سونیا کچھ لے کر آؤ۔''

میں ٹرالی سجا چکی تھی۔ ''لا رہی ہوں امی۔''

میں اندر گئی پہلے سب سے سلام دعا کی پھر سامان میز پر لگانے لگی۔ شازمہ کے بیٹے فرخ نے اچانک جھپٹ کر گرم نگٹ اٹھا لیا اور پھر بلبلا کر پھینک دیا۔ اس کا ہاتھ جلا تھا اور وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ آنٹی اور شازمہ اس میں لگ گئیں۔ انکل واحد نے کہا۔ ''بیٹا اس کا خیال رکھو ہر چیز میں گھس رہا ہے۔''

''بچہ ہے۔'' آنٹی نے ناگواری سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے نیچے گرا ہوا نگٹ اٹھا لیا۔ فرخ نے نشست گاہ کی اور چیزوں کو بھی الٹا پلٹا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کی مادر پدر آزاد تربیت ہوئی ہے جیسا کہ رواج چل نکلا تھا کہ بچے کو کچھ نہ کہو۔ نہ ٹوکو، بس کھلا چھوڑ دو۔ میں نے سب کو پلیٹوں میں نکال کر دیا۔ پھر باہر آگئی۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ کھانے پینے کا دور جسے فرخ نے گندگی اور پھیلاوے کا دور بنا دیا تھا ختم ہوا تو مجھے اوپر سے زیادہ نیچے سے چیزیں سمیٹنا پڑی تھیں اور مجھے غصہ آرہا تھا۔ میں چائے نکال لائی۔ لاؤنج میں آکر میں نے اپنے لیے چائے نکالی اور ایسی جگہ بیٹھ گئی کہ اندر ہونے والی گفتگو سن سکوں۔ جب واحد انکل نے امی سے جواب مانگا تو امی نے کہا۔ ''بھائی صاحب میں نے سوچا تھا کہ سونیا آگے پڑھے گی......''

''وہ شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہے۔'' واحد انکل نے بات کاٹ کر کہا۔

''یہ تو آپ کی مرضی ہوگی۔'' امی نے کہا تو میں اچھل پڑی تھی۔ امی نے ہاں کر دی تھی اور مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ ''آپ نے سونیا کو مانگا اور میں نے سوچا تو مجھے مناسب لگا کہ میں اسے اپنے گھر کی کر دوں۔ اچھا رشتہ بھی اللہ کی نعمت ہوتا ہے۔ ایان مجھے اچھا لگا اور آپ لوگ اچھے لگے۔ اس لیے میں یہ رشتہ منظور کرتی ہوں۔''

''بہن آپ نے ہمارا دل خوش کر دیا۔'' واحد انکل بولے۔ ''یوں سمجھ لیں کہ ہم پر احسان کیا اور ہماری عزت رکھ لی۔''

''ایسا نہ کہیں آپ عزت کے لائق ہیں۔ میری بیٹی آپ کے ہاں خوش رہے مجھے اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔''

''آپ چاہیں تو ہمارے بارے میں تحقیق کر لیں۔ ایان کے بارے میں جو جاننا چاہیں اور جیسے جاننا چاہیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' امی نے کہا۔ ''میں مطمئن ہوں۔''

''سونیا کو بلائیں تا کہ ہم دنیا کی رسم پوری کریں۔''

امی نے مجھے آواز دی تو اس بار مجھے اندر جاتے ہوئے بہت شرم آئی تھی۔ واحد انکل نے میرے ہاتھ پر دو ہزار روپے رکھے جو رواج ہے کہ لڑکی پسند آئے تو اس کے ہاتھ پر پیسے رکھتے ہیں۔ آنٹی نے مجھے دوپٹا پہنایا اور اس وقت وہ بھی خوش نظر آئیں۔ مگر شازمہ کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے یہ رشتہ پسند نہیں ہے اور وہ مارے باندھے یہاں آئی ہے۔ انکل واحد نے کہا۔ ''بہن ہم اپنی امانت جلد از جلد لے جانا چاہتے ہیں۔''

''کیوں نہیں بھائی صاحب، لیکن میں اکیلی عورت ہوں اور مجھے تیاری کے لیے کچھ وقت تو چاہیے ہوگا۔''

''آپ کتنا وقت چاہتی ہیں؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''مارچ کا آخر یا اپریل کا شروع بہتر رہے گا۔ مجھے چار پانچ مہینے مل جائیں گے۔''

واحد انکل نے سر ہلایا۔ ''خواہش تو تھی کہ فروری کے اینڈ تک ہم سونیا کو لے جائیں لیکن آپ کی بات بھی مناسب ہے۔''

میرے لیے وہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے میں اجازت لے کر وہاں سے اٹھ آئی۔ امی نے اچانک ہاں کر کے میری زندگی کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

ایک ناقابلِ بیان اذیت اور اس کے بعد ناقابلِ بیان خوشی تھی جو میں نے مشکل سے دس منٹ کے دوران محسوس کی تھی۔ جب وہ ننھا گلابی گل گوتھنا وجود میری باہوں میں آیا تو مجھے لگا کہ میری تکلیف راحت میں بدل گئی ہو۔ یہ بیٹی تھی جو شادی کے دس مہینے بعد ہی اللہ نے عطا کی تھی۔ ایان میرے برابر میں تھے اور ہم دونوں اس پر جھکے جا رہے تھے۔ ایان کے چہرے پر چمک اور خوشی تھی۔ انہوں نے جھک کر بیٹی کو چوما اور آہستہ سے بولے۔ ''اس کے دادا نے اس کا نام فرح رکھا ہے۔''

''میری بیٹی ہوگی بھی دلوں کو فرحت دینے والی۔'' میں نے کہا۔

شادی کے بعد ایک لڑکی کو سسرال میں جو خوشیاں اور تکالیف ہو سکتی ہیں میں نے ان کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ ایان اور واحد انکل کی طرف سے مجھے صرف خوشیاں ملی تھیں۔ انہوں نے میرا اتنا خیال رکھا کہ میں نازاں ہو جاتی مگر توازن رکھنے کے لیے دوسرے لوگ تھے۔ آنٹی فطرت کی اچھی تھیں۔ مگر وہ اپنی بڑی بہوؤں کی باتوں میں بہت آتی تھیں اور وہ دونوں میرے سخت خلاف تھیں۔ اصل میں خلاف صرف ایک تھی یعنی شازمہ اور اس کی وجہ بھی شادی والے دن سمجھ میں آ گئی جب میں نے تقریباً دلہن بنی روزینہ کو دیکھا اور حیران ہو رہی تھی کہ اس نے تعارف کرایا۔ ''میں شازمہ کی بہن ہوں۔''

اس کے لہجے میں زہر تھا اور اس کی وجہ کچھ عرصے بعد میرے علم میں آئی کہ وہ اور شازمہ چاہتے تھے کہ وہ ایان کی بیوی بن کر آئے۔ مگر قدرت نے قرعہ فال میرے نام کھولا تھا۔ یہ سراسر تقدیر کا فیصلہ تھا مگر وہ یوں میری دشمن ہو گئیں جیسے میں نے ان کا حق چھین لیا ہو۔ جب ایان کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے کہا۔ ''روزینہ نے خود مجھ سے بات کی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں اسے اچھی لڑکی سمجھتا تھا اور اگر خاندان کے توسط سے رشتہ ہوتا تو شاید میں مان جاتا مگر اس نے بات کر کے اپنی اصلیت کھول دی تھی۔ اس کے بعد جب خاندان کے توسط سے یہ بات چلی تو میں نے ابو سے کہہ دیا کہ میری شادی وہ جہاں چاہیں کریں لیکن روزینہ سے نہیں۔ امی بھی مان گئی تھیں مگر جب ابو نے ویٹو پاور استعمال کی تو معاملہ ختم ہوا اور میری جان بچی تھی۔''

''شکر ہے انکل نے اسٹیپ لیا۔'' میں نے شوخی سے کہا۔ ''ورنہ میں تو ماری جاتی۔''

شادی کے بعد ایان نے مجھے اتنی محبت اور اعتماد دیا کہ میں نہال ہو گئی تھی۔ وہ فطرت اور کردار کے بہت اچھے نکلے۔ مذہب کی طرف رجحان تھا مگر وہ دوسروں سے زیادہ خود پر اسے لاگو کرتے تھے۔ میں پہلے باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتی تھی خاص طور سے فجر کی نماز نکل جاتی تھی مگر ان کے ساتھ رہ کر میری پانچ وقت نماز کی عادت پکی ہو گئی۔ اس کے علاوہ بھی وہ دین کے حوالے سے مجھے بتاتے رہتے تھے۔ میری طرح وہ بھی اس کے قائل تھے کہ اخلاقیات کے بغیر دین پر عمل کرنا محض ایک مشق ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے گھر والوں سے بالکل الگ طرزِ عمل رکھتے تھے۔ ان سے بڑے ریحان اور نعمان بھائی مذہب کے معاملے میں بے پروا تھے۔ فرصت ملی تو جمعے کی نماز پڑھ لی ورنہ وہ بھی رہ جاتی تھی۔ روزے وہ بہ مشکل رکھتے تھے اور اکثر چھوڑ دیتے تھے۔ دنیا کی طرف رجحان بہت زیادہ تھا۔ ریحان بھائی ایک غیر ملکی این جی او میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ نعمان بھائی ڈاکٹر تھے اور انہوں نے اپنا کلینک کھول لیا تھا۔

مالی لحاظ سے دونوں بھائی ایان سے آگے تھے جو تنخواہ

دار انجینئر تھے۔ اگر گھر اپنا نہ ہوتا تو شاید ہم اتنی فراغت سے نہیں رہ سکتے تھے۔ انکل واحد نے تیس سال پہلے یہ پلاٹ لے کر اس پر چند کمرے بنائے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور بڑھاتے اور نئی تعمیر کرتے رہے۔ اب اس کے اوپر نیچے چار الگ پورشن تھے۔ اوپر ریحان اور نعمان بھائی رہتے تھے۔ ان کے پاس تین تین بیڈ روم اور ایک بڑا مشترکہ ڈرائنگ روم تھا۔ نیچے بھی تقریباً یہی حساب تھا۔ دو الگ پورشن تھے ایک ایان کے لیے تھا مگر میں نے آنے کے بعد الگ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے ایان سے کہا۔ ”امی ابو اکیلے رہیں یہ اچھا نہیں لگتا ان کے ساتھ کسی نہ کسی کو ہونا چاہیے۔“

ایان خوش ہو گئے۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ امی بے چاری اکیلی لگی رہتی ہیں۔ بھابیوں میں سے کسی نے آج تک نہیں کہا کہ وہ مل کر رہنا چاہتی ہیں۔“

اس کے باوجود آنٹی شازمہ اور صدف کی باتوں میں آتیں اور مجھ سے ان کا رویہ خراب ہو جاتا تھا۔ شازمہ کے دو بیٹے تھے۔ بڑا شاہ رخ جو پانچ سال کا تھا اور بدتمیزی میں وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بھی آگے تھا۔ صدف نے تیزی دکھائی تھی۔ اس کی شادی شازمہ سے صرف چار مہینے بعد ہوئی تھی مگر اس کے تین بیٹے تھے۔ خاندان کا سب سے بڑا بچہ اسی کا تھا یعنی وہ پہلے ماں بنی تھی۔ عدنان ساڑھے پانچ سال کا تھا اس کے بعد ساڑھے تین سال کا آریان اور سب سے چھوٹا ایک سال کا ذیشان تھا۔ مگر جہاں تک پرورش کا تعلق تھا تو سارے بچے ایک جیسے تھے اور سارا دن وہ اوپر نیچے ادھم مچائے رکھتے تھے۔ اوپر سے ایسی آوازیں آتیں جیسے کوئی چھوٹی موٹی جنگ چل رہی ہو۔ ظاہر ہے جب وہ نیچے آتے تو یہ جنگ بھی نیچے چلی آتی تھی۔ میں پریشان ہو جاتی کہ میں نے آج تک ایسا ماحول نہیں دیکھا تھا مگر آنٹی اور بچوں کی مائیں بالکل سکون سے رہتی تھیں۔

میں سمجھنے سے قاصر تھی کہ اتنی پڑھی لکھی ماؤں نے اپنے بچوں کی کوئی تربیت نہیں کی تھی۔ شرارتیں، ہنگامہ اور آپس میں لڑنا جھگڑنا یا چیزیں توڑنا پھوڑنا تو ان کا مشغلہ تھا۔ مگر ساتھ ہی انہیں کھانے پینے کے آداب کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جو کپڑا پہناؤ کچھ دیر بعد گندہ ہو چکا ہوتا تھا۔ حد یہ کہ ان کو پوٹی پشی کی تمیز بھی نہیں تھی۔ فرخ تین سال کا ہو کر بھی کہیں بھی پشی یا پوٹی کر دیتا اور بو سے ماں کو پتا چلتا تھا کیونکہ اس نے سکھایا ہی نہیں تھا کہ ایسے موقع پر ماں کو بتاتے ہیں۔ سب سے عبرتناک منظر کھانے کی میز پر ہوتا تھا جہاں کھایا کم جاتا تھا اور گرایا زیادہ جاتا تھا۔ میں نے ایک دو بار دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ مجھے اس میز پر کھانا نہیں پڑتا تھا۔ نیچے ہم سکون سے کھاتے تھے۔ بچے تو یہاں بھی آجاتے تھے مگر انکل نے سختی سے کہہ رکھا تھا کہ ان کے کھانے کے وقت کوئی بچہ نیچے نہ آئے۔ ایان نے بتایا کہ اس بات پر شازمہ اور صدف دونوں نے بہت ہنگامہ کیا تھا مگر انکل کا حکم تھا اس لیے وہ مجبور ہو گئی تھیں۔ اسی طرح جس وقت انکل آرام کر رہے ہوتے یا ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تھی تب بھی بچے نیچے نہیں آسکتے تھے۔

ایان کی تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ سن دو ہزار میں جب میری شادی ہوئی تو اس وقت ان کی تنخواہ سترہ ہزار تھی۔ مگر آنے والے سالوں میں اس میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ انکل نے ساری عمر جو کمایا تھا وہ اس بنگلے پر لگا دیا تھا۔ فنڈ سے ملنے والی رقم انہوں نے اولڈ ایج اسکیموں میں لگا رکھی تھی جہاں نفع نقصان کی بنیاد پر رقم ملتی تھی۔ وہ سود کے خلاف تھے۔ ان کی پنشن بھی اچھی خاصی تھی۔ یعنی وہ مالی لحاظ سے مضبوط تھے۔ اس لیے جب میں نے ساتھ رہنے کی بات کی تو ساتھ ہی ایان سے کہا۔ ”کہیں یہ تو نہیں سمجھا جائے گا کہ ہم اس لیے ساتھ رہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے اخراجات شیئر ہو جائیں۔“

”کچن میرے ذمے ہے اور باقی بل اور مہمان داری یا آنا جانا ابو کے ذمے ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارا شیئر ٹھیک ہے، رہی دوسروں کی بات تو جو چاہے سمجھتا رہے۔ میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی ہے۔“

واقعی ایان زیادہ خرچ کرتے تھے اور یہ ان کا فرض بھی تھا کیونکہ وہ اپنے ماں باپ پر خرچ کر رہے تھے۔ دو ہزار جیب خرچ وہ مجھے دیتے تھے۔ ایک ہزار انکل دیتے تھے اور یہ میرے لیے کافی سے زیادہ تھے۔ پھر امی کے پاس جاتی تو وہ مجھے کچھ نہ کچھ دیتی تھیں اگرچہ میں منع کرتی تھی۔ امی نے مجھے اتنا اچھا جہیز دیا کہ میری جیٹھانیاں بھی ایسا جہیز نہیں لائی تھیں۔ جو زیادہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تھیں۔ میں خود حیران تھی کہ امی نے اتنا کچھ کیسے کر لیا۔ انہوں نے مجھے سونے کے دو سیٹ دیئے۔ چار موٹی چوڑیوں کا سیٹ تھا۔ سونے کی زنجیر اور بالیاں الگ سے تھیں۔ امی نے نہ جانے کب یہ تھوڑا تھوڑا کر کے بنالیا تھا۔ چنیوٹ کا بنا ہوا بیڈ روم سیٹ دیا تھا۔ کراکری اور دوسری

چیزیں بھی اعلیٰ درجے کی تھیں۔ مشینری میں امی نے مجھے مکمل کچن مشینری اور فریج کے ساتھ واشنگ مشین بھی دی تھی۔

نیچے ایان کے لیے تین کمرے مخصوص تھے لیکن مجھے شروع میں دو کمرے ملے اور ان میں سب آرام سے سیٹ ہوگیا تھا۔ اس سے زیادہ کی ہمیں فی الحال ضرورت بھی نہیں تھی۔ شادی کے بعد ہم ہنی مون منانے ہنزہ اور کالام گئے تھے۔ دو ہفتے ہم نے ان حسین جگہوں پر ہر لمحے کو انجوائے کیا۔ بعد میں ایان نے بتایا کہ اسے ہنی مون انکل نے گفٹ کیا تھا اس پر تقریباً پچاس ہزار خرچ ہوا تھا۔ انکل نے اپنی گاڑی بھی دی تھی کہ ہمیں کنوینس کا مسئلہ نہ ہو۔ ایان کے پاس تو موٹر سائیکل تھی۔ وہ اسی پر دفتر آتے جاتے تھے۔ ریحان اور نعمان بھائی کے پاس اپنی گاڑیاں تھیں۔ اگر ہمیں کہیں جانا ہوتا تو ایان انکل کی گاڑی لے لیتے تھے۔ یہ پرانے ماڈل کی لیکن لگژری اور بہت اچھی حالت والی کار تھی۔

شادی کے ایک مہینے بعد ہی میں اُمید سے ہوگئی تھی اور چوتھے مہینے مجھے علم ہوگیا تھا کہ بیٹی ہے۔ یوں تو سب ہی بہت خوش تھے لیکن انکل کو پتا چلا کہ بیٹی ہے تو وہ بہت خوش... ہوئے تھے کیونکہ انہیں بیٹی کی خواہش تھی۔ اب تک پوتے ہی ہوئے تھے۔ انہوں نے پیدائش سے پہلے فرح کا نام تجویز کردیا تھا۔ آنٹی کے جوڑوں میں تکلیف تھی اور وہ ایک حد سے زیادہ کام نہیں کرسکتی تھیں۔ اس لیے جب تک میری طبیعت سیٹ نہیں ہوگئی امی میرے پاس رہی تھیں اور میرے ساتھ فرح کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ امی بہت خوش تھیں اور انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”اللہ کی نعمت سے کبھی انکار مت کرنا، تم اکیلی تھیں میری تو اسی کو اکیلا مت رہنے دینا۔“

امی ایک ہفتہ میرے ساتھ رہیں اور فرح ان سے یوں مانوس ہوگئی کہ جب وہ گئیں تو وہ کئی دن ان کے لیے بے چین رہی اور میں نے بہ مشکل اسے اپنی طرف راغب کیا تھا۔ چھلے کے بعد میں نے ایان اور انکل آنٹی سے اجازت لی اور ایک ہفتہ امی کے پاس جا کر رہی تھی۔ ہم اتنے قریب تھے کہ پیدل آ جا سکتے تھے مگر امی اس معاملے میں محتاط تھیں۔ وہ مہینے میں دو تین بار ہی میرے گھر آتی تھیں۔ انکل کو فرح سے بہت پیار تھا اس لیے جب تک میں امی کے گھر رہی وہ روز اسے دیکھنے آتے رہے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے خیال آیا اور میں نے امی سے پوچھا کہ انہوں نے میری اتنی اچھی تربیت کیسے کی؟ کیا انہیں نانی نے سکھایا تھا۔ امی نے بتایا۔ ”تمہاری نانی سادہ عورت تھیں انہیں تربیت کا اتنا علم نہیں تھا۔ یہ میری اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں جنہوں نے ہم بچیوں کو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی دی اور ان کا مقصد ماؤں کی ایک اچھی نسل پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے جو مجھے سکھایا وہ میں نے تمہیں سکھایا اور تم سے اُمید ہے کہ تم آگے اپنے بچوں کو سکھاؤ گی۔“

میں نے امی سے وعدہ کیا کہ میں ایسا ہی کروں گی۔ پہلا وعدہ اولاد کا تھا۔ اس لیے فرح کی پیدائش کے صرف چار مہینے بعد میں پھر اُمید سے ہوئی تو میں اور ایان دونوں خوش تھے۔ فرح چھوٹی تھی مگر اولاد ہمارے لیے بوجھ نہیں تھی۔ فرح بہت سیدھی بچی تھی اور میں نے اس کی روٹین بھی اس طرح بنائی تھی کہ وہ وقت پر سو جاتی، کھاتی پیتی اور کھیلتی تھی۔ جاگنے اور کھیلنے کے اوقات میں وہ زیادہ تر اپنے دادا کے پاس ہوتی تھی۔ فیڈ کے وقت میرے پاس آتی تھی اور جب میرے پاس ہوتی تو میں اسے گود میں کم لیتی تھی زیادہ وقت وہ لیٹتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چھ مہینے کی عمر میں اس نے خود لڑھکنا اور پیٹ کے بل سرکنا سیکھ لیا۔ آٹھ مہینے کی عمر میں وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنے لگی تھی اور ایک سال کی عمر میں اس نے چلنا شروع کردیا۔

اتنی سی عمر میں وہ مجھے پوٹی پشی کا بتانے لگی تھی۔ میں نے اس کے ذہن میں نقش کردیا تھا کہ صاف ستھرا رہنا ہے اور اپنے کپڑے گندے نہیں کرنے اور اس پر پوری طرح عمل کرتی تھی۔ جب تک اسے بولنا نہیں آیا وہ روز صبح اٹھ کر میرے ساتھ جا کر اپنے دادا اور دادی کو اشارے سے سلام کرتی تھی۔ میں نے اسے پہلا نام اللہ کا سکھایا اور سب سے پہلے بسم اللہ کہنا سکھایا۔ میں اسے صاف ستھرا اور خوشبو لگا کر رکھتی تھی خود اسے بھی گندگی پسند نہیں تھی اور اس کا لباس ذرا سا گندہ ہوتا تو وہ اس وقت تک بے چین رہتی تھی جب تک اسے صاف یا تبدیل نہ کردیا جائے۔ ابھی وہ سوا سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ریان میری گود میں آگیا۔ ابھی ریان ڈیڑھ سال کا ہوا تھا کہ اللہ نے ہمیں اور ایک بیٹے سبحان سے نوازہ۔ اس کے بعد اولاد میرے نصیب میں نہیں تھی۔

☆☆☆

بعض اوقات ماں بیٹی کا مقدر ایک جیسا ہوجاتا ہے۔ جیسے میری امی اور نانی کا تھا۔ میں بھی شادی کے بعد زیادہ عرصے سہاگن نہیں رہی تھی۔ ابھی سبحان دو سال کا تھا

کہ ایک صبح ایان ناشتے کا سامان لینے نزدیکی بازار تک گئے تھے۔ وہاں دو گروپوں میں جھگڑا ہوا۔ کسی نے اسلحہ نکال کر اندھا دھند فائرنگ کی۔ سب بچ گئے صرف ایک گولی آ کر ایان کو لگی اور وہ جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ ان کی لاش گھر آئی تو میرے لیے قیامت سے پہلے قیامت آ گئی۔ جن گھروں میں ایسی جوان موت کا دکھ گزرتا ہے صرف وہی اس دکھ کی شدت سے واقف ہوتے ہیں۔ کوئی لفظ اور جملہ اس کی عکاسی نہیں کر سکتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایان یوں مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے، وہ تو کہتے تھے کہ ساری عمر میرا ساتھ نبھائیں گے۔ مگر نہیں انہوں نے زندہ رہنے کی شرط عائد کی تھی اور اب وہ زندہ نہیں تھے انہوں نے وعدہ نبھایا تھا۔ مجھے ان سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ مجھے ان کے جانے کے بعد ہوا تھا۔

کوئی مرنے والے کے ساتھ نہیں مرتا اور نہ دنیا تیاگ کرتا ہے کیونکہ زندگی خود انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا میرے ساتھ بچے تھے اور اب وہ میری توجہ چاہتے تھے۔ ان کا باپ نہیں رہا تھا۔ ان کے باپ کا کردار بھی مجھے ادا کرنا تھا جیسے بھی امی نے میرے لیے ماں باپ دونوں کا کردار ادا کیا تھا۔ بچوں کے بعد انکل اور آنٹی تھے۔ وہ جوان بیٹے کے صدمے سے بے حال تھے۔ انکل سے صدمہ برداشت نہیں ہوا تھا۔ ایان کی وفات کے ایک ہفتے بعد انہیں فالج کا ہلکا حملہ ہوا۔ ان کے جسم کے بائیں حصے پر اثر ہوا تھا اور وہ اب بستر اور کرسی تک محدود ہو گئے تھے۔ حرکت کرتے تو بہت مشکل سے کرتے تھے۔ آنٹی کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ مجھے بچوں کے ساتھ ان کو بھی دیکھنا پڑا تھا۔

اس مشکل وقت ریحان اور نعمان بھائی یا ان کی بیویوں نے ہمارا ساتھ دینے کی بجائے ہماری زندگی مشکل بنانا شروع کر دی۔ ایک تو انہوں نے سب مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ یعنی انکل اور آنٹی کی دیکھ بھال سے لے کر گھر کے تمام کام کرنا۔ عدت کی وجہ سے میں ابھی باہر جا نہیں سکتی تھی۔ باہر کے بہت سے کام تھے جو کوئی مرد یا باہر جانے والی عورت ہی کر سکتی تھی۔ مگر ان لوگوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اس موقع پر امی میرے کام آئیں۔ انہوں نے میرا دکھ بھی بانٹا اور بوجھ بھی۔ اسی سال فرح کو اسکول میں داخل کرایا تھا۔ ایان نے اس کے لیے ایک اچھے پرائیویٹ اسکول کا انتخاب کیا تھا جس کی اچھی خاصی فیس تھی۔ میں نے اسے پانچ سال کی عمر سے پہلے اسکول میں داخل کرانے نہیں دیا تھا۔ ہاں گھر میں اسے پڑھایا تھا اور وہ سب سکھایا جو امی نے مجھے سکھایا تھا۔

جب کہ ریحان اور نعمان بھائی کے سارے ہی بچے ابھی تین سال کے بھی نہیں ہوتے تھے کہ انہیں اسکول میں داخل کرا دیا جاتا تھا۔ مجھے اس پر بھی بہت کچھ سنایا گیا کہ مجھے بچوں کی تعلیم کی پرواہ نہیں ہے۔ آنٹی نے بھی میری مخالفت کی تھی مگر انکل اور ایان میرے ساتھ تھے۔ فرح کے بعد میں نے ریان اور سبحان کی بھی اسی طرح تربیت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمیز، طریقے اور مہذب بچے تھے۔ وہ نہ بلا وجہ کا شور شرابا کرتے تھے۔ چیزوں سے کھیلنے، توڑنے اور لڑائی جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اس معاملے میں بہت محتاط رہی تھی کہ اوپر والے بچوں کا اثر ان میں نہ آئے اور اس کے لیے میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ میں نہ تو بچوں کو اوپر جانے دیتی تھی اور نہ ہی ان بچوں کے ساتھ کھیلنے دیتی تھی۔ اس کا میری جیٹھانیوں نے بہت برا منایا تھا اور آنٹی کو بھی بھڑکایا تھا۔

میرے لیے باہر کے کام امی نے سنبھال لیے تھے۔ جیسے فرح کا اسکول آنا جانا اسی طرح بچوں کی بیماری اور علاج وغیرہ امی دیکھتی تھیں مجھے چیزیں لا دیتی تھیں۔ حد یہ کہ گھر کے بل تک جمع کرا دیتی تھیں۔ ریحان اور نعمان بھائی سے اتنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بے چارے انکل اس صورت حال پر بہت شرمندہ ہوتے تھے لیکن میں انہیں تسلی اور حوصلہ دیتی۔ میں ان سے کہتی۔ ”انکل ایان کے بعد آپ ہی میرے سرپر ہیں اور آپ کی ذات سے مجھے کتنا حوصلہ ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ پلیز انکل میری خاطر اور میرے بچوں کی خاطر خود کو سنبھال کر رکھیں۔“

یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ ایان کے بعد ہمارا سارا مالی بوجھ انکل نے اٹھا لیا تھا۔ ایان کی تنخواہ چالیس ہزار کے پاس تھی اور اس سے ہمارے سارے اخراجات پورے ہو جاتے تھے اور ہم کچھ بچت بھی کر لیتے تھے۔ مگر ایک تو ان کی نوکری پرائیویٹ تھی اس لیے نہ تو فنڈ تھا اور نہ ہی پینشن وغیرہ۔ فرم کے مالکان نے دو لاکھ روپے دیئے تھے تو یہ بھی کتنا چلتے۔ مل ملا کر ہمارے پاس ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ فرح کے اسکول کی فیس اور وین کے اخراجات، پھر گھر کے اخراجات اور بلز وغیرہ یہ سب ملا کر پچاس ہزار کے پاس پہنچ جاتے تھے اور تمام اخراجات انکل

کر رہے تھے۔ عدت کا وقت مشکل ضرور تھا لیکن اس نے مجھے سوچنے اور مستقبل کی پلاننگ کا موقع دیا اور جب عدت ختم ہوئی تو میں نے فرح کو اس اسکول سے اٹھالیا۔ آنٹی اور انکل حیران تھے۔ انکل نے پوچھا۔ ''بیٹا تم نے فرح کو اسکول سے کیوں نکالا؟''

''ابو میں اس کی تین ہزار فیس افورڈ نہیں کر سکتی۔''

''بیٹا وہ میں کر رہا ہوں۔ تم کیوں ٹینشن لیتی ہو۔''

''جی ابو آپ کر رہے ہیں تو میں آپ کی بات ہی کر رہی ہوں۔ میں خود کو آپ سے الگ نہیں سمجھتی۔ میں اسے ایف جی میں داخل کراؤں گی۔ اس سال اس کی ایسی تیاری کراؤں گی کہ اگلے سال اسے دوسری کلاس میں داخلہ مل جائے گا۔ اس کے ساتھ ریان بھی داخل ہوگا۔ ابو صرف فرح کی بات نہیں ہے۔ ان دونوں نے بھی پڑھنا ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں کی فیس ہر سال بڑھتی ہے اور دوسرے اخراجات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ایان تھے تو اور بات تھی لیکن اب ہمیں اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہییں۔''

انکل دکھی ہونے لگے۔ ''لیکن بیٹا اس گھر کے باقی بچے اچھے اسکولوں میں پڑھیں اور ایان کے بچے سرکاری اسکول میں۔''

''انکل اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میں خود سرکاری اسکول کی پڑھی ہوئی ہوں۔ آپ مجھ میں کوئی کمی پاتے ہیں اسی طرح میرے بچوں میں بھی کوئی کمی نہیں ہو گی۔ اصل چیز تو تربیت ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ان کی کیسی تربیت کر رہی ہوں۔''

انکل مان نہیں رہے تھے لیکن میں نے انہیں منا لیا تھا۔ شادی کے بعد پہلے تین سال تک تو مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ حالانکہ اس دوران میں امی کئی بار اصرار کر چکی تھیں کہ میں پرائیویٹ ہی ماسٹر کرلوں۔ شاید ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان کی بیٹی پر ایسا وقت آنے والا ہے جب اسے اس تعلیم کی ضرورت ہوگی۔ ریان کی پیدائش کے بعد میں نے ماسٹر کے لیے پرائیویٹ انرولمنٹ کرایا اور ایان کی ناگہانی موت سے صرف دو ہفتے پہلے فائنل کا آخری پیپر دیا تھا۔ عدت کے دوران میں رزلٹ آیا اور میں نے فرسٹ کلاس پوزیشن میں ماسٹر کیا تھا۔ عدت مکمل ہونے تک میں نے جاب کا سوچ لیا تھا کیونکہ اب اپنے بچے پالنا بنیادی طور پر میری ذمے داری تھی۔ انکل بھی ایک حد تک یہ ذمے داری اٹھا سکتے تھے اور ان کے بعد مجھے ہی اٹھانی تھی تو میں پہلے سے

کیوں نہ تیار ہو جاتی۔ میں نے سرکاری اسکول ٹیچرز کے لیے اپلائی کر دیا۔

میں نے کسی کو بتایا یا اجازت نہیں لی تھی۔ کیونکہ میں بچوں والی اور خود مختار عورت تھی۔ مگر جب انٹرویو لیٹر آیا تو مجھے انکل کو بتانا پڑا۔ انہوں نے کمزوری مخالفت کی کیونکہ وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ اب سب مجھے ہی دیکھنا تھا۔ میں نے انٹرویو دیا مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔ بہرحال میں نے ہمت نہیں ہاری جب ٹیچرز کی ضرورت کا اشتہار آتا تو میں اپلائی کرتی تھی۔ اس دوران میں گھر کی سیٹنگ میں رہی۔ فرح اور ریان کو اسکول میں داخلے کی تیاری کراتی رہی۔ مجھے اُمید تھی کہ جاب مل جائے گی تو میں کم سے کم اپنے اور بچوں کے ذاتی اخراجات پورے کر سکوں گی۔ اتفاق کی بات ہے ادھر میں نے فرح اور ریان کو اسکول میں داخل کرایا اور ادھر مجھے ٹیچر کی جاب مل گئی۔ مزید خوش قسمتی کہ مجھے اپنے علاقے کے پاس ہی ایک اسکول میں پوسٹنگ ملی تھی۔ اب میں صبح بچوں کو اسکول چھوڑتی جاتی تھی اور دوپہر میں امی انہیں اسکول سے لے آتیں۔

مالی معاملات کی طرف سے اطمینان ہوا تھا مگر گھر کے حالات میرے لیے مسلسل مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ شازمہ اور صدف نے جیسے سوچ لیا تھا کہ مجھے اور میرے بچوں کو ہر ممکن تنگ کریں گی۔ ان کے بچے بے وجہ فرح، ریان اور سبحان سے لڑتے اور انہیں مارتے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کو لڑنا سکھایا ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ پٹ کر اور زیادتی برداشت کر کے آجاتے تھے۔ شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ذرا سا کچھ کہو، وہ دونوں جاہلوں کی طرح لڑنے پر آجاتیں۔ میری ساس کا یہ حال تھا کہ وہ ان لوگوں کی زیادتی پر خاموش رہتی تھیں یا پھر الٹا مجھے ہی کچھ نہ کچھ سناتی تھیں۔ ان کی کمزوری ریحان اور نعمان بھائی کے بچے تھے اگر وہ میری ذرا بھی حمایت کرتیں تو بچوں کو نیچے آنے اور ان سے ملنے سے روک دیا جاتا تھا۔ بلکہ ایسی صورت حال میں بچے آنٹی سے بدتمیزی کرتے تھے اور وہ خاموشی سے برداشت کرتی تھیں۔ میرے بچوں نے بدتمیزی تو دور کی بات ہے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی اور وہ انہیں اکثر جھڑکتی رہتی تھیں۔

جاب کے بعد میں یہ کرنے لگی کہ صبح کا ناشتا بنا کر جاتی تھی۔ دوپہر کا کھانا میری ساس کر لیتی تھیں۔ اس کے بعد رات تک کھانا اور کچن میری ذمے داری ہوتی تھی۔ انکل کے لیے الگ سے پرہیزی بنتا تھا۔ صفائی اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے ماسی آتی تھی۔ گھر میں صرف سبحان کو چھوڑ کر جاتی تھی۔ فرح اور ریان کو امی اپنے گھر لے جاتیں اور میں وہاں سے انہیں لیتی آتی تھی۔ پھر ایک دن میں اسکول سے آئی تو سبحان رو رہا تھا اور اس کی کہنی سے خون نکل رہا تھا۔ میں تڑپ گئی۔ ''کیا ہوا میری جان؟''

''شاہ رخ بھائی نے مارا ہے۔'' اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔

شاہ رخ اس سے خاصا بڑا تھا۔ ''تم نے دادی کو نہیں بتایا؟''

''بتایا تھا انہوں نے شاہ رخ کو کچھ نہیں کہا۔''

میں ہمیشہ برداشت سے کام لیتی تھی۔ مگر اس روز میرا دماغ گھوم گیا اور میں اسے لے کر پہلے آنٹی کے پاس گئی۔ ''اسے چوٹ لگی ہے اور اس نے آپ کو بتایا مگر آپ نے شاہ رخ کو کچھ نہیں کہا۔ اس کا زخم تک نہیں دیکھا۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' انہوں نے آرام سے جواب دیا۔

میں سبحان کو اوپر لے گئی اور شازمہ کو کھری کھری سنائیں۔ میں نے کہا۔ ''اب آپ کے بچے نیچے نہیں آئیں گے۔''

''وہ ان کے دادا دادی کا گھر ہے۔''

''اس میں ایک پورشن میرا ہے اور اب کسی نے میرے بچوں کو مارا یا ہاتھ لگایا تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گی۔'' میں کہہ کر نیچے چلی آئی۔ میں نے انکل اور آنٹی سے بھی کہہ دیا کہ اب اوپر والے بچے نیچے میرے پورشن میں نہیں آئیں گے۔''

اس پر آنٹی بڑبڑ کرنے لگیں مگر انکل نے میری حمایت کی۔ ''ٹھیک کہہ رہی ہے یہ اوپر والوں نے زندگی عذاب کر دی ہے اور تم ان کی حمایت کیے جا رہی ہو کیا یہ تمہارا پوتا نہیں ہے جو اس کا خون دیکھ کر بھی تمہارا خون جوش میں نہیں آیا؟''

آنٹی خاموش ہو گئیں لیکن ان کا منہ بنا رہا تھا۔ میں نے انکل سے کہا۔ ''اب میں اپنی غیر موجودگی میں اپنے بچوں کو یہاں نہیں چھوڑوں گی وہ محفوظ نہیں ہیں۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا بیٹا کہ اسے بہن کے پاس چھوڑ جایا کرو۔ یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔'' انہوں نے آنٹی کو کڑی نظروں سے دیکھا۔

اگلے دن سے میں سبحان کو امی کے پاس چھوڑ کر جانے لگی۔ وہ تین سال کا ہو گیا تھا اور دو سال بعد اسے بھی اسکول میں داخل کرایا جا سکتا تھا۔ امی خوش ہو گئی تھیں کہ انہیں سبحان کی صورت میں ایک ساتھی مل گیا تھا۔ وہ بھی نانی کے ساتھ خوش تھا جو اس کے ساتھ باتیں کرتیں اور کھیلتی تھیں۔ میرے بعد امی کے پاس فارغ وقت زیادہ ہوتا تھا اس لیے انہوں سلائی زیادہ کر دی تھی مگر مسلسل نہیں کرتی تھیں بلکہ وقفوں کے ساتھ سلائی کرتیں۔ سبحان کی وجہ سے ان کا وقت اچھا گزرنے لگا اور سبحان کی تربیت کی ذمے داری انہوں نے سنبھال لی تھی۔ سبحان کے ساتھ فرح اور ریان بھی یہاں خوش رہتے تھے جب کہ گھر آنے پر ان کا موڈ بدل جاتا تھا۔ وہاں وہ زیادہ سنجیدہ اور خاموش سے رہتے تھے۔ اگر آنٹی ان سے اچھے یا نارمل انداز میں پیش آتیں تو میرے بچے یوں خاموش نہ ہوتے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ان کا باپ نہیں رہا تھا اور ایسے میں بچے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ ایک شام میں نے امی سے حالات کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔

''سونیا میں بہت عرصے سے دیکھ اور سمجھ رہی ہوں۔ میری تجویز ہے کہ تم میرے پاس واپس آ جاؤ۔''

''سوچا تو میں نے بھی یہی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن میں آ نہیں سکتی۔ ان بچوں کا گھر وہی ہے۔''

''کیوں کیا تم بچوں کا حصہ چاہتی ہو ان کے دادا کی جائیداد سے؟''

''نہیں امی، ایسی سوچ نہ آئی اور نہ آ سکتی ہے۔ آپ جانتی ہیں میں نے کبھی ان چیزوں کو اہمیت نہیں دی۔ آپ نے میری تربیت ایسے کی ہی نہیں ہے۔ اللہ کی قسم مجھے صرف ایان کے ماں باپ اور خاص طور سے انکل کا خیال ہے۔ مجھے معلوم ہے اوپر والوں میں سے کوئی ان کی دیکھ بھال اور خدمت نہیں کرے گا۔ وہ اس بڑھاپے میں خود سے اپنا کیسے کریں گے۔ انکل کی حالت بہتر ہوئی ہے لیکن انہیں اب بھی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں لیکن کچھ بڑے ہوں گے تو اپنے دادا کا سہارا بنیں گے۔''

اس بار امی نے گہری سانس لی۔ ''جیتی رہو میری بچی، تم نے میرا دل خوش اور سر فخر سے بلند کر دیا ہے، آج مجھے لگا ہے کہ میں نے جیسی تمہاری تربیت کرنا چاہی تھی تم اس سے بھی اچھی نکلی ہو۔''

''نہیں امی میں اب بھی ویسی نہیں ہوں، آپ نے میری تربیت اس سے کہیں زیادہ اچھی کی ہے۔'' میں نے دل سے کہا۔ ایک طرف میرے لیے اپنے ساس سسر کے لیے یہ جذبہ تھا دوسری طرف آنٹی کا رویہ دن بہ دن مجھ سے خراب ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ اب دوپہر کا کھانا صرف اپنے اور انکل کے لیے بنانے لگی تھیں۔ میرے اور بچوں کے لیے نہیں بناتی تھیں۔ بلکہ اگر ان کے بنائے میں سے کچھ بچ جاتا تو وہ اوپر کسی کو دے آتی تھیں۔ اب مجھے اسکول سے آ کر کھانا بنانا بھی پڑتا تھا۔ امی کو پتا چلا تو انہوں نے ہمارے لیے دوپہر کا کھانا بنانا شروع کر دیا۔ میں نے منع بھی کیا مگر وہ نہیں مانیں۔ انہیں گوارہ نہیں تھا کہ میں تھکی ہاری جا کر فوراً کچن میں لگ جاؤں اور اس سے زیادہ انہیں اپنے نواسی نواسوں کا خیال تھا کہ وہ اتنی دیر بھوکے رہیں گے۔

اس لیے اب یہ ہوتا کہ جب تک میں اسکول سے آتی امی بچوں کو کھانا کھلا چکی ہوتی تھیں۔ امی کھانا بہت اچھا بناتی تھیں اور انہیں بہت سے کھانے بنانا آتے تھے اس لیے بچوں کے مزے ہو گئے وہ روز اپنی نانی سے فرمائش کر کے کھانے بنواتے تھے۔ میں آتی تو امی میرے ساتھ کھاتی تھیں اور پھر کبھی میں جلدی بچوں کو لے کر گھر آ جاتی اور کبھی دوپہر وہیں رک کر شام کو گھر آتی تھی مگر اس صورت میں انکل کو کال کر کے پوچھ لیتی تھی کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے یا انہیں کوئی کام کروانا ہے۔ اس صورت میں میں جلدی چلی جاتی تھی۔ انکل پر مالی بوجھ کم ہوا تو انہوں نے اپنے لیے ایک فزیوتھراپسٹ لگوا لیا جو روز آ کر انہیں ایکسر سائز کراجاتا تھا اس سے ان کی حالت بہتر ہونے لگی اور دو سال بعد وہ اسٹک کا سہارا لے کر چلنے پھرنے لگے تھے۔ اب وہ شام کے وقت بچوں کو لے کر باہر نکل جاتے اور نزدیکی پارک جا کر تازہ ہوا لیتے۔

جس دن پہلی بار بچے دادا کے ساتھ گئے اور واپسی پر میں نے ان چہروں پر چمک اور خوشی دیکھی تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مشکل میں ثابت قدم رکھا۔ بچوں کا اصل گھر اور رشتہ یہیں سے تھا۔ انہیں یہیں رہنا چاہیے تھا۔ وہ اپنے دادا سے بہت پیار کرتے تھے، خاص طور سے فرح ان کا بچپن سے خیال رکھنے لگی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد جا کر پوچھتی کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد اس کا زیادہ وقت اپنے دادا کے پاس ہی گزرتا تھا۔ ایک دن

فرح نے انکل سے پوچھا تو نزدیک ہی بیٹھی سویٹر بنتی آنٹی نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''کبھی دادی کو بھی پوچھ لیا کرو۔''

اتفاق سے میں نزدیک ہی تھی اور سن رہی تھی۔ ان کی بات سن کر انکل کو غصہ آگیا۔ ''تم ایک دس سال کی بچی کو کہہ رہی ہو کبھی خود اپنا رویہ دیکھا ہے۔ پینسٹھ سال کی عورت کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ چھوٹے بچوں سے کیا سلوک کرنا چاہیے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ۔'' آنٹی انکل کے غصے پر حیران اور کسی قدر خوف زدہ بھی ہوگئیں۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بہت ہوگیا۔ اوپر والوں کا خون تو سفید ہے ہی، اب مجھے پتا چل گیا کہ ان کے خون میں یہ سفیدی کہاں سے آئی۔ شہناز بیگم مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم ایسے مہذب اور تمیز دار پوتے پوتی ملیں۔ تم اصل میں اوپر والوں کے قابل ہو اور جلد میں تمہارا اور اوپر والوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم ان کے ساتھ رہو گی تو تمہاری عقل خود ٹھکانے آجائے گی۔''

''کیا ہوگیا ہے آپ کو؟''

''مجھے عقل آگئی ہے جو پہلے آجانی چاہیے تھی۔'' انہوں نے کہا۔ ''ابھی میں نے اوپر والوں کو بھی بلایا ہے۔ آج شام تم دیکھو گی یہاں بہت سے فیصلے ہوں گے جو پہلے ہوجانے چاہیے تھے مگر نہیں ہوئے۔''

شام کو انکل نے ریحان اور نعمان بھائی کو معہ بیویوں کے بلا لیا اور اس کے بعد ان کی ایسی کلاس ہوئی کہ ان کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ انکل نے آغاز میں ہی کہہ دیا کہ وہ پہلی تاریخ سے مکان خالی کر کے جہاں چاہیں اپنا بندوبست کرلیں۔ اس کے بعد انکل نے ان کی اور ان کی بیوی بچوں کی بے حسی اور خود غرضی کی اس طرح تصویر کشی کی کہ جواب دینا تو ایک طرف رہا ان کے لیے تردید کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ معافیاں مانگ رہے تھے مگر انکل کا موڈ معاف کرنے والا نہیں تھا۔ انہوں نے آخر میں کہا۔ ''اپنی ماں کو بھی لے جانا تاکہ اسے پتا چلے کہ تم لوگ اس سے کتنی محبت کرتے ہو اور اس کی کتنی خدمت کرو گے۔''

نعمان نے ہمت کر کے کہا۔ ''اس مکان میں ہمارا بھی حصہ ہے۔''

''وہ میرے مرنے کے بعد ہوگا۔'' انکل نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ابھی یہ صرف میرا ہے۔ اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور جا کر کہیں کرائے پر رہو تاکہ تمہیں پتا چلے کہ تم کتنی عیاشی میں بنا کسی ادائیگی کے رہ رہے تھے۔''

میں نے اس وقت دخل نہیں دیا۔ آنٹی کی حالت خراب تھی وہ مسلسل رو رہی تھیں۔ شام کو جب میں انکل کو کھانا دینے گئی تو ان کا موڈ کسی قدر بہتر تھا۔ کھانے کے بعد میں نے ان سے کہا۔ ''انکل آپ صبح غصے میں تھے اس لیے میں نے کہا نہیں لیکن اب کہہ رہی ہوں کہ ریحان اور نعمان بھائی کو گھر سے نہ نکالیں۔''

''بیٹا میں سمجھتا ہوں لیکن یہ لاتوں کے بھوت ہیں باتوں سے نہیں مانیں گے۔''

''پھر بھی انکل آپ کوئی اور حل نکال لیں۔ انہیں گھر سے نہ نکالیں۔ ورنہ بات بھی گھر سے نکل جائے گی۔''

بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ چند دن بعد جب ریحان اور نعمان بھائی نے ان سے معافی چاہی تو انہوں نے معاف کردیا لیکن اس شرط پر کہ وہ پورشن کا کرایہ دیں گے۔ نیچے کے تمام بل وہ دونوں بھریں گے۔ تین میں سے ایک ایک وقت کا کھانا ان کی بیویاں بنا کر دیں گی ورنہ وہ انہیں ملازمہ رکھ کر دیں جو انہیں کھانا دے اور ان کی دیکھ بھال کرے۔ ریحان اور نعمان بھائی نے مزاحمت کی مگر جب انکل ڈٹ گئے تو انہیں ماننا پڑا۔ وہ جس پورشن میں رہ رہے تھے اس کا کرایہ اس وقت بھی تیس ہزار سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد انکل نے خاموشی سے یہ کیا کہ مکان میں چوتھا حصہ میرے نام کردیا۔ اب میں اپنے پورشن کی مالک تھی اور یہ مکان بکتا تو اس میں چوتھا حصہ مجھے ملتا۔ انکل کی طبیعت بہتر ہوگئی تھی۔ میں اور میرے بچے ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا تو وہ مجھ سے اور میرے بچوں سے خوش اس دنیا سے گئے۔ ان کے بعد آنٹی نے میرے پاس رہنے کا فیصلہ کیا۔ مجھ سے اور میرے بچوں سے ان کا رویہ اسی وقت بدل گیا تھا جب انکل نے بیٹوں کو ماں سمیت مکان سے جانے کو کہا تھا اور انہوں نے ماں سے ایک لفظ نہیں کہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ اب وہ میرے ساتھ ہیں۔ میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ فرح میٹرک اور ریان نویں میں ہے۔ سجان ساتویں میں ہیں۔ میرے بچے ہر کلاس میں پوزیشن لیتے ہیں جب کہ شازمہ اور صدف کے بچے آج تک کسی کلاس میں پوزیشن نہیں لاسکے۔ کیونکہ ان کی ماؤں نے صرف تعلیم پر زور دیا اور میں نے تعلیم سے پہلے اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دی۔ آج لوگ میرے بچوں کی مثال دیتے ہیں۔

"آپی......آپی کہاں ہو آپ؟" وشمہ دور سے آوازیں دیتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔

"کیا ہوا آپی کی جان کو؟" سدرہ اس کی بڑی بہن نے پیار سے اس کے پھولے ہوئے گالوں کو چھو کے کہا۔

"آپی دیکھو ناں پھر سے یہ نمبر تنگ کر رہا ہے بار بار کال پر کال میں تو تنگ آ گئی ہوں اور پتا ہے آپی اسے میرے بارے میں سب پتا ہے کہ میرا نام کیا ہے کس کلاس میں پڑھتی ہوں کیسی ہوں سب جانتا ہے۔ آپی یہ اتنا سب

ہوشیار

محترم مدیراعلیٰ

سلام تہنیت

ارسال کردہ سچ بیانی کی گہرائی کو مدِّنظر رکھیں۔ کس طرح موبائل اور انٹرنیٹ نے معاشرے کو تباہ کر رکھا ہے۔ کچّے ذہنوں کو بگاڑ رکھا ہے، اس کا ادراک ہر ایک کو ہے لیکن تدارک کی کوشش کوئی نہیں کررہا ہے۔ وشمہ نے اپنی جان ہار کر یہی پیغام دیا ہے کہ وقت رہتے اگر معاشرے کو سنبھالا نہ گیا تو ہر گھر سے وشمہ کا جنازہ نکلے گا۔

تمثیل حیدر
(کراچی)

کیسے جانتا ہے؟'' وشمہ کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''کون ہو سکتا ہے یہ؟''

''تم اپنے ننھے سے ذہن پر زور مت دو اور فضول ٹینشن نہ لو آج کل کسی کے بارے میں پتا کرانا کوئی مشکل کام نہیں ہے تم بس جواب نہ دینا خود ہی تھک کے بس کر جائے گا اوکے سوئو۔'' سدرہ نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی آپی!'' وشمہ نے بچوں کی طرح سر ہلا کے جواب دیا تو سدرہ کو ہنسی آگئی۔

''بالکل بچی ہو ابھی بھی۔ گریجویشن کمپلیٹ ہونے والی ہے لیکن تمہارا بچپنا نہیں گیا۔ اچھا یہ بتاؤ پیپرز کی تیاری کیسی ہے؟ ہمیشہ کی طرح ٹاپ کرنا ہے یا بس ٹینشن ہی لیتی رہو گی؟'' سدرہ نے پیار سے اس کے کان کھینچے تو وشمہ نے ہنستے ہوئے بچوں کی طرح جوش سے کہا۔

''جی نہیں آپی آپ دیکھ لینا ٹاپ تو اس بار بھی میں ہی کروں گی، انشاء اللہ۔''

''انشاء اللہ میری جان!'' سدرہ نے دل سے دعا دی۔

''آپی عباد کہاں ہے اس نے میری رسٹ واچ پر قبضہ کرلیا ہے کہتا ہے واپس نہیں دوں گا۔ حالانکہ ادھار لی تھی اب واپس مانگ رہی ہوں تو ڈان بن گیا ہے۔ اس نے اگر واپس نہ کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ یہ تو مجھے کزن کم ازلی دشمن زیادہ لگتا ہے۔'' وشمہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''مذاق کرتا ہے تمہارے ساتھ، پاگل تم بھی ناں بس چھوٹی چھوٹی بات دل پہ لے لیتی ہو، وہ تنگ کرتا ہے اور تم ناراض ہوجاتی ہو تو اسے تمہیں چھیڑنے میں مزہ آتا ہے۔ واپس دے دے گا، میں کہوں گی اسے۔'' سدرہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ جو بچوں کی طرح منہ پھلا کے کھڑی ہوئی تھی ایکدم سے خوش ہوگئی۔

''سچی آپی؟ میں ابھی اسے بتا کے آتی ہوں کہ آپی اسے ڈانٹیں گی اگر اس نے میری واچ واپس نہ کی تو......'' یہ کہہ کر وہ کچن سے تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ سدرہ نے پیار سے بہن کی معصوم ہنسی کو سنا۔

سردار رئیس خان کی دو ہی بیٹیاں تھیں سدرہ اور وشمہ۔ وشمہ کا دوسرا نمبر تھا۔ باپ کی لاڈلی تھی۔ سردار رئیس کی بیوی وشمہ کو جنم دے کر چل بسی تو ایک بھاری ذمہ داری ان کے کندھوں پر آپڑی، کہیں بچوں کے حقوق کی حق تلفی نہ ہو یہ سوچ کر انہوں نے دوسری شادی نہ کی اور اپنا سارا پیار ان بچیوں پر لٹا دیا۔ ان کی ہر خواہش کو بن کہے ہی پورا کردیا۔ بچیاں اپنے باپ کی گرویدہ تھیں تو باپ کی بھی جان ان میں بسی ہوئی تھی۔ کہیں لوگ سردار رئیس کی شرافت و ہمت کی مثال دیتے تو کہیں ان کی بچیوں کی ذہانت و معصومیت کی۔ غرض یہ کہ وہ ایک آئیڈیل فیملی تھی۔

☆......☆

وشمہ نے مندی مندی آنکھوں سے میسج دیکھا رونگ کالر نے گڈ مارننگ وش کی تھی اس کا دماغ تپ گیا آخر یہ منحوس ہے کون؟ صبح دوپہر شام لازمی Msg کرتا ہے۔ تین ماہ سے تنگ کر رکھا ہے اس نے، پھر کچھ سوچ کر Who لکھ کے Send کردیا اور آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ اس کی آنکھ سدرہ کے جگانے پر ہی کھلی۔

''کیا ہوا چندا؟ کیا رات دیر سے سوئی تھی کہ ابھی تک سورج کو ہیلو نہیں کہا؟'' سدرہ نے اس کی گدگدی کرتے ہوئے چھیڑا تو وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

''نہیں آپی Exam ختم ہوگئے ہیں ناں تو اب نیند کا مزہ ہی اور ہے، پتا ہے آپی رات میں خواب میں پری بنی ہوئی تھی میں نے بادلوں کی سیر کی پھر ناں......''

''ہاہاہا! حرکتیں بھی بچوں جیسی کرتی ہو اور ابھی تک خواب بھی بچوں جیسے ہیں تمہارے اور بابا ہیں کہ تمہاری شادی کا سوچ رہے ہیں۔'' سدرہ نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''ہائے آپی نہیں، میں نے نہیں کرنی کوئی شادی وادی، میں بس اپنے بابا کے پاس رہوں گی۔ اتنے گندے ہوتے ہیں آدمی، مجھے ڈر لگتا ہے۔ پتا ہے میری فرینڈ لیلیٰ جس کی شادی چھ ماہ پہلے ہوئی تھی وہ بے چاری اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ اس کا شوہر بہت شکی اور گندا سا تھا۔ مارتا تھا۔ روز اسے وہ تو بہت پیار کرتی تھی اسے پتا نہیں اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔'' وشمہ کی آواز دوست کے درد میں محبت سے بھر گئی۔

''نہیں چندا! ایسی بات نہیں اگر ایک مرد برا ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ہر مرد برا ہوتا ہے۔ یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے اس لیے بڑے کہتے ہیں خدا ہر بیٹی کا نصیب اچھا کرے۔''

''جی آپی بس میں ابھی آئی دو منٹ میں۔'' وشمہ جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ بستر سے اٹھ گئی۔ فریش ہو کے واپس آئی تو موبائل پر کئی میسجز کے نشان دیکھ کے حیران رہ

گئی۔

''ارے واہ! آج میری کس فرینڈ کو اتنا جوش چڑھا ہوا ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے اوپن کیا تو تمام میسج اس رونگ کالر کی طرف سے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسرا پڑھ پڑھ کے ڈیلیٹ کرتی گئی۔

''میں آپ کا ویل وشرز ہوں۔''

''آپ کی آنکھیں بہت پیاری ہیں۔''

''آپ کے ایگزام کیسے ہوئے؟ میں نے آپ کے لیے بہت دعا مانگی تھی۔''

''آپ مجھ سے دوستی کریں گی۔ میں آپ کے پازیٹو رسپانس کا ویٹ کروں گا تو یو ٹیک کیئر۔'' آخری میسج پڑھ کے وشمہ کا دماغ گھوم گیا۔

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری گھٹیا باتیں۔ نیکسٹ اگر ایک بھی میسج کیا تو بہت برا ہوگا۔''

میسج ٹائپ کر کے اوکے کیا اور غصے سے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

☆......☆

''پلیز عباد ڈراما اینڈ ہو جائے گا دیکھنے دو ناں۔'' وشمہ نے روتی صورت بنا کے کہا۔

''تم نے کون سا وکیل بننا ہے یا سراغ رساں کہ ایسے ڈرامے دیکھتی ہو؟ پہلے خود کو تو سنبھالو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح لڑتی اور بحث کرتی ہو، چلو اٹھو، جاؤ کچن میں آپی کے ساتھ کام کرو ویسے بھی احسن بھائی ایک ماہ کی چھٹیوں پر جاب سے واپس گھر آرہے ہیں تو ظاہر ہے آپی اپنے گھر چلی جائیں گی پھر سارے کام خود ہی کرنا پڑیں گے۔'' عباد نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے پیر پٹختی ہوئی اپنے روم میں آ کے رونا شروع ہو گئی۔ روتے روتے آخر تھک گئی اور عباد کو جی بھر کے کوس کے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ ابھی سونے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ میسج ٹون سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پھر سے اسی رونگ کالر کا میسج تھا۔ ''کھانا کھایا؟''

وشمہ نے حیرت سے میسج دیکھا۔ عجیب انسان ہے، میں نے اتنا ڈانٹا لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں ایسے بات کر رہا ہے جیسے ہم دوست ہوں۔

''کیا آپ میں کوئی عزت نہیں کہ اتنی انسلٹ کے بعد بھی میسج کر رہے ہیں۔ آپ ہوتے کون ہو مجھ سے کچھ بھی پوچھنے والے، اپنی حد میں رہو آپ۔'' وہ جو پہلے ہی عباد کی وجہ سے چڑی ہوئی تھی اس میسج سے مزید چڑ گئی۔

''ہونہہ...... جسے دیکھو میری لائف ڈسٹرب کرنے پر تلا ہے۔ عباد ہے تو میرے گھر میں مجھ پر حکم چلاتا ہے اور یہ بدتمیز شخص ذہنی سکون برباد کرنے پر تلا ہے۔'' وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

''عزت تو ہے بٹ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا، اتنی مشکل سے تو آپ کا نمبر ملا ہے۔'' وشمہ نے حیرت سے اس دامنی پڑھا۔

''لیکن میرا نمبر آپ کو ملا کہاں سے؟ اور آپ نے کیوں تلاش کیا؟''

''میں نے آپ کو ویل میں گردیزی مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ آپ نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے آپ کی آنکھوں کی حیا نے اور آپ نے بہت امپریس کیا۔ تب سے آپ کے نمبر کی تلاش میں تھا پھر ایک بار اتفاق سے کالج کے سامنے آپ کو دیکھا تو آپ کا پیچھا کر کے آپ کے گھر کا پتا چلا لیا اور پھر نمبر لینا آسان ہو گیا۔'' کافی دیر بعد اسے میسج ریسیو ہوا۔

''آپ کو شرم نہیں آئی میرا پیچھا کرتے ہوئے۔ چھچھورے لڑکوں جیسی حرکت کی آپ نے، افسوس ہے۔'' وشمہ نے فوراً میسج ٹائپ کیا۔

''Extremely sorry آپ کو میرا ایسا کرنا برا لگا، بٹ خدا گواہ ہے میں نے آپ کے بارے میں کبھی برا نہیں سوچا، آپ مجھے اچھی لگی ہیں اسپیشلی آپ کی Eyes بہت اٹریکٹو ہیں، بہت پاکیزگی ہے ان میں۔'' میسج پڑھتے ہی وشمہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے دل ایکدم تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے جواب دیئے بغیر موبائل رکھ دیا۔

☆......☆

''ہیلو مائی سویٹ ڈائری! سوری یار آج کل تمہیں وقت نہیں دیتی لیکن آج تم سے ایک بہت اہم راز شیئر کرنا تھا سو بھاگ دوڑ کے کام سمیٹے اور تمہارے پاس آ گئی۔ کسی اور کو بتا بھی نہیں سکتی ناں۔ یہ پتا ہے وہ جو رونگ کالر ہے ناں وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے، میرا بہت خیال رکھتا ہے، میرے ایک ایک پل کی خبر ہے اس کے پاس۔ میرا جی چاہتا ہے وہ گھنٹوں مجھ سے باتیں کرے لیکن کیا کروں پتا تو ہے بدھو ہوں ناں میں مجھ سے بات نہیں ہوتی۔ اوہ...... آپی آرہی ہے۔'' سدرہ کی آواز سن کر وشمہ نے تیزی سے ڈائری کو بند

کر کے ٹیبل دراز میں رکھا اور آنکھوں پر بازو رکھ کے لیٹ گئی۔ سدرہ نے آتے ہوئے اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی مسکراتے ہوئے آ کے بہن کے کان پکڑے۔ ''اچھا تو جناب اب ہم سے اپنی ڈائری چھپ کے لکھتی ہیں۔ کیوں جی ایسی کیا خاص بات ہے جسے ہم سے چھپایا جا رہا ہے؟''

''کک...... کچھ نہیں آپی ویسے ہی۔'' وشمہ کی جان نکل گئی کہ کہیں سدرہ ڈائری نہ کھول لے۔ ''آپ کے سامنے لکھوں تو آپ ڈانٹتی ہیں ہر وقت ڈائری نہ لکھوں۔'' وشمہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو سدرہ نے پیار سے اس کے گال پر چٹکی کاٹی۔

''پاگل چل باہر آجا بابا یاد کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر سدرہ کمرے سے چلی گئی۔

''جی آپی ابھی آئی۔'' وشمہ نے سکون کا سانس لیا۔

بابا کی شفقت بھری نصیحتیں سن کے واپس کمرے میں آئی تو بیڈ پر رکھے موبائل کی اسکرین کو چمکتے دیکھ کر جھپٹ کر اٹھایا اور میسج اوپن کیا۔ ''یار پلیز مل لو نا۔ نہ ترساؤ اتنا عرصہ ہو گیا، کیا ابھی بھی مجھ پر اعتبار نہیں؟ جہاں کہو جیسے کہو وہیں مل لیتے ہیں۔ بس ایک نظر دیکھ کے چلا جاؤں گا، پلیز۔'' وشمہ کے چہرے کو مسکراہٹ نے چھوا۔

''کیوں جی کیوں ملوں بھلا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑائی لیکن ایک تجسس سا تھا اس کے دل میں کہ ایک بار دیکھوں تو سہی وہ کیسا ہے پھر آخرکار اس نے دل کی مان لی اور اوکے لکھ کے Send کر دیا۔ فوراً اس کی کال آ گئی وشمہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال اٹینڈ کی۔

''ہیلو! وشمہ، تھینک یو میری جان، میں بتا نہیں سکتا کتنا خوش ہوں تم نے ہاں کر کے مجھے جو عزت دی ہے میں ہمیشہ اسے یاد رکھوں گا۔'' اس کے لہجے میں بہت عزت اور پیار تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ نے وشمہ کے دل میں گھر کر لیا۔

''میں پہچانوں گی کیسے؟ مجھے کیا پتا آپ کیسے دکھتے ہیں۔'' وشمہ نے فوراً پوچھا۔

''مجھے تمہاری اسی معصومیت نے پاگل کر رکھا ہے میری جان، میری بلوری آئیز ہیں کلر فیئر ہے اور ہائیٹ 6 فٹ ہے، ڈریس بلیک ہو گا۔ تم آسانی سے پہچان لو گی۔'' اس نے تفصیل سے سمجھایا تو وشمہ نے جگہ کا پوچھ کے کال End کر دی۔ اس کی آنکھوں میں انگنت سپنے تھے۔

☆......☆

سفید مرمریں نازک ہاتھوں سے وہ بار بار نقاب کو درست کرتے ہوئے آتے جاتے ہر بندے کو بے چین نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دل تھا کہ 180 کی اسپیڈ پر دھڑک رہا تھا اور کہیں نہ کہیں ایک خوف بھی تھا کہ کوئی جاننے والا... دیکھ نہ لے اور دوسری طرف دل میں ایک عجیب سا سرور بھی تھا کہ کوئی اس کا دیوانہ ہے اسے چاہتا ہے، وشمہ بیک وقت کنفیوژ بھی تھی اور خوش بھی۔

''افوہ وہ آیا کیوں نہیں اب تک؟''

وہ جھنجلا کے بڑبڑائی۔ ''یا اللہ رحم کرنا آ تو گئی ہوں کسی نے دیکھ لیا تو زندگی کا آخری دن ہو گا۔''

وشمہ عادت کے مطابق سوچتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی کہ اچانک سائیڈ پر اس کے قریب بائیک کا ہارن بجا۔ اس نے چونک کے دیکھا۔ وہ واقعی ویسا ہی تھا بڑی بڑی بلوری آنکھیں، گھنے سیاہ بال، ہلکا سا مسکراتا ہوا ایکدم سے وہ اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔

''ت...... تم تو واقعی گڈ لکنگ ہو مجھے لگا ایویں امپریس کرنے کے چکر میں جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ ہولے سے بولی تو اس نے بھنویں اچکا کے جان بوجھ کے کہا۔

''کیا کہا؟'' جیسے اسے آواز صحیح سنائی نہ دی ہو۔ وشمہ بات کو سنبھالنے کے لیے الٹا اس پر برس پڑی۔ ''ٹائم دیکھا ہے بیس منٹ سے یہاں کھڑی ہوں کتنے لوگ آ جا رہے ہیں اتنی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی مجھے، پتا نہیں لوگ کیا سمجھ رہے ہوں گے۔''

''سوری...... سوری یار آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو کب سے آ چکا تھا۔ وہ جو سنبل کا درخت ہے اس کے پیچھے کھڑا ہو کے تمہیں دیکھتا رہا۔ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ نظر ہٹانے کو دل نہیں مان رہا تھا، آخر میں اس کا لہجہ بدل گیا تو وشمہ مزید کنفیوژ ہو گئی اس کے دیکھنے سے۔''

''اچھا بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ دیکھنا تھا دیکھ لیا اب میں چلتی ہوں۔'' اس نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے تو ایکدم سے اس نے بائیک اس کے آگے کر دی۔

''بائیک پر بیٹھو جہاں کہو گی اتار دوں گا۔''

''کیا؟'' وہ پریشان ہو کے ایک جھٹکے سے رکی۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو؟ میں کیوں بیٹھوں تمہارے ساتھ۔''

''یار سب لوگ دیکھ رہے ہیں انسلٹ نہ کراؤ لوگ غلط سمجھیں گے۔ میری خیر ہے تم پر کوئی بات کرے یہ مجھے

گوارا نہیں، پلیز ٹرسٹ می۔ آگے جا کے جہاں کہو گی اتار دوں گا۔‘‘

وشمہ نے ایک لمحہ سوچا تو اسے اس کی بات ٹھیک لگی۔ ڈرتے ڈرتے اس کے پیچھے بیٹھ گئی مگر دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ ’’یا اللہ عزت کی لاج رکھنا۔‘‘

’’پلیز تیز چلانا اور آگے چوک سے پہلے جو گلی ہے وہاں اتار دینا۔‘‘ وشمہ نے رونی آواز میں کہا تو اس نے زور سے جاندار قہقہہ لگاتے ہوئے ایک جھٹکے سے بائیک اسٹارٹ کی۔ وشمہ نے خود کو گرنے سے سنبھالنے کے لیے فوراً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو عجیب سا احساس ہوا اسے اور ہاتھ ہٹا لیا۔

’’ایک تو ڈرتی بہت ہو یار گر جاؤ گی ہاتھ رکھ لو۔‘‘ اس نے پیار سے سمجھایا۔

’’نہیں میں ایسے ٹھیک ہوں بس۔‘‘ بچوں کی طرح ضدی لہجے میں جواب دیا تو اس نے ہاتھ پیچھے کر کے وشمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وشمہ جی جان سے کانپ گئی۔

’’پلیز ہاتھ چھوڑو۔‘‘ آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ پھر ایکدم سے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیا تو اس نے فوراً ہاتھ چھوڑ کے بائیک کو سائیڈ پر روکا۔

’’سوری...... معاف کر دو مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ تمہارے ہاتھ اتنے پیارے ہیں کہ خود پر قابو نہ رکھ سکا معاف کر دو پلیز۔‘‘ اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔

’’میں نے گھر جانا ہے۔‘‘ وشمہ نظریں نیچے کیے مسلسل روتی جا رہی تھی۔

☆......☆

وشمہ کی آنکھوں میں انوکھے جذبوں کی چمک تھی وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے لگاتار میسیجز میں مصروف تھی۔ ان کے تعلق کو ایک سال بیت چکا تھا۔ وقت کے بہتے اس دھارے میں جہاں چاہت کو عروج ملا تھا وہیں وشمہ نے اس پر خود سے زیادہ اعتبار کر دیا تھا۔ وہ بھی اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا احساس کرتا اور اس کی دی ہوئی ہر چھوٹی چیز کو بھی سنبھال کے رکھتا تھا۔ دن رات کونٹیکٹ میں رہنا ان کا معمول تھا۔ اس وقت بھی بات سے بات نکل رہی تھی۔

’’سنو! اگر میں تمہیں کورٹ میرج کا کہوں تو؟‘‘

’’تو جان لے لوں گی تمہاری۔ تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے بابا کی عزت بہت عزیز ہے۔ عزت سے رخصت ہونا

مولانا انعام الحسن کاندھلوی

(1918ء۔10 جون 1995ء)

مولانا کا تعلق کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ایک دینی و علمی خانوادے سے تھا۔ ان کا سلسلہ نسب ساتویں پشت میں حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش سے جا ملتا ہے جنہوں نے مثنوی مولانا روم کا ساتواں دفتر لکھا اور پورے عالم اسلام میں خاتم مثنوی مولانا روم کہلائے۔ مولانا کے والد بزرگوار کا نام اکرام الحسن تھا۔ انہوں نے حافظ منگو سے قرآن کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اردو اور فارسی نانا حکیم عبدالحمیدؒ سے پڑھی۔ نو برس کی عمر میں ان کے والد کے ماموں مولانا الیاسؒ اپنے ساتھ دہلی لے آئے اور باقی تعلیم بنگلے والی مسجد کے مدرسے میں (جہاں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے) حاصل کی۔ حدیث کی کچھ تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں بھی حاصل کی لیکن مولانا محمد الیاس نے انہیں جلد ہی اپنے پاس بلا لیا۔ ان کے مدرسے ہی میں حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا الیاس نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں فرمایا تھا کہ ان میں سے جس پر اتفاق ہو امیر چن لیا جائے۔ ان میں مولانا انعام الحسن کا نام بھی شامل تھا۔ 1944ء میں مولانا الیاس کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف امیر مقرر ہوئے اور مولانا انعام الحسن اس کام میں ان کے ساتھ پورے انہماک کے ساتھ خاموشی سے لگے رہے۔ اپریل 1965ء میں مرکزی ذمہ داروں سے مشورے کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نے انہیں امیر تبلیغی جماعت مقرر کیا۔ مولانا کی کوششوں سے گزشتہ 33 برسوں میں تبلیغی جماعت کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا۔ تبلیغی کاموں کے سلسلے میں انہوں نے دور دراز ممالک کے بے شمار سفر اختیار کیے اور دنیا بھر کے لوگوں کو مرکز میں آنے کی دعوت دی۔ مولانا کا مدفن دہلی میں ہے۔

مرسلہ: کاوش عثمانی۔ پتوکی

چاہتی ہوں۔ آپی سے ایک بار ایک شعر سنا تھا یوں سمجھو وہ میرے دل کی آواز ہے۔ ''عزت نفس جس سے زخمی ہو۔ ایسی چھاؤں سے دھوپ بہتر ہے''۔ وشمہ نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''لو یو سوچ جان! میں تم سے یہی سننا چاہتا تھا اسی لیے تو اتنی اچھی لگتی ہو تم بہت معصوم ہو۔'' اس کا جواب دیکھ کے وشمہ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

''مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے ناں؟'' وشمہ نے ایک آس سے مان سے پوچھا۔

''نہیں میری جان کبھی بھی نہیں تم تو میری زندگی ہو۔ اچھا ابھی ملو ناں بس تھوڑی دیر کے لیے پلیز انکار نہ کرنا۔ دو ہفتے ہو گئے دیکھے ہوئے۔'' اس نے منت کرتے ہوئے کہا تو وشمہ کو ہنسی آ گئی۔

''او کے بابا لیکن آدھے گھنٹے سے ایک منٹ بھی اوپر نہ ہو۔''

''جو حکم جان جی! کب پہنچ رہی ہو؟'' اس نے چہک کے پوچھا۔

''میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔'' اس نے کال ڈس کنیکٹ کی اور جلدی سے سر پر چادر لے کر باہر آ گئی۔ سدرہ اپنے شوہر کے ساتھ واپس گھر جا چکی تھی۔ عباد دوستوں کے ساتھ یونی کے فنکشن پر تھا سو اس کے بھی ان کے گھر آنے کے آثار نہیں تھے اور بابا بھی زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے جانے میں مسئلہ نہ ہوا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر سے باہر آئی اور رکشا میں بیٹھ کر مطلوبہ جگہ پہنچ گئی۔ وہ اس کا ہی منتظر تھا وہ جیسے ہی اس کے پاس آئی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات دیکھ کے فوراً پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے ناں؟''

''یار میرے دوست کی ابھی کال آئی ہے کہ اس کی مدر کی حالت بہت سیریس ہے وہ انہیں اسپتال لے کر جا رہا ہے۔ پیچھے گھر خالی ہے وہ جلدی میں لاک نہ کر سکا تھوڑی دیر ان کے گھر رکنا پڑے گا۔ حالات خراب ہیں چور اچکے ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن تم ساتھ ہو مجھے سمجھ نہیں آ رہی اسے کیسے منع کروں؟ تمہاری عزت کا بھی خیال ہے۔''

وہ روہانسے لہجے میں بولا تو وہ ایکدم بول اٹھی۔

''ٹینشن کیوں لے رہے ہو تھوڑی دیر کی تو بات ہے چلو اس کے گھر، دوست ہے وہ تمہارا منع کرو گے تو برا مان جائے گا۔''

وہ اس کے چہرے پر پریشانی دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

''رئیلی؟'' وہ بے یقینی سے بولا تو وشمہ کو ہنسی آ گئی۔

''پاگل چلو اب دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بائیک پر اس کے پیچھے گئی۔

وہ جب وہاں گھر پہنچے تو گھر خالی تھا۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ وشمہ کو اس پر اندھا اعتماد تھا وہ اس کے پیار میں سرتاپا ڈوبی ہوئی تھی۔

☆......☆

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''راحیل گھر تو بہت پیارا ہے۔'' وشمہ نے چاروں طرف نظر دوڑا کے کہا اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

''اچھا...... لیکن میری جان کا گھر اس سے بھی پیارا بنواؤں گا۔'' اس کی نظروں میں پیار ہی پیار تھا۔

''سچ راحیل؟'' وشمہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

''ہاں میری جان! اچھا نقاب تو اتار دو اتنی گرمی ہے مر جاؤ گی گرمی سے۔''

''ناں بس ایسے ہی ٹھیک ہوں تم پھر گھورنے لگ جاتے ہو مجھ سے پھر بات نہیں ہو گی۔'' اس نے معصومیت سے کہا تو وہ ایکدم اٹھ کر پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وشمہ کا دل دھڑکنے لگا۔ راحیل نے اپنے ہاتھ سے اس کا نقاب اتار دیا اور بے خود ہو کے اسے تکنے لگا۔ وشمہ ایک دم پریشان ہو کے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تو اس نے ہاتھ کھینچ کے واپس بٹھا کر اسے بانہوں میں لے لیا تو وہ مچل گئی مگر مرد جیت گیا ہوس کے اس کھیل میں۔

☆......☆

رات کی تاریکی میں آنسو اس کے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ دل تھا کہ بہلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں وہ پیار کا لمس تھا ہی نہیں جو اسے سلا دیتا اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور ٹیبل کی دراز سے پین کلر نکالی پھر دبے قدموں کچن میں جا کے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور پین کلر لے کے غٹاغٹ پانی کو حلق میں اتارا تو تھوڑی سی دل کو ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ آہستہ قدموں سے چلتی واپس جب وہ اپنے بیڈ پر پہنچی تو موبائل اسکرین پر میسج دیکھ کے بے تابی سے اسے اوپن کیا۔

''سونو کیسی ہو میری جان۔'' پڑھتے ہی اس کے ہونٹوں کو ایک شکستہ مسکراہٹ نے چھوا۔

''کیسی ہو سکتی ہوں؟''

''پری جیسی۔''

اس سے کوئی جواب نہ بن پایا تو اس نے صرف ''اچھا'' لکھ کے Send کر دیا۔

''ہاں ناں میرے پاس آؤ۔''

''نہیں کوئی اور بات کرو۔'' اس نے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔

''کیوں نہیں؟ آؤ ناں مجھے تمہاری بہت یاد آرہی ہے تمہاری خوشبو مجھے سونے نہیں دیتی۔''

''پلیز آنٹی کو بھیجو تمہیں پتا ہے ناں بابا میرا رشتہ اپنے فرینڈ کے بیٹے سے کرنا چاہ رہے ہیں پلیز خدا کا واسطہ نہ دو مجھے اتنی اذیت، میں تھک گئی ہوں، بہت ٹوٹ گئی ہوں۔'' آنسوؤں کو باہر آنے کا راستہ مل گیا تھا۔

''یار کیا مصیبت ہے جب بات کروں دماغ خراب کر دیتی ہو کہا تو ہے بھیجوں گا۔'' اس نے جھنجلا کے جواب دیا۔

''کب بھیجو گے؟ جب میری شادی ہو جائے گی؟ کھو دو گے تم مجھے کھو دو گے لیکن یاد رکھنا میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں۔'' اس کا دل چلا اٹھا لیکن اس نے پھر جواب ہی نہ دیا وہ کافی دیر ویٹ کرتی رہی اس کے میسج کا لیکن اس نے ایک حرف تسلی کا کہنا گوارا نہ کیا تو اس نے کرب سے آنکھیں موندھ لیں۔

☆......☆

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ وہ جتنا اسے بھولنے کی کوشش کرتی دل اس سے بغاوت کرتا اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ گزرا ہوا ایک ایک پل اس طرح یاد آتا کہ بے چین ہو کر اس کی روح تک بین کرتی۔ وہ چیخ اٹھی اپنی حالت سے گھبرا کے۔

''جھوٹ ہے، اسے مجھ سے کبھی پیار تھا ہی نہیں۔ جھوٹ بولتا تھا کہ میرے بنا جی نہیں سکتا، جھوٹ سب جھوٹ تھا، دھوکا دیا اس نے۔ میری معصومیت سے کھیلتا رہا۔ مجھے میری ہی نظروں سے گرا دیا۔ میری حیا میری معصومیت چھین کے آج کہتا ہے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ کیسے کہہ سکتا ہے وہ ایسے۔ پیار تو پاکیزگی کا نام ہے تو مجھے کیوں چھوا اس نے؟ کیوں مجھے جیتے جی مار ڈالا؟ میں اب کیسے کسی اور کو خود پر حق دوں گی اس نے مجھے بے مول کر دیا۔''

وہ اندر ہی اندر گھٹتی جا رہی تھی پھر اس نے مرے مرے ہاتھوں سے اس شخص کا نمبر ڈائل کیا جسے بد دعا دے کے بھی وہ اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کافی دیر بعد اس نے کال اٹینڈ کی تو اس کی ہیلو سنتے ہی اس کے دل کو سکون سا مل گیا۔ اس نے بے قراری سے کہا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے موبائل کو گھورا کہ اب وہ ملنے کی بھی وجہ پوچھے گا۔

''پلیز میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ دیکھو میں نے کبھی تم سے ملنے کا نہیں کہا۔ ہمیشہ تم نے ملنے پر مجبور کیا۔ آج پہلی بار تم سے ریکویسٹ کر رہی ہوں پلیز۔''

''یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کہیں مجھے مارنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے کسی دن تم مجھے قتل کر دو گی۔'' اس نے اتنے روکھے پن سے کہا کہ اس کا دل مٹھی میں آگیا اور اس کے بے جان ہاتھوں سے موبائل چھوٹ گیا اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

پھر اس کی آنکھ اسپتال کے بستر پر کھلی تو سب کو خود کے لیے پریشان دیکھ کر شرمندہ ہو گئی کہ ایک شخص کی خاطر اتنے پیار کرنے والے چہروں کو اس نے اداس کر دیا۔ وہ اداسی سے مسکرا دی تو اس کے ایک کزن کو غصہ آگیا۔

''پرابلم کیا ہے تمہیں؟ نہ کچھ بتاتی ہو نہ کہتی ہو مشکل سے مشکل کنڈیشن میں بھی مسکرا کے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کرتی ہو کہ تم ٹھیک ہو۔ پاگل سمجھ رکھا ہے ہم سب کو؟ تم ہم سب کے پیار کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو جان نکال دی تھی تم نے میری۔ تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔'' غصے میں وہ کچھ زیادہ ہی ایموشنل ہو گیا اور بولتے بولتے رک گیا اور سب کے حیران چہرے دیکھ کے شرمندہ ہو کے روم سے باہر نکل گیا۔ شام تک اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

☆......☆

زندگی عجیب چیز ہے کبھی اتنی خوب صورت لگنے لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے تتلی بن کے ہوا کے سنگ رقص کریں۔ اس کا ہر رنگ خود میں سمیٹ لیں اور کبھی اتنی بدصورت لگنے لگتی ہے اور اتنی مشکل کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ زندگی میں رنگ پیار کے جذبوں سے ہیں لیکن اگر جذبے ہی ہوس کا شکار ہوں، ہوس میں لپٹے ہوں تو زندگی تنگ پڑ جاتی ہے۔ نہ جیا جاتا ہے نہ ہی مرنا آسان ہوتا ہے۔ سوچتے سوچتے ایک آہ سسکی کی صورت میں اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ ایک عجیب بے نام سی بے چینی ہی بے چینی تھی جسے وہ

درد کا نام بھی نہیں دے سکتی تھی۔ نہ ذہن کام کر رہا تھا نہ ہی دل ساتھ دے رہا تھا۔ وہ بہلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا بار بار ایک ہی نام کی تکرار کر رہا تھا۔ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس سے مخلص ہی نہیں ہے۔ آخر دل و دماغ کی اس جنگ میں دل نے اس کی نسوانی انا کو شکست دے دی۔ کانپتے ہاتھوں سے ایک بار پھر اس سے ملنے کی آس میں میسج کیا۔ ''میں تو تمہاری زندگی تھی ناں تو پھر کیسے مجھے اکیلا چھوڑ سکتے ہو پلیز رحم کرو ملو مجھ سے آخری بار پھر کبھی نہیں کہوں گی ملنے کو۔'' اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

موبائل پر میسج ٹون کی آواز سنتے ہی ایک جھٹکے سے سیدھے ہو کر میسج اوپن کیا اور ''اوکے'' پڑھ کے دل خوشی سے رو دیا چلو کچھ تو اسے میرا خیال آیا گھر والے سب رشتے داروں کے گھر شادی پر گئے ہوئے تھے اس نے تیزی سے چادر سر پر لی اور نہر کا رخ کرنے کا ارادہ کیا جہاں اکثر وہ اس سے مل کے سہانے خوابوں کی سیر کراتا تھا۔

☆......☆

''کہاں جا رہی ہو؟'' ابھی اس نے گیٹ سے قدم باہر رکھا ہی تھا کہ اسے اس شخص کی آواز سنائی دی جو ہر مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیتا تھا لیکن زمانے کی ٹھوکروں نے اسے ہر فرد سے بدگمان کر دیا تھا۔ کسی پر یقین نہیں آتا تھا اسے ہر مرد ہوس و غرض میں لتھڑا نظر آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ راستے سے ہٹو میں تمہاری جوابدہ نہیں ہوں۔''

اس نے حیرت سے ہونٹ سکیڑ کے اس ہستی کو دیکھا جو اس کی کل کائنات تھی لیکن پتا نہیں کیوں ہر وقت اس سے خفا رہتی اس کی شوخیاں کہیں کھو گئی تھیں۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔ ''دیکھو تمہاری طبیعت ابھی بھی بہتر نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے بیڈ ریسٹ کا کہا ہے تم ابھی کہیں نہ جاؤ۔''

''مائنڈ یور اون بزنس۔'' وہ سختی سے کہتی سائیڈ سے ہو کر باہر نکلتی چلی گئی۔ وہ حیران سا کھڑا رہ گیا۔

نہر کنارے پہنچ کے اس کے قدم ڈھیلے پڑ گئے وہ دشمن جان سامنے موجود تھا۔ ہمیشہ کی طرح کلف لگا ہوا سفید کرتہ، گھنے کالے بالوں کو اوپر کی طرف کنگھا کیا ہوا اور بلیک سن گلاسز لگائے بائیک سے ٹیک لگائے وہ اسی کی سمت تک رہا تھا۔ اس نے الفاظ کو ترتیب دینا شروع کر دیا کہ بات کہاں سے شروع ہو کہیں وہ بات سنے بغیر ہی چلا نہ جائے۔ وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے ذہن میں خیالات کا اتنا ہجوم تھا کہ الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔ مدعا کیسے بیان کرے یہ سوچ کے کئی سیکنڈ اس کو خالی نظروں سے تکتی رہی۔

''کیا ہے یار کچھ بولو گی یا ایسے ہی گھورتی رہو گی؟'' وہ سخت بدمزہ ہوا۔

ایک ٹھنڈی سانس سسکاری کی صورت اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ ''یاد ہے تم کہتے تھے میں تمہاری زندگی ہوں تم میری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تم نے قسمیں کھائی تھیں وعدے کیے تھے کہ جلد مجھ سے شادی......''

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیخ پڑا۔

''اس لیے نہیں ملتا تھا تم سے، ہر وقت فضول بحث کرتی ہو، لڑتی ہو میری کون سی کہیں اور شادی ہو گئی ہے یا کوئی اور لڑکی پھنسا لی ہے کہ تم مر رہی ہو۔ جب دیکھو ایک ہی رٹ ہوتی ہے کیا کروں میں؟ نہیں مانتے گھر والے اس میں میری کیا غلطی اب اپنے گھر والوں کو مار دوں کیا تمہارے لیے؟''

''ترس کھاؤ مجھ پر۔'' وہ سسک اٹھی۔ ''اتنا آگے آ کے اس طرح مجھے اکیلا نہ چھوڑو، میں جی نہیں پاؤں گی، تم جانتے ہو میں ایسی لڑکی نہیں تھی۔ تم نے مجبور کیا اتنا آگے آنے پر اب ہاتھ نہ چھوڑو ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں کرب ہی کرب تھا۔

''میرے گھر والے میری کزن سے انگیجمنٹ کرنا چاہ رہے ہیں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ اس نے بہت روکھے لہجے میں جواب دیا۔ اس نے لڑکھڑا کے ایکدم بائیک کا سہارا لیا بائیں سائیڈ میں اسے ہلکے سے درد کا احساس ہوا سانس تھا کہ لینا دشوار ہو رہا تھا اس نے اپنی مٹھی بند کر کے کھولی ہمت جمع کی اور ایک بار پھر اس کے سامنے آئی۔

''میں، میری عزت کچھ بھی نہیں تمہارے لیے۔ میں مر جاؤں تو؟''

''تو مر جاؤ مجھے پتا ہے تم مرنے والی نہیں ہو مجھے مار کے ہی مرو گی، ہر وقت ذہنی اذیت دیتی ہو اس حال میں تم سے پہلے میں مر جاؤں گا۔'' اس نے انتہائی غصے سے جواب دیا۔ الفاظ تھے کہ بھالے اسے لگا دل رک رہا ہے۔ ''جاؤ۔'' اس نے یہ کہہ کے رخ پھیر لیا اسے کوئی جواب نہ ملا چند سیکنڈ بعد اسے بائیک اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور وہ چلا گیا۔

اس کے رگ و پے میں عجیب سا مدھم مدھم سا ایک درد تھا آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا سا چھا جاتا تھا اس

نے مشکل سے ڈبڈبائی آنکھوں سے رکشا روکا اور اسے گھر کا پتا سمجھایا۔ سفر کب اور کیسے گزرا اسے معلوم تک نہ ہوا رکشا ایک جھٹکے سے اس کے دروازے پر رکا تو وہ چونک کے نیچے اتر آئی۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ برآمدے میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر حیرت ہوئی اسے۔ ''تم ابھی تک یہیں ہو؟''

وہ چلتا ہوا اس کے پاس آ کے رک گیا۔

''میں گیا ہی کب تھا۔'' اس نے جیسے سرگوشی کی پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی پریشان ہو گیا۔ ''تمہیں کیا ہوا تم ٹھیک ہو ناں؟'' اور ایکدم سے آگے بڑھ کے اسے متاع جاں کی طرح اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا جس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

☆......☆

''ڈاکٹر......ڈاکٹر ایمرجنسی......'' اسے ہاتھوں میں سمیٹے وہ تیزی سے چلاتا ہوا اسپتال ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوا تو سائیڈ کوریڈور سے ایک وارڈ بوائے نے فوراً ایک اسٹریچر آگے کیا جس پر اس نے اسے لٹا دیا۔ وارڈ میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے آگے بڑھ کے نبض چیک کی اور مریض کی حالت دیکھ کے پرچی پر ٹیسٹ لکھ کے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ سب سے پہلے مریضہ کی ای سی جی کرائیں انہیں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔ اس نے اپنے حواس قابو میں کیے اور سر ہلا کے تیزی سے اسے ای سی جی روم میں لے گیا۔ نرس نے اسے باہر روک لیا اور اسٹریچر اندر لے گئی۔ وہ سر جھکا کے باہر رکھے بینچ پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا میری بیٹی کو؟'' پریشانی میں ڈوبی آواز سن کر اس نے ایکدم سر اٹھایا اور فوراً آگے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر پاس بٹھا دیا۔ وہ جیسے ہی بے ہوش ہو کر گری تھی اس نے اسے سنبھال کے گاڑی میں لٹانے کے فوراً بعد انکل کو کال کر کے بتا دیا تھا اس لیے وہ فوراً ہی سب اسپتال پہنچ گئے تھے۔

''انکل ڈاکٹر ٹیسٹ کر رہے ہیں سب ٹھیک ہے آپ پلیز ریلیکس رہیں۔'' اس نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا جب کہ اس کا اپنا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک نرس اسٹریچر باہر لے آئی۔ رپورٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ ''انہیں ڈاکٹر نے فوراً آئی سی یو ایڈمٹ کرنے کا کہا ہے۔'' اتنی دیر میں ڈاکٹر وارث بھی وہاں آ گئے تھے............ ''ڈاکٹر وارث کیا ہوا میری بیٹی کو؟ ٹھیک ہے ناں وہ؟''

باپ کے اندر بے چینی تھی بیٹی کا حال دیکھ کے۔ ڈاکٹر وارث نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈال کے نرس کو اشارہ کیا کہ وہ اسے آئی سی یو میں شفٹ کرے پھر تسلی کے لیے ان کے کندھے کو ہلکا سا دبایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ سب حیران و پریشان اسے آکسیجن ماسک اور خون کی بوتل لگتے دیکھتے رہ گئے۔

کافی دیر بعد ڈاکٹر وارث روم سے باہر آئے تو سب کھڑے ہو گئے۔

''سر پلیز بتائیں ناں کیا ہوا ہے اسے؟''

ڈاکٹر نے ایک نظر رک کے اسے دیکھا اور پھر اشارے سے اسے ساتھ آنے کا کہا۔ سب سے الگ جا کے ڈاکٹر نے جو کچھ کہا اسے سن کے بار بار اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا دل تھا کہ کسی بھی بات کو مان ہی نہیں رہا تھا۔

''دیکھیں آپ سب کو ہمت سے کام لینا ہو گا انہیں انجائنا پکٹورس کا اٹیک ہوا ہے۔ ان کی کنڈیشن بہت کریٹیکل ہے۔ ابھی آکسیجن ماسک اور خون کی بوتل لگا دی ہے حالت پھر بھی ویسی ہے۔ بارہ گھنٹے زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ زندگی اس پاک ذات کے ہاتھ میں ہے۔ ہو سکتا ہے معجزہ ہو جائے آپ سب دعا کریں۔''

وہ بہت مشکل سے خود کو سنبھال رہا تھا۔ اسے لگا ڈاکٹر نے اس کی روح کھینچ لی ہو جیسے یہ سب کہہ کے......'' آئی سی یو کے سامنے گھر کے ہر فرد کو اس نے سوالیہ نظروں سے اپنا منتظر دیکھا تو چہرے پر تھوڑی سی بشاشت پیدا کی وہ جانتا تھا اگر ایکدم سب کو سچ بتا دیا تو کوئی بھی یہ دھچکا برداشت نہیں کر سکے گا، خاص طور پر باپ جس کا وہ سرمایہ تھی۔

''وہ ٹھیک ہو جائے گی انشاء اللہ! ہمارا وسیلہ خدا ہے دیکھنا آپ یہ ہم سے پہلے کی طرح باتیں کرے گی، ہنسے گی شرارتیں کرے گی۔'' وہ ان سب سے زیادہ خود کو امید دے رہا تھا۔

''کہتے ہیں دعا حوصلہ ہے راز ہے خدا اور بندے کے درمیان، طاقت ہے کمزوری میں ایمان کی اور وہ اس وسیلے کا ورد کرتا جا رہا تھا اس کا دل زبان روح سب کی پکار صرف اس کی زندگی تھی یا شاید اس کی زندگی میں ان ڈائریکٹ وہ اپنی ہی زندگی مانگ رہا تھا۔''

☆......☆

آئی سی یو میں مشینوں میں جکڑی ہوئی زرد چہرے کے ساتھ وہ مثل گلاب کملائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ان سب کے چہروں پر ایک آس ایک اُمید تھی۔ دل انجانے خدشے سے لرز رہا تھا اور ذہنوں میں بس ایک سوال ہی تھا ایسا کب کیا ہوا جسے وہ دل پر لے گئی؟ وہ تو ایک ہنستی مسکراتی زندگی سے بھرپور لڑکی تھی پھر آج اس کی زندگی کا چراغ لرزنے کیوں لگا تھا؟ باپ پر سکتے کی سی کیفیت تھی اس کی بہن باپ کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ پرشکوہ نم نظروں سے اس دشمنِ جاں کو تک رہا تھا جس کے بنا جینا تو کیا جینے کا تصور بھی محال تھا وہ اس کی سنگھی تھی بچپن کا ساتھ تھا اور یہ ساتھ کب چاہت میں بدلا پتا تک نہ چلا لیکن اس کی معصومیت، بھولا پن اسے کچھ کہنے کی اجازت نہ دیتا اس لیے اس نے تمام جذبے ایک خاص وقت کے لیے دل میں سنبھال رکھے تھے اور وہ تھی کہ موقع ہی نہ دے رہی تھی۔ وہ بہت شوخ چنچل شرارتی سی لڑکی تھی اور اب اسے اس حال میں دیکھ کے اس کا دل کٹنے لگا تھا۔ وہ ایک دو ماہ سے بہت چپ چپ رہنے لگی تھی۔ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ لگتی۔ جب اسے پکارا جاتا بہت چونک کے دیکھتی اور مسکرا دیتی لیکن اس کا لہجہ اس کی آنکھوں کا خالی پن اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہ دیتا۔ وہ اس سے کترانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے بے اعتباری دیکھ کر وہ بہت ڈسٹرب رہتا تھا۔ کئی بار پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹال گئی۔ کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ لگ رہا تھا اس کا سر پھٹ رہا تھا اچانک اس کی پاکٹ میں رکھا موبائل وائبریٹ ہوا اس نے چونک کے اسے باہر نکالا یہ اس کا موبائل تھا جس کے لیے وہ دل و جان سے مصروف دعا تھا۔ اسے یاد آیا جب وہ گرنے لگی تھی تو اس کا موبائل ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا جسے اس نے اٹھا کر پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔ اس نے بے دلی سے میسج اوپن کیا۔ ''جان مجھے معاف کردینا پلیز۔ تم بہت معصوم ہو مجھے کبھی بددعا نہ دینا تمہیں تمہارے پیار کا واسطہ......!''

اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا اس نے فوراً اس نمبر پر کال کی۔

''ہیلو وشمہ۔'' ایک مردانہ آواز آئی۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کون ہو تم؟'' سامنے والے نے مردانہ آواز سنتے ہی کال ڈسکنکٹ کردی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اسے یاد آیا کہ اسے ڈائری لکھنے کی عادت تھی وہ بے چینی سے کھڑا ہوگیا سب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا لیکن بنا کسی سے بات کیے اس نے تیزی سے پارکنگ ایریا سے جا کے گاڑی نکالی اور گھر روانہ ہوگیا۔

☆......☆

عباد کے ہاتھ سے ڈائری چھوٹ گئی اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ڈائری پر جگہ جگہ آنسوؤں کے نشانوں نے اس کا دل چیر کے رکھ دیا تھا۔

''کیسے برداشت کیا اتنا سب کچھ تم نے؟ ایک بار ایک بار تو کہہ کے دیکھا ہوتا۔'' وہ تاسف سے پیشانی مسل رہا تھا۔

بار بار کال آتی رہی تھی اور جب اس نے ریسیو کی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ سدرہ نے روتے ہوئے بتایا کہ وشمہ کی حالت مزید بگڑ گئی ہے۔ وہ بھاگتا ہوا اسپتال پہنچا۔ عباد نے دیکھا ڈاکٹرز کے چہرے پر تشویش تھی وشمہ کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ عباد نے خون کی بوتل دی جو ڈاکٹر اب اسے لگا رہے تھے لیکن اس کی کنڈیشن بجائے سدھار کے مزید خراب ہوگئی تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ باہر کھڑے ہر نفس کی روح اذیت میں تھی وہ مجسم دعا بنے ہوئے تھے لیکن شاید درد دعا سے کہیں بڑھ کے تھا کہ دعائیں اثر کھو رہی تھیں۔ نظریں بس اسی پر ٹکی ہوئی تھیں وہ آنکھیں بند کیے درود پاک کا ورد کرتے ہوئے بہت کمزور لگ رہے تھے۔ عباد کا رواں رواں وشمہ کو واپس بلا رہا تھا اور پھر اسے لگا کائنات تھم سی گئی ہے جس میں اسے صرف وشمہ کی مدھم ہوتی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹرز نے سی پی آر کر کے بھی جب دیکھا کہ عمل تنفس نہ ہونے کے برابر ہے تو ڈائی گاکسن کا انجکشن لگا کے اسے بچانے کی آخری کوشش کی۔ عباد کا سانس رک گیا۔

''یا خدا! رحم......رحم......رحم۔'' اس کی زبان سے مسلسل یہی الفاظ ادا ہو رہے تھے کہ اس نے دیکھا اس گلابوں جیسی رنگت والی وشمہ کے چہرے پر ڈاکٹر نے سفید رنگ کا کپڑا ڈال دیا۔

معصوم لڑکیاں جس محبت کو اپنے تئیں زندگی کا سب کچھ سمجھ لیا کرتی ہیں۔ وہ ریت بن کر پھسل بھی جاتی ہیں اور زندہ وجود کو بھی ریت جیسا بھر بھرا بھی کردیتی ہیں کہ وہ محبت تو ہوتی ہی نہیں۔

مکافات

محترم ایڈیٹر
ایک ایسی سرگزشت روانہ کررہا ہوں جو عرصہ دراز سے میرے ذہن پر بوجھ ہے۔ میں جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی الجھتا جاتا ہوں۔ مکافاتِ عمل کس طرح سامنے آتا ہے اس کی سچی تصویر کشی کردی ہے۔

اختر شہاب
(کراچی)

"تم دیکھ لینا...... بلکہ میری یہ بات لکھ کر رکھ لو کہ جب ہم مرجائیں گے تب بھی تم سکون سے بیٹھے رہو گے۔ خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے رہو گے اور ہمارا کریا کرم بھی ہوجائے گا۔ تب تمہیں اس کی اطلاع ملے گی۔"

یہ میرے تاؤ کے الفاظ تھے جو اس وقت میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ تاؤ سے میری مراد تایا ہی ہے۔ وہ میرے سگے تایا نہیں تھے بلکہ ابا کے دوست تھے۔ اس وجہ سے ہم انہیں تاؤ کہتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا

کہ نہ صرف وہ ہمارے دور پرے کے رشتے دار تھے بلکہ ابا کے بچپن کے دوست بھی تھے۔ انہیں تاؤ کا لقب بھی ابا جان نے ہی دیا تھا۔ وہ ہمارے ابا سے صرف ایک دن بڑے تھے لہٰذا جب بھی وہ ہمارے گھر آتے ابا پر اپنے بڑے ہونے کا رعب جھاڑتے۔ ان کے مزاج میں تھوڑا غصہ بھی زیادہ تھا لہٰذا جب بھی وہ آتے اباجی کہتے۔ ''لو وہ آگیا۔ تاؤ کھانے والا تمہارا تاؤ۔''

پر تاؤ کا یہ خطاب کسی حسد یا جلن کا مظہر نہیں تھا بلکہ یہ تو دوستی محبت اور آپس کی نوک جھوک کا ایک پیارا سا سلسلہ تھا۔

ہمارے گھر تو وہ نہ جانے کب سے آرہے ہوں گے مگر ہم نے ہوش سنبھالنے کے بعد انہیں زیادہ تر عید بقر عید ہی آتے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور مسئلہ ہوتا تو وہ آتے ورنہ نہیں۔ عید بقر عید پر وہ ہفتہ دس دن پہلے ہی ہمارے ہاں آجاتے اور جب بھی وہ ہمارے ہاں آتے کبھی خالی ہاتھ نہ ہوتے۔ رمضان میں موسمی پھل، میوہ، گڑ اور دوسری سوغاتیں ان کے ہمراہ ہوتیں اور بقر عید پر دو بکرے جن میں سے ایک ہمارا اور دوسرا ان کی بیٹی کا ہوا کرتا تھا۔

جی ہاں! ہم سے زیادہ تو وہ اپنی بیٹی شہلا سے ملنے کے لیے بے تاب ہوتے تھے جو شادی کے بعد ہمارے شہر میں آن بسی تھی مگر تاؤ میں چونکہ وضعداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لیے وہ اپنی سابقہ روایات کو نبھانے سے پہلے ہمارے ہاں آتے اور پھر اپنی بیٹی کے ہاں جاتے، یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنے آنے کی اطلاع فوراً اپنی بیٹی کو کردیتے اور خراب ہونے والی سوغاتیں مثلاً پھل وغیرہ فوراً ہی اس کے ہاں پہنچواتے اور باقی سامان جب وہ خود جاتے تو اپنے ساتھ لے جاتے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ چیزیں خود میرے ساتھ لے جائیں مگر وہ ہر دفعہ انکار کردیتے اور اکیلے ہی چل پڑتے۔

''بیٹا!'' وہ کہتے۔ ''اگر تم میرے ساتھ جاؤ گے تو شہلا میرے ساتھ ساتھ تمہارا بھی خیال کرنے کی کوشش کرے گی۔ یوں اس کی توجہ بٹ جائے گی اور اس کی خوشی میں فکر شامل ہو جائے گی جو میں نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ تمہارے جانے سے میری جو خصوصی حیثیت ہوتی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ سمجھا کرو یار۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھاتے اور میں لاجواب ہو جاتا۔

''تو باقی چیزیں میرے ہاتھ سے کیوں بھجواتے ہیں۔ یہ بھی خود لے جایا کریں نا۔'' میں چڑ کر کہتا۔

''دیکھو بھئی۔'' وہ کہتے۔ ''تم سے چیزیں بھجوانے کی دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ خراب ہو جائیں گی اور دوسرے میں اگر وہاں چلا گیا تو شہلا مجھے آنے نہیں دے گی۔ بیٹی اور نواسوں کو دیکھ کر میں خود بھی پھسل جاؤں گا۔ پھر تمہیں ہی گلہ ہو گا کہ تاؤ تو ہمارے گھر ٹھہرے ہی نہیں۔ بولو کیا کہتے ہو لے جاؤں؟''

''نہیں.....نہیں! تاؤ ایسا غضب مت کریں۔ ایک تو آپ کے جانے سے گھر کی رونق ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے ابا جان میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔''

بیٹی کے پاس ان کے جانے کا بھی کوئی لگا بندھا معمول نہ تھا۔ جب انہیں ابا کی کوئی بات بری لگتی یا جب ان کا دل کرتا وہ خاموشی سے نکل جاتے۔ ان کا خیال تھا کہ سرپرائز دینے سے ان کی بیٹی زیادہ خوش ہوتی ہے۔ بیٹی کے پاس سے وہ ہمارے پاس واپس نہیں آتے بلکہ وہیں سے گاؤں نکل جاتے۔ یوں ہمیں ان کے آنے اور جانے کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے لیے یہ سب معمول تھا۔

ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ تاؤ سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ کوئی بزرگ یا ضعیف سے شخص ہوں گے۔ جی نہیں! ان کی عمر پچاس کے قریب تھی اور دیہات میں رہنے کی وجہ سے ان کی صحت اباجی سے بھی بہتر تھی اور وہ اچھا خاصا وزن اٹھا کے میلوں پیدل چل سکتے تھے۔

''بھابی! اس بڑے میاں کو نکیل ڈال کر رکھیں۔ اس لحہ میں بھی تانکا جھانکی سے باز نہیں آتا۔'' وہ امی سے مذاق کرتے۔

''بیٹا! وہ تو تب پتے چلے گا جب میں دوسری والی کا پتا جا کے بتاؤں گا۔ ابھی تو میں نے چھپا رکھا ہے۔'' اباجان جوابی حملہ کرتے۔

ان کی اباجان سے اسی طرح نوک جھوک چلتی رہتی۔ ان دوستوں کی نوک جھوک اور لڑائی جھگڑا اپنی جگہ مگر تاؤ ہم بچوں کے بھی بہت لاڈ اٹھاتے۔ وہ جب بھی آتے بچوں کی فرمائشیں شروع ہو جاتیں۔ اباجی لاکھ آنکھیں دکھاتے مگر تاؤ اپنے بڑے ہونے کا رعب ڈال کے انہیں چپ کرادیتے۔ بچپن میں تو ان کے ساتھ میں سویا کرتا تھا۔ سونے سے پہلے وہ مختلف واقعات اسلامی کہانیاں اور دعائیں یاد کراتے۔ ان کا کہانی سنانے کا ڈھنگ بھی ایک خاص ہی تھا۔ وہ کہانی سناتے ہوئے ہاتھوں کے اشارے

کرتے اور مختلف آوازیں نکال کر ایسی منظر کشی کرتے کہ ہم سب خود کو اسی ماحول میں پاتے اور کہانی سننے میں اس قدر محو ہو جاتے کہ گردوپیش کو بھی بھول جاتے۔

''تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو۔'' ایک دن وہ نہ جانے کس موڈ میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

''اتنا زیادہ کہ اگر آپ ہمارے سگے تایا ہوتے تو شاید ان سے بھی نہ کرتا۔''

''بدمعاش! مجھے اپنا نہیں غیر سمجھتا ہے۔'' وہ بولے۔

''نہیں تاؤ۔ میں گڑبڑا گیا۔ وہ تو میں نے یونہی مثال دی تھی ورنہ آپ تو مجھے بہت پیارے ہیں۔''

''اچھا یہ بتا۔ میں مر گیا تو تو رو دے گا۔''

''تاؤ! کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' میں بولا۔ ''مریں آپ کے دشمن۔''

''او میاں۔'' وہ بولے۔ ''مرنا تو سبھی کو ہے۔ اس دنیا سے سب نے ایک ایک کر کے اٹھ جانا ہے مگر میں تجھے ایک بات بتاؤں جب میں مروں گا تو تو نہیں روئے گا۔''

''کیوں نہیں روؤں گا۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''کیا میں آپ سے محبت نہیں کرتا یا میری محبت پر آپ کو شک ہے۔''

''اس لیے نہیں روئے گا۔'' وہ رک گئے انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ''کہ تجھے میری موت کی اطلاع تب ملے گی جب مجھے لوگ کئی دن ہوئے دفنا چکے ہوں گے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں تاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ خدانخواستہ کسی کے انتقال کی خبر آنے میں دن لگ جائیں۔ ٹیلی فون پر فوراً اطلاع ہو جاتی ہے (یاد رہے اس زمانے میں موبائل کا دور نہیں تھا۔) اور اس کے علاوہ مجھے پاکستان سے باہر جانا بھی پسند نہیں ہے لہٰذا میرے پردیس میں ہونے کی وجہ سے بھی دیر سے اطلاع ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔'' وہ بولے۔ ''مگر قسمت کے آگے سب کام بیکار ہو جاتے ہیں۔ قسمت ہر اطلاع کے پر کاٹ دیتی ہے اور ٹیلی فون لائنیں جام کر دیتی ہے۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سب آپ کی قسمت میں لکھا ہے۔'' میں چڑ... کر بولا۔ ''یعنی آپ شاید اس دور کے کوئی ولی ہیں جو آپ کو آئندہ پیش آنے والے حالات وواقعات کا پہلے سے علم ہو گیا ہے۔''

''ارے میاں!'' وہ بولے۔ ''یہ قسمت نہیں یہ تو بدلے کا چکر ہے۔ یہ مکافاتِ عمل ہے میں نے جو بویا ہے وہی کاٹا ہے۔''

''کیا مطلب!'' میں حیران ہو گیا۔ ''کیسا بدلہ، کیا کھویا اور کیا کاٹا، آپ مجھے تفصیل سے بتائیں۔'' میں نے ضد کی۔

''میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مجھے کسی کو راز دار بنانا پڑے گا اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں یہ ذمہ داری اسے دے دیتا۔''

''واہ تاؤ'' میں نے چوٹ کی۔ ''ابھی تو آپ مجھے کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو اپنا نہیں سمجھتا اور اب آپ خود ہی مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھ رہے۔''

''بیٹا سمجھا ہے۔ تبھی تو یہ ذمہ داری ڈال رہا ہوں۔''

''بولیں۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''بیٹا! یہ اس وقت کا قصہ ہے جب آتش جوان تھا۔'' وہ رک گئے اور پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ گویا ہوئے۔ ''ان دنوں رگوں میں خون دوڑتا نہیں بلکہ جوش مارتا تھا۔ جوانی کی راتیں اور سردیوں کے دن تھے۔ ہمارا اور تمہاری تائی کا عشق زوروں پر چل رہا تھا۔ اس معاملے میں تمہارے ابا جان ہمارے راز داں تھے۔ جیسا کہ تمہیں علم ہے کہ تمہاری تائی ہماری رشتہ دار بھی تھیں۔ سو ہمارے عشق میں کوئی ظالم سماج نہیں آیا اور ہم دونوں کے گھر والوں کی رضامندی سے ہماری منگنی ہو گئی۔

''پھر اس کے بعد ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔'' میں نے تاؤ کو چھیڑا۔ ''تاؤ! یہ تو کوئی قصہ نہ ہوا۔''

''ایک تو تم یہاں ہمیں بیچ میں مت ٹوکا کرو۔'' وہ بولے۔ ''اصل قصہ تو منگنی کے بعد شروع ہوتا ہے، ہوا یوں کہ تمہاری تائی کی ایک سہیلی تھی بہت گہری اور بہت پکی۔ یوں سمجھ لو کہ دونوں یک جان دو قالب تھیں۔ نام تھا اس کا زلیخا۔ تھی تو غریب گھرانے کی مگر تھی بہت خوب صورت تمہاری تائی سے بھی زیادہ۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں تاؤ کو چھیڑنے کو بولا۔ ''آپ تائی کو چھوڑ کر اس پر عاشق ہو گئے ہوں گے۔''

''پھر وہی بک بک.....'' وہ ناراض ہو گئے۔ ''جاؤ میں نہیں سناتا۔'' وہ خاموش ہو گئے۔

''اچھا.....اچھا.....تاؤ! اب میں بیچ میں نہیں بولوں گا۔'' میں ان کی خوشامد کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ اپنا بیان

جاری رکھیں۔"

"اچھا تو پھر سنو۔" وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "تو وہ جو زلیخا تھی ناں، وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی چنچل بھی تھی۔ میرے ساتھ تو وہ اکثر مذاق کیا کرتی تھی کیونکہ اسے بھی میرے اور تمہاری تائی کے تمام معاملات کا علم تھا۔ ویسے تو منگنی کے بعد سب کو ہی معلوم ہو گیا تھا مگر وہ روزِ اوّل سے ہی تمہاری تائی کی راز دار تھی۔ اس لیے وہ مجھ کو تنگ بھی زیادہ کرتی تھی مگر میں اس کے مذاق کا قطعاً برا نہیں مناتا تھا۔"

"تاؤ! آپ تو زلیخا کی تعریفوں میں ہی کھو گئے ہیں۔ آگے چلیں۔" میں نے تاؤ کو ٹوکا۔

"میاں! زلیخا تھی ہی اتنی حسین کہ اس کے لیے کسی یوسف مصر کا ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے حسن کی وجہ سے گاؤں کا ہر نوجوان دل میں یہ خواہش رکھتا تھا کہ زلیخا اس کے دل کی ملکہ بنے۔ ہر شخص اس کا دیوانہ تھا۔ ان دیوانوں میں گاؤں کے زمیندار کا بیٹا دل محمد بھی شامل تھا۔ وہ بری طرح سے زلیخا کے پیچھے پڑا ہوا تھا بلکہ ایک بار تو اس نے اظہارِ عشق کے لیے زلیخا کا ہاتھ بھی پکڑ لیا جس پر زلیخا نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ کیونکہ زلیخا اسے نہیں کسی اور کو چاہتی تھی۔ وہ کس سے عشق کرتی تھی یہ راز کسی کے بھی علم میں نہ تھا یہاں تک کہ اس نے یہ بات تمہاری تائی کو بھی نہیں بتائی تھی۔ تمہاری تائی کے بار بار پوچھنے پر اس نے صرف ایک بات کہی تھی، اب نام بتانے سے کیا فائدہ جب وہ کسی اور کا ہو گیا ہے۔"

"کیا اسے تمہاری محبت کا علم ہے۔" تمہاری تائی نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔

"تو اللہ کی بندی!" تمہاری تائی غصے سے بولی۔ "بند کرو اس یک طرفہ ٹریفک کو۔"

"اگر تمہارا منگیتر تم سے بے وفائی کرے تو کیا تم اس سے محبت کرنا بند کر دو گی۔" اس نے سوال کیا۔

"کیا تمہارے دل سے محبت نکالنا تمہارے اختیار میں ہے۔"

"نہیں! اس معاملے میں، میں بے بس ہوں۔"

"تو جس طرح تم بے بس ہو اسی طرح میں بھی بے بس ہوں۔" وہ بولی۔

"تو کیا ساری زندگی اسی کے نام پر کاٹ دو گی۔"

"میرے بس میں ہو تو یہی کروں مگر مجھے ماں باپ کی بات ماننا تو پڑے گی۔"

"تو پھر چودھری دل محمد کی بات مان لے۔ وہ تجھے گھر کی رانی بنانا چاہتا ہے۔"

"پہلی دو بیویوں کے ہوتے ہوئے؟" زلیخا طنز سے بولی۔ "اس عیاش اور آوارہ سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں زہر کھا لوں۔"

"تو پھر کس سے کرے گی۔"

"کسی بھی ایسے شخص سے جو میرے ماں باپ کی پسند ہو اور میری قدر کرے۔"

"اللہ کرے تجھے کوئی بہت چاہنے والا ملے۔"

☆......☆

"زندگی یونہی اگر ہنسی خوشی گزرتی رہے تو زندگی نہیں ہوتی۔ زندگی میں اگر اونچ نیچ اور پریشانیاں نہ آئیں تو انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہمارے گاؤں میں بھی ہوا۔" تاؤ نے دونوں سہیلیوں کی گفتگو سنانے کے بعد بات پھر سے شروع کی۔ "لوگوں کو پتا چلا کہ چودھری دل محمد نے زلیخا کو اغوا کر کے اس کی عزت لوٹ لی ہے اور اس نے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی ہے۔"

"لوگوں کو کیسے تفصیل معلوم ہوئی؟"

"بیٹا! گاؤں میں کوئی بات چھپی نہیں رہتی اور ویسے بھی زلیخا اس حادثے کے بعد سیدھی تمہاری تائی کے پاس آئی تھی۔ اس نے صرف اپنی عزت کے لٹیرے کا نام ہی نہیں بتایا بلکہ تمہاری تائی کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ کس سے محبت کرتی تھی۔"

"کس سے......!" میں نے پوچھا۔

"مجھ سے اور کس سے۔ ویسے مجھے بھی خود اس کا تھوڑا تھوڑا اندازہ تھا اور اگر تمہاری تائی بیچ میں نہ آتی تو شاید وہ مجھ سے اظہارِ محبت بھی کر دیتی مگر تمہاری تائی کی وجہ سے مجبور ہو گئی۔"

"تاؤ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" میں نے کہا۔ "اس نے آخر آپ کا نام کیوں بتایا۔"

"اس لیے بیٹا کہ زلیخا نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا جس کا ذرہ برابر خیال بھی تمہاری تائی کے ذہن میں نہ آیا۔ اس نے تمہاری تائی سے کہا کہ اسے یعنی مجھے کبھی دکھ نہ دینا ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یہ بات سن کر بھی تمہاری تائی کوڑھ مغز یہ بات نہ سمجھی کہ زلیخا ایسا کیوں کہہ

رہی ہے۔ اپنی خفیہ باتیں اپنے دل کا راز کیوں بتا رہی ہے۔
یہ تو دوسرے دن اسے زلیخا کی خودکشی کی اطلاع ملی تو تمام بات اس کی سمجھ میں آئی۔ پھر تو وہ سر پر ہاتھ مار مار کے روتی تھی اور اپنے آپ کو کوستی تھی کہ اس نے زلیخا کی بات کیوں نہ سمجھی اسے اپنے پاس سے جانے کیوں دیا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا۔'' تاؤ بولے۔ ''جب تمہاری تائی کے کچھ ہوش حواس بحال ہوئے تو اس نے میرے سامنے ایک ہی شرط رکھ دی اور وہ یہ کہ اگر تم زلیخا کا بدلہ نہیں لو گے تو میری تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں تو خود بھی زلیخا کی موت کا دکھ تھا۔ ہم بدلہ لینے کو تیار ہو گئے۔''

''زلیخا سے اپنی محبت کا احوال سن کر آپ تو اور بھی جذباتی ہو گئے ہوں گے ناں۔'' میں نے پوچھا۔

''میاں! یہ بات نہیں تھی۔'' تاؤ طنز سے بولے۔ ''یہ محبت والی بات تو تمہاری تائی نے شادی کے کئی سالوں بعد بتائی۔ بہت گھنی ہے وہ۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات بتانے سے میری اس سے محبت میں کمی ہو جائے گی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اسی کا ہوں تب اس نے بتایا۔''

''چھوڑیں اس بات کو آگے چلیں۔'' میں بولا۔

''ہم آگے ہی تو چل رہا تھا۔ یہ تو تم مجھے درمیان میں ٹوک کر بات اِدھر کی اُدھر کر دیتے ہو۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''تمہاری تائی کی یہ شرط بہت کڑی تھی۔ اب میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا کروں اگر میں اسے للکار کر قتل کرتا ہوں تو نسلوں کی دشمنیاں چل جائیں گی۔ اس کے علاوہ میرے اس طرح للکارنے سے لوگ زلیخا کو میرے حوالے سے بھی بدنام کریں گے۔ لہٰذا اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ اسے بہانے سے گاؤں کے نزدیکی جنگل میں لے جاؤں اور وہیں اس سے حساب کتاب کر لوں۔''

اب میری اور اس کی بظاہر تو کوئی دشمنی نہیں تھی سوا ایک دن میں اسے شکار کے بہانے گاؤں سے باہر جنگل میں لے گیا۔ وہاں میں نے اسے بے ہوشی کی دوا ملی ہوئی چائے پلائی اور اس کے بے ہوش ہونے کے بعد اسے ایک درخت سے باندھ دیا۔ جب اسے ہوش آیا تو میں نے ڈنڈے سے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ چیخا چلایا اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ تم کیوں کر رہے ہو۔ میری تمہاری کیا دشمنی ہے۔''

''یہ میں تم سے زلیخا کا بدلہ لے رہا ہوں۔'' میں نے

کہا۔ ''میں تمہیں اتنی آسان موت نہیں ماروں گا پہلے تمہارے ہاتھ پیر توڑوں گا اور پھر آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتاروں گا تاکہ تمہارے گناہوں کا بدلہ تمہیں دنیا میں بھی ملے۔''

''مگر...... وہ...... میں معصوم ہوں، مجھ سے قسم لے لو جو میں نے زلیخا سے کچھ بھی کیا ہو۔ یہ مجھ پر غلط الزام ہے۔''

میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا کیونکہ موت کے خوف سے تو سبھی جھوٹ بول سکتے ہیں اور جی بھر کے اس کی ٹھکائی کرتا رہا۔

''لو بھئی! اب تمہارا جو جی چاہے کرو۔'' وہ چیختے چیختے خاموش ہوگیا اور بولا۔ ''مگر میں آخری دفعہ اپنے بیوی بچوں کی قسم کھا کے کہہ رہا ہوں کہ میں نے زلیخا کی عزت نہیں لوٹی۔''

''مگر زلیخا نے خودکشی کرنے سے پہلے تمہارا نام لیا تھا اور مرتا ہوا شخص جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''پھر میں تو اس دن گاؤں میں ہی نہیں تھا۔ ایک دوست کی عیادت کے لیے شہر گیا تھا اور وہاں اسپتال میں اس کے پاس ہی رک گیا تھا۔ تم وہاں سے تصدیق کر سکتے ہو۔''

''تو پھر زلیخا نے تمہارا نام کیوں لیا۔''

''ہوسکتا ہے اس نے گل محمد کہا ہو اور تمہاری منگیتر نے دل محمد سمجھ لیا ہو۔''

''مگر گل محمد تمہاری طرح بدکردار نہیں ہے اور تم ہی اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔''

''یہی وجہ ہے کہ تمہاری منگیتر نے گل محمد کو دل محمد سمجھ لیا۔ ورنہ گل محمد بہت گھنا شخص ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''بظاہر تو شریف بنا پھرتا ہے مگر اندر سے گنوں کا پورا ہے۔ میرا بھائی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

اس کی باتیں سن کر میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں اگر اس کی بات صحیح ہے تو میں نے غلط شخص کو اغوا کرلیا ہے۔ میرے لیے ایک اور مشکل بھی ہوگئی تھی کہ اگر وہ بے گناہ تھا تو اس کا قتل ناجائز تھا مگر میں چونکہ اسے اغوا کر کے لے آیا تھا تو میں نے دشمنی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اب اگر میں اسے چھوڑتا تو نہ صرف قتل و غارت گری ہوتی بلکہ اس نے گل محمد کو خبردار کردینا تھا کہ اپنا بچاؤ کرلے، یوں میں اپنا انتقام نہ لے سکتا تھا۔ میں کافی دیر سوچتا رہا اور بالآخر اسے یونہی بندھا چھوڑ کر واپس چل پڑا۔ وہ مجھے یوں واپس جاتے دیکھ کر حیران ہوگیا اور چیختا چلاتا رہا کہ مجھے کھول دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ سب ایک غلط فہمی سمجھ کر بھول جاؤں گا۔

''میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔'' میں نے اسے جواب دیا۔ ''ہاں! اگر کوئی آتا جاتا تمہیں دیکھ لے اور تمہیں کھول دے تو تمہاری قسمت۔''

''یہاں کون آئے گا۔ ڈاکوؤں کے سوا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

پھر میں کچھ نہ بولا اور چل دیا۔ مجھے یوں جاتا دیکھ کر اس نے بددعائیں دینا شروع کردیں۔ ''دیکھ مجھے کھول دے ورنہ یاد رکھ کہ میرے ساتھ جو سلوک ہوگا میں خدا سے دعا کروں گا کہ تیرے ساتھ بھی وہی سلوک ہو۔ یہ ایک دکھی دل کی بددعا ہے عرش تک جائے گی۔''

میں نے اس کی تمام باتیں نظرانداز کردیں اور وہاں سے چلا آیا۔ واپس آکے میں نے تمہاری تائی سے پوچھا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ زلیخا نے دل محمد کہا تھا یا گل محمد۔

''مجھے لگا تو دل محمد ہی تھا اور میں نے یوں یقین بھی کرلیا تھا کہ وہی کمینہ اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔'' وہ میری بات سن کر شش و پنج میں پڑ گئی اور کافی غور کرنے کے بعد بولی۔ ''مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ اس رات گاؤں میں ہی نہیں تھا۔''

''تم بھی بھولے بادشاہ ہو۔ ہوسکتا ہے اس نے خود کو محفوظ رکھنے کو یہ کہانی بنائی ہو اور گاؤں سے باہر جانے کا بہانہ کر کے وہ چھپ گیا ہو۔''

تمہاری بات میں وزن ہے مگر جس طرح اس نے اپنے بچوں کی قسم کھائی تھی اس نے میرے دل پر اثر کیا اور مجھے لگا کہ بچوں کی قسم کھا کر یہ شخص جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔

''لیکن...... اگر وہ بچ کر آگیا تو دشمنی تو پڑ گئی ناں۔'' تمہاری تائی متفکر ہوگئی۔

''وہ بچ گیا تو اس کی قسمت۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اب تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کسی طرح جلد از جلد گل محمد کو اٹھا لوں تاکہ اصل مجرم کا پتا چل سکے۔''

تاؤ بات کرتے کرتے خاموش ہوگئے تو میں جوان کی کہانی سننے میں محو ہوگیا تھا۔

''آگے بتائیں ناں تاؤ۔ پھر کیا ہوا۔'' میں نے پوچھا۔

''آگے کی کہانی بس تھوڑی سی ہے۔ میں گل محمد کو پکڑنے کے چکر میں تھا کہ اسی رات گاؤں میں ڈاکوؤں نے حملہ کیا جس میں گل محمد مارا گیا۔''

''اور دل محمد! اس کا کیا ہوا......''

''اس کے غائب ہونے پر بڑی ڈھنڈیا مچی۔ جب اس کے گھر والے تلاش کرتے کرتے دوسرے گاؤں پہنچے تو وہاں لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ میرے جانے کے بعد دل محمد کو وہاں سے ڈاکو پکڑ کے لے گئے تھے اور انہوں نے اسے پولیس کا مخبر سمجھا جو جان بوجھ کر زخمی ہو کر اور بھیس بدل آیا تھا۔ اس جرم میں اسے مار کے انہوں نے جنگل کے دوسری طرف پھینک دیا۔ وہاں سے اس گاؤں کا ایک دیہاتی بیل گاڑی میں گزر رہا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر لے آیا اور جب اس کے وارثوں کا پتا نہ چلا تو اسے دفن کر دیا گیا۔ جب دل محمد کے گھر والے وہاں پہنچے تو اس کے کپڑوں اور دوسری چیزوں سے انہوں نے اسے شناخت کیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا لہٰذا وہ وہیں دفن ہے۔''

''تو کہانی تو ختم ہو گئی۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ کو کاہے کی فکر ہے۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ میں آج تک اسی شش و پنج میں ہوں کہ زلیخا کے ساتھ زیادتی کرنے والا دل محمد تھا یا گل محمد اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اس بات پر فکر مند ہوں کہ اگر دل محمد بے قصور تھا اور جس طرح وہ مارا گیا اور لاوارث دفن ہوا تو اس کی بد دعا کے سبب میں بھی اسی طرح نہ مارا جاؤں اور لاوارث دفنایا جاؤں۔''

''کیسی بات کرتے ہیں تاؤ۔'' میں ہنس پڑا۔ ''اب تو رابطے کا ذریعہ ہے، فون موجود ہے رابطے کے اور بھی طریقے ہیں اور آپ کی بظاہر کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے تو کون آپ کو قتل کرے گا۔ خدانخواستہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی بھی ہے تو کوئی نہ کوئی تو آپ تک پہنچ ہی جائے گا۔ آپ فکر کاہے کی کرتے ہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''کہتے تو ٹھیک ہو مگر میں اس دل کا کیا کروں اس دل کو ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو مجھے اس بات پر یقین ہوتا جا رہا ہے کہ میں اسی طرح لاوارث مارا جاؤں اور لاوارث ہی دفنایا جاؤں گا۔ تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد ہے کہ تم نے ڈھونڈ کر میری قبر تلاش کرنا ہے۔''

''تاؤ! آپ اس وہم کو دل سے نکال دیں اور بے فکر ہو جائیں۔ ہم ہیں ناں......'' میں نے تاؤ کو تسلی دی اور انشاء اللہ کہنا بھول گیا۔

☆......☆

چونکہ تاؤ کی بیٹی کو ان کی سرپرائز دینے کی عادت کا علم تھا۔ اس لیے اس نے کنفرم کرنے کے لیے فون کیا۔ ''ابا جی کب تک آ رہے ہیں؟''

''اس دفعہ وہ نہیں آ رہے۔ وہ عید کر کے آئیں گے۔'' اتفاقاً اس وقت میں گھر میں اکیلا ہی موجود تھا اس لیے جب میں نے فون اٹھایا تو اس سے مذاقاً کہا۔

''کیا مطلب۔''

''مطلب یہ کہ بہت ہو گئی۔ تاؤ ہر دفعہ عید تمہارے ساتھ مناتے ہیں۔ اس دفعہ ہم نے ضد کر کے انہیں روک لیا ہے۔ وہ عید منا کر تمہارے پاس آئیں گے۔ انہوں نے ہماری بات مان لی ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ہم لوگ تو شدت سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ایسا ہو گیا ہے۔ اب تم آرام سے بیٹھو۔'' میں ہنسا۔

''چلو یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہوا۔'' وہ بولی۔ ''میرے میاں کو کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد جانا پڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم بھی چلو ہم عید وہیں کریں گے مگر میں ابا کی وجہ سے نہیں جا رہی تھی۔ اب سوچتی ہوں کہ چلی ہی جاؤں۔''

''تو تم جا رہی ہو؟'' میں نے مذاق کیا۔ ''میں یہ بات تاؤ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ کی بیٹی آپ کے ڈر سے گھر چھوڑ کے جا رہی ہے۔''

''ارے یہ غضب مت کرنا۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ وہ کتنے حساس ہیں۔ ویسے بھی میرا پکا پتا نہیں ہے کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ عید کا مزہ تو گھر پر ہے پردیس میں عید کا کیا خاک مزہ آئے گا۔''

☆......☆

اس کا فون سننے کے بعد مجھے اچانک دفتر کے کام سے دو دن کے لیے شہر سے باہر جانا پڑا اور میں یہ بات تاؤ سے کہنا بھول گیا کہ وہ کنفرم کر کے جائیں کہ شہلا گھر میں ہے یا نہیں۔ تیسرے دن میں گھر آیا تو تاؤ حسب معمول جا چکے تھے اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہلا کا پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔ تبھی تو تاؤ واپس نہیں آئے۔ ورنہ تو وہ واپس آتے اور ابا جان کو بلکہ مجھے برا بھلا کہتے۔ میں نے دل میں سوچا اور مطمئن ہو گیا۔

☆......☆

یہ عید کا دوسرا روز تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔

''عابد بھائی! بہت ہو گئی اب تو ابا جی کو واپس بھیج دو۔ قسم سے ان کے بغیر بالکل مزہ نہیں آ رہا۔ ان کی وجہ سے میں

تو چاند رات کو ہی واپس آگئی تھی۔'' فون کے دوسری طرف شہلا تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تاؤ تو تمہارا فون آنے کے اگلے دن ہی یہاں سے چلے گئے تھے یعنی اکیسویں روزے کے دن۔''

''ابا جی! پھر کہاں چلے گئے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''وہ تو تمہارے پاس سے میرے گھر آتے تھے اس کے علاوہ تو ان کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ میں نے اس کا ذکر ابا جان سے کیا تو وہ بولے۔ ''کہاں جا سکتا ہے وہ۔ کراچی میں اس کے جانے کے صرف دو گھر ہیں۔ کہیں تم لوگوں نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کر دی جس کی وجہ سے وہ غصے میں گاؤں چلا گیا ہو۔''

''نہیں ابا جان! ایسی گستاخی کون کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

لو جی پھر تو ڈھنڈیا مچ گئی۔ یہ بات چونکہ بیس پچیس سال پرانی ہے تو اس زمانے میں فون بھی خال خال ہوتا تھا۔ نزدیکی شہر فون کیا گیا وہاں سے ایک بندہ گاؤں گیا اس نے واپس آکر خبر دی کہ تاؤ گاؤں میں بھی نہیں ہیں۔ پھر میں اپنے بھائی فرقان کے ہمراہ تاؤ کو ڈھونڈنے نکلا۔ جب ہم اپنے علاقے کے نزدیکی بس اسٹاپ پر پہنچے تو میں نے سوچا وہاں پان سگریٹ کی دکان سے سگریٹ ہی خرید لوں۔ سگریٹ خرید کر تاؤ کی باتیں میں فرقان سے کر رہا تھا۔ ہماری باتیں سن کر دکاندار چونکا۔

''یہ اکیس رمضان کی بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''ایک بزرگ شخص کو کار نے ٹکر ماری تھی۔ کار والا تو فرار ہو گیا مگر لوگ اسے عباسی اسپتال لے گئے تھے۔ ان کا کچھ سامان میرے کیبن میں پڑا ہے۔ آپ دیکھ لیں کہیں وہ تو نہیں ہے۔''

ہم نے سامان دیکھ کر چیزیں پہچان لیں اور تیزی سے عباسی اسپتال گئے تو انہوں نے بتایا کہ اس روز ایک شخص کو لایا تو گیا تھا مگر لانے والوں نے اس کی جیب سے تمام چیزیں نکال لی تھیں جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔ اس کے علاوہ چونکہ اس کے سر میں چوٹ آنے کی وجہ سے اس کی یادداشت بھی متاثر ہوئی تھی جس کے باعث وہ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے بھی قاصر تھا لہٰذا ہم نے تین دن اس کا علاج کیا اور اس کی حالت سنبھلنے پر اسے ایک مشہور خیراتی ادارے میں بھجوا دیا تھا۔

ہم اس مشہور و خیراتی ادارے میں پہنچے تو انہوں نے تصدیق کرنے سے پہلے کہا کہ آپ مردہ خانے میں موجود لاشوں کا چہرہ دیکھ کر پہچان لیں کہ کہیں وہ ان میں سے تو نہیں ہے۔ میں خود سرد خانے میں گیا۔ ہر لاش کے منہ سے کفن ہٹا کر دیکھنا ایک انتہائی خوفناک تجربہ تھا مگر جیسے تیسے یہ کام کرنے لگا مگر ان لاشوں میں تاؤ کی لاش نہ تھی۔

اس بات سے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ تاؤ شاید صحیح سلامت ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے پاس موجود ریکارڈ میں تصویریں دیکھنے کو کہا۔ تیسری ہی تصویر تاؤ کی تھی۔ میں تصویر دیکھ کر سن سا رہ گیا۔

''میاں! جب مروں گا تو تم خوشیاں منا رہے ہو گے اور میری موت کی اطلاع تمہیں میرے کریا کرم کے بعد ملے گی۔'' میرے ذہن میں تاؤ کے الفاظ گونج رہے تھے جو لفظ بہ لفظ سچ ہو گئے تھے۔

اس خیراتی ادارے والوں نے جو تفصیل بتائی اس کے مطابق تاؤ کو جب وہاں لایا گیا تو سر کی چوٹ کے باعث وہ ذہنی خلل کا شکار ہو گئے تھے۔ اس لیے انہیں ذہنی مریضوں کے وارڈ یعنی چڑیا وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ وہاں پاگلوں نے ان پر حملہ کر دیا جس سے وہ ہلاک ہو گئے اور انہوں نے اسے لاوارثوں کے قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔

ان کے بیان میں بہت سے شکوک و شبہات تھے جس کے باعث مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی بات بھی یاد آئی تھی جس کے مطابق لاوارث لوگوں کو یہ ادارہ خود ہی مار دیتا ہے اور ان کے اعضا بلکہ لاش بھی فروخت کر دیتا ہے۔ ورنہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسا صحت مند شخص یوں اچانک ہلاک ہو جائے۔

بہرحال ہم اس خیراتی ادارے کے قبرستان گئے۔ وہاں ان کے نام کا نمبر بتایا۔ تاؤ کے نام کی تختی نصب کی اور خیراتی ادارے کے بقایا جات ادا کیے۔ میں نے تو ضد کی تھی کہ قبر کھود کر پوسٹ مارٹم کروایا جائے مگر تاؤ کے بیٹے نے اجازت نہ دی کہ اب جو ہونا تھا ہو گیا اس طرح تاؤ واپس نہیں آ سکتے تو ان کا مردہ جسم خراب کرنے کا فائدہ۔

مکمل

دوسری شادی

محترم مدیر
سلام شوق
میں سرگزشت کی پرانی قاری ہوں۔ 1990ء سے پڑھ رہی ہوں۔ اس لیے کہ مجھے سرگزشت میں چھپنے والی اکثر کہانیوں میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ میں نے زمانے کے بہت ستم سہے ہیں۔ انہی واقعات کو یکجا کر کے میں آپ کی خدمت میں ارسال کررہی ہوں۔ اگر پسند آجائے تو اسے شاملِ اشاعت کرلیں تاکہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔

شازیہ
(لاہور)

راجا اور میں بچپن کے دوست تھے۔ اس کا اصل نام تو رضوان ہے لیکن ماں باپ نے اسے پہلے دن سے ہی راجا کہنا شروع کردیا اور پھر سب لوگ اسے اسی نام سے پکارنے لگے اور اس کا اصل نام صرف سرکاری کاغذوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ وہ میرا ماموں زاد بھائی تھا اور ننھیال میں ماموں ہی ہمارے واحد رشتے دار تھے اس لیے فطری طور پر امی کا جھکاؤ ان کی طرف تھا۔ ماموں بھی اپنی اکلوتی بہن کو بہت چاہتے تھے اور ہر دوسرے تیسرے دن ان سے

ملنے ضرور آتے۔ اسی طرح امی بھی ہفتے میں ایک مرتبہ ان کے گھر کا چکر لگا لیتیں۔ ان کی سسرال والوں سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ حالانکہ میرے دو چچا اور دو پھوپیاں تھیں لیکن امی نے ان سے برائے نام تعلق قائم کر رکھا تھا۔ وہ خاص خاص موقعوں پر ہی ان کے یہاں جاتیں۔ ابو سب بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ اس لیے وہ لوگ ان سے ملنے آجاتے تھے۔ امی اپنے سسرال والوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں لیکن یہ سب دکھاوا تھا۔ درحقیقت انہیں ان لوگوں سے کوئی انسیت نہیں تھی اور وہ بھائی کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی تھیں۔

میں اور راجا ہم عمر ہیں جب کہ مجھ سے چھوٹے دو بھائی ہیں۔ اسی طرح راجا کا کوئی بھائی نہیں البتہ چار چھوٹی بہنیں ہیں اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے اس کی بچپن سے ہی ناز برداری کی گئی اور شہزادوں کی طرح اس کے نخرے اٹھائے گئے۔ ماموں بے چارے صبح سے شام تک اپنی دکان پر رہتے۔ اس لیے انہیں اولاد کی طرف توجہ دینے کا موقع کم ہی ملتا تھا اور ممانی ہی ان کی تعلیم و تربیت کی ذمے دار تھیں۔ پرانے وقتوں کی اَن پڑھ عورت ہونے کی وجہ سے انہیں تعلیم کی اہمیت کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ یہی سمجھتی رہیں کہ انہوں نے راجا کو جنم دے کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ تمام فکروں سے آزاد ہوگئی ہیں۔ راجا کو بھی پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ماموں کے ڈر سے اسکول تو چلا جاتا لیکن وہاں بھی اس کا زیادہ وقت شرارتوں، کھیل کود اور تفریح میں گزرتا۔ البتہ سالانہ امتحانات سے پہلے وہ اتنی محنت ضرور کر لیتا تھا کہ پاس ہو کر اگلی کلاس میں چلا جائے۔ آٹھویں تک تو یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن بورڈ کے امتحان میں اس کی قلعی کھل گئی اور نویں جماعت میں وہ صرف دو پرچوں میں کامیاب ہو سکا۔ اس کا رزلٹ دیکھ کر ماموں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ انہوں نے پہلے تو اس کی خوب پٹائی کی اور پھر گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر ممانی ایک بار پھر راجا کی حمایت میں آگئیں اور انہوں نے منت سماجت کر کے ماموں کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی بہرحال اس واقعے کے بعد راجا کچھ سنبھل گیا اور اس نے جیسے تیسے کر کے میٹرک پاس کر لیا لیکن اس کے اتنے کم نمبر آئے تھے کہ اسے کسی سرکاری کالج میں داخلہ نہ مل سکا اور ماموں کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ بھاری فیس دے کر راجا کو کسی پرائیویٹ کالج میں داخلہ دلاتے چنانچہ اس طرح راجا کی پڑھائی سے جان چھوٹ گئی۔

راجا کی پڑھائی ختم ہونے کی ذمے دار ممانی تھیں۔ ان کے حد درجہ لاڈ پیار نے اسے خودسر، لاپروا اور ضدی بنا دیا تھا۔ وہ آئے دن حیلے بہانے کر کے اسکول سے چھٹی کرتا اور ممانی اس کی ناز برداری میں لگ جاتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود کو سچ مچ کا راجا سمجھنے لگا۔ کسی اور پر تو اس کا بس نہیں چلتا تھا لیکن بہنوں پر خوب حکم چلاتا۔ میرے کپڑے استری کیوں نہیں کیے، جوتوں پر پالش نہیں ہوئی، میرا کنگھا کہاں ہے۔ ایک پیالی چائے بنا دو وغیرہ وغیرہ۔ بہنیں بے چاری دوڑ دوڑ کر اس کے کام کرتیں کیونکہ ممانی کا یہی حکم تھا، اے ہے ایک ہی تو بھائی ہے تمہارا، تم سے نہیں کہے تو اور کس سے کہے گا، ایک دلچسپ بات تو میں بتانا بھول ہی گئی ایک طرف تو ممانی نے راجا کی تعلیم پر بالکل توجہ نہیں دی لیکن دوسری جانب وہ اپنی بیٹیوں کی پڑھائی کے بارے میں بہت فکرمند رہا کرتی تھیں۔ کسی جاننے والی نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو اچھے رشتے باآسانی مل جاتے ہیں اور آج کل زیادہ تر لڑکے یہی چاہتے ہیں کہ ان کی شادی کسی تعلیم یافتہ اور برسرروزگار لڑکی سے ہو تاکہ دونوں میاں بیوی مل کر گھر کی گاڑی کو آسانی سے چلا سکیں۔ اس کے بعد ممانی کو یہ دھن سوار ہوگئی کہ وہ اپنی چاروں بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گی۔ خوش قسمتی سے وہ لڑکیاں بھی پڑھنے میں تیز تھیں اور اپنی محنت و ذہانت کے بل بوتے پر ہر سال اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتی تھیں۔

ہمارے گھر میں اس کے برعکس معاملہ تھا۔ ابو نے غربت کی گود میں آنکھ کھولی اور بہت چھوٹی عمر میں ان پر ذمے داریوں کا بوجھ آن پڑا تھا جس کی وجہ سے وہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے ایک سرکاری محکمے میں کلرک کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا اور بیس سال میں ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچ سکے۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس تھا اور سمجھتے تھے کہ اگر زیادہ پڑھے لکھے ہوتے تو کسی اچھی پوسٹ پر فائز ہو سکتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے امی کے سامنے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی کہ ہم بے شک چٹنی کے ساتھ روٹی کھا لیں گے لیکن ان بچوں کے تعلیمی اخراجات ہر صورت میں پورے کریں گے۔ اسی لیے وہ ہماری پڑھائی میں پوری دلچسپی لیتے۔ دفتر سے آنے کے بعد

وہ ہمیں ہوم ورک کرواتے، کلاس میں ہونے والا کام دیکھتے اور مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ ہمارے اسکول کا بھی چکر لگاتے۔

راجا ہمارے گھر میں پڑھائی کا ماحول دیکھ کر بہت الجھتا تھا کیونکہ میں اس سے کافی بے تکلف تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے ہی بحث کرنے لگ جاتا اور آخر میں تان اس فقرے پر آن کر ٹوٹتی کہ ''کیا کرو گی اتنا پڑھ لکھ کر آخر کو تمہیں روٹیاں ہی تھوپنی ہیں۔''

میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ ''اس لیے پڑھ رہی ہوں کہ اگر تم جیسے کسی نکھٹو سے واسطہ پڑ گیا تو کوئی ملازمت کر کے گھر کی گاڑی چلا سکوں۔''

''دیکھو شازیہ! میں عورتوں کی ملازمت کے سخت خلاف ہوں۔ اس طرح ان پر دوہری ذمے داری آ جاتی ہے، نوکری بھی کریں اور گھر بھی سنبھالیں۔ ویسے بھی گھر چلانا مرد کی ذمے داری ہے اور تم کیا سمجھتی ہو کہ جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے انہیں کوئی کام نہیں ملتا میں تمہیں ایسے کئی جاہلوں کے نام گنوا سکتا ہوں جو کروڑ پتی ہیں تم دیکھ لینا ایک دن میں بھی امیر آدمی کہلاؤں گا۔''

''ذرا میں بھی سنوں کہ وہ کون سا شارٹ کٹ ہے جس کے ذریعے تم راتوں رات دولت مند بن جاؤ گے۔''

''میں نے پوری پلاننگ کر رکھی ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کرلو سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔''

اس طرح کی چھوٹی موٹی جھڑپیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ ابو کو راجا کا ہمارے گھر آنا پسند نہیں تھا لیکن رشتے داری کا معاملہ تھا۔ اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ میں بچپن سے ہی راجا کے ساتھ پلی بڑھی تھی اور اسے اپنا قریبی دوست سمجھتی تھی۔ نوجوانی کی حدود میں داخل ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ دوستی کوئی اور رنگ اختیار کر رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں کانپ کر رہ گئی۔ جانتی تھی کہ ابو اسے پسند نہیں کرتے اور وہ کسی قیمت پر بھی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دیں گے کیونکہ وہ کسی نیم خواندہ شخص کو اپنا داماد نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ اپنا تن پیٹ کاٹ کر ہم بہن بھائیوں کو اسی لیے تعلیم دلا رہے تھے تاکہ ہمارا مستقبل بہتر ہو۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب میں پوری طرح راجا کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ حالانکہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن میں اس کے دل کا حال پڑھ چکی تھی اور وہ بھی میرے جذبات سے آشنا ہو چکا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد اس قابل ہو جائے کہ ابو اس کے رشتے سے انکار نہ کر سکیں اگر وہ اپنی سماجی حیثیت میں اضافہ کرے تو پھر اس کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھے گا۔ یہی سوچ کر میں نے ایک دن اس سے کہا۔ ''راجا تمہیں میٹرک پاس کیے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے لیکن تم نے ابھی تک نہ تو کسی کالج میں داخلہ لیا اور نہ ہی کوئی کام شروع کیا ہے۔ ایسا کب تک چلے گا؟''

''دیکھو شازیہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اب میرا تعلیمی سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ابا کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ مجھے کسی پرائیویٹ کالج میں داخلہ دلا سکیں۔ میری چار بہنیں ہیں۔ ان کے لیے بھی کچھ سوچنا ہے ویسے بھی میں سوچتا ہوں کہ ڈگری لے کر کیا کروں گا۔ اس ملک میں لاکھوں لوگ ایسے کاغذ لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور انہیں دس ہزار کی نوکری بھی نہیں ملتی۔''

''پھر کیا سوچا ہے تم نے۔'' میں زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا کرو گے تمہارے پاس دولت کہاں سے آئے گی؟''

''سوچ رہا ہوں کہ دبئی یا سعودی عرب چلا جاؤں۔ چار پانچ سال میں اتنا کما لوں گا کہ پھر کسی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

مجھے بہت زور کی ہنسی آ گئی اور بولی۔ ''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے وہاں درختوں پر درہم اور ریال لگے ہوتے ہیں۔ وہاں جانے کے لیے بھی کوئی تعلیم یا ہنر ہونا چاہیے مزدوری تو تم کرنے سے رہے۔''

''میں نے ایک ریکروٹنگ ایجنسی سے بات کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں اگر ویلڈر کا کورس کرلوں تو وہ مجھے باہر بھجوا سکتا ہے۔''

''صرف کورس کر لینا ہی کافی نہیں اس کے ساتھ دو تین سال کا تجربہ بھی ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے ویسے بھی کچھ عرصے یہیں کام کرنا ہوگا ریکروٹنگ ایجنٹ کو دینے کے لیے پیسے بھی تو چاہیے ہوں گے۔''

میں نے سوچا کہ اگر راجا واقعی باہر چلا گیا تو اس کا نیم خواندہ ہونے کا عیب چھپ جائے گا اور اس کی سماجی حیثیت بہت بہتر ہو جائے گی پھر شاید ابو کو بھی رشتہ دینے پر اعتراض نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر کہا۔ ''ٹھیک ہے راجا تم یہ کورس کرلو، اس کے بعد ملازمت بھی

مل جائے گی۔ کسی کام دھندے سے لگ جاؤ گے تو تمہاری قدر منزلت بڑھ جائے گی اور لوگ تمہیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔''

''اور تم!'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''میری بات چھوڑو۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے ہر حال میں عزیز ہو۔''

راجا نے اپنے پروگرام کے مطابق ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ ماموں اس پر بھی بہت جز بز ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ راجا کوئی اور کورس کرے لیکن راجا کے دماغ میں ویلڈر بننے کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی من مانی کی۔ چھ ماہ پلک جھپکتے گزر گئے اور اسے ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ گو کہ تنخواہ بہت کم تھی اور راجا کے آدھے پیسے بس کے کرائے اور کھانے پینے میں خرچ ہو جاتے تھے لیکن وہ یہ ملازمت صرف تجربہ حاصل کرنے کے لیے کر رہا تھا اور اسے پیسوں کی پروا نہیں تھی۔

اب ممانی اس کی پہلے سے زیادہ ناز برداری کرنے لگی تھیں۔ اسے کام پر جانے کے لیے استری کیے ہوئے کپڑے ملتے۔ انڈے پراٹھے کا ناشتا کروایا جاتا اور شام کو بھی اس کے لیے بہترین کھانا بنایا جاتا۔ گھر میں وہ شہزادہ تھا لیکن باہر اس کی حیثیت ایک عام آدمی جیسی تھی جس کی وجہ سے اسے عملی زندگی میں اسے مشکلات پیش آرہی تھیں کیونکہ فیکٹری میں اس کے ناز نخرے برداشت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ البتہ حکم چلانے والے بہت تھے راجا کو صبح دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ اس لیے کام پر بھی دیر سے پہنچتا۔ اسے کئی مرتبہ تنبیہ کی گئی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اسے ملازمت کیے ہوئے بمشکل تین ماہ ہوئے ہوں گے کہ اس کا سپروائزر سے جھگڑا ہو گیا۔ بات بہت چھوٹی سی تھی لیکن راجا کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کا بتنگڑ بن گیا۔ ہوا یوں کہ معمول کے مطابق اس نے ایک دن چھٹی سے پندرہ منٹ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور سائرن بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ عین اسی وقت کسی مشین میں کوئی خرابی ہو گئی اور اس میں ویلڈنگ کا کام نکل آیا۔ سپروائزر نے راجا سے کہا کہ وہ یہ کام ختم کر کے گھر جائے لیکن راجا نے صاف انکار کر دیا۔ سپروائزر نے بہت سمجھایا کہ اگر اس وقت یہ کام نہیں ہوا تو مشین رات بھر بند رہے گی اور کافی نقصان ہو جائے گا لیکن راجا نے اس کی ایک نہ سنی اور چھٹی کا وقت ہوتے ہی گھر چلا گیا۔

دوسرے دن جب وہ کام پر پہنچا تو اسے فیکٹری کے گیٹ پر ہی روک لیا گیا سیکیورٹی سپروائزر نے اسے ملازمت سے برطرفی کا پروانہ تھماتے ہوئے کہا کہ وہ کل آکر اپنے واجبات وصول کرلے۔ راجا نے غصے میں آکر وہیں کھڑے کھڑے لیٹر پھاڑ دیا اور دوبارہ اس فیکٹری کا رخ بھی نہیں کیا۔ ماموں نے جب یہ سنا تو وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا زندگی میں کچھ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے چاروں بیٹیوں سے کہہ دیا کہ وہ بھائی کے آسرے پر نہ رہیں انہیں اپنی زندگی خود بنانی ہے۔

اس کے بعد راجا کا یہی معمول بن گیا۔ وہ کچھ عرصہ کہیں کام کرتا پھر کسی نہ کسی وجہ سے اس کی ملازمت ختم ہو جاتی۔ ایک تو وہ پابندی سے کام پر نہیں جاتا تھا۔ عموماً دیر سے ڈیوٹی پر پہنچتا اور بہانے بہانے سے چھٹیاں کرتا تھا دوسرے اس کا مزاج بہت تیز تھا۔ ذرا سی بات پر غصے میں آجاتا اور سامنے والے کو بے بھاؤ کی سنا دیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے چند ہفتوں یا مہینوں بعد ہی کام سے جواب مل جاتا۔ اس دوران جو کماتا وہ اپنی ذات پر خرچ کر دیتا۔ اسے نئے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ ہر چھٹے مہینے موبائل تبدیل کر لیتا۔ دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں جانا اور فلمیں دیکھنا اس کے محبوب مشغلے تھے۔ گھر میں تو کچھ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے ایجنٹ کو دینے کے لیے ایک خطیر رقم جمع کرنا ہے۔

اس کی یہ روش میرے لیے بہت پریشان کن تھی۔ میں نے انٹر کر لیا تھا اور زیادہ سے زیادہ گریجویشن کے بعد میری شادی ہو جاتی۔ امی نے تو جہیز بھی جوڑنا شروع کر دیا تھا اور میرے کان میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ اگر اس دوران کوئی اچھا رشتہ آ گیا تو میری شادی کر دی جائے گی۔ ابو کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد میرے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ ادھر میں اپنے خیالوں میں راجا کو بسائے بیٹھی تھی اور اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن راجا کی پوزیشن دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے اس پر میٹرک پاس کا لیبل لگا اور اب نکھٹو کے طعنے بھی ملنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ابو کسی صورت بھی اس سے میرا رشتہ نہ کرتے۔ ہاں اگر وہ سعودی عرب چلا جاتا تو شاید صورت

حال مختلف ہوتی۔

میں نے ان خدشات کا اظہار راجا سے کیا تو وہ ہمیشہ کی طرح لاابالی انداز میں بولا۔ ''مجھے پھوپا کی نہیں صرف تمہاری پرواہ ہے اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ٹکرا سکتا ہوں۔''

''فلمی ڈائیلاگ مت بولو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''زندگی کوئی فلم نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے اور سچ وہی ہے جو نظر آ رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ان حالات میں ابو تمہارا رشتہ قبول کر سکیں۔''

''میرے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی نہیں بن سکتیں۔'' وہ چیلنج کرنے کے انداز میں بولا۔ ''دیکھتا ہوں کہ پھوپا تمہاری شادی کسی دوسرے شخص سے کیسے کرتے ہیں۔''

''کیا کر لو گے تم، انہیں گولی مار دو گے یا مجھے اٹھا کر لے جاؤ گے۔''

''تمہیں پانے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''کان کھول کر سن لو۔ میں والدین کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر مجھ سے شادی کرنا ہے تو کچھ بن کر دکھاؤ۔ میں تمہیں دو سال کا وقت دے رہی ہوں گریجویشن کرنے کے بہانے آنے والے رشتوں کو ٹالتی رہوں گی لیکن اس کے بعد میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نئے سرے سے کوشش کرتا ہوں لیکن تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ میری واپسی کا انتظار کرو گی۔''

''میں اپنی بات پر قائم رہوں گی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

اس کے بعد راجا نے سنجیدگی سے باہر جانے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ اس نے کچھ دوستوں سے قرض ادھار لے کر پیسوں کا بندوبست کیا اور ویزا خرید کر دبئی چلا گیا۔ اسے پوری اُمید تھی کہ وہاں کام مل جائے گا اور جلد ہی وہ اس قابل ہو سکے گا کہ قرض اتار سکے۔ سب لوگ اس کے جانے پر بہت خوش تھے۔ البتہ مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر وہاں بھی اس نے اپنی روش نہ بدلی تو اسے خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا جب میں نے اس سے یہ بات کہی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''بعض اوقات تم بالکل بے وقوفوں جیسی بات کرتی ہو۔ میں کچھ گنوانے نہیں بلکہ کمانے جا رہا ہوں اور مجھے اپنے نفع نقصان کا خوب اندازہ ہے اب کچھ بن کر ہی واپس آؤں گا۔ بس تم اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

''تم بار بار یہ بات یاد دلا کر مجھے شرمندہ مت کرو۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہوں گی۔''

جانے سے پہلے وہ ابو سے ملنے آیا تو ان کا رویہ بھی کافی بدلا ہوا تھا۔ وہ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئے اس کے بہتر مستقبل کے لیے دعا کی اور گلے لگا کر رخصت کیا۔ ان کا رویہ دیکھ کر میں مطمئن ہو گئی کہ حالات اتنے برے نہیں ہیں جتنا کہ میں سمجھ رہی تھی اور اگر راجا واقعی اپنی مالی پوزیشن بہتر بنانے میں کامیاب ہو گیا تو شاید ابو کو اسے اپنا داماد بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہو۔

اسے ایک ماہ بعد ہی کام مل گیا اور جب اس کا پہلا ڈرافٹ آیا تو ماموں کے گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ ممانی کے تو قدم ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ انہوں نے پورے خاندان میں مٹھائی تقسیم کی۔ ہمارے گھر بھی وہ دو کلو کا ڈبہ لے کر آئیں اور اپنے مخصوص انداز میں امی کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ ''سب لوگ میرے بیٹے کو کھوٹا سکہ سمجھتے تھے۔ دیکھ لو وہی سب سے کھرا نکلا۔ کیا ہوا اگر وہ پڑھ نہیں سکا۔ ماشاء اللہ کمائی میں پورے خاندان سے آگے ہے۔''

''اللہ کرے وہ اور ترقی کرے تاکہ ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہو۔'' امی خلوصِ دل سے بولیں۔

راجا کی ملازمت کی سب سے زیادہ خوشی مجھے تھی اگر وہ دل لگا کر کام کرتا تو دو سال میں اتنا کما سکتا تھا کہ ابو کے پاس اعتراض کی گنجائش نہ رہتی۔ میں نے اسے فون پر مبارک باد دی اور کہا کہ وہ تمام اندیشوں سے بے نیاز ہو کر اپنے کام پر توجہ دے، میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔ اس کے بعد میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر امی کو بھی اپنا راز دار بنا لیا تاکہ اگر اس دوران کوئی رشتہ آ جائے تو وہ کوئی مناسب بہانہ بنا کر اسے ٹال سکیں۔ امی میری بات سن کر تھوڑی سی پریشان ہو گئیں اور بولیں۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تمہارے ابو اس پر تیار نہیں ہوں گے۔ تم جانتی ہو کہ وہ تعلیم کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے امی لیکن زندگی مجھے گزارنی ہے اور میں اسے پسند کرتی ہوں۔ لہٰذا ابو کو بھی میری خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔''

"ٹھیک ہے، وقت آنے دو کوشش کروں گی کہ انہیں قائل کرسکوں۔"

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ تقدیر نے ایک ایسا وار کیا کہ میرے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ایک دن ابو دفتر سے آئے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر ہم لوگ بھی تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ جب پریشانی کی وجہ پوچھی تو پہلے ٹال مٹول کرتے رہے پھر ہمارے بے حد اصرار پر بتایا کہ ان پر غبن کا جھوٹا کیس بنا دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے افسروں کے کہنے پر غلط کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اب انکوائری ہوگی اور اگر الزام ثابت ہوگیا تو انہیں ملازمت سے برطرف کردیا جائے گا۔

یہ سن کر ہمارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہم سب جانتے تھے کہ ابو ایسا کام نہیں کرسکتے۔ اگر انہوں نے غبن کیا ہوتا تو اس کے اثرات گھر میں بھی نظر آتے۔ آخر وہ غبن کیا ہوا پیسا کہاں چلا گیا۔ دوسرے دن ان کے دفتر کے ایک ساتھی ان سے ملنے آئے اور کافی دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ابو سے باتیں کرتے رہے اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں ہی چائے لے کر گئی۔ جیدی صاحب نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور ابو سے بولے۔

"ماشاء اللہ آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔"

ابو مسکرا کر چپ ہوگئے لیکن جیدی صاحب کے دیکھنے کا انداز مجھے بہت عجیب سا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کے تھے لیکن ان کی نظریں مجھے اپنے جسم کے پار اترتی محسوس ہوئیں۔ وہ بڑی وارفتگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے لیے وہاں رکنا محال ہوگیا۔ میں نے جلدی سے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

ان کے جانے کے بعد ابو خاصے مطمئن نظر آئے۔ جیدی صاحب نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرکے انہیں اس الزام سے بری کروا دیں گے۔ انکوائری آفیسر ان کا جاننے والا ہے اور وہ ان کی بات نہیں ٹالے گا۔ اگر کچھ پیسے خرچ کرنا پڑے تو وہ اس کا بندوبست بھی کردیں گے۔ یہ ایک طرح سے قرض حسنہ ہوگا اور وہ اس کی فوری واپسی کے لیے اصرار نہیں کریں گے۔

اس مشکل گھڑی میں جیدی صاحب ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ انکوائری آفیسر پانچ لاکھ مانگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ تین لاکھ پر تیار ہوا۔ جیدی صاحب نے ہی اس رقم کا بندوبست کیا اور انکوائری کے نتیجے میں ابو اس الزام سے بری ہوگئے لیکن اس واقعے کے بعد وہ اندر سے بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ جو جرم انہوں نے کیا ہی نہیں، اس سے بری ہونے کے لیے انہیں رشوت دینا پڑی جب کہ وہ اسے جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن جیدی صاحب کے سمجھانے پر انہیں اس کے لیے آمادہ ہونا پڑا ورنہ برطرف ہونے کی صورت میں روزگار کے ساتھ ساتھ واجبات سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے اور بدنامی الگ ہوتی۔

جیدی صاحب کی ہمارے گھر میں آمدورفت بڑھ گئی۔ ابو تو ان کے مرید بن کر رہ گئے تھے۔ جیدی صاحب کو میرے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی۔ اس لیے آتے ہی فرمائش کرکے مجھ سے چائے بنوائی پھر انہوں نے آہستہ آہستہ مجھ سے بے تکلف ہونا شروع کردیا۔ وہ میری تعلیمی سرگرمیوں، مشغلوں اور دیگر دلچسپیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے حالانکہ میرے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن جیدی صاحب کی نظر التفات مجھ پر ہی تھی۔ میں بچی نہیں تھی کہ ان نظروں کا مفہوم نہ سمجھتی لیکن جب ان کی اور اپنی عمر کے فرق کو دیکھتی تو مجھے یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی اور میں اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹال دیتی۔

اس واقعے کے چھ ماہ بعد ابو کا انتقال ہوگیا۔ باپ کا سایہ سر سے ہٹا تو یوں لگا جیسے ہم کھلے آسمان تلے کھڑے ہیں۔ اوپر آگ برساتا سورج اور قدموں تلے تپتی ریت ہے۔ میرا یونیورسٹی کا پہلا سمسٹر تھا اور چھوٹے بہن بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ گھر کا کمانے والا واحد فرد اس دنیا سے جاچکا تھا اور ہم سب خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے سے سوال کررہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ مکان ذاتی تھا ورنہ سر پر سے چھت بھی چھن جاتی۔

ایسے میں جیدی صاحب ایک بار پھر ہماری مدد کو آئے۔ انہوں نے بھاگ دوڑ کرکے ابو کے واجبات نکلوائے اور ساری رقم قومی بچت کے مرکز میں جمع کروادی تھی کہ امی کو ہر مہینے منافع ملتا رہے گو کہ اس سے گھر کے اخراجات پورے نہ ہوتے لیکن پھر بھی کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر تھا۔ میں نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا اور ایک قریبی اسکول میں ٹیچر کی جاب کرنے لگی۔ اس وقت مجھے راجا کی بات یاد آئی کہ لڑکیاں چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ جائیں انہیں بالآخر روٹیاں ہی پکانی ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑے

سے حالات بہتر ہو جائیں تو پرائیویٹ بی اے کرلوں گی۔ جیدی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ گریجویشن کے بعد مجھے کوئی اچھی ملازمت دلوادیں گے۔

گھر کے حالات تھوڑے سے قابو میں آئے تو امی کو جیدی صاحب کے قرض کی فکر ستانے لگی گو کہ ابھی تک انہوں نے تقاضا نہیں کیا تھا لیکن کسی وقت بھی وہ یہ بات کہہ سکتے تھے اگر ابو کے واجبات کی مد میں ملنے والی رقم سے قرض ادا کیا جاتا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہ بچتا اور گھر میں فاقوں کی نوبت آجاتی۔ امی نے یہ پریشانی جیدی صاحب کے سامنے رکھی تو وہ بے پروائی سے بولے۔ ''بھابی! پیسے کہیں بھاگے نہیں جارہے آپ کو جب سہولت ہو، دے دیجیے۔''

''بھائی صاحب آپ تو ہمارے حالات جانتے ہی ہیں۔ بچے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کب اس قابل ہوسکیں گے کہ آپ کا قرض ادا کرسکیں جب کہ مجھے ایک ایک دن بھاری لگ رہا ہے۔''

''بھابی! آپ پریشان نہ ہوں میں کچھ سوچتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

راجا کے دبئی جانے کے بعد ماموں کے گھر میں خاصی خوش حالی آگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کے رویے بھی بدل گئے تھے اب ماموں ہمارے گھر بہت کم آتے تھے۔ ممانی کو بیٹے کی کمائی اور بیٹیوں کی پڑھائی کا غرور تھا۔ راجا نے بھی ابو کے انتقال پر رسمی انداز میں تعزیت کی لیکن کسی نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ ہم لوگ کس حال میں ہیں یوں لگا کہ راجا مجھے وعدے کی زنجیر میں باندھ کر خود بدل گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ابو کے انتقال کے ایک مہینا بعد اس کا دوسرا فون آیا تو اس نے مجھے بہت تسلی دلاسے دیئے اور پیشکش کی کہ وہ میرے ایک بھائی کے لیے ویزے کا بندوبست کرسکتا ہے لیکن امی نے انکار کردیا کیونکہ ابھی ان دونوں نے انٹر بھی نہیں کیا تھا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر اور دوسرا انجینئر بننا چاہ رہا تھا اور امی نہیں چاہتی تھیں کہ اس کم عمری میں وہ پردیس کے دھکے کھائیں۔

جیدی صاحب نے ہمارے مسئلے کا جو حل تجویز کیا وہ اتنا انوکھا اور ناقابلِ یقین تھا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ ہوا یوں کہ ایک خاتون ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے اپنا تعارف جیدی صاحب کی بھابی کے طور پر کروایا۔ امی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مجھے چائے لانے کے لیے کہا۔ میں سوچ رہی تھی کہ جیدی صاحب کی بھابی کیوں آئی ہیں۔ بہر حال میں چائے بنا کر لائی تو انہوں نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی تم اگر برا نہ مانو تو میں تمہاری والدہ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

میں خاموشی سے باہر چلی گئی لیکن مجھے تجسس ضرور تھا کہ آخری ایسی کیا بات ہے جو وہ تنہائی میں کرنا چاہتی ہیں چنانچہ میں دروازے کی اوٹ سے کان لگا کر کھڑی ہوگئی اور جو کچھ میں نے سنا وہ کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ خاتون میرے لیے جیدی صاحب کا رشتہ لے کر آئی تھیں اور انہوں نے یہ پیشکش کی کہ اگر امی یہ رشتہ قبول کرلیں تو جیدی صاحب اپنا قرض معاف کرسکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کرتے رہیں گے۔ دوسری صورت میں ہمیں فوری طور پر یہ قرض ادا کرنا ہوگا۔ امی نے بڑے تحمل سے ان کی بات سنی اور کہا۔ ''میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے مجھے اپنی بیٹی سے پوچھنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ میں ایک ہفتے بعد جواب لینے آؤں گی۔''

میرے دونوں بھائی یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ یہ بے جوڑ شادی ہرگز نہیں ہونے دیں گے اگر قرضہ ادا کرنا ہے تو مکان بیچ دیں۔ ہم کرائے کے گھر میں رہ لیں گے۔

میں نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی۔ موجودہ آمدنی سے ہمارا کھانے کا خرچ بھی بمشکل پورا ہوتا تھا۔ کرایہ کہاں سے دیا جاتا۔ اس کے علاوہ قرض کی ادائیگی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ اب میری سمجھ میں جیدی صاحب کی پوری اسکیم آگئی۔ ان کی پہلے دن سے ہی مجھ پر نظر تھی۔ اس کے لیے پہلے انہوں نے ابو کو انکوائری کے جال میں پھنسایا اور پھر قرض دے کر ان کی جان چھڑائی۔ وہ جانتے تھے کہ ابو ساری عمر وہ قرض نہیں اتار سکیں گے اور وہ اس کے بدلے میرا ہاتھ مانگ لیں گے۔ ابو کی موت نے ان کا کام اور بھی آسان کردیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ امی ان کے قرض کی ادائیگی کے لیے فکر مند ہیں تو انہوں نے اپنا پتا پھینک دیا۔ اب فیصلہ مجھے کرنا تھا۔

وہ پورا ہفتہ میں نے سوچنے میں گزار دیا اور ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے جیدی صاحب کی پیشکش قبول کرلینا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں

راجا کو دل و جان سے چاہتی تھی اور میں نے اس سے انتظار کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن میں ممانی کے بدلے ہوئے تیور دیکھ رہی تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی کمائی پر کچھ زیادہ ہی غرور ہو گیا تھا اور وہ ہم لوگوں کو بہت حقیر سمجھنے لگی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ دیارِ غیر میں کام کرنے والوں کی مارکیٹ ویلیو کیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کا رشتہ کسی اونچی جگہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں گی جہاں سے لمبا چوڑا جہیز ملنے کی امید ہو.... بالفرض یہ سب نہ ہوتا اور میں راجا کے وعدے پر اعتبار کر کے اس کا انتظار کرتی رہتی تو جیدی صاحب کا قرضہ کس طرح ادا ہوتا۔ گھر والوں کو بے گھر کرنے سے بہتر تھا کہ میں اپنی محبت کی قربانی دوں اور جیدی صاحب سے شادی کرلوں۔

راجا کو میرے اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے مجھے بے بھاؤ کی سنائیں۔ مجھے بے وفا، لالچی، خودغرض اور نہ جانے کیا کیا کہہ دیا، اس نے جوش میں آ کر یہ دعویٰ بھی کیا کہ اگر میں اسے اپنی مجبوری بتاتی تو وہ تین لاکھ روپوں کا بندوبست کر دیتا لیکن میں جانتی تھی کہ یہ دعویٰ کھوکھلا ہے۔ ایک ویلڈر کی یہ حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکے پھر وہ اپنی کمائی کا بڑا حصہ گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس تین لاکھ تو کیا تین ہزار روپے بھی نہیں ہوں گے۔ جب وہ اپنی کہہ چکا تو میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا کہ میں یہ کڑوا گھونٹ اپنے گھر والوں کی خاطر پی رہی ہوں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ مجھے بھول جائے۔ اسے مجھ سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔

شادی بہت سادگی سے ہوئی اور امی نے ماموں ممانی کے علاوہ کسی رشتے دار کو مدعو نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ ممانی کوئی شکوہ کریں گی کہ پہلا حق ہمارا تھا لیکن تم نے ہم سے پوچھے بغیر لڑکی کو دوسری جگہ بیاہ دیا۔ اس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ ممانی کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ راجا کی شادی کسی بڑے گھرانے میں کرنا چاہ رہی تھیں۔

شادی کی پہلی رات ہی میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ ظاہر ہے کہ ادھیڑ عمر مرد ایک بیس سالہ لڑکی کی تسکین نہیں کر سکتا لیکن میں نے اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ جیدی صاحب بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے اور انہوں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ میں ایک پُرآسائش زندگی بسر کر رہی تھی۔ اپنا گھر، گاڑی، گھر میں نوکر اور دوسری تمام سہولتیں موجود تھیں۔ میرے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جہاں چاہتی چلی جاتی اور جو چاہتی خرید لیتی۔ صبح ڈرائیور جیدی صاحب کو دفتر چھوڑنے جاتا اور شام کو واپس لے آتا۔ بقیہ وقت گاڑی میرے استعمال میں ہوتی تھی۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن امی کے گھر کا چکر لگاتی اور صبح سے شام تک وہیں رہتی۔ جیدی صاحب نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ خود بھی چھٹی کے دن میرے ساتھ امی کے گھر آ جاتے۔

زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی میں ماں بن گئی۔ قدرت نے مجھے ایک خوب صورت بیٹے سے نوازا تھا۔ جیدی صاحب تو خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی برسوں پرانی خواہش پوری ہوگئی تھی اب میری توجہ کا مرکز ننھا عامر ہی تھا۔ میں جی جان سے اس کی پرورش میں لگ گئی۔ اس کے بعد میرے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس طرح پانچ سال گزر گئے۔

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ راجا دبئی سے واپس آ گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ممانی نے اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کرلی ہے اور وہ شادی کرنے ہی آیا ہوگا لیکن اس کی واپسی کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ جس کمپنی میں کام کر رہا تھا اس کا ٹھیکا ختم ہو گیا اور کمپنی نے اس پروجیکٹ پر کام کرنے والے تمام ملازمین کو فارغ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی راجا کا ویزا بھی ختم ہو گیا اور دوسرے ویزے کے حصول کے لیے اس کا پاکستان واپس آنا ضروری تھا۔ ہم سب لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ایک دو مہینے بعد وہ واپس دبئی چلا جائے گا۔

راجا سے میری ملاقات امی کے گھر ہوئی۔ میں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن وہ اچانک ہی وہاں آ گیا۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے ایک بار پھر شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ وہ ایک ہی بات دہرا رہا تھا کہ میں نے فیصلہ کرنے میں جلدی کی اور مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مجھے بھی موقع مل گیا کہ جو بات اس سے فون پر نہ کہہ سکی وہ اب وضاحت سے بیان کردوں۔ میں نے اپنی مجبوری بتانے کے بعد اس سے پوچھا کہ ان حالات میں میرے پاس کون سا راستہ باقی رہ گیا تھا۔ دو ہی صورتیں تھیں کہ جیدی صاحب کا قرض ادا کردوں یا ان سے شادی کرلوں۔ اس وقت ہمارے پاس تین ہزار روپے بھی نہیں تھے تین لاکھ کا انتظام کہاں سے ہوتا۔

میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''تم مکان بیچ کر ان کا قرض اتار دیتیں۔ لیکن تم نے تو خود اپنے لیے یہ سزا تجویز کی۔''

''میں اتنی خود غرض نہیں کہ اپنی خوشیوں کی خاطر گھر والوں کو دربدر کر دیتی۔ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اسے میں نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔''

''یہ سب دل کو تسلی دینے والی باتیں ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم جس آگ میں جل رہی ہو۔ میں اس کی تپش کو محسوس کر سکتا ہوں۔ یہ تو ایک بے وقوف بھی سمجھ سکتا ہے کہ تم جیسی خوب صورت اور جوان عورت ایک بوڑھے کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔''

اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور بڑی بے دردی سے وہ تلخ حقیقت بیان کر دی جو میں زبان پر لانے سے قاصر تھی۔ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار رونے لگی۔ اس نے قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے اور جذباتی... انداز میں بولا۔

''دیکھو شازیہ! غلطی تم سے ہوئی لیکن اس کا خمیازہ میں بھی بھگت رہا ہوں۔ تمہاری شادی کی خبر سننے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میری زندگی میں کوئی دوسری لڑکی نہیں آئے گی۔ امی میری شادی کرانے پر بضد ہیں لیکن میرا دل اس کے لیے تیار نہیں میں آج بھی تم سے پہلے جیسی محبت کرتی ہوں اور تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے اس کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس سچائی کو قبول کر لینا چاہیے کہ اب میں کسی دوسرے کی ہو چکی ہوں اور تمہیں چاہیے کہ مجھے بھلا کر اپنا گھر بسا لو۔''

''کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں مطمئن ہو گئی کہ اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی ہے لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ اس دن کے بعد تو اس نے میرا پیچھا ہی لے لیا۔ میں جب بھی امی کے یہاں جاتی تو وہ پہلے سے وہاں موجود ہوتا۔ نہ جانے اسے کیسے خبر ہو جاتی تھی ایک دو دفعہ وہ میرے گھر بھی آیا۔ جیدی صاحب موجود نہیں تھے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ان کی موجودگی میں آیا کرے۔ مرد کے دل میں شک بیٹھتے دیر نہیں لگتی۔ اگر جیدی صاحب کو معلوم ہو گیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھیں۔ اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی اور وہ شام میں آنے لگا۔ جیدی صاحب اسے میرا رشتے دار سمجھ کر آؤ بھگت کرتے لیکن مجھے اس کا اپنے گھر... آنا پسند نہیں تھا لیکن اسے صاف صاف منع بھی نہیں کر سکتی تھی پھر اسے بھی احساس ہو گیا کہ اس آمدورفت کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جیدی صاحب کی موجودگی میں ہم کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس نے خود ہی میرے گھر آنا کم کر دیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ راجا کے آجانے سے میرے سوئے ہوئے جذبات ایک بار پھر بیدار ہو گئے۔ اب مجھے اس کا آنا اور اس سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا۔ پہلے میں دو تین دن بعد امی کے گھر جایا کرتی تھی۔ اب ایک دن چھوڑ کر جانے لگی۔ اب میں گھر سے نکلتے وقت اسے فون کر دیتی اور وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔ میرے دل میں اس کی سوئی ہوئی محبت انگڑائیاں لے رہی تھیں اور اس کی پیار بھری باتوں نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ اب مجھے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرا شباب جوبن پر تھا۔ جب کہ جیدی صاحب کی عمر ڈھل رہی تھی اور وہ میرے بپھرے ہوئے جذبات کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔

راجا میری کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ مجھے ورغلانا شروع کر دیا۔ اس کی باتوں میں آ کر میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی۔ امی کے گھر میں ہمیں مکمل تنہائی میسر تھی۔ دونوں بھائی کام پر چلے جاتے تھے اور امی گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں پتا بھی نہ چل سکا کہ ان کی بیٹی اور بھتیجا کیا گل کھلا رہے ہیں۔ وہ جب مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتا تو میں بے اختیار رونے لگتی اور وہ مجھے گلے سے لگا کر میرے آنسو پونچھنے لگتا۔ اس وقت میں بالکل بھول جاتی تھی کہ وہ میرے لیے نامحرم ہے اور مجھے اس سے اتنا قریب نہیں ہونا چاہیے۔ اس قربت کا جو نتیجہ نکلنا تھا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسے دبئی سے آئے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے لیکن دوبارہ جانے کی صورت نہیں بن رہی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کب واپس جا رہا ہے تو وہ مسکین صورت بناتے ہوئے بولا۔ ''کیسے جاؤں اب ویزا ملنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ایجنٹ کی ڈیمانڈ بہت زیادہ ہے جو میں پوری نہیں کر سکتا۔''

''تم نے دبئی میں پانچ سال کام کیا۔ اچھے خاصے پیسے کمائے ہوں گے۔ پھر کیا مسئلہ ہے؟''

اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''سب یہی سمجھتے ہیں کہ میرے پاس بہت پیسا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میں بالکل خالی ہوں۔ جو کمایا وہ گھر بھیجتا رہا اور یہاں یہ لوگ مزے کرتے رہے۔ اسی پیسے سے بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ گھر کے لیے چیزیں خریدی گئیں۔ تم تو جانتی ہو کہ امی کو دکھاوا کرنے کا کتنا شوق ہے۔ انہوں نے سارا پیسا چیزوں کے خریدنے میں لگا دیا۔ صوفے، قالین، فرنیچر، پردے، اے سی اور نہ جانے کیا کیا۔ آج ہمارے گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود ہے لیکن اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہی کرسکوں۔''

''تب پھر زندگی کیسے گزارو گے؟''

''بس کوئی کام دیکھوں گا باہر جانا تو بہت مشکل لگ رہا ہے۔''

میں جانتی تھی کہ اب اس کی زندگی کا مشکل دور شروع ہونے والا ہے۔ جن لوگوں کو باہر کی کمائی کا مزہ لگ جائے ان کا گزارہ یہاں کے پیسوں میں نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ ''تم ویزے کے لیے کوشش کرتے رہو۔ تمہارے لیے باہر جانا ہی بہتر ہے۔''

''دیکھو کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا پھر اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''سچ پوچھو تو میرا دل بھی یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔ تمہارے بغیر جس طرح پانچ سال گزارے ہیں وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ یہاں رہ رہ کر تمہارے دیدار تو نصیب ہو جاتے ہیں۔''

''دیدار ہوں یا نہ ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب میں تمہارے لیے غیر ہو چکی ہوں۔''

''اگر تم چاہو تو یہ دوریاں دور ہو سکتی ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''وہ کس طرح؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے شادی کرلو۔ اس طرح ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں گے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے جبکہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا۔ تم جیدی سے طلاق لو۔ چار مہینے دس دن عدت گزارو۔ پھر مجھ سے نکاح کرلو۔''

''طلاق لینے کے لیے کوئی جواز ہوتا ہے میں کس بنیاد پر اس سے یہ مطالبہ کرسکتی ہوں جب کہ انہوں نے مجھے دنیا جہاں کی خوشیاں دے رکھی ہیں۔''

''لیکن تم زندگی کی حقیقی مسرتوں سے محروم ہو، کیوں اپنی جوانی کو گھن لگا رہی ہو۔ وہ بوڑھا تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ میں تمہارا دامن خوشیوں سے بھردوں گا۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جیدی صاحب اتنی آسانی سے طلاق نہیں دیں گے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ کیا ممانی اس شادی پر تیار ہو جائیں گی۔''

''امی کو راضی کرنا میرا کام ہے اور جہاں تک جیدی سے طلاق لینے کا تعلق ہے تو یہ میں بھی جانتا ہوں کہ وہ اتنی آسانی سے اس پر تیار نہیں ہوگا۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اسے اتنا تنگ کرو کہ وہ خود ہی تمہیں چھوڑ دے۔''

''تم نہیں جانتے کہ وہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

''مرد خواہ کتنے ہی ٹھنڈے مزاج کا کیوں نہ ہو۔ عورت کی بے وفائی برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر جیدی کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم اب بھی مجھ سے چوری چھپے ملتی ہو تو وہ تمہیں کھڑے کھڑے طلاق دے دے گا۔''

''نہیں یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں کوئی دوسرا طریقہ سوچتی ہوں۔''

اس کے بعد میں نے جیدی صاحب کو زچ کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کردیا اور ان کے ساتھ میرا رویہ دن بہ دن خراب ہوتا گیا اور میں ان سے بے رخی برتنے لگی۔ صبح ناشتے کی میز پر منہ پھلائے بیٹھی رہتی اور اگر وہ کوئی بات کرتے تو کڑوے لہجے میں جواب دیتی۔ شام کو بھی میرا یہی رویہ ہوتا تھا۔ ان سے سیدھے منہ بات نہ کرتی اور بات بات پر چلانا شروع کردیتی لیکن ان باتوں کا جیدی صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح میری ناز برداری میں لگے رہتے لیکن ایک دن بات بہت بڑھ گئی۔ میں ٹیلی فون پر راجا سے باتیں کررہی تھی کہ وہ غیر متوقع طور پر وقت سے پہلے گھر آگئے۔ میں نے گھبرا کر فون بند کردیا۔ ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ جلدی کیوں آگئے انہوں نے خود ہی کہا۔ ''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ ایک پیالی چائے بنادو۔''

مجھ پر ویسے ہی جھنجلاہٹ سوار تھی۔ پیر پٹختی ہوئی کچن میں گئی اور چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ دی۔ چائے کا پانی گرم ہوگیا تو میں نے اس میں پتی ملائی اور بدحواسی میں چینی کی جگہ نمک ڈال دیا۔ چائے کی پیالی ان کے سرہانے کی تپائی پر رکھ کر واپس ہو رہی تھی کہ انہوں نے آواز دے کر بلایا اور بولے۔ ”میرے پاس بیٹھ جاؤ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔“

میں منہ بناتی ہوئی ان کے بیڈ کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ لیا اور جھلاتے ہوئے بولے۔ ”یہ کیا چینی کی جگہ نمک ڈال دیا۔“

میں نے شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”اس میں اتنا بگڑنے والی کیا بات ہے۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ ان دنوں تمہارا مزاج ٹھکانے پر نہیں ہے۔ سیدھے منہ بات کرتی ہو اور نہ ہی تمہارا کسی کام میں دل لگتا ہے۔ میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔“

”کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس میرا دل نہیں لگتا۔“

”یہ اچانک تمہارے دل کو کیا ہوگیا۔ پہلے تو تم اچھی بھلی رہ رہی تھیں۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں شادی کے بعد ایک دن بھی آپ کے ساتھ خوش نہیں رہی۔“

”خوش نہ رہنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی جب کہ میں نے ہمیشہ تمہارا خیال رکھا، تمہارے لیے دنیا بھر کی آسائشیں مہیا کیں۔ تمہارے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی اس کے باوجود تم یہ کہہ رہی ہو کہ میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔“

”ایک عورت کو اس کے علاوہ بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے جو آپ دینے سے قاصر ہیں۔“ میں نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ ”ضرور تمہیں کسی نے ورغلایا ہے ورنہ پہلے تو تم نے ایسی بات نہیں کی۔“

”میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں جو کسی کے بہکاوے میں آجاؤں گی۔ آپ کو خود یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ آپ کی عمر کا مرد میری جیسی عورت کو کس طرح خوش رکھ سکتا ہے۔“

”میں بھی اتنا بے وقوف نہیں کہ کچھ نہ سمجھ سکوں۔ شک تو مجھے پہلے سے تھا لیکن اب یقین ہوگیا ہے اس کے

انصار برنی

عالمی شہرت یافتہ پاکستان کے سماجی رہنما، وہ کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے گرین لینڈ اسکول سے میٹرک اور گریجویشن اور لاء گریجویشن اسلامیہ کالج کراچی سے کیا۔ دورانِ تعلیم پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد کراچی میں پریکٹس شروع کر دی۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو جیل سے رہائی دلوائی اور متعدد افراد کو پاگل خانوں سے نکلوا کر ان کے گھر بھجوا دیا۔ تقریباً چالیس ہزار افراد کو جیلوں سے رہا کرا چکے ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اندرون اور بیرونِ ملک سے ایک سو ایوارڈ دیئے گئے۔ 1978ء میں انہوں نے پرزنرز ایڈ سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ امریکی بائیوگرافر انسٹی ٹیوٹ آف امریکا نے حقوق انسانی کے علمبردار کی حیثیت سے انہیں مین آف دی ائر 1991ء کا خطاب دیا اور ان کا نام ”ہوز ہو“ میں شامل کیا گیا۔ وہ اس وقت انصاری برنی ویلفیئر ٹرسٹ کراچی کے چیئرمین ہیں۔ 1992ء میں انہیں فرانس کے ہیومن رائٹس کے ادارے نے بھی انعام سے نوازا۔

مرسلہ: اکبر خان۔ پشاور

انطباق (Superpose)

کسی شکل کو ایک دوسری شکل پر اس طرح رکھنا کہ دونوں کے متناظر حصے منطبق ہو جائیں۔ ایک مثلث کو دوسرے مثلث پر اس طرح منطبق کیا جائے کہ پہلے مثلث کے ضلع اور زاویے دوسرے کے ضلعوں اور زاویوں پر ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائیں۔ اگر دو مثلث ایک دوسرے پر منطبق ہو جائیں تو ان کے اضلاع اور زاویے باہم برابر ہوتے ہیں۔ ان برابر ضلعوں کے مقابل زاویے متناظرہ زاویے اور برابر کے زاویوں کے مقابل اضلاع متناظرہ اطلاع کہلاتے ہیں۔ اگر دو قائم الزاویہ مثلثوں کے وتر برابر ہوں اور ان کا ایک ایک ضلع بھی برابر ہو تو دونوں مثلث منطبق ہوں گے۔ منطبق مثلثوں کے رقبے بھی برابر ہوتے ہیں۔

مرسلہ: زرین مصطفی۔ ایبٹ آباد

باوجود میں تمہیں کوئی الزام نہیں دوں گا۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔''

''آپ مجھے آزاد کردیں۔'' میں نے دبی زبان سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں تمہیں ابھی اور اسی وقت آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تمہیں عامر کے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ وہ میرا بیٹا ہے اور اس کی پرورش و تعلیم تربیت میری ذمے داری ہے۔''

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جیدی صاحب اتنی آسانی سے طلاق دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ راجا کی محبت میں اتنی پاگل ہوگئی تھی کہ میں نے جیدی صاحب کی شرط مان لی اور اپنی ممتا کا گلا گھونٹ دیا۔ البتہ جیدی صاحب نے مجھ پر اتنا احسان ضرور کیا کہ میں جب چاہوں عامر سے ملنے آسکتی ہوں۔

یوں میں طلاق کا داغ ماتھے پر سجائے میکے کی دہلیز پر آکر بیٹھ گئی۔ امی اور بھائیوں نے سنا تو حیران رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جیدی صاحب جیسے نیک اور فرشتہ صفت انسان نے مجھے کیوں طلاق دی وہ مجھ سے بار بار اس کا سبب پوچھ رہے تھے۔ مجبوراً میں نے انہیں ایک فرضی کہانی سنائی جس میں جیدی صاحب کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جیدی صاحب انتہائی سنگ دل اور شکی انسان ہیں اگر میں کسی نوکر یا دکان دار سے بھی ہنس کر بات کرلوں تو ان کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ وہ چوری چھپے میرے موبائل فون پر کالوں کا ریکارڈ دیکھتے تھے۔ مجھے میکے کے سوا کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کئی مرتبہ انہوں نے مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنایا لیکن میں صرف اپنے بھائیوں کے مستقبل کی خاطر یہ ظلم سہتی رہی اس طرح کی اور جھوٹی سچی باتیں میں نے نمک مرچ لگا کر بیان کیں تو سب کو میری مظلومیت کا یقین آگیا۔

راجا کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا لیکن اس نے مجھے تاکید کی کہ پابندی کے ساتھ عدت کی مدت پوری کروں اور اگر وہ ہمارے گھر آئے تو اس کے سامنے نہ آجاؤں تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ ممانی البتہ اس موقع پر بھی طنز کے تیر برسانے سے باز نہ آتیں۔ ویسے تو وہ ماموں کے ساتھ امی سے اظہارِ ہمدردی کرنے آتی تھیں لیکن اس کی آڑ میں انہوں نے خوب باتیں سنائیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ امی نے دولت کے لالچ میں بیٹی ایک بڈھے کے حوالے کردی۔

عدت کے دن پورے ہوئے تو راجا نے ممانی سے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لہٰذا وہ پیغام لے کر جائیں۔ ممانی یہ سنتے ہی بھڑک اٹھیں اور انہوں نے راجا کو بے بھاؤ کی سنا ڈالیں۔ وہ کسی بھی صورت میں ایک مطلقہ عورت سے اس کی شادی کرانے پر تیار نہ تھیں لیکن راجا بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک بار جو بات سما جائے وہ اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا تھا۔ اس نے ممانی سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو مجھ سے ورنہ ساری عمر کنوارہ بیٹھا رہے گا۔ مجبوراً ممانی کو اس کی بات ماننا پڑی اور وہ اس کا رشتہ لے کر ہمارے گھر چلی آئیں۔

شادی بہت سادگی سے ہوئی جب کہ ممانی اپنے اکلوتے بیٹے کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہ رہی تھیں لیکن مالی مجبوری کے سبب وہ اپنے دل کے ارمان پورے نہ کرسکیں۔ دوسرے یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ بے دلی سے سارے کام نمٹا رہی تھیں۔ ایسے میں دھوم دھڑ کا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

راجا نے شروع شروع میں میرا بہت خیال رکھا لیکن تنگ دستی کے سبب وہ میری ناز برداری کرنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے بھی کبھی اس سے کوئی فرمائش نہیں کی بلکہ اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ میرے بہت سمجھانے پر اس نے وقتی طور پر پاکستان میں ہی ملازمت کرلی تاکہ چار پیسے ہاتھ میں آئیں لیکن وہ اس قلیل آمدنی سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے باہر کی کمائی کی عادت ہو چکی تھی۔ اس کی نظر میں چند ہزار روپے کیا حقیقت رکھتے تھے۔

اس مالی تنگی کی وجہ سے اس کے مزاج میں تلخی بڑھتی گئی۔ وہ دن بہ دن چڑچڑا ہوتا جارہا تھا۔ بات بات پر جھگڑنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اس کی یہ بدمزاجی رنگ لائی اور دو مہینے بعد ہی اسے کام سے جواب مل گیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہمت ہار کر گھر بیٹھ جائے لہٰذا اسے سمجھا بجھا کر دوسری ملازمت تلاش کرنے پر آمادہ کیا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا چند دنوں بعد ہی وہ دوسری جگہ کام پر لگ گیا لیکن یہ ملازمت بھی زیادہ دیر نہ رہ سکی اور وہ ایک بار پھر فارغ ہوگیا۔

اس کے بعد یہ ایک معمول بن گیا۔ وہ چند روز کسی

جگہ کام کرتا اور لڑ جھگڑ کر بیٹھ جاتا۔ مستقل آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں تنگی نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ راجا کی چاروں بہنوں کی شادی ہو چکی تھیں اور وہ سب برسرِ روزگار تھیں۔ وہی چوری چھپے ممانی کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھ دیتیں جس سے گھر کا چولہا جلتا رہتا۔ میں اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھی۔ پچھلی زندگی سے موازنہ کرتی تو شدید قسم کا پچھتاوا ہونے لگتا۔ جیدی صاحب کے گھر میں عیش و آرام کی زندگی گزار رہی تھی۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی پریشانی اور نہ ہی کوئی کہنے سننے والا تھا۔ یہاں تو دن بھر ممانی کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی تھی اور وہ اس تنگ دستی کا ذمے دار مجھے سمجھتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے منحوس ہونے کا طعنہ دیا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے راجا کو بتائے بغیر ایک قریبی اسکول میں ملازمت کر لی۔ راجا کو جب معلوم ہوا تو وہ غصے میں آگیا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ... میں عورتوں کے ملازمت کرنے کے سخت خلاف ہوں پھر بھی تم نے نوکری کر لی۔“

”کیونکہ اب مجھ سے یہ تنگی برداشت نہیں ہوتی۔“ میں نے بھی ترخ کر جواب دیا۔ ”جب تمہیں کوئی پکی نوکری مل جائے گی تو میں یہ جاب چھوڑ دوں گی۔“

”یہاں رہ کر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ گدھے کی طرح کام لیتے ہیں اور مہینے کے آخر میں چند نوٹ ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں۔ اوپر سے جھڑکیوں اور ڈانٹ ڈپٹ الگ سے سننے کو ملتی ہیں۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔“

”اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”باہر جانے کے لیے پیسے چاہئیں جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔ اس لیے تمہیں یہیں رہ کر انہی حالات میں کام کرنا ہوگا۔“

”ایک صورت ہو سکتی ہے اگر تم تعاون کرو تو......“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میری ایک ایجنٹ سے بات ہوئی ہے وہ ویزا لگوانے کے دو لاکھ مانگ رہا ہے۔ اگر تم مجھے وہ زیور دے دو جو جیدی نے تمہیں دیا تھا تو بات بن سکتی ہے میں چھ مہینے میں ہی تمہارے پیسے لوٹا دوں گا۔“

اس کی یہ بات سن کر میرے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں اور اس کا اصل چہرہ میرے سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے امی کی وہ نصیحت بھی یاد آئی کہ چاہے تم پر کوئی قیامت ہی نہ گزر جائے لیکن ان زیورات کو ہاتھ مت لگانا چنانچہ میں سنبھلتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو راجا! میرا تمہارا پیسا الگ نہیں اگر میرے پاس وہ زیور ہوتے تو ضرور دے دیتی لیکن جیدی نے وہ بھی مجھ سے واپس لے لیے تھے۔“

وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”بہت ہی گھٹیا انسان ہے یہ جیدی بھی۔ بھلا کوئی دی ہوئی چیز بھی واپس لیتا ہے۔“

میں معصوم بنتے ہوئے بولی۔ ”میں کیا کہہ سکتی ہوں جب اس نے بچہ اپنے پاس رکھ لیا تو زیور کیسے چھوڑ دیتا۔ اس نے مجھے آزاد کرنے کی پوری پوری قیمت وصول کی ہے۔“

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ صرف زیور ہی نہیں بلکہ مہر کی جو رقم جیدی صاحب نے مجھے دی تھی وہ میں نے امی کے پاس رکھوا دی تھی کیونکہ میں راجا کے حالات سے واقف تھی۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ جاتی تو چار دنوں میں سب اڑا دیتا اس دن کے بعد راجا کا رویہ بالکل بدل گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو دن رات میری محبت کا دم بھرتا تھا۔ اب وہ بات بات پر لڑنے لگتا تھا اور ممانی بھی اس کا ساتھ دیتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹوں نے مل کر میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ مجھ پر اتنا کٹھن وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ صبح چھ بجے اٹھ کر سب گھر والوں کے لیے ناشتا تیار کرتی۔ اپنے کپڑے استری کرتی اور ساڑھے سات بجے اسکول کے لیے نکل جاتی۔ ڈیڑھ بجے اسکول سے واپس آ کر کھانا بناتی۔ برتن دھوتی، گھر کی صفائی کرتی اور پھر شام کے کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ ممانی کو تو بغیر تنخواہ کی ماسی مل گئی تھی۔ ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ناشتے کے برتن ہی دھو دے دیتیں۔

ایک دن اسکول سے واپس آئی تو دیکھا کہ راجا ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ وہ دونوں میرے بیڈ روم میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں اتنا قریب دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں گرج کر بولی۔ ”یہ کون ہے اور میرے کمرے میں کیا کر رہی ہے؟“

راجا پر میرے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”اچھا ہوا تم بھی آگئیں۔ ان سے ملو یہ سلمٰی ہے۔ ان سے ہماری دور کی رشتے داری بھی ہے۔“

”لیکن تم نے اسے یہاں کیوں بٹھا رکھا ہے۔ مہمانوں کے لیے ڈرائنگ روم موجود ہے۔“

”یہ تکلف غیروں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تو ہماری اپنی ہے۔“

میرے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لیے پیر

بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ راجا ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں لاکھ برائیاں سہی لیکن وہ بے وفا نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر یہ سب کیا تھا جو میں نے دیکھا۔ اگر وہ لڑکی اس کی رشتے دار ہے تب بھی اسے پہلو میں بٹھا کر ہنس ہنس کر باتیں کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ میری آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹ چکا تھا اور راجا کا فریب پوری طرح کھل کر سامنے آچکا تھا۔ اس نے مجھ سے صرف اس لیے شادی کی تھی تاکہ جیدی صاحب کے دیے ہوئے مال پر عیش کرسکے لیکن جب اس کی امید پوری نہ ہوئی تو اس نے مجھے جوتے کی نوک پر رکھ لیا اور دوسری لڑکی سے راہ و رسم بڑھانے لگا۔ یقیناً اس میں بھی اس کی کوئی غرض شامل ہوگی۔

اب مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔ جیدی صاحب جیسے بھی سہی لیکن انہوں نے مجھے پھولوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ ان میں ایک کمزوری کے علاوہ کوئی خامی نہیں تھی۔ میں نے ان کے ساتھ جو وقت گزارا وہ میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ انہوں نے مجھے عیش و آرام ہی نہیں دیا بلکہ وہ میرے محسن بھی تھے۔ انہی کی وجہ سے میرے بھائی آج اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ میں نے ہی ان کی قدر نہیں کی اور راجا کے بہکاوے میں آکر جنت سے نکل کر جہنم میں آگئی۔ حالانکہ دنیا میں نہ جانے کتنی عورتیں ہوں گی جو ہر طرح کے مردوں کے ساتھ گزارہ کرتی ہیں۔ مجھے بھی چاہیے تھا کہ ایک وفا شعار بیوی کی طرح بقیہ زندگی صبر و سکون سے گزار دیتی لیکن مجھ پر تو محبت کا بھوت سوار تھا۔

سلمٰی کے جانے کے بعد راجا نے میری بہت بے عزتی کی۔ وہ غصے سے پاگل ہورہا تھا۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس سے یہ گستاخی برداشت نہ ہوسکی اور اس نے شادی کے بعد پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا اگر ممانی بیچ میں نہ آجاتیں تو وہ میری اچھی طرح دھنائی کرتا۔ وہ بکتا جھکتا باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ممانی نے الٹا مجھ کو ہی الزام دے دیا اور بولیں۔ ’’عورت کو تھوڑا سا برداشت سے کام لینا چاہیے اگر اس نے سلمٰی سے دو باتیں کرلیں تو کون سی قیامت آگئی۔ تمہیں اس طرح اس کی بے عزتی نہیں کرنا چاہیے تھی۔‘‘

ان کی بات سن کر مجھے غصہ آگیا اور بولی۔ ’’کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ سلمٰی کہاں سے دریافت ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کا نام سنا۔‘‘

’’یہ میرے دور پرے کے رشتے دار علی خان کی بیٹی ہے۔ بہت امیر لوگ ہیں۔ ان کا لوہے کا کاروبار ہے۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ چند روز پہلے ایک شادی میں ملے تو بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ ان کی بیوی اور بیٹی بھی بہت اچھی عادت کی ہیں۔ اس کے بعد سے ہی ان لوگوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ سلمٰی تھوڑی سی آزاد خیال ہے اس لیے مردوں سے جلدی بے تکلف ہوجاتی ہے۔‘‘

’’مجھے تو وہ ضرورت سے زیادہ آزاد اور بے باک لگ رہی تھی۔ ورنہ کوئی بھی لڑکی کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح لگ کر نہیں بیٹھتی۔‘‘

’’تم تو بلاوجہ شک کررہی ہو۔‘‘ ممانی نے کہا۔ ’’آج کل ایسی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اب راجا سے کچھ مت کہنا۔ وہ ویسے ہی بہت پریشان ہے۔‘‘

مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ راجا نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ شام کو وہ دیر سے گھر آیا میں نے کھانے کو پوچھا تو اس نے منع کردیا اور بولا۔ ’’کمرے میں آؤ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔‘‘

میں اپنے کاموں سے فارغ ہوکر کمرے میں گئی تو وہ خاصا بے چین اور مضطرب نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ’’میری بات ٹھنڈے دل سے سننا اور جب تک اپنی بات پوری نہ کرلوں تم بیچ میں مت بولنا۔ اس کے بعد میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔‘‘

’’کہو میں سن رہی ہوں۔‘‘

’’آج تم نے جو کچھ دیکھا اس پر تمہاری ناراضی بجا ہے لیکن شازیہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ حالات اب میرے قابو سے باہر ہوچکے ہیں۔ اس لیے سلمٰی سے راہ و رسم بڑھانا میری مجبوری ہے۔ اس کا باپ کروڑ پتی شخص ہے اور اگر میں سلمٰی سے شادی کرلوں تو وہ کوئی کاروبار شروع کرنے میں میری مدد کرسکتا ہے۔ اس کے لیے پانچ دس لاکھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ شازیہ تم میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو میں نوکری نہیں کرسکتا چاہے وہ پاکستان میں ہو یا دبئی میں۔ میرے لیے اپنا کاروبار ہی بہتر ہے۔ جس میں کوئی مجھ پر حکم چلانے والا نہ ہو اور میں ایک آزاد پنچھی کی زندگی بسر کرسکوں لیکن یہ خواب صرف سلمٰی سے شادی کرنے کی صورت میں ہی پورا ہوسکتا ہے۔‘‘

’’کیا اس نے تمہیں کوئی یقین دہانی کرائی ہے؟‘‘

’’زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اشاروں

میں بتا دیا ہے کہ اس کا باپ ضرور میری مدد کرے گا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تم سے شادی کیوں کرے گی؟ کیا اسے اپنے ہم پلہ کوئی لڑکا نہیں مل رہا؟''

وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔''یہ دل کے فیصلے ہیں تم نے بھی تو مجھ سے شادی کی تھی۔''

''میری بات رہنے دو۔ میں تو تمہاری محبت میں پاگل ہوگئی تھی۔''

''کچھ یہی حال اس کا بھی ہے بلکہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے جل کر پوچھا۔

''تم مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دو۔ تمہاری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور تم پہلے کی طرح میرے دل پر راج کرتی رہو گی۔''

''اور اگر میں اجازت نہ دوں تو؟''

''تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ کیونکہ مجھے ہر حال میں سلمٰی سے شادی کرنی ہے اور اس کی وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''میں کسی صورت تمہیں دوسری شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہارا دل جو چاہے وہ کرو۔''

''اچھی طرح سوچ لو... دو دفعہ کی طلاق یافتہ عورت کو کوئی نہیں پوچھے گا۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ جن عورتوں کی شادی نہیں ہوتی وہ بھی زندگی گزار لیتی ہیں۔''

میرا خیال تھا کہ ممانی اس معاملے میں میرا ساتھ دیں گی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ آگ انہی کی لگائی ہوئی تھی۔ وہ شروع دن سے ہی میرے خلاف تھیں اور چاہتی تھیں کہ راجا کی شادی کسی ایسی لڑکی سے ہوجائے جس کا باپ بہت سا جہیز دینے کے ساتھ ساتھ اس کی مالی مدد بھی کرسکے۔ سلمٰی کو بھی انہوں نے ہی دریافت کیا تھا اور اب اسے بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

راجا کئی روز تک میری منت سماجت کرتا رہا کہ میں اسے دوسری شادی کی اجازت دے دوں کیونکہ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اس کی پہلی محبت تھی جس سے آدمی اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہوتا لیکن میں اپنی محبت میں کسی کی شراکت نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے راجا سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے سلمٰی سے شادی کرنی ہے تو پہلے مجھے طلاق دے دے۔ میں کسی بھی صورت میں اسے دوسری شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔

میرا خیال تھا کہ اس دھمکی کے بعد وہ اپنے ارادے سے باز آجائے گا لیکن اس کی آنکھوں پر تو لالچ کی پٹی بندھ چکی تھی چنانچہ اس نے مجھے طلاق دے دی اور میں ایک بار پھر میکے کی دہلیز پر آن بیٹھی۔ ایک بار پھر تنہائی میرا مقدر بن گئی۔ جیسے تیسے عدت کے دن پورے کیے اور دوبارہ ملازمت کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اب مجھے اپنا بیٹا عامر بہت یاد آرہا تھا۔ جیدی صاحب نے طلاق دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں جب چاہوں اس سے مل سکتی ہوں لیکن راجا سے شادی کرنے کے بعد میں اپنے بیٹے کو بالکل بھول گئی تھی۔ میں نے بھائیوں سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں جیدی صاحب سے بات کریں۔

اس روز میں گھر میں تنہا تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو جیدی صاحب عامر کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے بے اختیار عامر کو سینے سے لگا لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔ جیدی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔''عامر تمہیں بہت یاد کرتا ہے کیا تم اس کی خاطر دوبارہ میری زندگی میں آنا پسند کرو گی۔'' مجھے یوں لگا جیسے تپتی دھوپ میں کسی بادل کا سایہ مل گیا ہو۔ میں نے سر جھکا لیا تو وہ بولے۔''شام کو تمہارے گھر والوں سے بات کرنے آؤں گا۔''

پھر سب معاملات بڑی آسانی سے طے ہوگئے اور میں ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی جنت میں واپس آگئی۔ اس تجربے سے مجھے سبق ضرور مل گیا کہ عورت کو دوسری شادی راس نہیں آتی۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ بقیہ زندگی تنہا گزار دے۔ ہاں راجا کے بارے میں بتانا تو بھول ہی گئی جب ممانی اس کا رشتہ لے کر سلمٰی کے گھر گئیں تو اس کے باپ نے انہیں یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ انہیں اتنی بڑی بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ کہاں راجا اور کہاں سلمٰی۔ یہ تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے والی بات ہے۔ ممانی اپنا سا منہ لے کر واپس آگئیں اور راجا بھی راندۂ درگاہ ہوکر آوارگی کی زندگی بسر کررہا ہے۔ وہ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ میں نے امی کے گھر جانا بھی کم کردیا ہے تاکہ اس سے سامنا نہ ہو۔ میں ایسے لالچی اور خود غرض انسان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ دوسری لڑکیوں کو بھی یہی کہوں گی کہ وہ راجا جیسے مردوں کی باتوں میں آکر اپنا گھر برباد نہ کریں۔

AA

ری کوری

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ گزرا ہے جس نے مجھے حد درجہ ذہنی خلجان میں مبتلا کردیا تھا۔ یقین کریں میں خودکشی کرلینے کا سوچنے لگا تھا۔ اسی واقعے کو میں نے ذرا الگ انداز سے مزاح کا پہلو لے کر تحریر کیا ہے۔ یعنی 60 فیصد سچ اور 40 فیصد بناوٹ ہے اس تحریر میں، وقت گزارنے کے لیے اچھی کہانی سمجھ کر ہی اسے شائع کردیں۔
زہیب علی
(کراچی)

یہ کہانی تخیلاتی نہیں کیونکہ کچھ دنوں کے بعد ایسا ہی ہونے والا ہے۔

میں نے اپنے رقیب کی زندگی عذاب کر کے رکھ دی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ خودکشی کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا ہے۔

ابتدا اس دن سے ہوئی جب فروزاں نے مجھ سے کہا ''نوید، ہوسکتا ہے کہ تم سے میری شادی نہ ہوسکے۔''

''کیوں؟'' میں اس کی بات سن کر سناٹے میں رہ گیا تھا ''شادی کیوں نہیں ہوسکتی؟''

''اس لیے نہیں ہوسکتی کہ تم ایک بے روزگار نوجوان ہو اور خالد ایک پیسے والا آدمی ہے۔''

''کون خالد؟''

''وہی جس کا رشتہ میرے لیے آیا ہے۔'' فروزاں نے بتایا۔

''نہیں فروزاں، ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کہا ''میں تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، میں نے برسوں سے تمہاری محبت کی آبیاری کی ہے۔ اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ تمہیں ہر دم اپنی سانسوں میں شامل رکھا ہے۔ پھر میں کس طرح تم سے الگ ہونے کا تصور کرلوں۔''

''تو پھر خدا کے لیے فوری طور پر کوئی نوکری تلاش کرو، ورنہ مصیبت ہوجائے گی۔''

لیکن پتا نہیں نوکری کہاں چھپ گئی تھی، میں تو تلاش کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ میری تعلیم بھی اچھی تھی۔ کمپیوٹر بھی جانتا تھا۔ اس کے باوجود جاب کہیں نہیں مل رہی تھی۔

نہ جانے کتنی جگہ انٹرویو دے چکا تھا۔ کہاں کہاں نہیں اپنی C.V ڈراپ کر آیا تھا۔ اس کے باوجود کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

کوئی کاروبار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور مالی حالات ایسے تھے کہ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑتے جارہے تھے اور ایسے میں فروزاں نے بھی یہ خبر سنادی تھی کہ کوئی خالد نام کا شخص میرے اور اس کے درمیان آنے کی کوشش کررہا ہے۔

میں بہت بددل اور اداس ہو کر ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ کوئی سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وہ مخلوق تھی جو عام طور پر سگنل وغیرہ کے پاس یا مارکیٹ میں تالیاں بجاتی دکھائی دیتی ہے یعنی خواجہ سرا۔

لیکن دوسرے خواجہ سراؤں کی نسبت یہ کچھ مہذب اور اسمارٹ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بھی خود سے میری طرف دیکھا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے پوچھا ''ہائے ہائے' کیوں اتنے اداس بیٹھے ہو' خیریت تو ہے نا۔''

''ہاں ہاں۔'' میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''ارے ذرا مسکرا کر تو بات کرلو۔'' اس نے کہا ''میں بھی انسان ہوں' آسمان سے نہیں اتری ہوں۔ بتاؤ گے تو ہوسکتا ہے تمہارے کام بھی آجاؤں۔''

''تم کیا کام آؤ گے؟''

''ارے کسی کو بے کار مت سمجھو۔'' وہ مٹک کر بولا ''کبھی کبھی راستے کا پتھر بھی کام آجاتا ہے۔''

''میں بے روزگار ہوں' اب بتاؤ' تم میرے لیے کیا کرسکتے ہو؟''

''ارے' میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔'' اس نے پھر مٹک لگائی ''اس لیے شکل ایسی ہو رہی ہے۔ تو اس کے لیے اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہمارے ساتھ آجاؤ۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''ارے میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' پھر وہ آگے کی طرف جھک کر بولا ''بھائی جان۔ میں بالکل صحیح ہوں۔ نارمل انسان ہوں' پڑھا لکھا۔''

''تو پھر...... یہ سب......؟''

''روزگار!'' وہ اپنی ایک آنکھ دبا کر بولا ''تم یقین کرو' روزانہ کے پانچ چھ سو روپے کمالیتا ہوں۔''

''شرم نہیں آتی تمہیں؟''

''کیسی شرم! میرے دوست' انسان کو جب بھوک ستانے لگے نا تو پھر اس کے لیے شرم وغیرہ کی اصطلاح ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔ اسے صرف اپنی بقا کا خیال ہوتا ہے۔ میں بھی بہت شرم کرتا تھا اور گھر والے بھوکے مرتے تھے لیکن اب سب خوش ہیں' اطمینان سے ہیں۔''

''کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ تم یہ سب کرتے پھر رہے ہو؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے کہا ''اس گیٹ اپ میں کون پہچانے گا۔ میں درجنوں بار خود ان کے سامنے سے گزرا ہوں لیکن انہیں شبہ بھی نہیں ہوا ہے۔ تم بھی شروع ہوجاؤ۔ کون یہ دیکھنے جا رہا ہے کہ تم کس دفتر میں کام کرتے ہو۔ دن بھر میں اچھا خاصا کمالیتا۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''ویسے تو ظفر نام ہے لیکن ان لوگوں میں چنبیلی کہلاتی ہوں۔''

میں اس کی بات پر واقعی سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ جب جاب ہی نہیں مل رہی تو پھر اور کیا راستہ تھا میرے پاس۔ دوسرے طرف وہ فروزاں بھی ہاتھ سے نکلتی جارہی تھی۔

''ہائے ہائے' کیا سوچنے لگے؟'' اس کی آواز نے چونکا دیا۔

''ٹھیک ہے' میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔''

''میرا ساتھ نہیں' بلکہ خود اپنا ساتھ۔ اب آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں ٹریننگ سینٹر لیے چلتا ہوں۔''

ٹریننگ سینٹر بھی بہت کمال کی جگہ تھی۔

کئی کمرے تھے' گیٹ اپ وغیرہ کا پورا انتظام تھا۔ ایک استاد بھی تھا۔ جو نئے آنے والوں کو ٹریننگ دیا کرتا۔ اس طرح تالیاں بجانی ہیں' اس طرح چلنا ہے۔ اس طرح میک اپ کرنا ہے۔ اس طرح کی ڈریسنگ کرنی ہے۔

پھر لہجے کی ٹریننگ ہوتی۔ خاص قسم کے جملے سکھائے جاتے۔ انسانی نفسیات بتائی جاتی۔ چہرہ شناسی کی تعلیم ہوتی۔ غرضیکہ وہ باقاعدہ ایک درسگاہ تھی۔

وہاں کئی نوجوان تھے۔ ان میں سے کچھ تو اوریجنل تھے اور کچھ مجبوری اور ضرورت کے تحت ایسے بنے تھے۔

ان سبھوں نے بہت والہانہ طور پر میرا استقبال کیا تھا۔ ان کے درمیان پہنچ کر احساس ہوا تھا کہ ان کی دنیا منافقت کی نہیں ہے جبکہ باہر کی دنیا میں سوائے منافقت کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ایک ہفتے کی ٹریننگ ہوئی تھی میری۔

اس دوران میں ایک بار پھر فروزاں سے ملا۔ وہ بہت اداس تھی۔ خالد بہت تیزی سے اس کے گھر والوں کے قریب آتا جا رہا تھا اور فروزاں کے گھر والے اس شادی کے لیے تیار بھی ہوگئے تھے۔

''فروزاں۔ اب تو مجھے جاب بھی مل گئی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''مبارک ہو تمہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی ''لیکن شاید اب بہت دیر ہوچکی ہے۔ اب میں گھر والوں کو مزید نہیں روک سکتی۔''

اور کچھ دنوں کے بعد اس کا فون آیا کہ خالد سے اس کی شادی ہوگئی ہے۔ اس دن میں بہت اداس تھا۔ میرا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس موقع پر پھر ظفر عرف چنبیلی نے مجھ سے کہا ''میری جان۔ یہ سب زندگی کے مختلف رنگ اور مختلف کھیل ہیں۔ تمہیں ان ہی کے درمیان زندہ رہنا ہے۔''

''لیکن کس لیے' محبت تو چلی گئی۔''

''تم محبت کو اتنا محدود کیوں کررہے ہو۔ تمہارے گھر والے بھی تو ہیں۔'' اس نے کہا ''تم ان کی طرف دھیان دو۔''

وہ بہت دیر تک سمجھاتا رہا تھا۔ بالآخر اس کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

فروزاں کو میں اپنے دل سے بھلا تو نہیں سکتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں نے وقت سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ایک ہفتے کی ٹریننگ کے بعد مجھے ایک سگنل دے دیا گیا تھا جہاں کھڑے ہوکر مجھے اپنی کاریگری دکھانا تھی۔

شروع شروع میں بہت شرم آئی تھی۔ کچھ بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ تالیاں بجاتے ہوئے اپنے آپ سے شرم ساری ہونے لگتی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جھجک ختم ہوتی چلی گئی۔

میں اب پرفیکٹ ہونے لگا تھا۔ انکم بھی اچھی خاصی ہوگئی تھی۔ میں ذہین بھی تھا اسی لیے چہرہ شناسی کرکے وہی جملے بولا کرتا جن سے متاثر ہوکر آنے جانے والے کچھ دے دیا کرتے تھے۔

میرا نام مالتی رکھا گیا تھا۔ سب مجھے مالتی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

ایک شام سگنل پر ایک گاڑی آکر رکی۔ اس میں فروزاں اپنے شوہر خالد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے پہلی دفعہ اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ ایک موٹا اور بھدا سا شخص تھا لیکن کیونکہ وہ پیسے والا تھا' اس لیے فروزاں جیسی لڑکی کو اس نے حاصل کرلیا تھا۔

اور میں فروزاں سے محبت کرنے والا سگنل پر کھڑا خواجہ سرا بنا ہوا بھیک مانگ رہا تھا۔ کتنا فرق تھا۔ یہ پیسا بھی خود میں کتنی طاقت رکھتا ہے۔ ساری ویلیوز' ساری محبتیں اس کے سامنے دم توڑ دیتی ہیں۔

انتہا یہ ہوئی تھی کہ خود فروزاں نے بھی مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اس نے پچاس کا ایک نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا کیونکہ میں نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ خدا اس جوڑی کو سلامت رکھے بلکہ یہ کہا تھا کہ خدا اس کی محبت کو سلامت رکھے۔ ہوسکتا ہے کہ محبت کے حوالے پر اسے میری یاد آگئی ہو۔

اب اچھی خاصی انکم ہونے لگی تھی۔ گھر والے بھی خوش تھے۔ ظاہر ہے ان کو یہ نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ میں کیا کام کرتا پھر رہا ہوں۔

ایک دن ظفر عرف چنبیلی نے مجھ سے کہا ''ارے مالتی' تیرے لیے ایک بہت زبردست خبر ہے۔''

''وہ کیا؟''

''بینک والے اپنے قرضوں کی وصولی کے لیے ہم خواجہ سراؤں کو ملازمتیں دے رہے ہیں۔''

''اچھا!''

''ہاں' چلا جا۔ ہوسکتا ہے تجھے نوکری مل جائے۔''

اور مجھے واقعی ایک بینک میں نوکری مل گئی۔ کام وہی تھا' ریکوری۔ مجھے لوگوں کے پاس جاکر ان سے رقم کی واپسی کا تقاضا کرنا تھا۔

اور یہ کیسا اتفاق تھا کہ جو پہلا کیس مجھے ملا' وہ اسی خالد کا تھا۔ وہ بینک سے اسی لاکھ روپے لے کر بیٹھ گیا تھا۔ خالد کا سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔

اب میں اس سے اپنی محبت کا بدلہ لے سکتا تھا۔ میں دوسرے ہی دن اپنے چند ساتھیوں کو لے کر اس کے شاندار مکان کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میرے ساتھی اپنے ساتھ ڈھول وغیرہ بھی لیتے آئے تھے۔ ''ہائے ہائے' اری رضیہ! یہ تو پیسے لے کر بیٹھ گیا ہے۔''

''ہاں ری مالتی' قرضہ واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔''

اس کے بعد پھر دھما دھم ڈھول۔ پھر آوازیں ''اری چنبیلی' ایسے آدمی کا کیا کریں؟''

''اس کو شرم دلاؤ مالتی!''

پھر ڈھول کی آوازیں۔ بالآخر خود خالد ہی جھلا کر گیٹ پر آگیا تھا ''کیا بدتمیزی ہے۔ کون ہو تم لوگ؟''

''ارے' ہم تو بینک کی طرف سے آئے ہیں' پیسے وصول کرنے۔''

''ارے گلابو دیکھ تو سہی' کیسی بے شرمی کے ساتھ سامنے کھڑا ہوا ہے۔''

''ہائے رے رضیہ! اس کو ذرا ناچ کر تو دکھا۔''

''خاموش!'' خالد گلا پھاڑ کر چیخا ''چلے جاؤ تم لوگ ورنہ......''

''ارے چنبیلی دیکھ تو سہی' ایک تو پیسے لے کر بیٹھ گیا ہے اوپر سے آنکھیں دکھا رہا ہے۔ ہائے ری بے شرمی!''

پھر دھما دھم ڈھول۔ اور اس کے بعد خالد کی جھلاہٹ' غصہ لیکن وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ہمیں بینک نے بھیجا تھا۔ ہم کوئی غنڈہ گردی نہیں کررہے تھے' صرف پیسوں کی واپسی کا تقاضا کررہے تھے اور مجھے امید ہے کہ وہ یا تو پیسے واپس کردے گا یا خودکشی کرلے گا۔

ہیں کواکب......

محترم مدیر
السلام علیکم
سرگزشت پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق در آیا ہے اور اپنی ہی زندگی کا ایک اہم واقعہ قلم بند کررہا ہوں۔ میری زندگی میں "اس" لڑکی نے کس طرح "انٹری" کی اسی کو اس کہانی کا مرکزی نقطہ بنایا ہے اور وہ بات سب سے شیئر کررہا ہوں جو زندگی کا اہم نکتہ ہے۔ کہانی کو جاندار بنانے کے لیے میں نے جملوں کی تعداد بڑھائی ہے یعنی گھڑی ہے لیکن واقعہ سو فیصد سچا ہے۔ آپ میرے محلے کے کسی بھی شخص سے معلوم کر سکتے ہیں۔

طارق عثمانی
(کراچی)

اچانک کسی نے بڑی بے تکلفی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ قبول صورت، اسمارٹ، اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس چوبیس برس کی ہوگی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اسے نہیں جانتا تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھی۔
''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''کس طرف نکل جاتے ہیں۔ میں آپ کو

ڈھونڈتی ہوئی پچھلی طرف چلی آئی تھی۔"
یقیناً اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہہ سکتا۔ وہ میرے اور قریب آگئی اور دھیرے سے بولی۔ "پلیز۔ آپ اس طرح پوز کریں جیسے آپ میرے شوہر ہیں۔ پلیز میں اس وقت خطرے میں ہوں۔"

اس نے یہ بات اس طرح کی کہ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "چلیں نا۔" اس بار اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔ پہلے کچھ کھالیں اس کے بعد شاپنگ کرتے ہیں۔" اس نے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ "ہوٹل سامنے ہی تو ہے۔"

اس نے جیسے مجھے ہوٹل کی طرف کھینچنا شروع کردیا تھا۔ میں حیرت زدہ سا اس کے ساتھ چل پڑا۔ بے شمار اندیشے بن گئے۔ خوف بھی تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش گوار سا احساس بھی ہو رہا تھا۔

وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ وقت گزارا جاسکتا تھا۔ لیکن اس طرح یہ میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ ساتھ ہی کچھ کہانیاں بھی یاد آرہی تھیں کہ لڑکیاں اس طرح اُلو بنا کر لوٹ لیا کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود میں جیسے ٹرانس کے عالم میں اس کے ساتھ ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

وہ ایک صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ وہاں فیملی آکر بیٹھا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک مشہور شاپنگ سینٹر کے برابر میں تھا۔

"معاف کیجیے گا۔" اس نے ہوٹل آکر معذرت کی۔ "میری وجہ سے آپ پریشان ہوگئے لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"محترمہ میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں اور آپ اس طرح مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔"

"میرا نام سویرا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں شاپنگ کرنے آئی تھی کہ کچھ غنڈے میرے پیچھے لگ گئے۔ خدا جانے کیا ہوگیا ہے۔ جہاں کوئی لڑکی اکیلی نظر آئی یہ کمینے لوگ اپنی کمینگی دکھانے لگتے ہیں۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں کسی کو ایسا ظاہر کروں جیسے وہ میرے ساتھ ہے۔ ویسے تو بہت سے لوگ تھے لیکن آپ مجھے بھروسے کے قابل نظر آئے اس لیے میں آپ کے پاس آگئی۔"

بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے پھر کہا۔ "میں کچھ وقت گزار کر چلی جاؤں گی۔ اس وقت تک وہ غنڈے بھی جاچکے ہوں گے۔ ایک بار پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔"

"نہیں......نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ورنہ اس قسم کے غنڈے اسی طرح پریشان کرتے رہتے ہیں۔"

"حالانکہ میں اکثر مارکیٹ کی طرف آیا کرتی ہوں لیکن ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہوا ہے۔"

"ہوجاتا ہے۔ کمینگی حد سے زیادہ ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تم کچھ دیر اطمینان سے بیٹھو، اس کے بعد چلی جانا بلکہ اگر برا نہ مانو تو میں تمہیں پہنچادوں گا۔"

"اس میں برا کیا ماننا، آپ کا تو احسان ہوگا۔"

میں نے اس کے لیے چائے اور بسکٹ وغیرہ منگوائے۔ جس وقت میں نے اسے پہلی بار دیکھا اس وقت وہ بہت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی لیکن اب وہ آہستہ آہستہ پرسکون ہوتی جارہی تھی۔

"نام کیا ہے آپ کا؟" اس نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔

"طارق۔" میں نے بتایا۔ "ایک فرم میں ملازمت کرتا ہوں۔ جب کہ رہائش ناظم آباد میں ہے۔"

"او یعنی پاپوش نگر سے قریب۔"

"بہت قریب......تم بتاؤ؟" میں نے پوچھا۔

"فریحہ نام ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہم دو بہنیں ہیں۔ میں کالج میں ہوں مجھ سے چھوٹی ابھی میٹرک میں ہے۔"

"اور بقیہ لوگ۔"

"ہاں والد صاحب ہیں، دو بھائی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔"

بس اس دن ہمارے درمیان اسی قسم کی رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور ممکن تھا کہ آخری بھی ہو۔ کیونکہ وہ لڑکی راستے میں آٹکرائی تھی۔ اس کے علاوہ اس سے اور کیا تعلق ہوسکتا تھا۔

"میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" اس نے چائے ختم کرنے کے بعد کہا۔ "آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ کیا میں آپ کا موبائل نمبر لے سکتی ہوں۔"

"وہ کیوں۔"

"بس یوں ہی۔ کبھی آپ سے بات کرنی ہوئی تو

کرلوں گی۔''

''ضرور۔'' میں نے اسے اپنا موبائل نمبر بتا دیا۔ اس طرح اس نے بھی اپنا نمبر دے دیا تھا۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ کم بخت بھی مایوس ہو کر چلے گئے ہوں گے۔''

''ظاہر ہے۔ پھر بھی احتیاطاً میں تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا۔''

اس کا گھر وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود اس نے اصرار کیا کہ پیدل ہی چلنا چاہیے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ہم پیدل ہی چل پڑے۔

اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پُرجوش اور پُراعتماد دکھائی دے رہی تھی۔ ہوٹل میں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک خوش مزاج لڑکی ہے۔ بلکہ اس میں حسِ مزاح بھی تھی جو آج کل کم ہی لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش یہ ملاقات آخری نہ ہو بلکہ وہ مجھے فون کرتی رہا کرے۔

پاپوش نگر کی ایک گلی میں اس کا ایک منزلہ مکان تھا۔ اس نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں یہاں رہتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دی۔

میں اپنے گھر واپس آگیا۔ یہ ناگہانی واقعہ بھی کتنا خوشگوار تھا۔ اس سے پہلے زندگی میرے اتنے قریب کہاں آئی تھی۔

انسان بھی کیا ہوتا ہے۔ جنس مخالف میں کیسی کشش محسوس کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے سرینڈر کر جاتا ہے۔

بہرحال یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کو میں کئی دنوں تک بھلا نہیں پایا۔ دل میں آیا کہ ایک بار اس کے گھر جا کر اس سے مل لوں لیکن اس کے یہاں جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ آخر کیوں! وہ بھی یہی کہتے کہ ایک بار ملاقات کیا ہوئی کہ پیچھے ہی پڑ گئے بس یہی سوچ کر میں اس کے گھر نہیں گیا۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کا فون آگیا۔ وہ میری خیریت دریافت کر رہی تھی اور وہ خود بھی ملنا چاہتی تھی۔ میں نے یوں ہی شرارت کے انداز میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں پھر کوئی تنگ کر رہا ہے۔''

''شاید نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اس دن کے بعد سے تو وہ لوگ دکھائی نہیں دیے۔ حالانکہ میں اپنی بہن کے ساتھ دو دفعہ اس مارکیٹ کی طرف جا چکی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ یہ انگور کھٹے ہیں۔''

''ہاں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہرحال آج شام کو ہم وہیں ملتے ہیں جہاں ہم نے چائے پی تھی۔''

''ضرور، میں آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ اس ہوٹل میں پہلے سے میرے انتظار میں تھی۔ آج بھی ہم نے چائے پی۔ آج وہ کچھ اور بھی طرح دار دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس وقت میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ یہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

میری یہ کمزوری رہی ہے کہ مجھے ایسی لڑکیاں یا مرد اچھے لگتے ہیں جن میں حسِ مزاح ہو۔ جو کسی اشارے کی بات کو فوری طور پر سمجھ لیتے ہوں۔ کند ذہن لوگ مجھے کبھی پسند نہیں آئے۔

اس دن ہم نے بہت دیر تک باتیں کیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں اور بھی واقفیت ہوئی۔ ایک دوسرے کی پسند و ناپسند کے بارے میں معلوم ہوا۔

باتوں باتوں میں اس نے ایک عجیب بات بتائی۔ ''میں آپ کو بتاؤں کہ میں شادی شدہ ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''فیاض میرے ابو کا دوست تھا۔ ابو چاہتے تھے کہ وہ میرا جیون ساتھی بن جائے۔ وہ امریکا میں رہتا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فون پر ہمارا نکاح ہوگیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ فون پر نکاح کیسے ہوسکتا ہے۔ دونوں طرف گھر والے بیٹھے رہتے ہیں۔ دونوں طرف نکاح پڑھانے والے ہوتے ہیں۔ ایجاب و قبول کی ساری رسمیں فون پر ہو جاتی ہیں۔''

''ہاں جانتی ہوں میں۔'' میں نے کہا۔

''اس طرح ہم نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ نکاح کے بعد دونوں گھروں میں دعوت ہوئی۔ امریکا میں

بھی اور پاکستان میں بھی۔ اس کے بعد کاغذات کی تیاری کا مرحلہ شروع ہوا۔ فیاض کو پاکستان آکر مجھے اپنے ساتھ لے جانا تھا لیکن......''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ اس وقت وہ بہت دکھی سی دکھائی دے رہی تھی۔

''ہاں بتاؤ فریحہ، پھر کیا ہوا۔''

''پھر یہ ہوا کہ میں رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی۔'' اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اٹھا دی۔ اس کا لہجہ بہت سخت ہو رہا تھا۔ ''پتا نہیں کیوں کچھ لوگوں کو خوشیاں راس ہی نہیں آتیں۔ شاید میں بھی ان میں سے ایک ہوں بے چارہ فیاض پاکستان آنے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ تو میں ایسی بیوہ ہوں جو اپنے شوہر کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکی۔''

''اوہ یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔'' مجھے یہ سن کر واقعی افسوس ہوا تھا۔ اس کے دل میں بھی کیسے کیسے ارمان ہوں گے مگر سب خاک میں مل گئے تھے۔

''اس کے بعد میرے ساتھ اور بھی برا ہوا طارق صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''موت تو فیاض کو آئی تھی لیکن دیکھا جائے تو میں مرگئی کیونکہ مجھے خاندان میں، محلے میں عجیب نگاہوں میں دیکھا جانے لگا۔''

''ارے......وہ کیوں!''

''اس لیے کہ بقول ان کے میں منحوس ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''جو رخصتی سے پہلے اپنے شوہر کو کھا گئی۔ انتہا یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن کو بھی مجھ سے دور رکھا جاتا ہے کہ کہیں میرا سایہ اس پر نہ پڑجائے۔''

''لعنت ہے یہ کیسی جہالت ہے۔''

''بس یہی جہالت ہے طارق صاحب کہ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو رہی ہے جب کہ میں اپنے دکھوں کو چھپائے ہوئے ہنستی بولتی رہتی ہوں۔''

''واقعی تم سے مل کر کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا کہ تمہارے ساتھ ایسا ہو رہا ہوگا۔''

''معاف کیجیے گا۔ میں نے دوسری ہی ملاقات میں اپنے بارے میں آپ کو بہت کچھ بتا دیا ہے۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔''

''نہیں میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا۔ میں تو ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو تمہارے لیے ایسا خیال کرتے ہیں۔''

''ہونہہ۔'' اس نے تلخی سے منہ بنایا۔ ''اور ایسا سلوک کرنے والے کوئی غیر نہیں میرے اپنے ہیں۔ میرے دونوں بھائی خاص طور پر میری پھوپیاں، میر خالائیں وغیرہ۔

''اور تمہارے والدین، ان کا کیا رویہ ہے؟''

''ان کا رویہ پوری طرح سامنے تو نہیں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ان کی اولاد ہوں وہ میری اس بے گناہی پر مجھ سے نفرت کیسے کرسکتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اندیشے ان کو بھی ہیں۔ اس لیے چھوٹی بیٹی کو مجھ سے دور رکھا جاتا ہے جب کہ وہ بے چاری محبت میں بھاگ بھاگ کر میرے پاس آجاتی ہے۔''

''یہ کیسی خواب بھری زندگی ہے تمہاری۔''

''اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ بہرحال جو کچھ قسمت میں ہوتا ہے اس کو تو کوئی ٹال نہیں سکتا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

کچھ دیر اور اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ اجازت لے کر چلی گئی۔ اس بار وہ اکیلی ہی گئی تھی۔ جب کہ میں اس کے جانے کے بعد بھی وہیں بیٹھا رہا۔

پھر ایک آدمی میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ''اگر برا نہ مانیں تو میں کچھ دیر کے لیے یہاں بیٹھ جاؤں۔'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ یہ ایک ہوٹل ہے یہاں کوئی بھی بیٹھ سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ آپ کا۔''

وہ مجھے ایک معقول آدمی دکھائی دیا تھا۔ اس نے کپڑے بھی بہت سلیقے کے پہن رکھے تھے۔ میں عام طور پر کسی سے ملتے وقت ان چیزوں پر ہی دھیان دیتا ہوں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کی مکمل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔

''کیا زمانہ آگیا ہے جناب۔'' کچھ دیر بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اگر آپ پریشان نہ ہوں تو میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ بتا دوں۔''

''ضرور بتائیں۔'' مجھے بھی اس کی باتوں میں دل چسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ دیکھوں تو میں، وہ کیا چاہتا تھا۔ ویسے اب میں اس کی طرف سے ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں اس قسم کے کئی کردار پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اپنے اصل موضوع پر آجاتے ہیں۔ کیا بتاؤں

جناب! چھ مہینوں سے بے روزگار ہوں۔ زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔ شریف آدمی ہوں۔ کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں۔ ان میں سے چند ہی واقعی ضرورت مند ہوتے ہوں گے ورنہ عام طور پر پروفیشنل ہی ہوتے ہیں۔

لیکن یہ شخص بظاہر پروفیشنل نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے دوبارہ کہا۔ ''چلیں جناب بتائیں کیا واقعہ ہے۔''

''واقعہ یہ ہے بھائی کہ ایک شام مارکیٹ سے باہر نکل رہا تھا کہ اچانک ایک لڑکی آ ٹکرائی۔'' اس نے کہا۔

''کون جا رہا تھا۔ کس کی بات کر رہے ہیں۔''

''وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ایکس وائی زیڈ۔ کوئی بھی کہ ایک لڑکی اس سے آ ٹکراتی ہے۔ وہ آدمی اس لڑکی کو نہیں جانتا۔ اس نے پہلے کبھی اس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ وہ لڑکی اسے بتاتی ہے کہ کچھ غنڈے اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہ اس لیے اس آدمی سے آ ٹکرائی ہے کہ وہ غنڈے یہ سمجھیں کہ لڑکی اکیلی نہیں ہے کوئی اس کے ساتھ ہے۔''

میں اب سنبھل کر بیٹھ گیا کیونکہ وہ آدمی میرا ہی واقعہ بیان کرنے لگا تھا۔

''پھر یہ ہوا کہ وہ دونوں ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' اس آدمی نے بات آگے بڑھائی۔ ''دونوں کے درمیان باتیں ہوتی ہیں۔ وہ لڑکی اس کا فون نمبر لیتی ہے اور وہ آدمی اسے اس کے گھر تک پہنچا دیتا ہے۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے اس آدمی کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم یہ سب بتا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''پلیز صرف دو منٹ میری باتیں سن لیں۔'' اس نے کہا۔

''چلو کہو۔''

''کچھ دنوں کے بعد وہ لڑکی اس آدمی کو فون کرتی ہے دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اس بار وہ لڑکی ایک کہانی سناتی ہے۔ وہ یہ کہتی ہے کہ اس کا نکاح ہو چکا تھا لیکن رخصتی سے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا اور اب اس کے گھر والے اور خاندان والے اسے منحوس سمجھنے لگے ہیں۔''

''کیا ہے یہ سب......!'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''میں نے پہلی دفعہ کھل کر نہیں بتایا۔ ورنہ آپ میری بات کا یقین نہیں کرتے وہ لڑکی یہ ڈراما بہت سوں کے ساتھ کر چکی ہے۔''

''کیا!'' اب مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ وہ لڑکی کئی لوگوں کو بے وقوف بنا چکی ہے بلکہ میں خود بھی اس کا شکار بن چکا ہوں۔ پھر اس نے مجھ سے نظریں پھیر لیں۔ آج جب میں نے اسے آپ کے ساتھ دیکھا تو میں نے سوچا کیوں نہ ایک شریف آدمی کو اس کا نیا شکار ہونے سے بچا لیا جائے۔ یہ سوچ کر میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

''اوہ خدا!'' میں واقعی سناٹے میں رہ گیا تھا۔ سب کچھ تو ویسا ہی ہوا تھا جیسا وہ کہہ رہا تھا۔ تو کیا فریحہ فراڈ تھی۔

یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین کر لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا اگر ایسا نہیں تھا تو پھر اس آدمی نے وہ سب کچھ کیسے بتا دیا تھا۔

''اچھا یہ بتائیں کیا اس لڑکی نے آپ سے پیسوں وغیرہ کی کوئی ڈیمانڈ کی؟'' میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔

''اس نے ابھی تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ ویسے میں یہ بتا دوں کہ یہ بھی اس لڑکی کی چالاکی ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ اسے پیسوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے یا وہ کوئی فلرٹ ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ کوئی بہت بڑی پرابلم لے کر مجھ سے ملے گی اور زیادہ پیسوں کی ڈیمانڈ کرے گی۔ ابھی تو وہ اپنا اعتماد قائم کر رہی ہے۔''

''اس نے ابھی تک مجھ سے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''آپ سے تو اس کی ابھی دوسری ہی ملاقات ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''وہ اتنی جلدی نہیں کہے گی۔ دو چار ملاقاتیں ہو جانے دیں پھر اس کی کوئی بہت بڑی پرابلم آپ کے سامنے آ جائے گی۔''

''کمال ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ایسی بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سے مجھے خبردار کر دیا۔''

سچ یہ ہے کہ یہ سب سن میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کے لیے کیا کیا سوچا تھا۔ کیسے کیسے خواب دیکھے تھے اور

جب اس کا یہ حیرت انگیز لیکن دھوکے باز روپ میرے سامنے آیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ ابھی تک اس سے صرف دو ہی ملاقاتیں ہو سکی تھیں لیکن ان دو ہی ملاقاتوں میں وہ میرے دل کے بہت قریب آگئی تھی اور اب اچانک جیسے شیشہ ٹوٹ کر رہ جائے۔

کئی دنوں کے بعد اس کا پھر فون آیا۔ اس بار بھی اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ویسے تو اب اس سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اس بار یہ ملاقات اس ہوٹل میں نہیں بلکہ کہیں اور ہوئی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان سی ہے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ پا رہی تھی۔

''کیا بات ہے فریحہ تم کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، گھر میں ایک بڑی پرابلم آگئی ہے۔ اس نے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے اپنا ڈراما ذرا جلدی شروع کر دیا تھا۔

''بتاؤ، کیسی پرابلم ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کیا فائدہ آپ کو بتانے کا۔'' اس نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہ مسئلہ آپ کے بس سے باہر ہوگا۔''

''اوہ۔'' اس نے دوسرا جال پھینک دیا تھا کیا تکنیک تھی اس کی۔ وہ کس طرح مجھے اکسا رہی تھی۔

''بتاؤ تو سہی، شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔'' میں نے کہا۔

''گھر میں ایک ایسی پرابلم آگئی ہے کہ فوری طور پر ایک لاکھ کی ضرورت ہوگئی ہے۔'' اس نے براہِ راست یہ کہہ دیا۔

اب وہ پوری طرح سامنے آنے لگی تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا ایک لاکھ مانگ لیا تھا۔ وہ بھی تیسری ہی ملاقات پر۔ میں اس وقت خون کے آنسو رو رہا تھا۔ جب اعتماد رخصت ہو جائے تو پھر ایسی ہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔

اور اس وقت میرے اندر شیطان کروٹیں لینے لگا۔ جب وہ اس حد تک جا سکتی تھی تو میں بھی کسی حد تک تو جا ہی سکتا تھا۔

وہ میرے ساتھ کمینگی کر رہی تھی تو میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کر سکتا تھا۔ خدا معاف کرے میں نے اس کے لیے ایک شیطانی منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ منصوبہ کیا تھا بس یہی کہ میں اس کے قرب کا فائدہ اٹھالوں گا اس کے بعد اس کو روانہ کر دوں گا۔

حالانکہ فریحہ کے ساتھ ایسا ہونا خود میرے لیے بھی تکلیف کا باعث بن سکتا تھا لیکن کیا کرتا، اپنے اس بیان کے بعد وہ میرے لیے صرف ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ صرف ایک لڑکی۔

''ارے آپ کیوں پریشان ہو گئے۔'' اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ میری پرابلم ہے۔ اس کو میں ہی Solve کرلوں گی۔''

''نہیں فریحہ بات یہ ہے کہ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ تمہیں کب ضرورت ہے۔''

''اوہو، آپ تو رہنے دیں میں آپ سے کب مانگ رہی ہوں۔''

''تم بتاؤ تو سہی، کب تک چاہئیں تمہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''جتنی جلدی ہو، آج مل جائیں کل مل جائیں لیکن آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تم یہ رہنے دو۔ یہ اتفاق ہے کہ اس وقت میرے پاس اتنے پیسے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ایک پلاٹ لیا ہے اس کی پیمنٹ رکھی ہوئی ہے تم وہ لے لو میں بعد میں اس میں ایک لاکھ شامل کر دوں گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں نے آپ کو اس لیے بتایا تھا کہ آپ میری مدد کے لیے تیار ہو جائیں۔''

''اب چھوڑو اس بات کو۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کیا تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔''

''ارے یہ کیا پوچھ رہے ہیں۔ آپ پر بھروسا نہیں ہو گا تو کس پر ہوگا۔''

''تو پھر چلو میرے ساتھ۔ ظاہر ہے اتنی رقم میں نے جیب میں تو نہیں رکھی گھر پر ہے۔ میرے ساتھ گھر چل کر لے لو۔''

''نہیں طارق صاحب میں اتنی بڑی رقم آپ سے نہیں لے سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔''

یہ بھی شاید اس کی تیکنیک تھی کہ میں اصرار کروں اور وہ یہ ظاہر کرے کہ وہ تو لینا نہیں چاہتی تھی لیکن میں نے

زبردستی اسے پیسے دیے تھے۔

دوسری طرف مجھے کچھ مایوسی بھی ہونے لگی تھی۔ اس سے محبت وغیرہ کا خیال تو دل سے نکال ہی چکا تھا اور وہ شیطانی منصوبہ بھی تکمیل ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ”نہیں فریحہ یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ تمہارا کام نکل جائے۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی ہے۔“

”ایک بات بتائیں آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کررہے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”حالانکہ ہماری زیادہ ملاقات بھی نہیں ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں...... میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور جس کے ساتھ اس قسم کی پسند کا رشتہ قائم ہو جائے اس کے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ ملاقات کتنی بار ہوئی ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔“

لیکن اس کو اپنے ساتھ لے جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔

میں اس کو لے کر پارک کے گیٹ ہی تک پہنچا تھا کہ دو آدمی اچانک سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا مہذب انسان تھا اور دوسرا ایک نوجوان تھا۔ فریحہ ان دونوں کو دیکھ کر گڑبڑا گئی تھی۔ گیٹ کے سامنے ہی ایک گاڑی بھی کھڑی ہوئی تھی۔

اس بار ہم نے یہ ملاقات کسی ہوٹل کی بجائے پارک میں کی تھی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میں اسے شرمندہ کروں گا۔ ممکن تھا کہ غصے میں میری آواز کچھ بلند ہو جاتی۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا تھا کہ یہ ملاقات پارک میں ہو۔

”چلو۔“ ادھیڑ عمر شخص نے فریحہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹھو گاڑی میں۔“

”جناب! آپ اسے کہاں لے جارہے ہیں؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون ہیں آپ؟“

”میں باپ ہوں اس کا۔“ اس نے بتایا۔ ”اور یہ میری بیٹی ہے اور یہ اس کا بھائی ہے۔“ اس نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ یہ الجھن اس طرح ختم ہوئی کہ اس وقت فریحہ بول پڑی۔ ”ہاں طارق صاحب یہ

میرے ابو ہیں اور یہ میرا بھائی ہے ریحان۔ میں گھر جا رہی ہوں خدا حافظ۔''

اور وہ سب چلے گئے اور میں ہونق بنا ہوا کھڑا رہ گیا۔ کیا ڈراما تھا یہ۔ ابھی تک کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ تو مختلف قسم کے واقعات ہو رہے تھے۔ اس کی ابتدا ہی ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔

اس کا اچانک راستے میں مل جانا، یہ بتانا کہ کچھ غنڈے اس کا تعاقب کر رہے ہیں پھر میرے ساتھ ہوٹل آنا، اپنے بارے میں بتانا کہ اس کا نکاح ہو چکا تھا لیکن شوہر کا انتقال ہو گیا۔

پھر میری اس سے دوسری ملاقات۔ ایک اجنبی کا ملنا جو یہ بتاتا ہے کہ یہ لڑکی فراڈ ہے۔ اس قسم کے ڈرامے کئی لوگوں سے کر چکی ہے اور کہتی ہے کہ گھر والے اسے منحوس سمجھنے لگے ہیں۔ آج اس کا ملنا اور یہ کہنا کہ اس کے گھر والوں کو ایک لاکھ کی ضرورت ہے۔

پھر اس کے گھر والوں کا اچانک آ جانا۔ جیسے یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہو۔ اس نے بتا دیا کہ وہ فلاں جگہ پر ہے اور اس کے باپ اور بھائی پہنچ گئے ہوں۔

کتنی خطرناک لڑکی تھی۔ کتنے روپ تھے اس کے۔ اس نے اپنے حساب سے تو ایک لاکھ دینے کے لیے مجھے پھانس بھی لیا تھا۔

اس کے گھر والے اس کو لے کر روانہ ہو گئے تھے اور میں وہیں کھڑا اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا تھا۔

یہ الجھن کئی دنوں تک رہی تھی۔ پھر ایک دن اچانک موبائل پر کال آ گئی۔ میں نے سوچا نظر انداز کر دوں۔ پھر کوئی نہ کوئی کہانی تیار ہو گی لیکن میں نے فون اٹینڈ کر ہی لیا۔

خلافِ توقع دوسری طرف سے مردانہ آواز تھی۔ ''کیا طارق صاحب بول رہے ہیں؟'' پوچھا گیا۔

''جی ہاں طارق ہی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کون؟''

''میں نعیم بول رہا ہوں فریحہ کا والد۔''

''اوہ۔'' میں نے جلدی سے سلام کیا۔ ویسے فریحہ کے والد کا فون آنا مجھے حیران کر گیا تھا۔ ''جی جناب میں پہچان گیا ہوں آپ کو فرمائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''طارق صاحب آپ ہمارے گھر آ سکتے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔ ''شاید آپ نے گھر دیکھا ہو۔''

''جی ہاں ایک بار آپ کی صاحب زادی نے دکھایا تھا۔ خیریت تو ہے نا۔''

''ہاں ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''چلیں میں حاضر ہو جاتا ہوں۔''

اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر مجھے کیوں بلایا جا رہا ہے۔ فریحہ کے والد کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا کہ مجھے فون کرنے کی نوبت آ گئی تھی۔

بہرحال کچھ دیر کے بعد میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ فریحہ کے والد نے بہت گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔

میں الجھن میں تھا۔ نعیم صاحب بھی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ بہت الجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن آغاز مشکل ہو رہا ہو۔ بالآخر کچھ دیر بعد انہوں نے خاموشی ختم کی۔

''طارق صاحب آپ کو شاید یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''میں آپ سے معذرت کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''معذرت! کس بات کی معذرت؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ آپ کو میری بیٹی کی وجہ سے ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولے۔ ''طارق صاحب فریحہ ذہنی مریضہ ہے۔''

''کیا!''

''ہاں ذہنی مریض۔ ہم اس کا علاج کروا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کا یہ کہنا ہے کہ وہ نفسیات کی ایک خاص قسم کی بیماری کا شکار ہے جس میں ایوژن بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس نے جو کچھ کہا یا جو کچھ کیا وہ صرف آپ کے ساتھ نہیں بلکہ اور بھی کئی لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ لوگ اسے دھوکے باز، فراڈ سمجھتے ہیں۔ خراب لڑکی سمجھتے ہیں جب کہ وہ ایسی ہرگز نہیں ہے۔''

''جی ہاں اتنا تو میں نے بھی اندازہ لگا لیا ہے لیکن یہ نفسیاتی مریضہ......!''

''جی ہاں وہ ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔ وہ اپنی باتوں

سے پورا ایک ماحول تخلیق کر دیتی ہے۔ جیسے کچھ غنڈے اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور پھر وہ آپ جیسے کسی شخص کو پکڑ کر یہ درخواست کرتی ہے کہ اسے بچالیا جائے۔ بہت کم لوگ آپ جیسے ہوتے ہیں جو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔''

اس وقت مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی کہ میں نے بھی اس کے بارے میں اپنے دل میں پلاننگ کی تھی۔

''لیکن ایک بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی اس سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ فوراً ہوش میں آجاتی ہے۔ جیسے سوتے سوتے جاگ پڑی ہو ورنہ اس سے ملاقاتیں کرتی ہے اسے ایک کہانی سناتی ہے کہ نکاح ہوتے ہی اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔''

''او خدا! کیا اس کا نکاح نہیں ہوا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کا نکاح اس کا شوہر یہ سب اس کے تصور میں ہے۔'' نعیم صاحب نے بتایا۔ ''جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' میں بڑبڑایا۔

''باقی سب کچھ نارمل ہے اور کہیں کسی بھی موقع پر کچھ نہیں ہوتا۔ بس ایک طرح اس کو جب دورہ سا پڑتا ہے تو پھر وہ نکاح شدہ بھی ہو جاتی ہے۔ شوہر کا بھی انتقال ہو چکا ہوتا ہے اور گھر والے اسے منحوس بھی سمجھنے لگتے ہیں اور کچھ غنڈے اس کا پیچھا بھی کرنے لگتے ہیں جب کہ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے۔''

''پھر تو آپ لوگ بہت الجھنوں میں رہتے ہوں گے؟''

''بہت زیادہ! اس کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود جب موقع ملتا ہے تو خاموشی سے نکل جاتی ہے اور ایک داستان سنا کر آجاتی ہے۔''

''خدا اس کے حال پر رحم کرے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ بتائیں میں کیا کر سکتا ہوں۔''

میں نے آپ کو اس لیے زحمت دی تھی کہ ایک تو آپ سے معذرت کر لوں پھر یہ معلوم کر لوں کہ آپ نے اس کو کچھ رقم وغیرہ تو نہیں دی تھی۔

''نہیں جناب بالکل بھی نہیں۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہاں تک نوبت نہیں آئی۔''

''چلیں تو پھر مجھے اجازت دیں۔'' میں نے کہا۔

''طارق میاں میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں اس کا علاج تو ہو رہا ہے لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اگر واقعی اس کی شادی ہو جائے تو بہت حد تک ٹھیک ہونے کا امکان ہے۔''

''تو پھر شادی کر دیں۔''

''یہی تو پرابلم ہے۔ دو چار رشتے آئے تھے لیکن جب انہیں اس کے بارے میں معلوم ہوا تو سب نے انکار کر دیا خود سوچو، ایسی لڑکی سے شادی کر کے کون رسک لے گا۔ نہ جانے کیا کر جائے۔''

''قبلہ اگر برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''آپ چاہیں تو میرے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ میں...... میں اس رشتے کے لیے تیار ہوں۔''

نعیم صاحب کچھ دیر تک مجھے اس طرح دیکھتے رہے جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''ہاں یہ تمہارا ظرف ہے کہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی تم اس کو اپنانے کے لیے تیار ہو۔''

''قبلہ اس کی کئی وجوہات ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ فریحہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ لاشعوری طور پر کیا ہے وہ اپنے مزاج میں مجرم نہیں ہے بلکہ بیمار ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ اس کا تعلق ایک شریف شخص سے ہے۔''

''جزاک اللہ۔'' نعیم صاحب خوش ہو گئے تھے۔

''آپ بھی اب میری طرف سے اطمینان کر لیں۔'' میں نے کہا۔

اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ فریحہ میری بیوی ہے۔ شادی کے بعد میں نے اس کا علاج ایک ماہر نفسیات سے کروایا تھا۔ میں یہ کہانی اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ اگر کوئی اس قسم کا واقعہ آپ کے ساتھ بھی پیش آجائے تو اسے غلط نہ سمجھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض یا مریضہ ہو۔ انسانی ذہن اس قسم کے کرشمے دکھایا کرتا ہے اور ہم نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں منسوب کر لیتے ہیں۔

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
ایک اور سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے جو میری بہن حمنیٰ باجی کی ہے۔ یہ کہانی جب میرے علم میں آئی تو میں نے سوچ لیا کہ اسے کہانی کی صورت میں عوام کے سامنے لاؤں گی تاکہ وقت رہتے لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ ہر چہرے پر ملمع ہوتا ہے۔ زوبیہ نے بھی خود پر کیسا ملمع چڑھا رکھا تھا۔ اس نے کتنی گندی اور ظالمانہ پلاننگ کی تھی جسے پڑھ کر آپ بھی اس پر لعنت کریں گی۔
دانیہ صدیقی
(کراچی)

دوپہر کے دو بج رہے تھے اور حمنہ وقت کم اور مقابلہ سخت کی عملی تفسیر بنی جلدی جلدی دعوت کا اہتمام کرنے میں مصروف تھی۔ خلافِ توقع آج اس کی ماسی بھی نہیں آئی تھی اسی لیے اس کا غصہ عروج پر تھا۔ ابھی ڈھیروں کام باقی تھا اور حمنہ کسی مشین کی طرح کاموں میں لگی تھی۔ ابھی اس نے شامی کباب کے لیے قیمہ پیس کر ایک طرف رکھا ہی تھا کہ اچانک بیل بجی۔ اس نے انتہائی کوفت کے عالم میں دیوار پر لگی گھڑی کی جانب دیکھا اور چولہا آہستہ کرتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھی۔ گیٹ کھولنے پر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے جدید فیشن کے تمام مروجہ اصولوں پر پوری اترتی تیس، بتیس سالہ اسمارٹ سی عورت کھڑی تھی۔ حمنہ اس کی دلکش شخصیت سے متاثر ہو کر بولی۔ ”جی؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں!“

اسے اُمید تھی کہ جس طرح وہ عورت متاثر کن شخصیت کی مالک تھی ویسی ہی اس کی آواز بھی ہوگی مگر ہوا اس کے برعکس ادھر حمنہ نے یہ پوچھا اور ادھر وہ کانوں کو پھاڑتی آواز میں چلائی۔ ”جب تمیز سے رہنا نہیں آتا تو شرفا کے علاقے میں رہتے ہی کیوں ہو؟ تم لوگ تو ایسی جگہ جا کر رہو جہاں تم جیسے ہی تمیز سے عاری لوگ رہتے ہوں۔“ حمنہ جو اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی، حواس باختہ سی رہ گئی۔
”مگر آپ ہیں کون؟ اور اس طرح بات کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا؟“ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے یہی الفاظ برآمد ہو سکے۔

”میں کوئی بھی ہوں بی بی لیکن ایک بات تو یقینی ہے کہ تم نے اپنے بچے کو بالکل تمیز نہیں سکھائی۔ اگر بچوں کی درست پرورش نہیں کر سکتے تو پھر پیدا ہی کیوں کرتے ہو؟“ یہ اب کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا اور بات اب اس کے اکلوتے بیٹے زین پر آ گئی تھی اسی لیے حمنہ اپنی تمام جھجک ایک طرف رکھ کر کڑے تیوروں سے بولی۔ ”یہ آپ کس طرح بات کر رہی ہیں؟ میں خاموش ہوں تو سر پر ہی چڑھی آ رہی ہیں، پہلے آپ خود بات کرنے کی تمیز سیکھ کر آئیں پھر مجھ سے بات کیجیے گا۔ آخر ایسا کیا کیا ہے زین نے؟“ شدید غصے اور جھنجلاہٹ سے حمنہ کی سانس چڑھ گئی تھی۔

اس عورت کی حالت بھی زیادہ مختلف نہیں تھی۔ دونوں خواتین معرکے کے لیے بالکل تیار نظر آ رہی تھیں اور قریب تھا کہ دونوں ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتیں۔

120 گز کے برابر برابر میں بنے گھروں پر مشتمل سوسائٹی تھی۔ ہنگامہ سن کر آس پڑوس کی دوسری خواتین بھی جمع ہو گئی تھیں۔ پڑوسن ہونے کے ناتے سب حمنہ کی سائیڈ لے رہی تھیں اور اس عورت کو برا بھلا بول رہی تھیں جس نے بے بات کا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ چھ سالہ زین اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اس عورت کے لان میں پہنچ گیا جو چند ہفتے پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئی تھی اور وہاں فٹبال کھیلنے لگا۔ کھیل کے دوران گھاس کو نقصان پہنچا اور وہاں لگے پھولوں کے دو تین گملے بھی ٹوٹ گئے۔ اس

میں کوئی شک نہیں تھا کہ بچوں نے یہ غلط کام کیا تھا اور انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر بات یہ تھی کہ وہ بچے تھے اور دوسرے یہ کہ اسے بھی حمنہ سے اتنی بدتمیزی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔

یہ جھگڑا کافی دیر تک چلا اور حمنہ کی مدد کو آئی خواتین نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں اس زوبیہ نامی عورت کی خوب بے عزتی ہوئی اور اسے سخت لعن طعن کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ اپنی جان بچا کر حمنہ کو 'دیکھ لوں گی' کی گھسی پٹی دھمکی دے کر وہاں سے چلتی بنی۔ اس کے بعد حمنہ اور اس کی پڑوسنیں کافی دیر تک کھڑی زوبیہ نامی اس بدمزاج خاتون کو برا بھلا کہتی رہیں۔ حمنہ کا غصے سے برا حال تھا، اس نے زین کو بھی واپس بلا لیا تھا اور اس کے پھولے پھولے گالوں پر دو، تین تھپڑ بھی جڑ دیے تھے۔ وہ اسے اور مارتی مگر سب نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ زین آنکھوں میں آنسو بھرے اسے حیرت سے تکتا رہا۔ حمنہ تھوڑی دیر تک تو سب کے ساتھ کھڑی رہی پھر جب اس کا غصہ کچھ کم ہوا تو اسے یاد آیا کہ ابھی تو اسے دعوت کی تیاری بھی کرنی ہے اسی لیے وہ سب سے معذرت کرتی اندر بھاگی۔ غصے اور جلد بازی میں اس سے دو، تین برتن بھی ٹوٹے اور سالن میں نمک تیز ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شارق جب دفتر سے گھر پہنچا تو بیگم کا موڈ دیکھ کر سمجھا کہ شاید کام کی زیادتی کے سبب اس کا موڈ آف ہے۔ زین الگ اتری ہوئی شکل لیے ایک طرف بیٹھا تھا۔ شارق نے حمنہ کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی اس کو دعوت کے لیے کپڑے پہنا کر تیار کر دیا۔ تھوڑی دیر میں مہمان آنے شروع ہو گئے مگر حمنہ کا منہ پھولا ہی رہا۔ شارق اس کی یہ کیفیت نوٹ کر رہا تھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے ورنہ حمنہ کبھی بھی مہمانوں کی موجودگی میں ایسے بی ہیو نہیں کرتی۔ رات کو جب مہمان رخصت ہو گئے اور تھکی ہاری سی حمنہ اس کے پہلو میں آ کر لیٹی تو شارق پوچھنے سے باز نہ رہ سکا۔ حمنہ کی زبانی سارا قصہ جان کر وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ حمنہ برا منا کر بولی۔ ''آپ کو برا نہیں لگا کہ کس طرح اس نے میری بے عزتی کی؟''

شارق تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''تم نے اسے جواب تو دے دیا ناں! غصہ تو تم جب کرو جب تم خاموشی سے سب سہہ جاتیں۔ حساب برابر ہو گیا بلکہ تم نے تو الٹا اپنے ہی بیٹے کو سب کے سامنے مار کر اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچایا ہے۔ تم نے شاید غصے میں نوٹ نہیں کیا مگر آج

اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا اور اپنے کمرے سے نکلنا تو دور کی بات ان سے بات تک نہیں کی۔ غصہ تو اسے تم پر ہونا چاہیے مگر وہ تو سارا ٹائم تمہاری طرف معصومیت سے تکتا رہا۔“

شارق کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ حمنہ ”میں ابھی آتی ہوں“ کہتی ہوئی بستر سے اتر گئی۔ شارق کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے پوچھا نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب وہ سیدھی زین کے کمرے میں جائے گی اور پھر دونوں ماں بیٹا دیر تک روٹھنے منانے کے کھیل میں مصروف رہیں گے۔

☆☆☆

اس دن کے بعد کئی موقع ایسے آئے جب حمنہ اور زوبیہ آمنے سامنے ہوئیں مگر دونوں نے ایک دوسرے سے بات کرنا تو کجا رک کر سلام تک نہ کیا۔ محلے میں بھی ان دونوں کے درمیان چل رہی چپقلش کے بارے میں جانتے تھے۔ مسز سلیم کی بیٹی کی سالگرہ پر تو ایک مرتبہ پھر ان دونوں میں لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی جب زوبیہ نے حمنہ کو دیر سے آنے پر مغرور اور خود پرست کا طعنہ دے مارا۔ محفل میں موجود دیگر خواتین نے بات کو سنبھالا ورنہ اس روز بد مزگی ہو کر رہتی۔ اب حمنہ بھی بدلہ لینے کی تاک میں تھی اس لیے ایک شام جب زوبیہ حسب معمول کمپاؤنڈ میں بنے پارک میں واک سے فارغ ہو کر اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھنے کے لیے آئی تو حمنہ وہاں جان بوجھ کر پہلے سے براجمان تھی۔ زوبیہ نے اسے اٹھنے کے لیے کہا تو اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں زوبیہ سے کہیں اور بیٹھ جانے کو کہا۔ اس کے بعد تو بات اتنی بڑھی کہ حمنہ سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے خود پر لگائے گئے ایک رکیک الزام پر آگے بڑھ کر اسے ایک تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ پارک میں سناٹا چھا گیا۔ زوبیہ خود بھی سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی اور پھر حیرت انگیز طور پر حمنہ کو کچھ کہے بغیر وہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔

شارق کو جب اس تمام واقعہ کا علم ہوا تو ظاہر ہے اس نے بھی حمنہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا کہ نہ وہ اس کے منہ لگتی نہ یہ شرمناک حرکت ہوتی۔ اس نے حمنہ پر زور دیا کہ وہ جا کر زوبیہ سے اس کی معافی مانگے مگر غصے میں بھری ہوئی حمنہ نے اس کی یہ بات مسترد کر دی البتہ اس نے شارق سے وعدہ کیا کہ آیندہ وہ کبھی بھی زوبیہ سے بات کرنے میں پہل نہیں کرے گی اور نہ ہی اس سے لڑنے کا موقع ڈھونڈے گی۔

☆☆☆

سلیقے سے سجے ڈرائنگ روم میں ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر ابھی لائٹ جلانے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ اے سی کی وجہ سے ہلکی سی خنکی پھیلی ہوئی تھی جو اس گرم موسم میں بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں موجود دونوں افراد ہیولے کی مانند محسوس ہو رہے تھے۔ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہیولہ کسی عورت کا ہے جبکہ دوسرا کسی کم عمر بچے کا ہے۔ دونوں ہیولے صوفے پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور باتوں میں مصروف تھے۔ باتوں باتوں میں بچے نے عورت سے کہانی سننے کی فرمائش کر دی۔ عورت تھوڑی دیر تک تو اسے ٹالتی رہی مگر جب بچے کا اصرار بڑھا تو اس نے کہانی سنانی شروع کی۔ کہانی اسی کے عمر کے ایک بچے کی تھی۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے بچے کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

☆☆☆

شارق ابھی تھوڑی دیر قبل ہی دفتر سے لوٹا تھا۔ اس کی چھ ماہ پہلے ترقی ہوئی تھی، سیلری بڑھانے کے علاوہ کمپنی نے اسے گاڑی بھی دی تھی۔ ترقی کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح شام کو گھر واپس نہیں آتا تھا اکثر اسے رات گئے تک دفتر میں رک کر کام نمٹانے ہوتے تھے یا میٹنگز اٹینڈ کرنی پڑتی تھیں۔ وہ حمنہ اور زین کو بالکل وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ حمنہ اس کی مجبوری سمجھتی تھی، کبھی کبھی بیزار ہو کر وہ اس سے لڑتی بھی تھی مگر اب تنگ آ کر اس نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ زین بھی اس سے باتیں کرنے اور کھیلنے کے لیے بے چین ہوتا مگر اس کے پاس فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔

آج خوش قسمتی سے کوئی میٹنگ نہیں تھی اسی لیے وہ کافی عرصے کے بعد حمنہ اور زین کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔ حمنہ اور زین اس کی موجودگی سے بہت خوش تھے۔ زین تو اتنے دنوں بعد باپ سے ملنے کی خوشی میں اتنا ایکسائیٹڈ تھا کہ کھا کم رہا تھا اور باتیں زیادہ کر رہا تھا۔ ابھی بھی وہ اسے اپنے اسکول کا کوئی قصہ سنا رہا تھا جب حمنہ نے اسے ٹوکا۔ ”بیٹا، جلدی کھانا ختم کرو اور اپنا بیگ ریڈی کرو۔ زوبی تمہیں لینے آتی ہی ہو گی۔ اسے بتا دینا کہ تمہارا کل میتھ کا ٹیسٹ ہے تو اس کی تیاری ضرور کروائے۔“

شارق نے متجسس ہو کر پوچھا۔ "یہ زوبی کون ہے بھئی؟"

حمنہ نارمل سے انداز میں بولی۔ "ارے!! وہی اپنی زوبیہ جس سے چند ماہ پہلے میری لڑائی ہوئی تھی۔"

شارق یہ سن کر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ "کیا مطلب؟ یعنی تمہاری اس سے دوستی ہوگئی؟"

حمنہ اس کے انداز پر تھوڑی سی کھسیا گئی۔ "توبہ ہے۔ آپ بھی حد کرتے ہیں! میری کون سی جنموں کی دشمنی تھی۔ بس تھوڑی سی غلط فہمی ہوگئی تھی جو ہم نے آپس میں مل کر دور کردی۔ ذرا سی لڑائی کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں اس سے زندگی بھر بات ہی نہ کروں۔"

شارق کی حیرت ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔ "مگر وہ تمہارا عہد کہ کبھی اس کی شکل نہیں دیکھوگی اور اس سے بات کرنے سے بہتر ہوگا کہ زہر کھالوں گی وغیرہ وغیرہ۔ وہ کیا ہوا؟"

اب کی بار حمنہ جھلا سی گئی۔ "اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔ پچھلے مہینے جب آپ اسلام آباد گئے ہوئے تھے تو ایک دن وہ چاکلیٹس اور پھول لے کر آئی تھی۔ اپنے اس دن کے برتاؤ پر مجھ سے معافی مانگی اور اپنی کہانی سنائی۔ اس کے شوہر نے اسے بانجھ ہونے کی بناء پر طلاق دے دی ہے اسی لیے وہ یہاں کمپاؤنڈ میں کرائے کے مکان میں رہتی ہے۔ اس روز اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر بچے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ساتھ مل کر کیسا اُدھم مچاتے ہیں تو اسی لیے وہ وقتی طور پر اپ سیٹ ہوگئی تھی۔ بیچاری بہت شرمندہ تھی اور خیر غلطی تو میری بھی تھی کہ میں نے پارک میں اسے لڑنے پر اکسایا تھا، تو بس میں نے ساری باتیں بھلا کر اسے گلے لگالیا۔ آپ یقین نہیں کریں گے مگر وہ واقعی دل کی بہت اچھی ہے۔ اس دن کے بعد سے اس نے میرا آدھا بوجھ بانٹ لیا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ماسی زیادہ تر غائب ہی رہتی ہے اور آج کل میری کنڈیشن اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں زیادہ کام کروں۔ خاص طور پر زین کو تو اسی نے سنبھال لیا ہے۔ خود زین بھی اس سے بہت ہل گیا ہے۔ بیچاری خود بھی بچوں کو ترسی ہوئی ہے، بالکل ماں کی طرح اس کا خیال رکھتی ہے۔"

حمنہ کی اتنی لمبی توجیہہ کے باوجود شارق پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ چپ ہوئی شارق بول پڑا۔ "وہ جس مزاج کی عورت ہے اسے سوچ کر یہ ناممکن سی بات لگتی ہے کہ اس نے خود تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ دال میں کچھ تو کالا ہے۔"

شارق کے منہ سے یہ سن کر حمنہ تنک کر بولی۔ "آپ خواہ مخواہ پریشان مت ہوں۔ برا بھلا میں بھی سمجھتی ہوں اور زوبیہ واقعی ایک مظلوم عورت ہے۔ آپ کی غیر موجودگی میں اس نے جس طرح میرا اور زین کا خیال رکھا وہ قابلِ تعریف ہے اور مجھے تو اس کی صورت میں ایک بہترین مددگار مل گیا ہے۔ آپ تو زیادہ تر دفتر میں یا میٹنگز میں بزی ہوتے ہیں تو گھر اور باہر کے کاموں کے لیے مجھے ان دنوں میں کسی کی تو ہیلپ چاہیے ناں! کل تو چیک اپ کے لیے بھی وہی مجھے لے گئی تھی۔ مجھے رکشا سے جاتا دیکھ کر وہ اپنی گاڑی لے کر آ گئی اور زبردستی اس میں بٹھا کر لے گئی۔ آپ پلیز اس موضوع کو یہیں ختم کردیجیے کیونکہ میں اس پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔"

شارق اس وقت زوبیہ کے حق میں بڑھ بڑھ کر بولتی حمنہ کے مکمل طور پر بدلے ہوئے خیالات جان کر حیران تو تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ حمنہ مطمئن ہے تو اس نے بھی عورتوں کی ازلی سمجھ میں نہ آنے والی فطرت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ویسے بھی خواتین کی بے تکی لڑائی یا دوستی کے چکروں سے اسے کیا لینا دینا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت ویڈیو گیم کھیلنے میں مگن تھا جب اس کی گود میں کوئی لجلجی سی چیز آ گری۔ بے اختیار وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا تو وہ چیز اس کی گود سے گر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی کہ وہ ایک کالے رنگ کا ڈراؤنا سا سانپ تھا۔ اسی لمحے اس کے پیچھے سے قہقہے کی آواز ابھری۔ "ڈرپوک کہیں کے! یہ تو ربڑ کا سانپ ہے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے ذرا سا آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ واقعی ربڑ کا بنا ہوا معمولی سا سانپ تھا۔ اس نے سانپ کو ہاتھ میں اٹھالیا۔ "کیا میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں؟ میں اپنے دوستوں کو ڈراؤں گا۔"

قہقہہ دوبارہ گونجا۔ "صرف دوستوں کو؟ تمہیں یاد ہے ناں اس کہانی میں بچہ اپنی امی کو کس چیز سے ڈراتا ہے؟" اور بچے کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمکنے لگیں۔

☆☆☆

حمنہ اس وقت فریج صاف کر رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ ننھے مہمان کی آمد سے قبل وہ کچھ اہم کام نمٹالے کیونکہ وہ

جانتی تھی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد تک وہ گھر کو ٹھیک سے ٹائم نہیں دے پائے گی اسی لیے وہ حتی المقدور کام نمٹا رہی تھی۔

آج زین کی چھٹی تھی اسی لیے وہ کارٹونز دیکھنے میں مگن تھا۔ زوبیہ نے بصد اصرار اسے لنچ بنانے سے منع کیا تھا اور پلان یہ تھا کہ وہ کھانا بنا کر ان کے گھر لے آئے گی پھر وہ سب مل کر لنچ کریں گے اسی لیے حمنہ نے موقع جان کر دوسرے کام نمٹانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ صفائی سے فارغ ہو کر فریزر میں گوشت کے پیکٹس جما رہی تھی جب اسے محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے پیروں پر رینگ رہی ہے۔ اس نے چونک کر پیروں کی جانب دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بے اختیار چیخی اور پھر چیختی ہی چلی گئی۔ اس کے پیروں پر انتہائی کریہہ سا کالے رنگ کا سانپ رینگ رہا تھا۔ وہ بھاگنے کے لیے مڑی مگر اس حالت میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور کچن کے فرش پر گر پڑی۔ درد کی تیز لہر اٹھی اور اس کے پورے جسم میں پھیل گئی۔ وہ اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہی ڈرائنگ روم کا منظر تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ صوفے کی بجائے وہ دونوں ہیولے آج نیچے بچھے کارپٹ پر بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد عورت کی بے رحمانہ سی آواز کمرے میں گونجی۔ ”آپ نے جو کیا وہ بالکل ٹھیک کیا۔ اس سے آپ کی مما کو کوئی درد نہیں ہوا بلکہ وہ بے بی جو ان کے پیٹ میں تھا اسے درد ہوا ہے۔ ویسے بھی وہ جب آئے گا تو آپ کے مما پاپا تو آپ کو بھلا ہی دیں گے اور اسی کا خیال رکھیں گے۔ اس وقت آپ کو بھی تو کتنی تکلیف ہو گی ناں!“ اس کے سامنے بیٹھے، ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”ایسا تو نہیں ہے۔ مما کو بھی درد ہوا ہے۔ آج کل وہ سارا دن سوتی رہتی ہیں۔ میری مما کی جب طبیعت خراب ہوتی ہے وہ بس تب ہی سوتی ہیں اور میرے مما پاپا میرا بہت خیال بھی رکھتے ہیں۔“

عورت کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندگئیں۔ ”میری بات کا یقین نہیں آ رہا ناں؟ ٹھیک ہے تو تم اب وہی کرنا جو اس بچے نے کہانی میں کیا تھا پھر دیکھنا تمہاری مما کیا کرتی ہیں۔“ بچے نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”اگر میری مما نے بھی وہی کیا تو اس کا مطلب کیا ہو گا؟“ عورت کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اس کا مطلب یہ ہو گا میرے بچے کہ تمہاری مما اب تم سے محبت نہیں کرتی ہیں۔“

☆☆☆

اس روز والے واقعہ کے بعد سے شارق نے حمنہ کو سختی سے گھر کے کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر بھی دہل جاتا کہ اگر اس دن وہ اتفاق سے فائل لینے گھر نہ آتا تو آج حمنہ زندہ سلامت اس کے پاس نہ ہوتی۔ اللہ کے کرم اور ڈاکٹرز کی بھاگ دوڑ کی بدولت حمنہ نہ صرف بچ گئی تھی بلکہ ان کا ہونے والا بچہ بھی محفوظ تھا۔ بعد میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ حمنہ کے پیروں پر سانپ ڈالنے کی شرارت زین نے کی تھی مگر حمنہ نے غصے سے آگ بگولا ہوتے شارق کو اس سے باز پرس کرنے سے روک دیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شارق اسے مارے پیٹے۔ ویسے بھی زین نے تو معصومیت میں وہ شرارت کی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ فی الحال حمنہ کی حالت ایسے مذاق سہنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ حمنہ نے سوچا تھا کہ وہ موقع دیکھ کر خود اسے سمجھائے گی۔

اس کے بیڈ ریسٹ کے دوران زوبیہ نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ حمنہ کے پرہیزی کھانے جبکہ زین اور شارق کے لنچ اور ڈنر کی ذمہ داری بھی اس نے اٹھا لی تھی۔ یہاں تک کہ گھر میں ضرورت کی چیزیں ختم ہونے پر وہ خود ہی لے آتی۔ اب تو شارق بھی اس کے اعلیٰ اخلاق اور مروت کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اپنی خدمت کرواتے ہوئے حمنہ شرمندہ ہوتی تو وہ اسے ٹوک دیتی۔ ”شرمندگی کی کوئی بات نہیں مجھے اپنی بہن سمجھو اور ویسے بھی میں تمہارے صحت یاب ہونے کا انتظار کر رہی ہوں پھر سب سود سمیت وصول کروں گی۔“

اس کی یہ بات سن کر حمنہ ہنس دی تھی۔ حمنہ کے دل میں اس کی عزت دوچند ہو گئی جب اس نے زین کے فائنل ایگزامز کی تیاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور زین ہمیشہ کی طرح پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ شارق اور حمنہ نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے ڈنر پر باہر لے گئے اور تحفے میں نہایت نفیس اور مہنگا جیولری سیٹ دیا جسے اس نے بڑی رد و کد کے بعد قبول کیا۔ زین تو اب اسکول سے آتے ہی زوبیہ کے گھر بھاگتا تھا کیونکہ وہ بھی بالکل اس کی ماں کی طرح اس کے نخرے اور فرمائشیں فوراً پوری کرتی تھی۔ ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے حمنہ اپنی حالت کی وجہ سے کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی اور اکثر زین کی بڑھتی ہوئی

شرارتوں اور فرمائشوں پر اسے ڈانٹ دیتی تھی یا سزا دیتی تھی اسی لیے زین کے لیے زوبیہ کا گھر بہترین پناہ گاہ تھا۔

☆☆☆

حمنہ ان دنوں زین کے بدلتے ہوئے رویئے سے بہت پریشان تھی۔ وہ رفتہ رفتہ بدتمیز اور ضدی ہوتا جا رہا تھا۔ شارق سے کچھ کہنا بیکار تھا وہ اس سے سختی سے نمٹتا جو حمنہ کو قطعی منظور نہ تھا۔ وہ ان روایتی ماؤں کی طرح تھی جو چاہے تو خود اپنی اولاد کو ایک آدھ تھپڑ لگا دے مگر باپ سختی سے کام لے تو اس کا کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔ گزشتہ روز بھی جب حمنہ نے اسے بے وقت کھیلنے کے لیے باہر جانے سے روکا تھا تو زین نے اس سے کافی بدتمیزی کی تھی۔ زین نے نہ صرف اس سے بدتمیزی سے بات کی تھی بلکہ اس نے حمنہ کو ہلکا سا دھکا بھی دیا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ پیچھے دیوار تھی تو اس نے اس کا سہارا لے لیا۔ حمنہ کو بہتر لگا کہ زین کی بڑھتی ہوئی خودسری کا ذکر زوبیہ سے کرے۔ زوبیہ نے اسے تسلی دی اور وعدہ کیا کہ وہ زین سے بات کرے گی اور اس کو سمجھائے گی۔

زین جب گھر میں ہوتا تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی ہوتا۔ اب وہ پہلے کی طرح شارق کے پاس دوڑ کر نہیں آتا تھا اور نہ ہی اس سے زیادہ بات کرتا تھا۔ شارق بھی زین کے اندر یہ تبدیلیاں نوٹ کر رہا تھا اور اسی لیے اتوار کو جب وہ گھر میں تھا تو اس کے کمرے میں چلا گیا۔ زین اس وقت اپنے بیڈ پر اوندھا لیٹا ڈرائنگ بنا رہا تھا ساتھ ساتھ شاید کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ شارق دبے قدموں آگے بڑھا تاکہ اسے چپکے سے ڈرا سکے مگر زین کے منہ سے برآمد ہوتے الفاظ سن کر وہیں ٹھٹک گیا۔ اس وقت زین اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور اس کے منہ سے ''مما اینڈ پاپا ہیٹ می'' کے الفاظ برآمد ہو رہے تھے۔ شارق نے وہیں رک کر مزید الفاظ سننے چاہے مگر اس کے منہ سے برآمد ہونے والے باقی الفاظ گڈمڈ سے تھے اس لیے اسے سمجھ نہیں آ سکے۔ زین سے کھیلنے کا ارادہ ترک کر کے شارق اس کے کمرے سے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ شدید صدمے سے دوچار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زین کے سلسلے میں ان لوگوں سے کہاں کوتاہی ہوئی ہے جس سے اس کے ذہن میں ایسے خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس نے حمنہ کی پریشانی کا خیال کر کے اس سے یہ سب کہنا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی اس پر غور و فکر کرنے لگا۔

شام کو وہ زین کی پسند کی پیسٹریز اور ڈونٹس لے کر آیا تاکہ زین کے ننھے دماغ سے یہ تاثر نکال سکے کہ اس کے مما اور پاپا اس سے نفرت کرتے ہیں۔ بزی ہونے کی وجہ سے اسے ٹائم نہیں دے پا رہے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر زین کو پابندی سے ٹائم بھی دیا کرے گا اور ہر ممکن کوشش کرے گا کہ زین بہتر محسوس کر سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اگلے ہی روز اسے کانفرنس میں شرکت کے لیے تین دن شہر سے باہر رہنا پڑا اور واپس آنے کے بعد بھی زین کو ٹائم دینا تو ایک طرف مصروفیت میں اسے وہ بات بھی یاد نہیں رہی جس کی وجہ سے وہ اتنا ڈسٹرب ہوا تھا۔

☆☆☆

''سب کے مما پاپا تو ایسے نہیں ہوتے۔ سعد کے پیرنٹس کتنے اچھے ہیں جو آج اسکول فنکشن میں بھی آئے تھے۔ میں مما اور پاپا سے کہتا رہا مگر مما نے کہا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پاپا کو آفس جانا تھا۔ دونوں ہی نہیں آئے اور اگر آپ بھی نہیں آتیں آنٹی تو میں سارے فنکشن میں اکیلا ہی بیٹھا رہتا۔ تھینک یو آنٹی!'' بچے نے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''اس میں تھینک یو کہنے کی کیا بات ہے۔ تم تو میرے بیٹے ہو۔ تمہارے مما پاپا تم سے محبت نہیں کرتے تو کیا ہوا آنٹی تو تم سے محبت کرتی ہیں۔''

بچے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی آنٹی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مما اور پاپا کو تو صرف بے بی کی فکر ہے۔ آئی ہیٹ دیم۔''

بچے کی آنکھوں سے ٹپکتی نفرت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا اور اس نے ''ادھر آؤ میری جان'' کہہ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

حمنہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا اس سے اسکول فنکشن میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے سخت ناراض ہے اسی لیے اس نے زوبیہ کو اسے سمجھانے کی درخواست کی تھی۔ ویسے بھی وہ آج کل حمنہ سے زیادہ زوبیہ کی سننے لگا تھا۔ حمنہ کے لیے یہ بات کافی اطمینان بخش تھی کہ اب اسے زین کی زیادہ فکر نہیں کرنی پڑتی تھی ورنہ تو وہ اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر پاگل ہی ہو جاتی۔ اس کی فرمائش اب زوبیہ ہی پوری کیا کرتی تھی حمنہ جانتی تھی کہ وہ خودغرض ہو گئی ہے مگر اس نے یہ سوچ کر

خود کو مطمئن کرلیا تھا کہ ڈلیوری کے بعد وہ زین کے تمام شکوے اور شکایتیں دور کردے گی۔ اس کی ڈلیوری بس کسی بھی وقت متوقع تھی اس لیے اس نے زوبیہ کی مدد سے آنے والے مہمان کی تمام تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔

حسبِ توقع ایک خوبصورت صبح وہ اور شارق ایک اور پیارے سے بیٹے کے ماں باپ بن گئے۔ زین بھی ان کے ساتھ اسپتال میں ہی موجود تھا اور اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر بہت ایکسائیٹڈ تھا۔ بار بار اسے گود میں لینے کی ضد کرتا مگر شارق نے اسے دو بار گود میں دینے کے بعد اس کی ضد پر اسے ڈانٹ دیا۔ زین مچلنے لگا تو شارق نے اسے مہمانوں کے سامنے ہی لتاڑ دیا جس پر وہ روٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ زوبیہ یہ سب دیکھ رہی تھی اس لیے وہ حمنہ کے پاس آئی اور اس سے زین کو اپنے ساتھ گھر لے جانے کی اجازت مانگی۔ حمنہ اس وقت زین کا اپنے بھائی کو لے کر ایکسائیٹمنٹ کو دیکھ کر تھوڑی جھجکی مگر اسے کچھ دیر پہلے ہونے والا واقعہ یاد آیا اور پھر زین کی بیجا ضد کا سوچ کر اس نے ہامی بھر لی۔ شارق نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی۔

☆☆☆

"آپ کے مما پاپا نہیں چاہتے کہ آپ ابھی ان کے ساتھ اسپتال میں رکیں۔ وہ بے بی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اس لیے آپ کو میرے ساتھ گھر بھیج دیا ہے۔" اس کی زبان پھر زہر اگل رہی تھی جبکہ بچے کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر رواں تھا۔

"میں نے تو بے بی کو پیار کیا تھا اور گود میں بھی اٹھایا تھا پھر بھی مجھے کیوں واپس بھیج دیا انھوں نے؟"

وہ تلخی سے بولی۔ "اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے کہ آپ اسے گود میں اٹھائیں یا پیار کریں۔ دیکھا نہیں تھا کہ آپ کے پاپا نے کیسے سب کے سامنے آپ کو بے بی کی وجہ سے ڈانٹ دیا تھا کیونکہ وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں اور بے بی سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

بچہ یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

زندگی اچانک ہی بہت مصروف ہوگئی تھی۔ گھر کے کاموں اور ننھے آذر کی ذمہ داریوں میں حمنہ کے پاس سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے جو سوچا تھا کہ زین کو وقت دے گی وہ بات خیال ہو کر رہ گئی تھی پھر ویسے بھی زوبیہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی کہ حمنہ زین کی جانب سے بالکل بے فکر ہوگئی تھی۔ اس کا تعلق بس اتنا رہ گیا تھا کہ رات کا کھانا کھا کر وہ سو جاتا اور صبح جب حمنہ رات بھر آذر کو سنبھال کر سوئی ہوئی ہوتی تو زوبیہ اسے تیار کرکے اسکول لے جاتی جہاں سے واپسی پر وہ سیدھا اسی کے پاس چلا جاتا۔ حمنہ زوبیہ کی بے حد شکر گزار تھی جو کڑے وقت میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

چند دن پہلے زین ضد پر اڑ گیا کہ وہ رات کو حمنہ کے ساتھ سوئے گا جو آذر کے ہوتے ہوئے مشکل سی بات تھی۔ شارق نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ بالآخر حمنہ نے اسے اپنے ساتھ سونے کے لیے لٹا لیا۔ وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی جب آذر دودھ کے لیے رویا تو وہ اٹھ کر آذر کے پاس چلی گئی اور پھر وہیں سو گئی۔ آنٹی نے بتایا تھا کہ اس بچے کے ساتھ بھی اسٹوری میں یوں ہی ہوا تھا۔ زین ساری رات بے آواز روتا رہا۔

☆☆☆

"میں ایسا کیا کروں جس سے میرے مما پاپا پھر سے پہلے جیسے ہو جائیں؟" وہ بچے کے سر میں تیل لگا رہی تھی جب اس نے معصومیت سے دریافت کیا۔

اس کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمک اٹھیں اور وہ بولی۔ "یہ تو ناممکن ہے!"

بچے کا چہرہ بجھ گیا۔ "آنٹی کوئی تو ترکیب ہوگی جس سے میرے مما پاپا مجھ سے پہلی جیسی محبت کرنے لگیں۔"

اس نے تیل کی بوتل سائیڈ پر رکھی اور خاموشی سے تولیے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔

"بتایئے ناں آنٹی آپ تو اتنی جینیس ہیں۔ آپ کے پاس ضرور کوئی ترکیب ہوگی۔" مگر اس نے جواب دینے کے بجائے بے نیازی سے پاس رکھا میگزین اٹھا لیا۔ بچے نے غصے سے اس کے ہاتھ سے میگزین جھپٹ لیا۔

"زین! یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ غصے سے بولی۔

زین نے میگزین اپنی کمر کے پیچھے چھپا لیا اور ضدی لہجے میں بولا۔ "نہیں! یہ میگزین میں آپ کو تب دوں گا جب آپ مجھے کوئی ترکیب بتائیں گی۔"

زوبیہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور لمبی سانس لے کر بولی۔ "ٹھیک ہے ایک ہی طریقہ ہے بس مگر تم شائد اس پر عمل نہ کرسکو۔"

زین بیتابی سے اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ "بتایئے ناں آنٹی، آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا۔ بس

میرے مما پاپا مجھے پھر سے واپس مل جائیں۔“
زوبیہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور دھیرے دھیرے بتانے لگی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ سب لوگ نیند میں مدہوش تھے مگر کوئی تھا جو اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ جب گھڑی نے دو بجے کا اعلان کیا تو وہ حرکت میں آیا اور اپنے کمرے سے باہر نکلا اور دبے قدموں سے اپنے والدین کے کمرے کی جانب بڑھا۔ گھر کے در و دیوار اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ اس نے ادھ کھلے دروازے سے چپکے سے اندر جھانکا، کمرے میں شارق کے خراٹے گونج رہے تھے جبکہ دس ماہ کا آذر اس کی ماں کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت وہ دونوں بھی سو رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر بغیر کوئی آواز کیے آذر کو گود میں اٹھا لیا اور اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور ابھی وہ چوروں کی طرح گھر کے دروازے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ آذر اس کی گود میں ہلکا سا کسمسایا اور پھر زور زور سے رونے لگا۔ رات کے سناٹے کو چیرتی یہ آواز بھی بہت دور تک گئی ہوگی۔ اس اچانک اُفتاد سے زین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا گھر کی لائٹس ایک ایک کر کے کھلتی چلی گئیں۔ سب سے پہلے اسے حمنہ کی شکل دکھائی دی جو پریشانی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل رہی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے شارق کی گھبرائی ہوئی شکل نظر آئی۔

زین کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں ہے۔ حمنہ نے یہ منظر بے یقینی سے دیکھا اور چیل کی طرح جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے روتے بلکتے آذر کو لے لیا۔ شارق ایک لمحے کو ٹھٹکا اور جب اس پر صورتِ حال واضح ہوئی تو بے اختیار وہ زین پر ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ ”بول، اس وقت کہاں لے کر جا رہا تھا تو اپنے بھائی کو؟ یہ آدھی رات کو چوروں کی طرح! اگر یہ نہ روتا تو تو اسے کہاں لے جانے والا تھا!“

زین بری طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ گیٹ پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک ایک کر کے محلے دار اکٹھے ہونے لگے۔ حمنہ ایک طرف آذر کو سینے سے چمٹائے کھڑی تھی۔ غصہ تو اسے بھی بہت آیا تھا مگر وہ زین کو مزید پٹتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر شارق کو روکا اور زین کو محبت سے خود سے چمٹا لیا۔

”میرے بچے یہ تم کیا کرنے جا رہے تھے؟ میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ بتاؤ کس نے تمہیں ایسا کرنے کو کہا ہے؟“ زین بری طرح سہما ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشانات پڑ گئے تھے جبکہ گال تمتما رہے تھے۔

محلے والے بھی حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ حمنہ کے پوچھنے پر زین نے ڈرتے ڈرتے جو نام لیا اسے سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ زین کے مطابق زوبیہ نے اسے کہا تھا کہ وہ رات کو جب سب سو جائیں تو وہ چپکے سے آذر کو اٹھا کر اس کے گھر لے آئے۔ وہ آذر کو اپنے پاس رکھ لے گی اور پھر اس کے مما پاپا اسے دوبارہ پہلے کی طرح ٹائم دینے لگیں گے۔ شارق اسی وقت محلے کے دوسرے لوگوں کے ہمراہ زوبیہ کے گھر کی طرف چل پڑا جو پہلے ہی یہ شور سن کر فرار ہو چکی تھی۔ اس کے گھر پر تالا پڑا تھا اور اس کی گاڑی بھی غائب تھی۔ وہ لوگ ناکام واپس گھر آ گئے جہاں پڑوس کی عورتیں حمنہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ زین بھی چپ چاپ سے ڈرا ہوا اس سے چمٹا بیٹھا تھا۔ حمنہ نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے بالکل بھی ڈانٹا ڈپٹا نہیں تھا۔ وہ اور شارق اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ زوبیہ نے یہ تمام کھیل کس طرح زین کے کچے ذہن کو برین واش کر کے کھیلا ہے مگر اس کا مقصد کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کمپاؤنڈ کے سیکرٹری مظہر صاحب کی ہدایت پر سب اپنے گھروں کو جانے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر اس سے پہلے انہوں نے کہا کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے زوبیہ کے خلاف رپورٹ درج کرائی جائے گی تاکہ ایسی حرکت وہ پھر نہ کرے۔ یہ جرم ہی نہیں ظلم بھی ہے۔ باقی لوگوں نے بھی ان کی تائید کی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ پھر کسی دوسرے کے ساتھ ایسی حرکت کرے گی۔

شارق اور حمنہ نے باقی رات جاگ کر گزاری۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زوبیہ نے اتنی رکیک حرکت آخر کس مقصد کے تحت کی تھی۔ زین وہیں حمنہ کی گود میں سر رکھے رکھے ہی گہری نیند سو گیا تھا۔ نیند میں بھی وہ ہولے ہولے سسکیاں لے رہا تھا۔ حمنہ نے جھک کر اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

صبح ہوتے ہی شارق مظہر صاحب اور دیگر کے ہمراہ تھانے گیا اور زوبیہ کے خلاف رپورٹ درج کروائی۔ علاقے کا ایس پی مظہر صاحب کا رشتے دار تھا اس

نے یقین دلایا تھا کہ کیس میں پیشرفت ہوگی اور زوبیہ بہت جلد پولیس کسٹڈی میں ہوگی۔ جب شارق واپس پہنچا تو زین جاگ چکا تھا اور وہیں لاؤنج میں بیٹھا اپنی گاڑیوں سے کھیل رہا تھا۔ شارق کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ کھیل چھوڑ کر خوفزدہ سا ہو کر حمنہ کے پاس بھاگا اور اس کے پیچھے چھپ گیا کہ مبادا اسے پھر سے باپ کے ہاتھوں گزشتہ رات کی طرح مار کھانی پڑے۔ شارق کو اس کی حرکت پر بے اختیار پیار آ گیا اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے چاکلیٹ نکال کر ہوا میں لہرائی جو وہ اسی کے لیے لے کر آیا تھا۔ زین نے حیرت سے شارق کی شکل دیکھی پھر پلٹ کر حمنہ کی طرف دیکھا گویا اجازت لے رہا ہو۔ حمنہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ دوڑ کر شارق کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ سے چاکلیٹ لے کر اس سے لپٹ گیا۔ شارق نے اسے بے اختیار چوم لیا تو وہ حیرت سے پلٹ کر اس کی شکل دیکھنے لگا اور بولا۔ ”پاپا کیا آپ مجھ سے اب بھی محبت کرتے ہیں؟“

اس کے معصومانہ سوال کو سن کر شارق نے اسے دو تین پیار اور کر ڈالے اور بولا۔ ”مما پاپا آپ سے بہت محبت کرتے ہیں بیٹا!“

☆☆☆

فون زور زور سے بج رہا تھا۔ حمنہ نے فون اٹھایا تو دوسری جانب تھانے سے کوئی بات کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ زوبیہ نامی عورت جس کے خلاف انھوں نے ڈیڑھ سال پہلے شکایت درج کرائی تھی۔ وہ آج صبح گرفتار کر لی گئی ہے۔ شناخت کے لیے شارق کو تھانے بلایا جا رہا تھا۔ شارق اسی وقت تھانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ حمنہ بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ آج اتنے عرصے بعد اس راز سے پردہ اٹھ ہی جاتا تھا کہ زوبیہ نے ان کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کیوں کھیلا۔ شارق کی واپسی تین چار گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ مکمل تفصیلات لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس سارے ڈرامے کے پیچھے وہی لڑائی کار فرما تھی جو حمنہ اور زوبیہ کے بیچ ہوئی تھی۔

زوبیہ انتہائی منتقم مزاج عورت تھی اور سونے پر سہاگا وہ مجرمانہ ذہنیت کی مالک بھی تھی۔ اس کے شوہر نے اسے طلاق بھی انھی وجوہات کی بناء پر دی تھی۔ زوبیہ نے قبول کیا تھا کہ حمنہ سے معافی مانگنا اس کے گھناؤنے پلان کا حصہ تھا۔ دراصل جب اسے خبر ملی تھی کہ حمنہ اس وقت اُمید سے ہے تو اس کے ذہن میں ایک منصوبے نے جنم لیا جس سے اس کے اندر بدلے کی سلگتی آگ بھی ٹھنڈی ہو جاتی اور اس پر کوئی الزام بھی نہ لگتا چنانچہ اس نے سب سے پہلے حمنہ سے دوستی کا کھیل رچایا۔ اس کا اصل ہدف زین تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسی کے ذریعے وہ گھر میں قدم جما سکتی ہے۔ زین کے ساتھ اس نے دوستی کی اور پھر اس کو اپنے ماں باپ کے خلاف برین واش کرنا شروع کر دیا۔ اس عمل کا مقصد تھا کہ حمنہ جو اُمید سے تھی اسے اور اس کے ہونے والے بچے کو نقصان پہنچایا جائے بلکہ اس کا بچہ دنیا میں آ ہی نہ سکے۔ اس نے زین کے ذریعے وہ ربڑ کا سانپ حمنہ کو ڈرانے کے لیے اس کے پیروں پر ڈلوایا مگر اللہ کے کرم سے حمنہ یہ وار سہہ گئی۔ زوبیہ ہار ماننے والی نہ تھی مگر ایک دن نیوز میں بچوں کے اغوا کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں کی خبر دیکھتے ہوئے اسے آئیڈیا ہوا کہ وہ حمنہ کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیلے گی کہ وہ زندگی بھر کے لیے تڑپتی رہے گی۔ اسی لیے زوبیہ نے انتہائی چالاکی اور مہارت سے جال بچھایا۔ زین کے معصوم ذہن کو برین واش کر کے اسے ماں باپ اور بھائی کے خلاف سخت برگشتہ کر دیا اور اسے اس نہج پر پہنچا دیا کہ وہ اپنے بھائی سے پیچھا چھڑانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو گیا۔

اس کے بعد زوبیہ نے اپنے ایک دوست کے ذریعے چند بدمعاشوں سے رابطہ کیا اور ان سے ڈیل طے پا گئی۔ پلان کے مطابق رات کے اندھیرے میں زین اپنے بھائی کو لے کر اس کے گھر پہنچا اور وہاں موجود بدمعاش ان دونوں کو وہاں سے اٹھا لے جاتے اور آگے کسی جرائم پیشہ گروہ کو بیچ دیتے۔ زوبیہ کو اس کام کے لیے تگڑی رقم بھی ملتی اور اس پر کوئی الزام بھی نہ آتا۔ دوسری طرف حمنہ کو زندہ درگور کر کے اس کا مقصد بھی پورا ہو جاتا بہرحال اب تو پولیس نے زوبیہ پر دھوکا دہی اور اقدام قتل جیسی دفعات لگا کر اسے جیل بھیج دیا تھا۔

شارق کی زبانی یہ سب سن کر حمنہ تھرا کر رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زوبیہ انتقام لینے کے لیے اس حد تک گر سکتی تھی۔ اگر اس رات آذر نہ روتا تو آج اس کے بچے اس کے پاس نہ ہوتے اور حمنہ تو ان کے غم میں کب کی پاگل ہو چکی ہوتی۔ بیشک مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ حمنہ نے زین اور آذر کو سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں ہو گئے۔

بد خصلت

جناب مدیراعلیٰ
سلام تہنیت
سرگزشت میں لوگ آپ بیتیاں لکھتے ہیں، میں جگ بیتی کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ یہ ایوب خان منظور خان اور منصور خان کی روداد ہے لیکن اس سرگزشت میں ہر ایک کے لیے ایک پیغام بھی ہے سبق آموز پیغام جس کا ادراک آپ کو اس سرگزشت کے اختتام پر ہو جائے گا۔
تفسیر عباس بابر
(اوکاڑہ)

''ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا'' وہ مہربانو کی جھیل سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''پھر بھی قوی اُمید ہے کہ ابا جان تمہیں بہت خوشی سے بہو تسلیم کرلیں گے۔''
بہو کے نام پر اس کا گلابی چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

بلا ارادہ اس نے چند لمحوں کے لیے نظریں جھکالیں۔ وہ اس کی پلکوں کی گھنی جھالر کو محویت سے دیکھ رہا تھا۔

مہربانو اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ اس سے ایک کلاس پیچھے تھی۔ دونوں کی عمروں میں محض ایک

دوسال کا فرق تھا۔وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی نیک مزاج اور سادہ طبیعت تھی۔اس کے والد بینک منیجر تھے اور ماں اسکول میں ٹیچر تھیں۔تعلیم یافتہ اور مہذب فیملی تھی۔زیادہ آزادخیال نہیں تھے تاہم مہربانو کی شادی انہوں نے اس کی پسند پر چھوڑ رکھی تھی لہٰذا کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔وہ پلکیں اٹھاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔''تو پھر کب کرو گے اپنے ابا جان سے بات؟ میرا صرف ایک سال رہ گیا ہے۔تعلیم سے فارغ ہوتے ہی امی ابا کا دباؤ بڑھ جائے گا۔''

''ایک سال بہت وقت ہوتا ہے مہرو۔'' وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔''میں آج گھر جارہا ہوں۔آج ہی ابا جان سے بات کروں گا۔بس اجازت ہی لینی ہے۔مان تو وہ جائیں گے ہی۔''

وہ اسے وارفتگی سے دیکھنے لگی۔اس کے پرکشش چہرے پر کلیاں چٹخ رہی تھیں۔قوس قزح کے رنگ بکھر رہے تھے۔وہ محبت کے یہ رنگ اپنی آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔وہ دونوں کالج کی کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''اوکے خان''اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔''میں رات کو تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔''

''تمہیں کتنی بار کہا ہے خان کا نکتہ نیچے لگایا کرو۔''وہ اسے چھیڑتے ہوئے شوخ لہجے میں بولا۔

وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر زیرلب مسکرادی۔

''اوکے مہرو،اب بچھڑنے کا وقت ہوگیا ہے۔مجھے نکلنا ہوگا۔طویل سفر ہے۔'' کہتے ہوئے وہ کھڑا ہوگیا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی کار میں گاؤں کے لیے روانہ ہوچکا تھا۔شہر کی حدود سے نکلتے ہی اسی کی عمر کا ایک خوبرو نوجوان لفٹ کے لیے سامنے کھڑا اشارہ کررہا تھا۔فطرتاً وہ ایک نرم خو اور مہذب انسان واقع ہوا تھا۔اس لیے اس نے فوراً کار روک دی۔

''تھینک یو''نوجوان اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھتے ہوئے مہذب انداز میں بولا۔''میں اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤں گا۔''

''یو ویلکم ،آپ جہاں تک چاہیں میرے ساتھ سفر کرسکتے ہیں۔''اس نے خوشگوار لہجے میں گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا نام رضوان بتایا تھا۔اس کا اپنا بزنس تھا۔اسی سلسلے میں وہ کہیں جارہا تھا کہ راستے میں اس کی گاڑی خراب ہوگئی۔ان کے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔کار خاصی تیز رفتاری سے سڑک پر بھاگ رہی تھی۔اگلا اسٹاپ بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔اچانک خان کے موبائل فون کی رنگ ٹیون سنائی دینے لگی۔اس نے ساتھ والی سیٹ سے موبائل فون اٹھایا۔اسکرین پر مہربانو کا نام جگمگارہا تھا۔اس نے کال ریسیو کرنے کا ارادہ کیا۔دفعتاً اس کی نگاہ سامنے ونڈ اسکرین پر پڑی۔ایک تیز رفتار ٹرک گاڑی کے عین سامنے تھا اور آگے بڑھ رہا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا۔ٹرک ایک دھماکے کے ساتھ بائیں طرف ٹکرایا۔داہنی طرف کا دروازہ کھل گیا اور وہ باہر جاگرا۔اسی طرف کی سیٹ پر تھا وہ نیچے گرنے سے پہلے دم توڑ گیا۔اس کا سر بری طرح زخمی ہوا تھا اور لڑھکتا ہوا سڑک کی دوسری جانب نشیب میں چلا گیا۔یہاں جھاڑیوں کی بہتات تھی۔وہ بیہوشی کے عالم میں انہی جھاڑیوں میں روپوش تھا۔ٹرک برق رفتاری سے آگے بڑھ چکا تھا۔خان کی گاڑی سے رضوان کی لاش اور دو عدد موبائل فون ملے تھے۔خان کا موبائل ٹھیک حالت میں چل رہا تھا جبکہ رضوان کا موبائل فون بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔رضوان کی جیب سے سوائے چند ہزار کی رقم کے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔

☆......☆

ایوب خان کی تدفین ہوچکی تھی۔مہمان بھی رخصت ہوچکے تھے۔منظور خان خالی حویلی کے درودیوار کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔اب یہ حویلی اسے آسیب زدہ لگ رہی تھی۔تاحدنگاہ وحشت دویرانی کا راج تھا۔سورج نے شام کی گود میں سر ڈال دیا تھا اور اندھیرے کی چادر تان دی تھی۔اندھیرے بڑھے تو منظور خان کی وحشت فزوں تر ہوگئی۔حویلی کے صحن میں بچھی چٹائی پر وہ بیٹھا تھا۔اسے سردی کا احساس ہوا۔بوڑھے جسم کی لرزش نے اسے اٹھ کر اندر جانے پر مجبور ہوگیا۔اٹھتے ہوئے اس نے بلاارادہ اپنے آس پاس دیکھا۔نوکر چاکر مختلف کاموں میں مصروف تھے۔منصور خان منظر سے غائب تھا۔مضمحل وجود کے ساتھ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔کھانے کے نام پر وہ کچھ مہمانوں کے اصرار پر چند لقمے لے چکا تھا۔اسے اپنا ہی نہیں اپنے گاؤں کے غریب اور بے اختیار لوگوں کا مستقبل بھی تاریک نظر آرہا تھا۔

راہداری سے گزرتا ہوا وہ بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا۔اس کے کمرے سے پہلے

منصور خان کا کمرا تھا۔ جس کا دروازہ نیم وا تھا۔ بلب کی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔

"مبارک ہو منصور خان اب تم ہر چیز کے مالک و مختار ہو۔" ایک مردانہ آواز نے اس کے قلزم ہستی کی بنیادیں تک ہلا کے رکھ دیں۔ آواز منصور کے کمرے سے آئی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر ٹھٹک گیا۔

"تمہارے راستے کی رکاوٹ ختم کردی ہے۔"

آواز دوبارہ سنائی دی۔ "بس اب تم قبضہ لے لو۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ موجاں ای موجاں۔"

"جہانگیرے، ایک رکاوٹ ہے یار۔" منصور کی مکروہ آواز آئی۔ "تم نہیں جانتے میرا ابا ایوب اسے کتنا پیار کرتا تھا اور اب وہی رکاوٹ ہے۔"

"اوئے منصور، بڑی بلا تو ٹل گئی ناں۔" جہانگیر کی آواز آئی۔ "یہ چھوٹا سا روڑا ہے، خود ہی راستے سے ہٹ جائے گا۔ ایوب کے بعد اب وہ اور کتنی دیر جیے گا۔"

"اوئے ذرا آہستہ بول، اور مجھے یہ بتا یہ تدبیر تجھے کیسے سوجھی۔" منصور نے کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کافی دن لگیں گے حکومت ہاتھ آنے میں۔"

"یار آہستہ ہی بول رہا ہوں، اور ویسے بھی اب یہاں کون ہے، جس کا تجھے ڈر ہے۔"

"یار دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" منصور نے کہا۔

"اب دیواریں بھی تیری ہیں اور ویسے بھی دیواریں گونگی ہوتی ہیں۔" جہانگیر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور ٹرک والے نے پورا ایک لاکھ مانگا ہے۔ وہ مجھے ابھی دے دے۔ اسے فارغ کرنا ہے تاکہ منہ بند رکھے۔"

"اچھا، تمہارا ایک لاکھ میری جیب میں ہے، اور اب پیسوں کی فکر نہ کر، سب کچھ اپنا ہی ہے۔"

منصور کی آواز دروازے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل رہے تھے۔ منظور خان پتھر کا بت بنا اندھیری میں کھڑا تھا۔ اس کے سر پر جیسے بم پھٹ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ منصور اس حد تک گر سکتا ہے کہ اپنے ہی بھائی کو مروا دے۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ اس نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ اس کے جسم پر لرزہ ساطاری ہونے لگا۔ دھڑکتے ہوئے دل، نمناک نگاہوں اور کانپتے قدموں کے ساتھ وہ آگے بڑھنے لگا۔

لیکن قدم اس کی دسترس میں نہ رہے۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ چادر تن گئی۔ وہ تیورا کر نیچے گرا۔ گرنے سے پہلے ہی وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ ہوش میں آنے سے پہلے اسے اس کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ منصور نے اسے اسپتال لے جانا تو درکنار، گاؤں کے ڈاکٹر کو بھی بلا کر دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بلاشبہ وہ شقی القلب انسان تھا اپنے باپ کی موت کا بھی خواہاں تھا، لیکن زندگی موت تو اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔

ہوش آیا تو منظور خان اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ بلا کی سردی تھی لیکن اس کے اوپر کسی نے کمبل یا لحاف تک نہ ڈالا تھا۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں۔ زیرو پاور کے سرخ بلب کی روشنی میں اسے ہر شے سرخ نظر آرہی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن نقاہت نے اجازت نہ دی۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہن کام کرنے لگا۔ اسے منصور اور جہانگیر کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اچانک اسے شدید سردی کا احساس ہوا۔ اس نے بمشکل پائنتی کی طرف پڑا تہہ شدہ کمبل پیر کی مدد سے کھینچا اور اپنے اوپر لے لیا پھر اپنے جواں سال بیٹے ایوب کے تصور میں کھو گیا۔

"بابا میں جارہا ہوں۔" اسے وہ دن یاد آگیا جب ایوب شہر جانے کے لیے تیار ہو کر اس سے ملنے آیا تھا۔

"اتنی جلدی ایوب پتر۔ ابھی تو ہم نے جی بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔ میں نے تو تمہیں تسلی سے دیکھا بھی نہیں۔" وہ بیٹے کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بابا کل میرے پیپر شروع ہو رہے ہیں۔ امتحان کے بعد آؤں گا تو آپ کے قدموں میں ہی رہوں گا۔" وہ اس کے پیروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے مؤدب لہجے میں بولا۔

"تم میرے دل میں رہتے ہو پتر، قدموں میں نہیں۔"

"لیکن ماں کے بعد آپ نے مجھے ماں باپ دونوں کا پیار دیا ہے اس لیے مجھے آپ کے قدموں میں جنت نظر آتی ہے۔" اس کے لہجے نے باپ کو خوشی سے نہال کر دیا۔ اس نے بیٹے کو سینے سے بھینچ لیا۔ پھر الوداعی بوسہ دے کر رخصت کی اجازت دے دی۔ باپ کو اندازہ نہ تھا کہ بیٹا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے، اور وہ جان بھی کیسے سکتا تھا۔ تقدیر کے ارادوں سے انسان بے خبر ہی تو ہوتا ہے۔

گزرے ایام یاد آئے تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایوب اسے

چھوڑ کر جا چکا ہے۔

''ایوب'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ لیکن جانے والے کب کسی کی سنتے ہیں۔ آواز کی بازگشت ختم ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے آنسو رخساروں کی سلوٹوں میں تیر رہے تھے۔ ''ایوب پتر۔ میری جسے کی موت تمہیں کیوں آ گئی۔'' اس کے لہجے میں کرب و ملال کی آمیزش تھی۔ ''پر میں ہمت نہیں ہاروں گا۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا بمشکل اٹھ کر بیٹھا۔ ''تمہارے قاتلوں کو سزا دلواؤں گا۔ اس گاؤں کے لوگوں کو ظلم کا شکار نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظر اپنے کمرے کے دروازے پر پڑی۔ منصور خان دروازے کے وسط میں کھڑا اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

''کیا بڑ بڑ لگا رکھی ہے کن قاتلوں سے انتقام لو گے؟ وہ تمہیں مجھ سے بھی پیارا تھا۔ پر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔''

''اوئے بدبختا، تو نے بڑا ظلم کیا ہے۔ تو نے اپنے بھائی کو مروا دیا؟ مجھے شرم آ رہی ہے یہ سوچ کر کہ تو میرا بیٹا ہے'' وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولا۔

''اچھا اچھا، مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تجھے ابا کہنے کا، وہ جیسے بھی مرا، مر گیا ہے، تو اسے قتل ثابت نہیں کر سکتا اور زندگی کے باقی دن آرام سے رہ ورنہ......'' اس نے گستاخ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ورنہ، تو مجھے بھی مار ڈالے گا۔ یہ میں جانتا ہوں لیکن اب میں اپنے پتر کے بعد جی کر کروں گا بھی کیا۔''

منصور اسے چند لمحے بے تاثر نگاہوں سے گھورتا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔ منظور خان بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر رونے لگا تھا۔ غم کی ۔۔۔ زیادتی نے دماغ کی شریانوں میں خون کا دباؤ بڑھا دیا تھا اور اس دباؤ کا سیدھا اثر حرام مغز پر پڑا تھا جس کا نتیجہ فالج کی صورت میں نکلا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا، لیکن بولنے کی قوت تک سلب ہو چکی تھی۔ کیونکہ زبان بھی اکڑ گئی تھی۔ شیطان صفت منصور ایسے ہی موقعے کی گھات میں تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ صبح ہونے سے پہلے زمینوں کا وارث تبدیل ہو چکا تھا۔

☆......☆

جاگیر کا نظم و نسق سنبھالتے ہی منصور خان اپنی اوقات پر آ گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے حویلی کے پرانے ملازمین کو نوکری سے فارغ کیا۔ منشی رحمت سے زمینوں کا حساب کتاب لے کر اپنے منظورِ نظر غلام محمد کے حوالے کیا۔ گاؤں کے بورڈ پر منظور آباد کی جگہ منصور پور لکھ دیا گیا۔ یہ انقلاب آناً فاناً ہی قیامت کی طرح برپا ہوا تھا۔ گاؤں کے غریب لوگ پریشان انگشت بدنداں اور خوفزدہ تھے۔ وہ جس بدقماش آدمی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، آج وہی ان کا سربراہ بن بیٹھا تھا۔

منظور خان مفلوج پڑا تھا لیکن منصور خان نے اس کے علاج پر مطلوبہ توجہ نہ دی۔ اس کی بجائے ہر چیز پر قابض ہو گیا۔ اس انقلاب کے پیچھے، ان گنت سازشیں، مکروہ کوششیں اور تھیں ورنہ منظور خان نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ اس کا بدصفت بیٹا منصور خان گاؤں اور زمین و جائیداد کی باگ ڈور سنبھالے۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ یہ ہونی بھی ہو کر رہی۔ اب سینکڑوں ایکڑ اراضی، پیٹرول پمپ، فلور مل اور شیلر کا بلاشرکتِ غیرے منصور خان مالک و مختار تھا۔ اس کی ماں ایک سال پہلے بیمار ہو کر چل بسی تھی۔ منظور خان کی اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسرا بیٹا ایوب خان تھا جو کہ روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ جو انتہائی شریف ہونہار اور منکسر المزاج تھا جبکہ منصور خان اس کے برعکس ثابت تھا۔ اٹھائیس سال عمر، لمبا تڑنگا، کھردرے نقوش اور گھنی نوکیلی مونچھیں، جارحانہ مزاج، بلا کا ضدی اور رشتوں کے تقدس و احترام سے ناآشنا، وہ چند جماعتیں پڑھ کر ہی اسکول سے باغی ہو گیا تھا۔ منظور آباد چھوٹا سا گاؤں، جس کی آبادی کم و بیش تین ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ محنت مزدوری کرتے تھے۔ گاؤں کے وسط میں منظور خان کی عظیم الشان حویلی اس کی شان و شوکت کی مظہر تھی اور اب اس شان و شوکت کا مالک منصور خان تھا۔

جہانگیر گوندل منصور کے پڑوسی گاؤں ساون پور کا رہائشی تھا انتہائی بدصفت اور اخلاق باختہ آدمی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ماں باپ عرصہ قبل چل بسے تھے۔ پہلے وہ بس ڈرائیور تھا۔ ان دنوں بیروزگار تھا۔ چند مرلے پر مشتمل اس کا چھوٹا سا گھر مین بازار کی نکڑ پر واقع تھا۔ کچھ ماہ پہلے وہ ایک جواں سال لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ لوگوں کے استفسار پر اس نے اسے اپنی بیوی بتایا تھا۔ سب نے اس کی بات مان تو لی تھی مگر مطمئن نہیں ہوئے تھے کیونکہ اس کی بیوی بلا کی حسین تھی۔ اسے دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے۔

بیوی کا نام طاہرہ تھا لیکن وہ اسے تارو کہہ کر بلاتا تھا۔

وہ اسے لاری اڈے پر ملی تھی۔ ڈری ڈری سہمی سہمی۔ وہ

گرگِ باراں دیدہ آدمی تھا۔ پہلی ہی نظر میں بھانپ گیا تھا کہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے یا کسی مصیبت میں ہے۔ وہ دبے پاؤں اس کے قریب پہنچ کر آہستگی سے بولا تھا۔ ''کہاں جانا ہے بی بی؟ اب تو آخری بس بھی نکل گئی ہے۔''

تارو نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کے بعد آنسوؤں کی نمی نظر آنے لگی تھی۔

''پپ۔ پتا۔ نہیں میں نے کہاں جانا ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

اس کے شک کو تقویت مل گئی تھی کہ لڑکی واقعی مصیبت میں ہے۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں شیطانی منصوبے نے سر ابھارا تھا۔ وہ مکارانہ لہجے میں بولا تھا۔ ''اگر میں آپ کی کچھ مدد کردوں تو مجھے خوشی ہوگی۔ کچھ دیر بعد یہاں پولیس آجائے گی اور آپ کو پتا ہی ہے زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔''

پولیس کے نام پر وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح بدک سی گئی تھی۔ یوں جیسے شکاری اس کا نشانہ لے کر لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھا رہا ہو۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور بولا تھا۔ ''بی بی میں شریف آدمی ہوں۔ اگر آپ مجھ پر بھروسا کریں تو میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ کل جہاں مرضی چلے جانا۔''

تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوگئی تھی، کیونکہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی، اور اس کا محبوب اس سے زیورات اور نقدی وغیرہ لے کر فرار ہو گیا تھا۔ ان دونوں کا موبائل فون پر رابطہ ہوا تھا اور بات یہاں تک آپہنچی تھی۔

جہانگیر اس کی داستان سن کر تفہیمی انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا تھا۔ ''کیا دور آگیا ہے۔ موبائل فونوں نے لوگوں کی مت ہی مار کے رکھ دی ہے۔''

وہ آٹو رکشے سے اتر کر سادن پور کی طرف جا رہے تھے۔ اس کا گھر اسٹاپ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

''اچھا فکر نہ کرو۔ کل میں تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔'' وہ آپ سے تم پر آتے ہوئے بولا۔

''مم میرا بھائی تو مجھے گولی مار دے گا۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

طاہرہ نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ڈیڑھ سو کلومیٹر کا سفر کرکے بہاولپور سے یہاں آئی تھی۔ محبت کے نام پر وہ برباد ہو چکی تھی۔

''تو نے تو مجھے بھی الجھن میں ڈال دیا ہے۔'' وہ تشویش زدہ لہجے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب میں تمہیں ایسے بے سہارا چھوڑ بھی نہیں سکتا اور اپنے گھر میں رکھوں تو لوگوں کو کیا بتاؤں گا؟''

''کک کوئی بہانہ بنالیں۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

وہ دوبارہ سوچنے کی اداکاری کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا، ایک ہی طریقہ ہے۔ میں لوگوں سے کہوں گا کہ ہم میاں بیوی ہیں۔''

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

''میرا مطلب ہے لوگوں کے منہ بند ہوجائیں گے اور تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں اعتراض ہے اور تم جانا چاہو تو۔۔۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ نیم اندھیرے میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ جہانگیر اونچا لمبا اور قبول صورت آدمی ہے۔

گھر پہنچتے ہی جہانگیر نے اس کا موبائل فون لے کر آف کردیا تھا۔ وہ کھانا شہر سے لے کر آئے تھے۔ ایک کمرے پر مشتمل چھوٹے سے گھر میں کچھ زیادہ سامان نہیں تھا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ ایک دو دن آرام سے گزر گئے۔

اس نے اپنی شیطانی خواہشات کو بمشکل دبائے رکھا۔ تیسرے دن وہ غمناک اور گھبرائے ہوئے چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ طاہرہ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ پولیس اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ الغرض اس نے اسے خوب ڈرایا اور خود سے نکاح پر آمادہ کرلیا اور وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے تھے۔

اٹھارہ سالہ پُرکشش طاہرہ اب جہانگیر کی بیوی بن چکی تھی جو کہ عمر میں اس سے دس سال بڑا تھا۔

''تیار ہوجا تارو'' نکاح سے کافی دن بعد وہ اس کے ہاتھ سے چائے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''آج میں ترپ کا پتا کھیلن آیا ہوں۔ اب لکشمی ہمارے آگے پیچھے رہے گی۔''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''لکشمی کون ہے؟''

اس نے بلند قہقہہ لگایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تارو...... تو واقعی بھولی ہے۔ انڈین ڈرامے بھی نہیں دیکھتی ہے۔ ارے لکشمی دولت کو کہتے ہیں۔ بس دو چار دن انتظار کر اور پیسا سنبھالنے کے لئے جگہ بنالے۔ فی الحال یہ ایک لاکھ روپیا ہے، اسے سنبھال کے رکھ۔''

وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔ البتہ وہ یہ ضرور سمجھ گئی تھی

کہ جہانگیر اسے پسند کرنے لگا ہے۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایک ذرا سی بھول نے اسے ڈھول بنا دیا تھا۔ وہ پڑھی لکھی ہو کر بھی ایک جاہل گنوار کے پیر دبانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

جہانگیر چارپائی پر نیم دراز تھا۔ منصور کی بابت سوچ رہا تھا۔ اس نے منصور کے کہنے پر ایوب کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سوچتی ہوئی نظروں سے تارو کو دیکھنے لگا۔

☆......☆

صبح ہوتے ہی وہ منصور خان کی حویلی میں آن دھمکا۔ منصور اس وقت لان میں سردی کی دھوپ سینک رہا تھا۔ نوکر چاکر روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ ٹیبل کے اردگرد چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس پر بیٹھتے ہوئے جہانگیر نے کہا۔

"کیا چل رہا ہے منصور خان؟" وہ رسمی علیک سلیک کے بعد بولا۔ "آج تو کسی گہری سوچ میں گم ہو۔"

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا۔ منہ سے دھوئیں کا مرغولہ خارج کیا، اور آہستگی سے بولا۔ "جہانگیر تم جانتے تو ہو کہ میرا مسئلہ کیا ہے۔ ابا مفلوج ہو گیا ہے اگرچہ کہ سب کچھ اب میرا ہی ہے لیکن قانونی طور پر کچھ بھی میرا نہیں ہے۔ سب کچھ ابا کے نام ہی ہے۔ میری آج وکیل سے بات ہوئی ہے۔ جب تک ابا کاغذات پر دستخط......"

"منصورا!" وہ مکارانہ لہجے میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "جب ابا ہی مفلوج ہو گیا ہے تو اب رکاوٹ کیسی۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ باپ کے بعد سب کچھ اولاد ہی سنبھالتی ہے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے لیکن وصیت میں لکھا ہے کہ ابا کی موت کے بعد سب کچھ میرا ہوگا کیونکہ ایوب تو اب رہا نہیں۔ پر ابا ابھی زندہ ہے۔" وہ نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا احمقانہ باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔ اب وہ اور کتنے دن جیے گا؟ وہ تو مردوں سے بدتر ہے۔ اسے فالج کا فل اٹیک ہوا ہے، اور ایسے مریض کہاں بچتے ہیں۔ کچھ دن انتظار کر پھر سب کچھ تیرا ہی ہوگا، بلکہ اب بھی تیرا ہی تو ہے۔"

جہانگیر کی بات پر وہ اسے چند لمحے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔ "وکیل کہتا ہے ابا کا علاج کسی بڑے ڈاکٹر سے کرواؤ اور میں اس حق میں نہیں ہوں۔ کیا پتا کوئی دوائی کام کر جائے اور میرا کام تمام ہو جائے۔"

"لاٹھی تمہارے ہاتھ میں ہے تو ظاہر ہے بھینس بھی تمہاری ہی ہے۔ میں تمہیں ایک مشورہ دینے آیا ہوں۔"

"ہاں بول جہانگیر۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہے تو میرا مخلص اور پکا سچا یار ہے کوئی اچھا مشورہ ہی دے گا۔"

جہانگیر کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں پتا ہے گاؤں کے لوگ تمہیں اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ تمہاری عزت نہیں کرتے بلکہ عزت کرنے پر مجبور ہیں یا یوں سمجھ لو کہ تم سے ڈرتے ہیں۔"

اس نے سامنے ٹیبل پر پڑا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا، ایک سگریٹ نکالی اور اسے دیا سلائی دکھا دی۔ وہ دوبارہ بولا۔ "بخشو کی بیٹی کے واقعے کے بعد تو کوئی تمہیں دیکھنے کا روادار بھی نہیں لیکن اب معاملہ اور ہے۔ تم ان لوگوں میں گھل مل جاؤ اور یہ ظاہر کرو کہ اب بالکل بدل گئے ہو۔ ایوب کی موت اور ابا کی بیماری نے تمہیں توڑ کے رکھ دیا ہے۔ جب لوگ تمہارے ساتھ ہو جائیں گے تو تم مضبوط ہو جاؤ گے۔"

"بڑی گہری بات کی ہے تم نے جہانگیرے۔" وہ مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اچھا" بتا کیا یہی مشورہ لے کر آیا ہے یا......"

"نہیں خاص مشورہ تو ابھی دینا ہے۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "بس چپ کر کے میری باتوں پر عمل کرتے جاؤ۔"

"وہ تو میں کر ہی رہا ہوں۔ چل بتا...... کیا مشورہ ہے؟" اس نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

اس دوران منصور کا نوکر شرفو چائے رکھ کر جا چکا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

"مشورہ یہ ہے کہ اب شادی کر لو۔" وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اس سے بخشو کی بیٹی صغریٰ والا داغ بھی دھل جائے گا اور تمہارا وارث بھی آجائے گا۔"

"شادی؟" وہ ایک دم چونکتے ہوئے بولا۔ "ہاں یار یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں میں نے، پر میں شادی کس سے کروں گا؟"

"ظاہر ہے کسی لڑکی سے ہی۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''پر ہمارے برابر کی لڑکی ملے گی کہاں؟''

''وہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ برابری کی بات بھی بھول جا۔لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے۔بس تو تیاری کر لے۔''

''کون ہے لڑکی؟''اس نے استفسار کیا۔

''یار ہمارے خاندان کی ہی ہے۔بہت خوبصورت ہے دیکھنے والے اسے کسی اعلیٰ خاندان کا ہی سمجھیں گے اور بے چاری کا کوئی آگے پیچھے بھی نہیں ہے۔شادی تو میں بھی کرسکتا ہوں اس سے، پر میں سیلانی آدمی ہوں اور ویسے بھی میں تمہارا بھلا سوچ رہا ہوں۔''

منصور نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہے، پر لڑکی سے کہاں ملنا ہے؟''

وہ دل میں، یہ مارا، کا نعرہ لگاتے ہوئے بولا۔''میں اسے کل یہاں لے آؤں گا۔ایک دو دن تم دونوں اکٹھے رہنا اور ایک دوسرے کو دیکھ پرکھ لینا۔لڑکی کچھ ٹیڑھے مزاج کی ہے پڑھی لکھی بھی ہے اس لیے پہلے اس کے پر کترنے ہوں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے''اس نے گویا ہامی بھر لی۔''بس یہ صغری کا ذکر بار بار نہ کیا کر۔وہ مجھے یاد آنے لگتی ہے۔''

''او ئے اسے دیکھے گا تو بھول جائے گا صغری کو''وہ گرم لوہے پر چوٹ لگاتے ہوئے بولا۔''بس آج کی رات ہے کل وہ تمہارے پاس ہوگی۔یہیں مولوی بلا کر نکاح کر لیں گے۔ بس تو مجھے ایک لاکھ اور دے جو اس لڑکی کی قیمت ہوگی۔''

رقم ملتے ہی جہانگیر رخصت ہوگیا۔وہ منصور خان کے ماضی کے زخم سے کھرنڈ اکھاڑ گیا تھا۔صغری والا قصہ آج سے دو سال پرانا تھا۔وہ ان کے غریب مزارع بخشو کی اکلوتی بیٹی تھی۔انتہائی خوبصورت صحت مند بالکل گاؤں کی الہڑ مٹیار، ایک دن منصور نے اپنے ڈیرے پر اپنی فرعونیت کے زور سے اسے لوٹ لیا تھا۔چند مہینوں بعد جب اس کے پیٹ میں منصور کے گناہ کا بیج نمو پانے لگا تو وہ اس کے پاس آکر بہت روئی گڑگڑائی لیکن یہ پتھر کا پہاڑ ٹس سے مس نہ ہوا۔تو اس نے زہریلی گولیاں کھا کر خود کو ختم کر لیا تھا۔گاؤں کے لوگ اس اندوہناک حادثے کے محرکات سے آگاہ تھے۔ بخشو پاگل ہوگیا تھا اور اب بھی گلیوں میں گھومتا پھرتا نظر آتا تھا۔خان کی دہشت اور حیثیت نے اس ظلم پر کسی کو لب کھولنے کی اجازت نہیں دی لیکن وہ جانتا تھا جیسے ہی اس کی دہشت کم ہوگی۔لوگ اپنا منہ کھولنا شروع کر دیں گے۔

''اچھا اچھا، زیادہ بک بک نہ کیا کر۔اس کے پاس ہی رہ اور اگر کوئی پوچھے تو بتانا کہ وڈے خان کا علاج ہو رہا ہے۔''

اس نے درشت لہجے میں اپنے سامنے دست بستہ کھڑے ادھیڑ عمر شرفو سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔چشم افلاک یہ تماشہ بھی دیکھ کر محوِ حیرت اور مہر بہ لب تھی۔

☆......☆

''آج تم بہت پریشان لگ رہے ہو، خیریت تو ہے؟''

تارو نے اس کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بے دلی سے چنگیر ہاتھ سے ایک طرف کھسکا دی۔اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور تشویش زدہ لہجے میں بولا۔''پریشان نہیں خوفزدہ ہوں تارو۔''

''ہائے اللہ''وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔''کس سے اور کیوں خوفزدہ ہو جہانگیر؟''

''تارو، اب شاید ہم ایک ساتھ نہ رہ پائیں۔دراصل تمہارے گھر والوں کو پتا چل گیا ہے کہ تم کہاں ہو۔کیا پتا ہم پکڑے جائیں۔تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ کیونکہ وہ تو یہی سمجھیں گے کہ میں ہی تمہیں بھگا کر لایا ہوں۔''یہ کہہ کر وہ اپنے چہرے پر فکر و تشویش کے تاثرات میں اضافہ کرنے کی اداکاری کرنے لگا۔

وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جہانگیر تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔وہ واقعی میں ہمیں مار ڈالیں گے۔ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔''

''کب تک اور کتنا بھاگیں گے؟''وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔''اور اپنا گھر چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے؟''

''پھر بھی کوئی راستہ تو ہوگا جہانگیر۔''

وہ چند لمحوں کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔تارو اسے سراپا سوال بنی دیکھ رہی تھی۔وہ جانتی تھی اس کا سخت مزاج بھائی اسے مار ڈالے گا اور جہانگیر کو بھی نہیں چھوڑے گا۔اس کے دامن میں احساس کے نشتر اور پچھتاوؤں کے زہریلے کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔یہ بات اگر وہ گھر کی دہلیز عبور کرتے وقت سوچ لیتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔نہ ہی وہ ایک جاہل گنوار کی بیوی بنتی لیکن ابھی تو اسے اور بہت کچھ دیکھنا تھا۔سننا تھا سہنا تھا۔

''ایک حل ہے تارو۔''جہانگیر کی آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔''لیکن پتا نہیں تم کیا سمجھو۔''

وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔''جو بھی ہے اب کرنا تو ہے۔تم مجھے بتاؤ کیا حل ہے؟''

تھوڑی دیر میں وہ اسے اپنے اگلے پلان سے آگاہ کر

چکا تھا۔ وہ پتھر کا بت بنی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر بے یقینی سے بولی۔ ”ایسا کیسے ممکن ہے جہانگیر؟ میں تمہاری بیوی ہوں اور تمہاری بیوی ہوتے ہوئے میں اکیلے کسی کے یہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟“

”بس کچھ دن کی بات ہے۔ اسے ورغلانا ہے کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ تمہاری تھوڑی سی التفات مجھے اس کی دولت کا مالک بنادیں گے اور ہمارے سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ اسے پُرامید نظروں سے دیکھنے لگا۔ کندذہن تارو ایک بار پھر اس کی لچھے دار باتوں کے جال میں پھنس گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں تیار ہوں، پر میں اس سے شادی نہیں کروں گی اور نہ ہی شادی پر شادی ہوسکتی ہے۔“

اس نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگلے دس منٹ میں جہانگیر نے اسے سمجھا دیا کہ کیا اور کیسے سب کچھ کرنا ہے۔ اس رات سونے سے پہلے وہ مستقبل کے تانے بانے بنتا رہا۔ چشم تصور میں لاکھوں روپے گنتا رہا۔ سبز باغ دیکھتا رہا۔ اگلی صبح اس نے تارو کو لے کر منصور خان کی حویلی جانا تھا۔

☆......☆

تارو کو دیکھتے ہی منصور دل وجان سے فدا ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش سے زیادہ حرص تھی۔ محبت یا پسندیدگی کم تھی ہوس زیادہ تھی کیونکہ وہ شروع سے ہی بدخصلت تھا۔ وہ محبت ایثار اور وفا جیسے عظیم جذبوں سے قطعی ناآشنا تھا۔ اس کی ہوس کی چکی میں گاؤں کی نہ جانے کتنی لڑکیاں پس چکی تھیں۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تارو جہانگیر کے ساتھ حویلی میں وارد ہوئی تھی۔ وہ عظیم الشان حویلی دیکھ کر مرعوب ضرور ہوئی تھی تاہم منصور کی شخصیت نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ کھردرے نقوش اور سانپ جیسی باریک آنکھیں۔

”اس سے تو جہانگیر ہی بہتر ہے۔“ اس نے دل میں سوچا اور دونوں کا موازنہ کرنے لگی۔ یہاں منصور کا پلڑا بھاری پڑ رہا تھا۔ دولت جاگیر نوکر چاکر، چمچاتی کار، اور جہانگیر کے پاس کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ بھی ایک عورت تھی۔ عقل وشعور رکھتی تھی۔ حویلی کی چکاچوند نے اس کے خوابیدہ ذہن کو متحرک کردیا۔ وہ گہری نظروں سے منصور کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ جہانگیر اس محویت سے فائدہ اٹھا کر رفوچکر ہو چکا تھا۔ وہ منصور کے کمرے میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز تھی اور ازحد قیمتی تھی لیکن اس وقت کمرے میں منصور کو سب سے قیمتی اور خوبصورت شے وہی لگ رہی تھی۔ اضطراری طور پر اس نے سگریٹ سلگایا۔ گہرا کش لیا اور کثیف دھوئیں کا مرغولہ خارج کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے زیادہ باتیں نہیں آتیں نہ ہی میں تم سے تمہاری پچھلی زندگی کے بارے پوچھ تاچھ کروں گا۔ میرے بارے میں جہانگیر نے تمہیں سب کچھ بتادیا ہوگا۔ کیا تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟“

اس اچانک سوال پر وہ سٹپٹا سی گئی لیکن چونکہ وہ ذہنی طور پر اس سوال کی منتظر تھی۔ وہ انداز دلربائی سے بولی۔

”تو جہانگیر نے آپ کو میرے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا ہوگا۔ میں ایک مجبور اور بے سہارا لڑکی ہوں، آپ کو بیوی کی ضرورت ہے اور مجھے سہارے کی لیکن......“

”لیکن کیا؟“ وہ بے تابی سے بولا۔ ”لیکن ہمیں کچھ دن ایک دوسرے کو دیکھنا پرکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ اُمید ہے چند دن بعد ہم دونوں حتمی فیصلے پر پہنچ جائیں گے۔“

”اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ اس کی طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے بولا۔ جب شادی ہی کرنی ہے تو اتنی تفتیش کی کیا ضرورت ہے۔“

”ضرورت مجھے ہے۔“ وہ چائے کا کپ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔ زمانہ اچھا نہیں ہے۔ کیا معلوم کل کو آپ مجھے چھوڑ دیں جب جی بھر جائے تو......“

”ایسا نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے جو چاہو لکھوالو۔“ وہ بدستور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

اس پیشکش پر اس کے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی لیکن جلد بازی اکثر نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

”شکار کو کچھ تڑپنے کا موقع ضرور دینا چاہیے۔“

اس نے سوچا۔ لیکن وہ خود شکار ہوچکی تھی، چائے ختم ہوتے ہی اسے غنودگی سی ہونے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر صوفے پر لڑھک چکی تھی۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ اسے مطلق احساس نہیں ہوپایا۔ پہلے سے طے شدہ پلاننگ کے تحت وہ منصور کی ہوس کا شکار ہورہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ منصور کے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ جسم کے احتجاج نے اسے آگاہ کردیا کہ اس کے ساتھ عہد خلافی ہوچکی ہے۔ اسے بہت دکھ ہوا لیکن اس

نے داو دیا نہیں کیا کیونکہ جلد یا بدیر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا البتہ اس کی پلاننگ ضرور متاثر ہوئی تھی۔ اسی لمحے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ منصور کمرے میں داخل ہوا۔ وہ حسبِ عادت سگریٹ پی رہا تھا اور اسی لمحے اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت سرتاپا انتقام بن کر بیدار ہوگئی۔ وہ اسے سپاٹ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی استہزائیہ لہجے میں بولی۔ اسے منصور سے زیادہ غصہ جہانگیر پر آرہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو کیسے کسی کو سونپا اس لیے کہ یہ سب اس کے بھی علم میں رہا ہوگا۔ اس کھیل میں وہ پوری طرح شامل ہوگا۔ اب وہ اسے بھی نہیں چھوڑے گی۔ اس سے بھی اپنے لٹنے کا انتقام لے گی۔ ''یہ مردانگی تو نہ ہوئی خان صاحب۔ جب آپ سے بات ہورہی تھی تو اتنے تردد کی کیا ضرورت تھی۔ ایک بار تو آپ نے مجھے حاصل کرلیا اب آپ کو یہ حسرت ہی رہے گی۔ میں جارہی ہوں۔''

وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس سے کوئی بات نہیں بن پارہی تھی۔

''کہاں جاؤ گی تم'' وہ بولا۔ ''تمہارا کوئی آگے نہ پیچھے۔''

''آپ کو غلط بتایا گیا ہے جناب۔'' وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ میرے پیچھے بھی بہت لوگ ہیں اور میرے آگے میرا شوہر ہے۔''

''شوہر؟'' وہ ایک دم چونک کر بولا۔ ''تمہارا شوہر بیچ میں کہاں سے آگیا۔''

''بیچ میں شوہر نہیں آپ آئے ہیں۔'' وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

''کون ہے تمہارا شوہر؟''

''وہی جو آپ کا جگری یار بنا پھرتا ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''اور آپ کی دولت پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اب وہ نکاح پر نکاح کرنے کا مقدمہ چلوائے گا۔''

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر پھنکار کر بولا۔

''اگر یہ سچ ہے تو یہ اس کا آخری خواب ثابت ہوگا۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دندناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور پھر سب کچھ آناً فاناً ہوگیا۔ پہلے جہانگیر اور منصور کی بحث اور تکرار کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر اس بحث میں غصہ اور گالی گلوچ بھی شامل ہوگئیں۔ اور بالآخر گولی چلنے کی آواز کے ساتھ یہ بحث و مباحثہ

مناکو (Monaco)

بحیرۂ روم کے ساحل پر جنوب مشرقی فرانس کے اندر مناکو نامی ریاست واقع ہے جس کا رقبہ 1368 ایکڑ ہے۔ یہ ملک تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ مانٹی کارلو، لاکونڈی من اور مناکو۔ موخرالذکر دارالحکومت ہے۔ مونٹیکارلو جوئے خانوں کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ یہاں دنیا کے بڑے بڑے جواری آتے ہیں جن سے حکومت کو بہت آمدنی ہوتی ہے۔ صرف بادشاہ کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک مختصر سادستہ ہے۔ کچھ تعداد میں پولیس بھی ہے جو ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمے دار ہے۔ 1958ء تک یہاں آئینی حکومت قائم تھی جس کا سربراہ شہزادہ رینیئر سوم تھا لیکن جنوری 1959ء میں شہزادے نے ملک کا آئین معطل کردیا اور تمام اختیارات خود سنبھال لیے۔ 1956ء میں شہزادے نے ہالی ووڈ کی مشہور ایکٹریس گریس کیلی سے شادی کرلی اگر شہزادہ لاولد مرجاتا تو ملک 1958ء کے معاہدے کے مطابق فرانس کے زیرِ انتداب آجاتا۔ مئی 1993ء میں مناکو اقوام متحدہ کا رکن بنا۔ 1997ء میں مملکت نے اپنے قیام کی ساتویں سالگرہ منائی۔ مرسلہ: راحیل، کراچی

مناما

بحرین کا دارالحکومت، آزاد بندرگاہ اور اہم تجارتی مرکز۔ پرتگیزی اور ایرانی یہاں قابض رہے۔ تیل کی دریافت سے پہلے صدف گیری کو صنعت کا درجہ حاصل تھا۔ 1958ء میں اسے آزاد بندرگاہ قرار دیا گیا۔ یہاں دنیا کے بڑے بڑے بینکوں کے دفاتر بھی ہیں۔

منتخب التواریخ

ہندوستان کی تاریخ جس کے مؤلف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔ اس میں غزنوی دور سے لے کر اکبر کی حکومت کے پندرھویں سال تک کے معاملات تحریر ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں اکبری عہد کے صوفیا، فلاسفر، اطباء اور شعراء کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ بدایونی اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ مذہب سے متعلق ان کے احساسات بڑے نازک تھے۔ اکبر کی آزاد خیالی ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کیا ہے۔

مرسلہ: اسماء توحید۔ العین (یو اے ای)

ختم ہو گیا۔

پولیس پہنچ چکی تھی۔ تفتیش جاری تھی کہ ان کا نوکر کمرے میں دستک دے کر داخل ہوا۔

''خان جی کوئی صاحب جی آپ سے ملنے آئے ہیں اپنا نام ایوب خان بتا رہے ہیں۔''

منصور خان کو جیسے سکتہ مار گیا اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ماضی کی سفاک حقیقت کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ وہ ایوب خان جسے اس نے منوں مٹی تلے دفنا دیا تھا۔ اس کے سامنے بہ نفسِ نفیس کھڑا..... اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بلیک کلر تھری پیس، اور سیاہ چشمہ لگائے ایوب خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''کیسے ہو منصور خان''، وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کہاں گیا وہ زعم جس کی ترنگ میں تم نے انمول اور نایاب ترین رشتے پس پشت رکھ دیے۔ کس کام آئی وہ جائیداد، دولت اور جاگیر جس نے تمہارے خون کو پانی کر دیا تھا۔ مجھے تم پر غصہ نہیں رحم آ رہا ہے۔''

''تت..... تم زندہ ہو ایوب خان؟ میرے بھائی۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''مارنے والا کیوں بھول جاتا ہے کہ زندگی موت اس کے قبضہِ قدرت میں ہے جو آسمان پر بیٹھا اپنے بنائے ہوئے بندوں کے تماشے دیکھ رہا ہے۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''دولت اور اقتدار کا نشہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ تم نے تو اپنے باپ کو بھی نہ چھوڑا۔'' مجھے گاؤں والوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔

اس کا جسم سرتا پا لرز رہا تھا۔ دم بہ دم اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک دم کرسی پر ڈھے سا گیا۔ سامنے ٹیبل پر پڑے فلاسک جگ سے ایوب نے پانی کا گلاس بھرا اور اس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ غٹاغٹ پانی پی کر اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں منصور خان۔'' وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''کاش، تم مجھ سے سب کچھ مانگ لیتے، میں سب کچھ تمہارے نام کر دیتا۔ اب بھی میں تم سے کچھ مانگنے نہیں آیا۔ میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اور تم نے ابا جی اور میرے ساتھ جو کچھ کیا، وہ مقدمہ میں نے اللہ کی عدالت میں دائر کر دیا تھا، اور دیکھ لو، وہ سب سے بڑا منصف کیسے فیصلے کر رہا ہے۔''

''مم مجھے معاف کر دو ایوب خان۔'' وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنا جرم تسلیم کر لوں گا۔''

''میں کون ہوتا ہوں تمہیں معاف کرنے والا۔ معافی مانگنی ہے تو اپنے باپ سے مانگو، جو علاج نہ ہونے کی وجہ سے سسک سسک کر مر گیا۔''

''تت تم کہاں...... رہے اتنا عرصہ۔'' اس نے بمشکل کہا۔ ''اور تمہاری جگہ مرنے والا کون تھا؟''

وہ بولا۔ ''میری جگہ مرنے والا رضوان ایک بہت بڑے بزنس مین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میں جھاڑیوں میں کئی گھنٹے بے ہوش پڑا رہا۔ زندگی اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ رضوان کا موبائل فون بھی میرے پاس ہی گرا تھا۔ اسی فون کی وجہ سے مجھے زخمی حالت میں شاہد صاحب جو کہ رضوان کے والد تھے، ان کے ہاں پہنچا دیا گیا۔ مجھے تین دن بعد ہوش آیا تو میری یادداشت عارضی طور پر جا چکی تھی۔ شاہد صاحب ان دنوں اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ وہ دل کے مریض تھے۔ ان کا اپنے بیٹے کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے طور پر تحقیق کی تو سب کچھ سامنے آ گیا اور یہ روح فرسا خبر بھی ملی کہ ابا جان بھی رخصت ہو چکے ہیں۔ میں نے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا اور اس طرف آنے کا خیال ذہن سے نکال دیا۔''

وہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔ منصور کی حالت بگڑ رہی تھی۔ بے ساختہ اس نے ایوب کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہچکیاں باندھ کر رونے لگا۔

وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''اور ایک دن اچانک شاہد صاحب حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنا سب کچھ میرے نام کر گئے تھے۔ ان کے خیال میں رضوان اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ تمہاری جائیداد اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ میں نے مہربانو سے شادی کر لی ہے۔''

اس نے کہا اور خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ منصور خان کے اعصاب کمزور ثابت ہوئے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ تارو بھی پہنچ گئی تھی۔ ملازمین کی مدد سے منصور کے بے سدھ وجود کو پولیس وین میں لے جایا جا رہا تھا۔

وہ جائیداد جس کے لیے منصور خان نے اپنوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ آج لاوارث تھی، کیونکہ ایوب نے زمین جائیداد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اس کی وارث تارو تھی۔ بیشک...... وہی سب سے بڑا منصف ہے۔

عزت دینے والا

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
میں بہت زیادہ مطالعہ کرنے والا تو نہیں بس سونے سے پہلے تھوڑی دیر پڑھ لیتا ہوں لیکن پہلی بار میں نے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی آپ بیتی ہے اس لیے مجھے تو بہت پسند آئی پھر بھی جملوں کی درستگی کسی اچھے رائٹر سے کرا لیں۔

اظہر علی
(کراچی)

''تم لوگ لکھو پڑھو یا جو چاہے کرو۔'' میرے بڑے بھائی سید مظہر علی نے کہا۔ ''تم گھر کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ اب یہ میری ذمے داری ہے۔ ہر خرچ میں پورا کروں گا۔''

کچھ عرصے پہلے والد صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ ہم سب بہن بھائی چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے مظہر بھائی تھے اور وہ ان دنوں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب پر لگے تھے۔ ان سے چھوٹا میں اظہر علی ہوں۔ مجھ سے چھوٹی بہن زرینہ ہے پھر ایک چھوٹا بھائی اطہر علی ہے۔ اس کے بعد

دوسری بہن امینہ ہے اور سب سے چھوٹا خضر ہے۔ جو اس وقت امی کی گود میں تھا۔ والد صاحب اپنا مکان چھوڑ گئے تھے مگر کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ سب سے بڑے مظہر بھائی تھے۔

ہمارے سارے رشتے دار، چچا تایا ماموں اور دوسرے کھاتے پیتے اور صاحب حیثیت تھے۔ مگر کوئی اس وقت آگے نہیں آیا۔ زبانی کلامی دکھ سب نے ظاہر کیا۔ ملتے ملاتے بھی رہے لیکن جہاں تک عملی مدد کی بات ہے تو کسی نے اشارتاً بھی کچھ نہیں کہا۔ اگر کوئی کچھ کہتا بھی تو امی نے کسی سے مدد نہیں لینی تھی کیونکہ وہ حد درجے خوددار عورت تھیں۔ یہی حال مظہر بھائی کا تھا۔ مگر اس کے باوجود رشتے داروں کی طرف سے ایک اُمید ہوتی ہے تو انہوں نے وہ بھی پوری نہیں کی تھی۔

یہ وقت مشکل اور کڑا تھا۔ اتفاق سے بہنوں کی شادی کی عمر بھی تھی اور ان کے رشتے بھی تھے۔ دور جدید کی روایت سے قطع نظر ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی شادی کم عمری میں کر دی جاتی ہے۔ اٹھارہ انیس یا حد سے حد بیس سال کی عمر میں۔ بہت سی تو سولہ سال میں بیاہ کر اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ امی نے کچھ جمع جوڑا بھی تھا۔ انہیں خدشہ ہوا کہ حالات کی سختی میں کہیں یہ بھی نہ خرچ ہو جائے اس لیے انہوں نے زرینہ اور امینہ کی شادی کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس پر فوری عمل بھی کیا۔ زرینہ اٹھارہ سال کی تھی اور وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ جب کہ امینہ سولہ سال کی تھی۔ والد صاحب کی برسی سے پہلے وہ بیاہ کر اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد گھر میں امی اور ہم چار بھائی رہ گئے۔ اس وقت ذرا مشکل وقت شروع ہوا کہ ہم بھائی پڑھ رہے تھے۔ میں سول انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھا اور مجھ سے چھوٹا اطہر انٹر کر رہا تھا۔ خضر کو بھی اسکول میں داخل کرانا تھا۔

مظہر بھائی کی تنخواہ زیادہ نہیں تھی مگر وہ بہت محنت کر رہے تھے اضافی آمدنی کے لیے وہ اوور ٹائم کرتے تھے اور بعض اوقات تو اٹھارہ گھنٹے کی ڈیوٹی بھی کرتے تھے۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اس لیے کبھی کبھی کھانا بھی انہیں بنانا پڑتا تھا۔ گویا وہ ہمارے لیے ماں باپ دونوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔ آنے والے تین سال بہت کڑے تھے۔ میری انجینئرنگ کی فیس تو دینا پڑتی تھی ساتھ ہی اطہر بھی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا کورس کر رہا تھا۔ یہ بھی خاصا مہنگا پڑتا تھا اور مظہر بھائی کی آمدنی میں فیسیں ادا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

اطہر نے یہ صورت حال دیکھتے ہوئے فی الحال تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنا چاہی مگر مظہر بھائی نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”تم صرف پڑھو فیس کہاں سے دینی ہے یہ میرا مسئلہ ہے۔“

مگر ہم سمجھتے تھے کہ دو افراد کی فیسیں ادا کرنا آسان نہیں تھا جب کہ خضر بھی ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ اس زمانے میں پرائیویٹ اسکول کا رواج کم تھا مگر ان کی فیسیں اس وقت بھی اچھی خاصی ہوا کرتی تھیں۔ گویا تین افراد کا تعلیمی خرچ تھا جو مظہر بھائی پورے گھر کے خرچ کے ساتھ اٹھا رہے تھے اور وہ جیسے کر رہے تھے یہ ان ہی کی ہمت تھی۔ پھر اللہ نے مہربانی کی اور وہ جس کمپنی میں جاب کر رہے تھے اسی کے توسط سے انہیں کویت میں جاب مل گئی۔ مظہر بھائی ہم سے اور گھر والوں سے دور جانا نہیں چاہتے تھے مگر مالی مجبوری کی وجہ سے انہیں جانا پڑا اور یوں پہلی بار ہم نے مالی فراغت کا منہ دیکھا۔ اچھی تنخواہ کے ساتھ مظہر بھائی باہر سے سامان بھی بھیجتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا۔ لوگ باہر سے واشنگ مشین، فریج اور اے سی تک بھیجتے تھے۔ مظہر بھائی نے بھی گھر کے لیے یہ چیزیں بھیجیں۔ بہنوں کو پہلے جہیز میں کچھ خاص نہیں ملا تھا۔ اب اس کی تلافی کی گئی اور انہیں بہت سا سامان بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہنیں میکے آتیں اور انہیں کوئی چیز پسند آجاتی تو ہم انہیں دے دیتے تھے۔

میں نے انجینئرنگ کی اور کچھ عرصے ایک مقامی مل میں کام کیا۔ پھر مجھے بھی یو اے ای میں جاب مل گئی۔ اطہر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن رہا تھا۔ اس نے تعلیم مکمل کی اور میرے بعد وہ بھی سعودی عرب چلا آیا۔ یعنی ہم تینوں بھائی مڈل ایسٹ میں کما رہے تھے مگر گھر کا خرچ اب بھی مظہر بھائی ہی چلا رہے تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی رقم جمع کریں۔ مظہر بھائی صرف گریجویٹ تھے اور پاکستان میں انہیں اسٹور کیپر کی جاب ملی تھی پھر اسی بنیاد پر وہ باہر گئے۔ وہاں انہوں نے اسٹور کیپنگ سے متعلق کچھ کورس کیے اور ان کا عہدہ بڑھ گیا۔ اسی حساب سے تنخواہ بھی بڑھ گئی۔ وہ اپنی تقریباً ساری تنخواہ پاکستان بھیج دیتے تھے اور کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ امی یا ہم بھائیوں نے ان کی تنخواہ میں سے کتنا خرچ کیا اور کتنا بچایا۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ باہر سے جو لوگ کما کر اپنے گھر والوں کو بھیجتے ہیں۔ وہ اسے بہت بے دردی سے

اور فضولیات میں اڑا دیتے ہیں جیسے بلا وجہ کا سامان تعیش بھر لینا اور اپنا پرانا علاقہ چھوڑ کر مہنگے علاقے میں، مہنگے مکان لینا یا اپنا پرانا مکان ہی جدید انداز میں بنوانا۔ کھانے پینے اور گھومنے پھرنے میں اصراف سے کام لینا۔ ان لوگوں کو بالکل خیال نہیں ہوتا کہ باہر بے شک تنخواہیں اچھی ہوتی ہیں مگر وہ آدمی سے محنت بھی اسی لحاظ سے لیتے ہیں اور اپنا دیا ہوا ایک ایک روپیا ہم سے وصول کرتے ہیں۔ میں جہاں ملازمت کرتا تھا مجھے یاد ہے دوران ڈیوٹی مجھے ایک منٹ بھی سکون سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ آرام صرف لنچ کے وقفے میں ہوتا تھا۔ تقریباً یہی حال دوسرے لوگوں کا ہے جو باہر کماتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بے شک تنخواہیں کم ہیں مگر یہاں ملازمت میں مزے بھی بہت ہیں۔ اکثر لوگ تو بس برائے نام ہی ملازمت کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے یہاں کی کمائی میں وہ برکت بھی نہیں ہوتی ہے جو باہر کی کمائی میں ہوتی ہے۔

لیکن امی اور ہم بہن بھائیوں نے کبھی اس محنت کی کمائی کو ناجائز خرچ نہیں کیا۔ جو سامان بھائی باہر سے بھیجتے رہے تھے وہی ہمارے گھر میں رہا، مجھے نہیں یاد کہ ہم نے کبھی یہاں سے کچھ خریدا ہو۔ اس طرح گھر میں معمولی مرمت اور رنگ و روغن کے سوا اور کوئی کام نہیں کرایا۔ اسی طرح ہم دونوں بھائی بھی اپنی تنخواہ امی کو بھجوا دیتے تھے اور امی اس کے ایک ایک روپے کا حساب رکھتی تھیں۔ انہوں نے یہاں ہمارے اکاؤنٹ کھلوائے ہوئے تھے اور سب کی رقم وہ اسی کے اکاؤنٹ میں جمع کراتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہماری شادیوں کا وقت آیا تو سب کے پاس کافی سے زیادہ رقم تھی۔ تب ہم نے پہلی بار مکان کو ری نیو کرانے کا فیصلہ کیا اور ہمیں کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ امی کی دانش مندی نے ہماری لیے یہ مشکل کام بھی آسان کر دیا۔ ہمیں نہ قرض لینا پڑا اور نہ ہی اپنا کوئی دوسرا خرچ روکنا پڑا اور ہمارا ایک منزلہ گھر چند مہینے میں تین منزلہ ہو گیا۔ خضر ابھی چھوٹا تھا۔ زرینہ بیاہ کر راولپنڈی گئی تھی۔ مگر امینہ کراچی میں تھی اس کے شوہر رضوان نے گھر کی تعمیر کی ذمے داری لے لی اور بہت اچھی طرح نبھائی۔

☆☆☆

”میں شادی نہیں کر رہا امی۔“ مظہر بھائی نے کہا تو امی حیران رہ گئیں۔

”کیوں بیٹا تو پہلے بھی منع کرتا رہا ہے، بہانے کرتا رہا ہے کہ بھائیوں کو سیٹ کرنا ہے، اب تو سب ہو گیا ہے۔“

مظہر بھائی نے گہری سانس لی۔ ”امی یہ سچ ہے پہلے میں بھائیوں کے لیے دل مارتا رہا۔ آپ کے لیے کرتا رہا مگر اب میں اندر سے خود کو مردہ محسوس کرتا ہوں، کیا فائدہ میں کسی سے شادی کروں اور اسے خوش نہ رکھ سکوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں شادی نہیں کروں گا۔ آپ صرف اظہر اور اطہر کے لیے لڑکیاں دیکھیں۔“

مظہر بھائی اور امی کی گفتگو ان کی کویت واپسی سے ایک دن پہلے ہوئی تھی اور میں نے اتفاق سے سن لی تھی۔ مظہر بھائی اس وقت بھی کوئی بہت بڑے نہیں تھے، ان کی عمر چھتیس برس تھی۔ میں مظہر بھائی سے چھ سال چھوٹا ہوں اور اطہر مجھ سے تین سال چھوٹا ہے۔ میں تیس برس کا تھا اور اطہر ستائیس برس کا جب امی نے ہم بھائیوں کی شادی کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے ہم سب ہی ایک ساتھ چھٹیوں پر آئے تھے۔ اور اب واپسی تھی ان ہی دنوں امی نے ہماری شادی کا کہا۔ میرے اور اطہر کے لیے لڑکی دیکھ لی تھی مگر مظہر بھائی کے لیے تلاش کرنی تھی۔ ان کی عمر ذرا زیادہ تھی اس لحاظ سے ان کے لیے کم عمر لڑکی کا رشتہ آسانی سے نہیں مل رہا تھا اور جہاں مل رہا تھا وہاں امی مطمئن نہیں تھیں۔ یوں ان کا معاملہ اٹک رہا تھا اور شاید اسی وجہ سے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے شادی سے انکار کیا تھا۔ ورنہ چھتیس برس کون سی زیادہ عمر ہوتی ہے۔ میں نے اطہر کو بتایا اور اس سے کہا۔

”اگر شادی ہو گی تو ہم تینوں بھائیوں کی ہو گی۔ ورنہ کم سے کم میں مظہر بھائی کے بغیر شادی نہیں کروں گا۔“

”تو میں کون سا کر لوں گا۔“ اطہر نے خفگی سے کہا۔ ”کیا تم مجھے خود غرض سمجھتے ہو۔ مگر مسئلہ تو ان کا ہے اور اگر وہ مان جائیں تو ابھی لڑکی کہاں ملی ہے۔“

”لڑکی مل جائے گی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم اور امی مظہر بھائی کو راضی کرو۔“

”اگر تم لڑکی تلاش کر لیتے ہو تو باقی کام ہمارا ہے۔“ اطہر نے یقین سے کہا۔ ”بھائی راضی ہوں گے۔“

درحقیقت مجھے مظہر بھائی کے انکار سے دھچکا لگا تھا۔ شاید ہم نے خود غرضی کا ثبوت دیا تھا۔ ہم چند سال پہلے اس پوزیشن میں آ گئے تھے کہ ان کی شادی کر سکتے تھے مگر امی تو اس وقت بھی زور دیتی رہی تھیں اور یہ مظہر بھائی تھے جو بار بار انکار کرتے تھے بلکہ ایک بار تو امی نے لڑکی بھی پسند کر لی تھی اور اس کے گھر والوں سے بات بھی کر لی تھی۔ مگر مظہر

بھائی نے انکار کر دیا۔ امی تو زور دیتی رہی تھیں لیکن ہم بھائیوں نے بھی مظہر بھائی پر زور نہیں دیا کہ وہ شادی کر لیں۔ اگر یہ ہماری کوتاہی تھی تو میں نے سوچ لیا کہ اس کی تلافی کرنی ہے اور اس کا حل بھی میرے ذہن میں تھا۔ میں دبئی کی جس کمپنی میں جاب کرتا تھا وہاں اکثر پاکستانی تھے اور بہت سے کراچی کے ہی تھے۔ ان میں میرا ایک ماتحت جنید بھی تھا۔ جنید نوجوان اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ سول ڈرافٹ مین کا کورس کر کے وہ اب یہاں جاب کر رہا تھا۔ اس کے باپ کا بھی اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب جنید کے سوا سارے بہن بھائی چھوٹے تھے۔

جنید نے گھر بھی چلایا اور اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس سے چھوٹے چار بہن بھائی تھے۔ گزشتہ سال اس کی شادی ہوئی تھی اور اب اس سے چھوٹی بہن جو سرکاری جاب کر رہی تھی وہ اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ نورینہ نے ایم اے میں ٹاپ کیا تھا اور اسے گولڈ میڈل ملا تھا اور اپنی تعلیم کی وجہ سے فیڈرل گورنمنٹ میں آفیسر کی جاب ملی تھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی بس رنگ سانولا تھا ورنہ نقوش بہت اچھے تھے۔ جنید بہن کے لیے فکر مند تھا اور اس نے مجھ سے بھی رشتے کا کہا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے جو ہو سکا میں کروں گا۔ واپس جا کر میں نے اس سے بات کی۔ مظہر بھائی کی تازہ ترین تصاویر ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے جنید سے کہا۔ ''یار تم نے نورینہ کے رشتے کی بات کی تھی تو ادھر ہم مظہر بھائی کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ تم مظہر بھائی کو اچھی طرح جانتے ہو، مل بھی چکے ہو۔ صرف عمر ذرا زیادہ ہے۔ نورینہ سے تیرہ سال بڑے ہیں باقی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''میں امی سے بات کرتا ہوں۔'' جنید نے کہا۔ ''مجھے تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے مجھے اُمید ہے امی کو بھی نہیں ہوگا۔''

''تم بہن سے بھی پوچھ لینا۔ سب کی رضامندی ضروری ہے۔''

''اظہر بھائی آپ کی فیملی کو میرا پورا گھر اچھی طرح جانتا ہے اور آپ کو پسند بھی کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے میں آپ کو جلد اچھی خبر ہی سناؤں گا۔''

جنید نے اپنے گھر والوں سے بات کی اور توقع کے مطابق وہاں سے ہاں ہو گئی۔ میں نے امی کو فون کیا اور انہیں جنید کے گھر والوں اور نورینہ کے بارے میں بتایا۔ ''آپ جا کر دیکھ لیں، میں جانتا ہوں یہ بہت اچھی اور شریف فیملی ہے۔''

''میں چلی جاتی ہوں لیکن مظہر کہاں مان رہا ہے۔''

''امی یہ کام آپ ہم پر چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا۔ ''بھائی کو ہم راضی کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں جاتی ہوں۔''

امی جنید کے گھر گئیں اور ان کو نورینہ اور فیملی پسند آئی۔ جیسے ہی امی نے او کے کیا، میں نے اور اظہر نے باری باری مظہر بھائی کو کال کرنا شروع کر دی کہ وہ شادی کے لیے ہاں کریں۔ انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کے لیے رشتہ بھی دیکھ لیا ہے۔ پہلے تو انکار کرتے رہے مگر ہم بھی ثابت قدمی سے ان کو کال کرتے۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بابا میں راضی ہوں لیکن رشتہ کہاں ہے کس سے میری شادی کرو گے۔''

یہ بات انہوں نے مجھ سے کہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''لڑکی کے لیے آپ کی شرط کیا ہے؟''

''تعلیم یافتہ ہو اور سلجھے ذہن کی مالک ہو، باقی شکل صورت مناسب ہو۔''

''اگر ایسی لڑکی یا اس سے بھی اچھی لڑکی موجود ہو تو آپ پھر تو انکار نہیں کریں گے۔''

''یار سچ کہوں تو اب مجھے شادی کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔''

''یہ آپ کو ابھی لگ رہا ہے جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو کچھ عرصے بعد سب نارمل ہو جائے گا۔ بس آپ ہاں کر دیں۔ یہ سوچ کر ہی ہاں کر دیں کہ ہم بھائی آپ کے بغیر شادی نہیں کریں گے یہ ہمارا حتمی فیصلہ ہے۔''

''ٹھیک ہے یار میں راضی ہوں۔'' وہ بولے۔ ''بس خیال رہے مجھے پھنسوا مت دینا۔''

''میں ہر طرح کی ذمے داری لیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور امی کو ان کی رضامندی سے آگاہ کیا۔ امی نے فوراً جا کر بات پکی کر لی اور چند دن بعد شادی کی تاریخ بھی لے لی۔ کیونکہ شادیاں ایک ساتھ تھیں اس لیے ہم تینوں بھائیوں کو چھٹی لینا پڑی۔ سب سے کم چھٹی مظہر بھائی کو ملی تھی اور وہ صرف دس دن کے لیے آئے تھے اس کے بعد انہیں واپس جانا تھا۔ مگر شادی کے اگلے دن ہم نے ان کے جو تاثرات دیکھے ہم سب کے دلوں میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ ہمارے بھائی نے جس طرح ہماری لیے قربانی دی تھی ہمیں لگا کہ ہم نے اس کا تھوڑا سا جواب دے دیا تھا۔ باقی اصل صلہ تو انہیں اوپر

والے نے دیا تھا۔ مظہر بھائی جاتے ہوئے افسردہ تھے۔اس لیے بھی کہ نورینہ بھابی جاب کرتی تھیں اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ کویت نہیں جا سکتی تھیں۔ انہوں نے جاب مظہر بھائی کی اجازت سے جاری رکھی تھی۔

ہم بھائی بہت عرصے گھر میں یوں رہے کہ بس امی ہوتی تھیں اور وہ خاموش طبع تھیں۔ زیادہ بولنا انہیں آتا نہیں تھا۔ بہنیں آتیں تو گھر میں رونق ہو جاتی تھی جو صرف عورت کے دم قدم سے ہوتی ہے اس لیے جب ایک ساتھ تین عورتیں گھر میں آئیں تو بہ قول اطہر کے جہاں الو بولتے تھے اب وہاں مینائیں چہچہانے لگی تھیں۔ خوش قسمتی سے تینوں ہی اچھے اور سلجھے مزاج کی اور سب سے بنا کر رکھنے والی تھیں۔ کومل نے اپنے حسن سلوک اور خدمت گزاری سے مجھے پہلے ہی اپنا گرویدا کر لیا تھا جب اس نے میرے گھر والوں سے بھی بنا کر رکھی تو پوری طرح میرے دل میں گھر کر گئی۔ یہی وجہ تھی کہ واپس جاتے ہوئے میں بہت اداس تھا اور میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں واپس جاؤں۔ اگر روزگار کی مجبوری نہ ہوتی تو میں یہی کرتا۔ کومل کا تو برا حال تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے سوٹ کیس میں بند ہو کر میرے ساتھ چلی جائے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں کچھ عرصے بعد تم کو بلوا لوں گا۔“

اس نے انکار کیا۔ ”نہیں آپ واپس آ جائیں۔ خضر بے شک اب جوان ہے لیکن ہے تو لڑکا نا اور امی ہیں۔ میں، رمنا اور نورینہ بھابی چلے گئے تو یہ بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔ گھر میں کوئی تو بڑا مرد ہو۔“

کومل کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی گھر میں کسی مرد کو ہونا چاہیے تھا۔ خاص طور سے جب یہاں تین شادی شدہ عورتیں بھی تھیں۔ مظہر بھائی کی پوسٹ بہت اچھی تھی اور اطہر کو اس کی تعلیم کی بنا پر تنخواہ اچھی مل رہی تھی۔ میں جہاں لگا ہوا تھا وہاں مجھے تنخواہ تو اچھی مل رہی تھی مگر اس سے کچھ کم میں ملک میں رہ کر بھی حاصل کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے نورینہ کی بات درست لگی۔ میں نے امی اور بھائیوں سے مشورہ کیا تو اتفاق سے وہ بھی یہی سوچ رہے تھے۔ اطہر نے کہا۔ ”یار سچی بات ہے میرا اس وجہ سے یہاں دل کم لگتا ہے کہ رمنا، کومل بھابی اور نورینہ بھابی ہماری ذمے داری ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو جائے تو وہاں دیکھنے والا کون ہے، صرف ایک خضر ہے اور وہ بھی لڑکا ہے۔ ابھی پڑھ رہا ہے۔ اس لیے ہم میں سے کسی کا وہاں ہونا ضروری ہے۔“

یوں طے ہوا کہ میں دبئی سے جاب چھوڑ کر واپس پاکستان آ جاؤں اور یہاں نوکری کروں۔ میں آج سے کوئی بیس سال پہلے واپس آیا جب میرا پہلا برخوردار دنیا میں آ چکا تھا۔ میں نے یہیں جاب تلاش کر لی۔ اس وقت جاب آسانی سے مل جاتی تھی۔ اس میں آمدنی اگرچہ کم تھی مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ ہاں پہلے جو بچت کر لیتا تھا اب وہ نہیں ہو پاتی تھی۔ مکان اپنا تھا اور بلوں کی ساری ذمے داری مظہر بھائی اور اطہر نے لے لی تھی۔ امی اور خضر کا خرچ وہ الگ سے بھیجتے تھے۔ شادی کے شروع دنوں میں کچن ایک رہا تھا کیونکہ افراد ہی کتنے تھے۔ میں درمیان والے فلور پر تھا اور دونوں بھابیاں نیچے امی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اوپر والا فلور اطہر کا تھا مگر وہ خالی پڑا تھا جب وہ آتا تب دونوں میاں بیوی اوپر رہتے تھے اور جب وہ جاتا تو رمنا پھر نیچے امی کے پاس چلی آتی تھی۔

فی الحال کچن نیچے ہی تھا۔ سب مل کر پکاتے اور کھاتے تھے۔ پھر وقت گزرتا رہا اور سب کے کئی کئی بچے ہو گئے تو فلور خود بہ خود آباد ہوتے گئے اور سب کے الگ کچن بن گئے تھے۔ میری شادی کے سات سال بعد امی کا انتقال ہو گیا۔ تب تک خضر بھی تعلیم مکمل کر کے جاب کرنے لگا تھا۔ اس نے آرکیٹیکٹ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ امی کی خواہش تھی کہ اس کی شادی کر دیں مگر موت نے ان کو مہلت نہیں دی۔ ان کی وفات کے چند مہینے بعد ہم نے خضر کی بھی شادی کر دی اور اتفاق سے اسے سعودی عرب میں جاب آفر ہوئی اور وہ بیوی سمیت وہاں چلا گیا۔ جب شادی کے بعد ہماری بیویاں آئیں تو وہ ہمارا گھر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ تقریباً سب نے اپنے شوہروں سے ایک ہی بات کی۔ ”باہر جانے والے تو باہر کی چیزوں سے گھر بھر دیتے ہیں آپ لوگ تو کچھ لے کر ہی نہیں آئے۔“

دوسرے بھائیوں کی طرح میں نے بھی کومل کو وہی جواب دیا۔ ”اگر تم نے باہر کا سامان دیکھنا ہے تو ہماری بہنوں کا گھر دیکھ لو۔ یہاں تھا ہی کون جس کے لیے سامان بھیجتے۔ اس لیے جو آتا تھا وہ ان کا ہوتا تھا۔ اب تم لوگ آ گئی ہو تو سامان بھی آ جائے گا۔“

بیویاں آئیں تو ان کے لیے چیزیں بھی آنا شروع ہو گئیں اور کومل کے یوں مزے تھے کہ مظہر بھائی اور اطہر جو چیز اپنی بیوی کے لیے بھیجتے وہی کومل کے لیے بھی بھیجتے تھے اور اسے دو دو چیزیں مل جاتیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد

ہمارا گھر بھی سامان سے بھر گیا ورنہ پہلے ہمارے ہاں صرف ضرورت کی چیزیں تھیں۔ میں نے کومل سے کہا۔ ’’لو تمہارا شکوہ بھی دور ہو گیا۔ اب بولو کس چیز کی کمی ہے۔‘‘

’’کسی چیز کی نہیں۔‘‘ وہ ہنسی۔ ’’بلکہ جس چیز کی کمی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔‘‘

کومل کا اشارہ میری طرف تھا۔ وہ شروع دن سے میری جدائی برداشت نہیں کر پا رہی تھی اور یہی حال میرا تھا۔ اللہ نے ہم میاں بیوی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے بہت محبت رکھی ہے۔ اس لیے آنے کے بعد جب مجھے بیروزگاری کے کچھ دن بھی گزارنا پڑے تب بھی میں خوش رہا تھا۔ پھر جاب مل گئی اور تنخواہ بھی مناسب لگی تو زندگی مزید آسان ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد اطہر نے رمنا کو بلا لیا اور اس کے ایک سال بعد مظہر بھائی باہر سے وائنڈ اپ کر کے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے یہیں اپنا بزنس شروع کر دیا۔ پھر نورینہ بھابی کی جاب بھی تھی۔ جب تک مظہر بھائی کا بزنس سیٹ نہیں ہو گیا انہوں سپورٹ کیا۔ بزنس سیٹ ہونے کے بعد اللہ نے مظہر بھائی کو اتنا دیا کہ انہوں نے ڈیفنس میں اپنا بنگلا بنوا لیا اور بعد میں انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن تک بھیجا۔ یوں انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے جو قربانی دی تھی اللہ نے اس کے صلے میں انہیں بے پناہ نوازدیا۔

میرے بڑے صاحبزادے اُمید علی کے بعد سعید علی پیدا ہوئے۔ ان کے بعد اللہ نے دو بیٹے زید اور عبید دیئے۔ ہم میاں بیوی کو بیٹی کی اشد خواہش تھی مگر یہاں اللہ کی مرضی نہیں تھی اس لیے ہم راضی رہے۔ ہم نے سوچ لیا کہ جو ہماری بہوویں آئیں گی وہی ہماری بیٹیاں ہوں گی۔

مجھے پاکستان آئے ہوئے بارہ سال ہونے کو آئے تھے۔ بھائیوں کی اولادیں بھی تقریباً آس پاس ہوئیں اور وہ ہم عمر بھی ہو گئیں۔ اسٹیٹس سے قطع نظر ہم بھائیوں کی اولاد میں بہت محبت اور میل ملاپ تھا۔ مظہر بھائی اور اطہر کے بچے اعلیٰ درجے کے مہنگے اسکولوں میں پڑھنے گئے اور میرے بچے عام پرائیویٹ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور جب اپنے کزنز سے ملتے اور ان کی اسکولنگ کا سنتے تو انہیں بھی شوق ہوتا کہ وہ اعلیٰ درجے کے اسکولوں میں پڑھیں۔ میرا رجحان شروع سے مذہب کی طرف زیادہ تھا اگرچہ ہمارے سارے گھرانے کا رجحان مذہب کی طرف تھا اور تقریباً سب ہی روزے نماز کے پابند تھے۔

لیکن میں اور کومل اس معاملے میں ذرا آگے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی ایک اولاد کو حافظ قرآن بنائیں گے کہ شاید اسی سبب اللہ آخرت میں ہماری بخشش کر دے۔ مگر یہ فیصلہ ہم نے بچوں پر چھوڑا تو سب سے بڑے اُمید نے حافظ بننے کا اشتیاق ظاہر کیا اور ہم نے اسے پانچویں کے بعد حفظ کرانا شروع کر دیا۔ اس نے دل لگا کر اللہ کی کتاب کو سینے میں محفوظ کیا اور تین سال میں حفظ مکمل کر لیا۔ اس کے بعد اسکولنگ کا مرحلہ پھر سے شروع ہوا تب اُمید اور اس سے چھوٹے سعید نے جو ابھی آٹھویں میں آیا تھا مجھ سے کہا۔ ’’بابا ہم اچھے اسکول میں پڑھنا چاہتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بیٹا اچھے اسکول کی فیس بھی بہت اچھی ہوتی ہے اور تمہارے باپ کی آمدنی تمہارے سامنے ہے میں تمہیں اسی درجے کے اسکول میں پڑھا سکتا ہوں۔‘‘

’’بابا ہم چچا اور تایا کے بچوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔‘‘ اُمید نے کہا تو اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا اور کئی دن سوچ بچار کرتا۔ بالآخر مجھے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ میں پھر سے باہر چلا جاؤں۔ صرف باہر کما کر ہی میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکتا تھا۔ میں نے کومل سے کہا تو وہ کچھ دیر کو مرجھا گئی تھی۔ ’’آپ باہر چلے جائیں گے؟‘‘

’’مجبوری ہے میرے بچوں نے تعلیم کا سوال کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کبھی دنیا کی کوئی آسائش نہیں مانگی۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کے چچا اور تایا کے بچے کہیں زیادہ عیش و آرام میں رہتے ہیں۔ میں انہیں بھی یہ عیش و آرام دوں۔ انہوں نے وہ مانگا ہے جو ہر اولاد کا حق ہوتا ہے۔ اب بتاؤ میں کیسے انکار کروں؟ ان سے کیسے کہوں کہ میں ان کو اچھی تعلیم نہیں دلا سکتا؟ جب کہ باہر مجھے جاب مل سکتی ہے۔‘‘

کومل نے سوچا اور بولی۔ ’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔‘‘

’’اس لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ میں باہر چلا جاؤں اور وہاں سے کما کر بھیجوں۔‘‘

کومل نے حساب لگایا۔ ’’ابھی تو انہوں نے میٹرک کرنا ہے پھر ان کی اعلیٰ تعلیم کے مراحل بھی ہیں۔ اس میں بھی کم سے کم چھ سال لگیں گے۔ یعنی آپ کو آٹھ نو سال باہر رہنا پڑے گا۔‘‘

’’شاید اس سے بھی زیادہ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم بھول رہی ہو ہمیں اپنا گھر بھی بنانا ہے۔ یہ گھر تو سب کا ہے اور بالآخرا سے بیچ کر سب کو حصہ دینا ہوگا یا میں سب کا حصہ خرید

لوں تب بھی اس کے لیے رقم تو درکار ہوگی۔ سمجھ لو کہ یہ صرف بچوں کے مستقبل کا سوال نہیں ہے ہمارے مستقبل کا سوال بھی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے کومل کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ خود میری حالت اندر سے اچھی نہیں تھی حالانکہ یہ فیصلہ میں نے ہی کیا تھا۔ مگر اندر سے بار بار ڈانواں ڈول ہو رہا تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ خاص طور سے جب کومل کو دیکھتا تو دل کہتا کہ مت جاؤ مگر جب بچوں کو دیکھتا تو دماغ کہتا کہ ضرور جاؤ، یہ ان کے مستقبل کا سوال ہے۔ اسی کشمکش میں میں نے جاب سے چھٹی لی اور وزٹ ویزا لے کر یو اے ای چلا گیا۔ میری اپنی جان پہچان بھی تھی اور بھائیوں کی وجہ سے بھی بہت سے لوگ جانتے تھے اس لیے مجھے دوسرے ہی ہفتے ایک کمپنی میں سول انجینئر کی جاب مل گئی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی اور یہ میری پاکستان کی آمدنی کے مقابلے میں چار گنا زیادہ تھی۔ میں نے ہامی بھر لی اور واپس آکر جاب سے استعفا دیا۔ اس دوران میں میرا ویزا الگ کر آ گیا تھا۔ جب میرے جانے کا وقت آیا تو میں نے اُمید اور سعید سے کہا۔

"دیکھو بیٹا یہ میں صرف اور صرف تمہاری خاطر باہر جا رہا ہوں ورنہ تم جانتے ہو کہ تمہاری ماں کی وجہ سے میں پہلے بھی باہر کی ملازمت چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اب میری ایک شرط ہے کہ تم دونوں میٹرک میں کم سے کم اے گریڈ لو گے اگر تم دونوں نے ایسا کر لیا تو ٹھیک ہے ورنہ میں واپس آ جاؤں گا۔"

"بابا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ میٹرک میں اے گریڈ سے بھی اچھے نمبر لا کر دکھائیں گے۔" اُمید نے کہا اور سعید نے اس کی تائید کی۔

"تم نے اپنی ساری توجہ پڑھائی پر دینی ہے۔ یہاں تمہارے سر پر صرف تمہاری ماں ہے اور اسے نہیں معلوم کہ تم گھر سے باہر کیا کر رہے ہو اس لیے اب اپنی نگرانی بھی تمہیں خود کرنی ہے، تمہیں معلوم ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ میرے بچے سلجھے ہوئے ہیں، میں نے اور کومل نے ان کی پرورش اپنی طرف سے بہترین کی تھی اور صرف الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے بھی ان کو تربیت دی تھی۔ اس لیے یہ اُمید تھی کہ میری غیر موجودگی میں وہ بھٹکیں گے نہیں مگر دل کو ایک دھڑکا بھی تھا کہ وہ بچے ہی تو ہیں اور آج

جنید ابوالقاسم

جنید، ابوالقاسم بن محمد بن جنید خراز۔ آپ سری سقطی کے بھتیجے (یا بھانجے) اور انہی کے مرید تھے۔ آپ کی سکونت بغداد میں تھی۔ آپ نے فقہ ابوثور سے پڑھی، تصوف کی تعلیم حارث محاسبی سے حاصل کی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اپنے استاد محاسبی کے ساتھ چلتے پھرتے تصوف کے مسائل پر بحث کرتے تھے اور وہ آپ کے سوالات کے برجستہ جوابات دیتے تھے۔ ان جوابات کو بعد میں آپ نے کتابوں میں قلمبند کر دیا۔ محاسبی کے ساتھ آپ کو بھی راسخ العقیدہ صوفیا کا سب سے بڑا امام تسلیم کیا گیا ہے اور آپ کو سید الطائفہ (صوفیوں کے سردار) طاؤس الفقراء (شیخ المشائخ) کے القابات سے نوازا گیا ہے۔ لوگ آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں آپ کے رسائل کا ذکر کیا ہے جو خاص خاص اشخاص کے نام مرسلہ، خطوط اور تصوف کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ منصور حلاج پر آپ کا اثر بہت نمایاں تھا۔ جنید نے اپنے عقیدے کو جسے آپ نے دلائل عقلیہ سے واضح کیا تھا۔ اس طرح بیان کیا ہے چونکہ سب چیزوں کا اصل ذاتِ خدا ہے۔ اس لیے علیحدگی (تفریق) کے بعد آخرکار وہ پھر اسی ذات کی طرف عود کریں گے تاکہ پھر اس سے مل جائیں۔ نیز صوفی مقام فنا میں یہی درجہ حاصل کرتا ہے۔ آپ زبان کی ان جسارتوں سے بچتے جنہوں نے بسطامیؒ اور حلاجؒ جیسے اصحاب سُکر کی زبان پر جاری ہو کر راسخ الاعتقاد لوگوں کو ان کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا۔ الغرض جنید نے اپنے واضح تصورات اور مکمل ضبطِ نفس کی بدولت ایک ایسی بنیاد قائم کر دی جس کے اوپر بعد کے سلسلہ ہائے صوفیہ کی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ جنید ہمہ تن درد و عشق تھے۔ تصوف کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔ "جب تک ایک ہاتھ سے قرآن اور دوسرے سے سنت رسول نہ پکڑ لو اس راستے پر نہ چلو تاکہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرو اور نہ بدعت کی تاریکی میں مبتلا ہو سکو۔"

مرسلہ: نیاز کھوسو، حب بلوچستان

کا دور بہت خراب ہے۔ اس لیے جب باہر روانہ ہوا تو میرا دل اس وقت بھی آمادہ نہیں تھا۔ شروع کے کچھ عرصے تو بہت مشکل پیش آئی۔ میں بیوی بچوں اور رشتے داروں میں رہنے والا شخص ہوں اور جب اچانک ہی اکیلے رہنا پڑا تو بہت دل خراب ہوا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اطمینان آنے لگا۔ آنے سے پہلے میں اُمید اور سعید کو ایک بہترین اسکول میں داخل کرا کے آیا تھا جو صرف مہنگا نہیں تھا بلکہ یہاں تعلیمی معیار بھی بہت اچھا تھا۔ اتفاق سے اسکول کا مالک میرا دوست بھی تھا۔ اس کے باوجود بچوں کو یہاں داخل کرانے سے پہلے میں نے اس کا نصاب دیکھا جو ملک کے دوسرے بہترین اسکولوں کے نصاب سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ میں نے دبئی سے کما کر بھیجنا شروع کیا اور میرے بچے اپنی مرضی کے اسکول میں پڑھنے لگے۔ اسکول کے علاوہ ان کی ٹیوشن بھی تھی جو اسی معیار کی تھی اور اس کی بھی اچھی خاصی فیس جاتی تھی۔ ایک سال گزرا اور جب اُمید کا رزلٹ آیا تو میرے دوست نے خود مجھے کال کی اور اطلاع دی۔

''یار مجھے افسوس ہے اُمید ایک پیپر میں رہ گیا ہے۔''

میں شاک میں رہ گیا تھا۔ ''ایک پیپر میں رہ گیا ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ پوری محنت کر رہا ہے۔''

''محنت پوری کر رہا ہے اور میں بھی گواہ ہوں۔ مگر یار تم خود سوچو کہ اس نے درمیان کی تین کلاسز سرے سے نہیں پڑھی ہیں اور اب براہِ راست نائن سائنس کا امتحان دے گا تو کچھ نہ کچھ مسئلہ تو ہوگا۔ مگر تمہارے دوسرے برخوردار نے پورے اسکول میں ٹاپ کیا ہے۔ آج تک آٹھویں کلاس میں کسی بچے نے اتنے نمبر نہیں لیے ہیں۔''

مجھے کچھ ڈھارس ہوئی کہ اُمید نہ سہی سعید پڑھنے میں تیز ہے۔ میں نے اُمید سے بات کی تو وہ بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ ''سوری بابا میں نے پوری کوشش کی مگر میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن بابا اس ایک سال میں میں نے بہت سی چیزیں کور کر لی ہیں اگلے سال آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''

''تمہاری پرسنٹیج سکسٹی سیون ہے اور اگلے سال ایٹی پرسنٹ لانا بہت دشوار کام ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''تمہیں اندازہ ہے کہ تمہیں نائٹی سے اوپر نمبرز لینا ہوں گے پیپر میں۔''

''جی ابو میں نے یہی سوچا ہے۔'' اس نے ایک عزم سے کہا۔

میرے دوست نے مجھے کال کی اور مشورہ دیا۔ ''اُمید سے کہو کہ نائن ریوائز کر لے مجھے یقین ہے اس بار وہ بہت ہائی مارکس لے گا۔''

جب میں نے اُمید سے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ''اس طرح تو سعید میرے برابر آ جائے گا تو کیا میں اپنے سے چھوٹے کے ساتھ پڑھوں گا۔''

''حامد کا کہنا ہے کہ اس طرح تمہاری پرسنٹیج بہت اچھی ہو جائے گی۔ تم نوّے فیصد سے زیادہ مارکس لے لو گے۔''

مگر اُمید آمادہ نہیں ہوا اس کے خیال میں یہ اس کی بے عزتی ہوگی کہ وہ اپنے سے چھوٹے بھائی کے ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھے گا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ لازمی اے گریڈ لے کر دکھائے گا، چاہے اس کے لیے اسے جان کیوں نہ لڑانی پڑے۔ پھر اس نے سچ مچ جان لڑا دی۔ جس وقت میں گھر کال کرتا مجھے پتا چلتا کہ وہ پڑھ رہا ہے یا ٹیوشن کے لیے گیا ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد بس اس کے یہی دو کام تھے۔ اس نے تمام مشاغل چھوڑ دیے تھے۔ پہلے شام کو باہر جا کر کھیل لیتا تھا وہ بند کر دیا رشتے داروں کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ گھر میں اپنے کمرے میں بند ہوتا اور کوئی آتا تو بس سلام دعا کے لیے باہر آتا تھا۔ رشتے داروں نے برا منایا، لوگوں نے مذاق اڑایا اور اس کے دوست چھوٹ گئے مگر اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ اگلے سال جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو اس نے مجھ سمیت سب کو حیران کر دیا تھا۔ حسبِ معمول اس بار بھی سب سے پہلے حامد کا فون آیا اور اس نے بلبلا کر کہا۔

''یار تجھ سے کہا تھا اس لڑکے کو نائن ریوائز کرا دے۔''

میرا دل ایک لمحے کو رکا۔ ''خیریت...... کیا پھر؟''

''نہیں یار اس بار تو اس نے حیران کر دیا ہے اس کی ایٹی ایٹ پرسنٹیج آئی ہے۔ میتھ میں سو میں سو اور باقی ہر پیپر میں نوّے سے اوپر مارک لیے ہیں، پچھلے سال جو نائن کا رہ گیا تھا اس میں بھی پچانوے نمبر لیے ہیں۔''

اس بار میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔''

''پر یار مجھے شدید افسوس ہے بورڈ میں اُمید اور میرے اسکول کا نام ٹاپ پر آتا اگر یہ میری بات مان لیتا۔''

''میرے لیے اس کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اپنے بیٹے کی عزت نفس کی ہے وہ اپنے بھائی کے ساتھ ایک کلاس میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے بھی زور نہیں دیا۔''

''کاش مجھے پتا ہوتا تو میں سعید کو آٹھویں میں فیل کر دیتا۔ ایک سال کے لیے اسے روک لیتا۔ چل یار تجھے بہت مبارک ہو۔ اس نے میٹرک میں تو بورڈ میں ٹاپ کیا ہے مگر دونوں ایئرز کی پرسنٹیج ملا کر اتنی نہیں ہیں کہ پہلے دس بچوں میں اس کا نام آئے۔''

''بہت سی چیزیں نصیب میں بھی ہوتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''شاید سعید ٹاپ کر لے۔''

''مشکل ہے، وہ ذہین ہے مگر اُمید جیسا نہیں ہے۔'' حامد نے کہا۔ ''دیکھتے ہیں اس کا رزلٹ کیا آتا ہے۔''

اُمید بہت خوش تھا جب میں نے گھر کال کی تو اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''بابا میں آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہوا۔''

''مجھے یقین تھا کہ تم کامیاب رہو گے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بیٹے یہ صرف آغاز ہے ابھی اصل منزلیں باقی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں بابا، بس مجھے یہ اطمینان ہے کہ آپ نے جو وعدہ لیا تھا وہ میں نے پورا کر دیا ہے۔''

اُمید نے آگے پری انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ اس کے گریڈ اور نمبروں کی وجہ سے اسے کراچی کے ایک بہترین گورنمنٹ کالج میں داخلہ ملا۔ سعید کا رزلٹ آیا تو اس نے بھی تقریباً نوّے فیصد مارکس لیے تھے اور بورڈ میں اس کی نویں پوزیشن آئی تھی۔ اب میں بچوں کی طرف سے مطمئن تھا کہ میرے دور ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم اور گھر پر رکھی تھی۔ پہلے سال تو میں آ نہیں سکا لیکن اس کے بعد میں ہر چھ مہینے کے اندر ایک چکر لگاتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ باہر جانے کے بعد ہاتھ ذرا کھلا تو میں گھر اور بہنوں کو بھی سامان بھیجنے لگا۔ اس سے پہلے تو بس مظہر بھائی یا اطہر ہی بھیجتے تھے اور مجھے شرمندگی ہوتی کہ میں اپنی بہنوں کے لیے کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ اگرچہ بہنوں نے کبھی مجھے احساس نہیں دلایا بلکہ میرا خیال رکھا۔ مگر اس کے باوجود مجھے خیال رہتا تھا۔ اس لیے جب باہر آیا تو میں نے گھر والوں کے ساتھ بہنوں کے لیے بھی سامان بھیجنا شروع کر دیا۔ میرے بھانجے بھانجیاں فرمائش کرتی تھیں کہ چھوٹے ماموں یہ چاہیے اور میں لے کر بھیج دیتا تھا۔

بچے جیسے جیسے اگلے تعلیمی مدارج میں جا رہے تھے۔ ویسے ویسے اخراجات بڑھ رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ گھر کے لیے بھی سیونگ کروں گا مگر وہ اتنی ہو نہیں پا رہی تھی۔ مکانات اور زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ ایسے میں گھر والوں سے مشورہ کر کے میں نے ایک اچھے بلڈر کا فلیٹ بک کرا لیا۔ یہ ابھی شروع ہو رہا تھا میں نے بلڈر سے کہا کہ مجھے ایک کل قیمت کا تخمینہ بنا کر دے دو اور میں صرف مہینے کی قسط ادا کروں گا۔ ایڈوانس میں زیادہ دے دوں گا مگر اس کے بعد مہینے کی قسط دوں گا۔ اس نے ایسا ہی کیا فلیٹ کی قیمت بائیس لاکھ روپے طے ہوئی میں نے پانچ لاکھ پیشگی ادا کر دیئے اور باقی سترہ لاکھ کے لیے ماہوار قسط کروالی جو تقریباً پینتیس ہزار ماہوار بنتی تھی۔ فلیٹ خاصا بڑا اور پوش علاقے میں تھا اور ہمارے لیے کافی ہوتا۔ جب بچوں کی شادیاں کرتے تو پھر آگے دیکھتے مگر فی الحال یہ ٹھیک تھا۔ بلڈر نے چار سال میں قبضہ دینے کا وعدہ کیا۔

مگر ہوا یہ کہ ابھی تین سال گزرے تھے کہ اچانک یو اے ای کے حالات خراب ہونا شروع ہوئے اور مرکزی بزنس یعنی کنسٹرکشن بیٹھ گیا۔ کمپنیاں ملازمین فارغ کرنے لگیں اور اس کی زد میں، میں بھی آ گیا۔ مجھے فارغ نہیں کیا تھا بلکہ کمپنی ہی بند ہو گئی تھی اس نے یو اے ای میں اپنا دفتر بند کر دیا تھا اور ملازمین کی چھٹی کر دی۔ حالات ایسے تھے کہ جاب تھی نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ کہیں جاب تلاش کر لوں۔ پھر میں نے یہ کیا کہ رہائشی ویزا بھی لے لیا اب میں یہاں بیوی بچے بھی رکھ سکتا تھا مگر اس صورت میں جو بچت ہوتی تھی وہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی یہاں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتا تھا کہ وہ انتہائی مہنگی تھی۔ یہاں تو عام اسکولنگ بھی بہت مہنگی ہے۔ جن کی اچھی تنخواہیں ہوتی ہیں وہ بھی افورڈ نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں نے کبھی بیوی بچوں کو یہاں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بس سیر و تفریح کرنے آتے اور پھر چلے جاتے تھے۔

جاب ختم ہوئی تو پریشانی کا آغاز ہو گیا۔ کیونکہ جمع جتھا کچھ تھا نہیں جو کمایا تھا وہ بچوں کی تعلیم اور فلیٹ پر لگا دیا تھا۔ اس لیے جب میں مجبوراً واپس آیا تو تقریباً خالی ہاتھ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُمید کا انجینئرنگ کا آخری سال تھا اور سعید کے ایم بی اے کے دو سال باقی تھے۔ بچوں کی فیس کی رقم میں پہلے ہی بھر چکا تھا کہ اس صورت میں خاصا ڈسکاؤنٹ بھی مل گیا تھا۔ دونوں چھوٹے برخوردار ابھی کالج اور اسکول میں تھے۔ مجھے فلیٹ کی بقیہ اقساط کی فکر

تھی۔ مگر جب یہاں آیا تو پتا چلا کہ بلڈر اپنے ٹائم شیڈول
سے کسی قدر پیچھے ہے اور وہ چار سال میں پروجیکٹ مکمل کرتا
نظر نہیں آرہا تھا۔ یعنی پروجیکٹ مکمل نہیں ہوتا تو بلڈر مجھ سے
باقی رقم مانگنے کا مجاز بھی نہیں تھا۔ تو اس طرف سے بھی اطمینان
ہوگیا اگر بلڈر کام بروقت مکمل کر رہا ہوتا تو میں مشکل میں
پڑ جاتا اب میں ادائیگی میں تاخیر کرسکتا تھا۔ واپسی کے فوراً
بعد میں نے ملازمت کے لیے کوشش شروع کردی۔ تجربہ تھا
اور مظہر بھائی کی جان پہچان تھی۔ کورنگی انڈسٹریل ایریا کی
ایک مل میں جاب مل گئی۔ تنخواہ اتنی تھی کہ گزارا ہوسکتا تھا۔

میں واپس آیا تھا کہ بڑی بہن زرینہ نے اطلاع دی
کہ وہ بیٹی ریحانہ کی شادی کر رہی ہے۔ ریحانہ زرینہ اور
ساجد کی ایک ہی اولاد تھی۔ اس کا رشتہ تو اس وقت طے کر دیا
تھا جب وہ میٹرک میں تھی مگر اس کے سسرال والوں کی شرط
تھی کہ لڑکی کم سے کم گریجویشن کرے گی اس لیے زرینہ نے
بیٹی کو آگے پڑھایا تھا۔ اس نے گریجویشن کیا تو شادی کی
تاریخ رکھ دی گئی۔ مظہر بھائی نے زرینہ سے کہا کہ وہ سارا
فرنیچر دیں گے اور اطہر نے زیور کی ذمے داری سنبھالی۔
بہنوئی ساجد بہت اچھے اور شریف انسان ہیں۔ انہوں نے
ہماری بہن کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی مگر مالی لحاظ سے مضبوط
نہیں تھے۔ سرکاری ملازم تھے اور اب کہیں جا کر آفیسر گریڈ
میں پہنچے تھے۔ زندگی بھر میں جو کمایا تھا اس سے اپنا گھر بنا لیا
تھا اور اب اتنی گنجائش نہیں تھی کہ دھوم دھام سے بیٹی کی
شادی کرسکتے اس لیے ہم لوگوں نے یہ ذمے داری سنبھال
لی۔ دونوں بھائیوں نے دو بڑے مسئلے حل کر دیے مگر میں
اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان ہی کی طرح کوئی بڑی ذمے
داری لے سکتا۔ کومل نے پوچھا۔

''آپ کیا کریں گے؟''

میں نے صاف گوئی سے کہا۔''میرے پاس تو بس
بیس پچیس ہزار ہیں۔ ابھی ملازمت لگی ہے تو اس سے تو گھر
کا خرچ ہی چل سکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں دس ہزار دے
دوں۔''

''صرف دس ہزار۔'' کومل بے چین ہوگئی۔''یہ تو کم
ہے زرینہ اور دوسرے کیا سوچیں گے؟''

''دیکھو میں نے زندگی میں کبھی یہ نہیں سوچا کہ
دوسرے کیا سوچیں گے۔ جب میرے پاس تھا تو میں نے
کھل کر کیا اب نہیں ہے تو میں کھل کر نہیں کرسکتا ایک لمٹ
میں ہی کروں گا اور میری لمٹ اتنی ہی ہے۔ ویسے تم فکر مت
کرو اسے کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

''آپ کے پاس پچیس ہزار روپے ہیں۔''

''وہ تو ہیں لیکن آنا جانا کرنا ہے اور پھر تم لوگوں کو
کپڑے بھی چاہیے ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر ہم آج تک
پنڈی اسلام آباد سے آگے نہیں گئے میں سوچ رہا ہوں ایک
دو دن کے لیے مری یا کسی ہل اسٹیشن ہو آئیں۔''

''سچ۔'' کومل خوش ہوگئی۔''واقعی ہم ہر جگہ گھوم آئے
مگر یہاں کبھی نہیں گئے۔''

''بس اسی لیے ارادہ کرلیا۔''

کومل ہل اسٹیشن کے لیے دل و جان سے راضی ہوگئی
مگر اس کی تشویش برقرار رہی کہ میں بھانجی کی شادی میں
بہت کم دے رہا ہوں۔ جب کہ میں مطمئن تھا کہ میں اپنی
حیثیت کے مطابق ٹھیک دے رہا ہوں۔ اُمید اور سعید نے
جانے سے انکار کردیا کہ ان کے سمسٹر قریب تھے اور وہ نہیں
جا سکتے تھے اس لیے ہم نے زید اور عبید کو ساتھ لیا اور ٹرین
سے پنڈی کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان دنوں ٹرینوں کی
حالتِ زار بہت خراب تھی اور ہم آئے دن سنتے تھے کہ
ٹرینیں نہ صرف لیٹ ہو رہی ہیں بلکہ ویران مقامات پر ان
کے انجن فیل ہوجاتے تھے اور اس وجہ سے مسافروں کو بہت
دیر انتظار کی کوفت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ اس سفر میں
ہمیں اس کا عملی تجربہ ہوا۔ سندھ میں ایک بار اور ایک بار
پنجاب میں ٹرین کا انجن فیل ہوا اور دوسرا انجن آنے میں
خاصا وقت لگا۔ جو سفر عام طور سے ستائیس اٹھائیس گھنٹے میں
ہوتا ہے وہ چالیس گھنٹے میں جا کر پورا ہوا اور جب پنڈی
اسٹیشن پر اترے تو سب کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

ساجد اور دوسرے لوگ اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ گھر
پہنچ کر نہا دھو کر سکون ملا ورنہ اس طویل اور بے آرام سفر نے
ذہن اور جسم سب گندہ کر دیا تھا۔ تین دن بعد شادی تھی مگر
رسومات اور تقریبات شروع ہوگئی تھیں۔ ساجد کا تعلق لاہور
سے تھا اور وہاں کی روایت ہے کہ شادی میں دھوم دھام
بہت ہوتی ہے۔ اس لیے ساجد نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر
انتظامات کیے ہوئے تھے۔ ہم سمیت کوئی پچاس ساٹھ مہمان
مستقل آئے ہوئے تھے۔ ان کا تینوں وقت کا کھانا پینا اور
دوسرے انتظامات پر خاصا خرچ ہو رہا تھا۔ میں نے زرینہ
سے کہا تو اس نے جواب دیا۔''اظہر بھائی یہ یہاں کا رواج
ہے سب کو کرنا پڑتا ہے، بے شک قرض ادھار لے کر
کریں۔ ہمیں بھی کرنا پڑ رہا ہے۔''

اقوال دانایان فرنگ

• دنیا اپنی حلاوت پر قائم ہے اور رہے گی لیکن اس قفس کے اسیر ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔ قانون قدرت کسی جانور کو ہمیشہ قید نہیں رکھتا۔

• تمام انسانی عادات کا آغاز نہایت ہی حقیر ابتدا سے ہوتا ہے اور ایک غیر محسوس رفتار کے ساتھ یہ نقش رفتہ رفتہ گہرا پڑتا جاتا ہے۔ چشمہ سے پہلے نہایت ہی پتلی سی دھار نمودار ہوتی ہے۔ بہتے بہتے آگے چل کر یہ چشمہ نالہ بن جاتا ہے اور آگے بڑھ کر نالہ سے دریا بن جاتا ہے۔ پھر یہ عظیم الشان دریا بہہ کر سمندر میں جا ملتا ہے۔

''اب پتا چل جائے گا آپ کو۔''

اس دوران میں ایک عورت اسٹیج پر آئی۔ اور اس نے سب سے پہلے فرنیچر کا بتایا۔ ''کڑی دا تمام فرنیچر کڑی دے وڈے ماموں نے دتا اے۔''

پھر اس نے زیور کا بتایا اور اٹھا کر حاضرین کو سیٹ، چوڑیاں اور دوسری چیزیں دکھائیں۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل ڈوب رہا تھا پھر چچاؤں اور پھپوؤں کی دی ہوئی چیزوں کے بارے میں بتایا گیا۔ اس کے بعد نزدیکی رشتے داروں کی دی ہوئی چیزیں اور تحفے دکھائے جانے لگے۔ ہر چیز کے دکھاتے یا اس کے بارے میں بتانے پر حاضرین واہ وا اور تبصرے بھی کر رہے تھے۔ جہیز دینے والے کے بارے میں بھی بات ہو رہی تھی کہ اس نے کتنی فراخ دلی یا کنجوسی کا ثبوت دیا۔ کومل نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ کا تو ذکر ہی نہیں ہو رہا ہے۔''

''میں تو یہ... سوچ رہا ہوں کہ نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔'' میں نے جوابی سرگوشی کی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں اس صورت میں لوگ سمجھیں گے کہ منجھلے ماموں نے کچھ دیا ہی نہیں ہے۔''

''بس تو پھر جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں نے کہا نا عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

اتنے میں عورت نے پیک سوٹوں کا ایک بڑا سا بنڈل اٹھایا۔ ''اے کڑی تے منجھلے ماموں نے دس جاپانی سوٹ دتے نیں۔''

''یہ تو خود پر بوجھ ڈالنے والی بات ہو گئی۔''

''عزت کا معاملہ ہے اس لیے بوجھ تو ڈالنا پڑے گا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم کتنے عرصے سے اس کام کے لیے پیسے جوڑ رہے تھے۔ خدا رکھے میرے بھائیوں کو کہ انہوں نے میرا اتنا بڑا بوجھ کم کیا ہے۔''

زرینہ کی بات سن کر مجھے شرمندگی ہوئی تھی کہ میں صرف دس ہزار دے رہا تھا۔ پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ میں کمی نہیں کر رہا تھا۔ جتنی حیثیت تھی اس کے مطابق دے رہا تھا۔ شرمندہ تو مجھے اس وقت ہونا چاہیے تھا جب میں ہوتے ہوئے بھی نہ دیتا۔ وہاں ساجد کے رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے بھائیوں اور بہنوں نے بھی بہت کچھ دیا تھا مگر سارا چرچا تھا مظہر بھائی اور اطہر کے گفٹ کا جو وہ بھانجی کو دے رہے تھے۔ میرا کہیں نام نہیں تھا اس لیے مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ بات کومل نے بھی محسوس کی اور موقع پا کر اس نے تنہائی میں کہا۔ ''یہاں تو سب صرف مظہر بھائی اور اطہر بھائی کا کہہ رہے ہیں آپ کا تو کوئی نام ہی نہیں لے رہا۔ ہماری تو بے عزتی ہو جائے گی۔''

''دیکھو میں ایک بات جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''عزت اور ذلت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور وہ میرے حال اور نیت سے اچھی طرح واقف ہے۔ مجھے اس سے پوری اُمید ہے کہ وہ مجھے بے عزت نہیں کرے گا۔''

مگر کومل کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ فکرمند اور پریشانی میں تھی۔ جس دن جہیز کا سامان جانا تھا اس دن دولہا والوں کی طرف سے سب آئے تھے۔ ایک پوری تقریب تھی۔ میں اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لیے جب باقاعدہ جہیز سجایا گیا اور سوائے فرنیچر کے باقی ساری چیزیں لا کر ایک اسٹیج پر رکھی گئیں۔ تو پتا چلا کہ ابھی اعلان ہو گا کہ کس نے کیا کیا دیا ہے۔ اب مجھے بھی فکر لاحق ہوئی کہ یہ تو سرعام بتانے والی بات تھی کہ دو ماموؤں نے اتنا کچھ دیا اور ایک ماموں نے صرف دس ہزار دیئے۔ سب مہمان وہاں جمع تھے۔ کومل نے مجھ سے کہا۔ ''میں اسی کا سوچ کر ڈر رہی تھی۔''

''مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ ایسی بھی کوئی تقریب ہوتی ہے۔''

''یہاں ہوتی ہے آپ کو نہیں پتا کیا؟'' کومل ذرا چڑ کر بولی۔

''عجیب بات ہے مجھے علم نہیں تھا۔''

پھر اس نے پیچھے رکھے ہوئے اسپیکرز والے ڈیک کے ڈبے پر ہاتھ رکھا۔ "اسے وڈا ڈیک کڑی دے مجھلے ماموں نے دتا اے۔"

اس کے بعد اس نے ڈبے میں سجی ہوئی سونے کی چین اور ٹاپس دکھائے۔ "اے وی دیسے سونے دی چین تے ٹاپس مجھلے ماموں نے دتے نیں۔"

اس کے بعد تو ایک لائن شروع ہو گئی۔ راڈو کی تین گھڑیوں کا سیٹ، مائیکرو ویو اوون، فلپس آئرن، ہیئر ڈرائیر اور بہت سی چھوٹی چیزیں میرے نام سے حاضرین کو دکھائی جاتی رہیں اور آخر میں عورت نے کہا۔ "تے نال دس ہزار روپے بھی دتے نیں۔"

میرا ذکر اتنا ہوا کہ حاضرین خود بھی واہ واہ کرنے اور تالیاں بجانے میں لگ گئے۔ پھر اصرار ہونے لگا کہ بھانجی سے اتنا پیار کرنے والے ماموں سامنے اسٹیج پر آئیں۔ زرینہ نے مجھ سے کہا۔ "بھائی آپ اسٹیج پر آئیں تاکہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں۔"

"میں نہیں جارہا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "اپنی بھابی کو لے جاؤ۔"

پھر زرینہ کے اصرار پر میں اور کول اسٹیج پر آئے تو لوگوں نے پھر تالیاں بجائی تھیں۔ ہم شرمائے ہوئے تھے اور میں دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے کس طرح سے عزت رکھی تھی۔ شروع میں تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے نام سے یہ سب چیزیں کہاں سے آگئیں لیکن جب میں اسٹیج پر آیا تو مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ یہ ساری چیزیں میں نے باہر سے زرینہ اور بھانجی کے لیے بھیجی تھیں۔ کچھ اپنی طرف سے بھیجی تھیں اور کچھ زرینہ اور ریحانہ نے فرمائش کر کے منگوائی تھیں۔ زرینہ نے یہ سب سنبھال کر رکھا کہ اس کی شادی میں کام آئے گا اور عین اس وقت جب اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی کو اس کی ضرورت ہے تو اس نے اس وقت یہ سب کچھ میرے نام سے پیش کر دیئے اور میری عزت بڑھا دی۔ اس وقت مجھے اپنی بہن کے خیال اور سمجھداری پر بہت پیار آیا کہ اس نے میری برسوں سے بھیجی ہوئی اشیا کو سنبھال کر رکھا، ان کو روا روی میں استعمال کر کے ضائع نہیں کیا بلکہ اہم ترین موقع پر پیش کر دیا۔ حالانکہ میں نے یہ سب اسی نیت سے بھیجا تھا کہ میری بہن اور بھانجی استعمال کرے۔

میرے دل سے بوجھ اتر گیا تھا۔ خیریت کے ساتھ شادی ہوئی اور ریحانہ بیاہ کر سسرال چلی گئی۔ اس کے بعد ہم دو دن کے لیے مری گئے۔ اتفاق سے وہاں میرا ایک پرانا دوست مل گیا جو ایک گیسٹ ہاؤس چلا رہا تھا اس نے اصرار کر کے مجھے اپنے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور دو دن اسٹے کا ایک روپیا بھی لینے سے انکار کر دیا۔ بچ جانے والی رقم سے میں نے ریحانہ کو شادی کے بعد میکے رہنے پر آنے کے موقع پر تحفہ لے کر دیا۔ یوں اللہ نے اس موقع پر بھی عزت رکھ لی۔ واپس کراچی آیا تو پتا چلا کہ میں نے جس پروجیکٹ میں فلیٹ بک کرایا تھا وہ تکمیل کے پاس تھا اور بلڈر نے آخری ادائیگی کے لیے نوٹس دے دیا تھا۔ میں پریشان ہوا مگر یہ پریشانی بھی اللہ نے یوں دور کر دی کہ ان دنوں گولڈ کا ریٹ نہایت ہائی تھا۔ شاید باسٹھ یا تریسٹھ ہزار روپے تولہ تھا۔ کول نے اپنا کچھ گولڈ بیچ کر مجھے باقی ادائیگی کے لیے رقم مہیا کر دی اور میں نے وہ ادا کر کے فلیٹ کا الاٹمنٹ لیٹر حاصل کر لیا۔ اب صرف اوپری اخراجات اور رقم ہی باقی رہ گیا تھا۔ مگر میں نے اس کا انتظار کیے بغیر فلیٹ سترہ فیصد زائد قیمت پر بیچ دیا۔ اس کے مجھے سینتیس لاکھ روپے ملے تھے۔ اس رقم سے میں نے اپنا ہی مکان بھائیوں اور بہنوں سے بات کر کے لے لیا اور فلیٹ کی فروخت سے ملنے والی رقم سے ان کا حصہ ادا کر دیا۔ مظہر بھائی نے حصہ نہیں لیا اور مجھے واپس کر دیا۔ باقی بہن بھائیوں کا حصہ دے کر بھی میرے پاس کچھ رقم بچ گئی۔ اوپری منزلیں کرائے پر دینے کے بعد اتنی آمدنی ہونے لگی کہ ہم پہلے کی طرح فراغت سے زندگی گزارنے لگے اور مجھے اپنے بیوی بچوں سے دور بھی نہیں جانا پڑا۔ آج میں اپنے گھر میں اور اپنے ملک میں رہ رہا ہوں۔

شمارہ مارچ 2016 کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش ..... آپ کا انتخاب

☆ اول: حوصلہ .... عمران (کوئٹہ)

☆ دوم: بے غیرت .... مریم مراد (جھنگ)

☆ سوم: پچھتاوا .... ثناء اللہ احمد (کراچی)

ماہنامہ سرگزشت کے تیسرے انعام کے لیے آپ اپنی منتخب کیجیے ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری تاجی ھاشمی گذشتہ 25برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ھیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ھیں ۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رھتے ھیں ۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ھیں ۔

اولاد نرینہ کی ۔ طلب

O میرے دونوں بیٹے پیدا ہونے کے تین ماہ زندہ رہے اور فوت ہو گئے ۔ اللہ کی رحمت تین بیٹیاں ہیں وہ بالکل صحیح سلامت ہیں اللہ ان کی حیاتی رکھے لیکن اولاد نرینہ کی بڑی خواہش ہے ۔ آپ کے روحانی علاج کی بہت شہرت ہے آپ پر سرکار داتا حضور اور سیدنا غوث الاعظمؒ کی بڑی عنایت ہے آپ اسماء الحسنیٰ بھی تلقین کیجئے اور روحانی علاج بھی تجویز کر دیجئے ۔ مجھے آپ سے ملنے کا بھی بے حد اشتیاق ہے ۔ فیس بک پر آپ کی زیارت ہوتی رہتی ہے ۔ آپ کا تابعدار ۔ غائبانہ مرید ۔ نسیم اختر شیخوپورہ

☆ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے لیکن ناممکن کچھ بھی نہیں ، اللہ تعالیٰ ہر دعا کو پورا کرنے پر قادر ہے ۔ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کو ننانوے برس میں اولاد عطا کر سکتے ہیں تو آپ کو عطا کرنا اس کے لئے کیا ناممکن ہے ۔ اپنا ایمان قائم رکھئے ۔ ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف ابراہیمی پڑھ کر دعا کیجئے ۔ آپ کی فرمائش پر علاج ورد عقیم اولاد نرینہ کے لئے ارسال کیا جا رہا ہے ۔ آپ بروز اتوار محفل درود شریف میں آیئے دعا کے بعد ملاقات ہو جائے گی ۔ انشاءاللہ

ڈپریشن ۔ والدہ کی بے بسی

O رات رات بھر جاگتی ہوں لیکن نیند نہیں آتی ہے ۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن سکون قلب میسر نہیں ہے ۔ مال و اولاد سب حاصل ہے لیکن دل بالکل مردہ ہے ۔ ڈپریشن ، غصہ ، ناکامی ، اداسی جیسی کیفیات طاری رہتی ہیں ۔ کئی حکیموں ، ماہر نفسیات کو دکھا چکی ہوں لیکن کوئی فائدہ نا ہوا بلکہ دوائیں کھا کھا کر السر کی مریض ہو چکی ہوں کیا میری اس بے بسی کا علاج ہے؟ نصرت آرا ۔ کراچی

☆ بہن ! آپ کی بیماری جسمانی نہیں روحانی ہے آپ کے حوالے سے جو چیز استخارے کے ذریعے سامنے آئی اس نے میرا دل دہلا دیا اور آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا ، آپ نے اپنی والدہ کا دل بہت دکھایا ہے ، وہ آپ کو آخری لمحوں تک یاد کرتے کرتے ، آپ کا انتظار کرتے کرتے اس جہاں سے گذر گئی تھیں لیکن آپ نے ان کی کوئی خبر نہیں لی ، آپ کی والدہ نے ، مجھے سو فیصد یقین ہے کوئی بددعا نہیں دی ہو گی ، لیکن ان کے صبر اور بے بسی نے آپ کو جکڑ لیا ہے ، آپ ان کے لئے ایصال ثواب کریں ، ممکن ہو تو ان کی قبر پر جا کر باقاعدہ معافی مانگیں ۔ "سورۃ الملک" پڑھ کر ان کو ہدیہ کریں ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی اطاعت اور ان کی دعائیں سمیٹنے والا بنائے ۔ (آمین)

ہر بار ۔ مزید قرضدار

O گذشتہ کئی برسوں سے جو کاروبار بھی کرتا ہوں وہ شروع میں تو اچھا چلتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے نقصان میں آ کر ختم ہو جاتا ہے اور میں مزید قرض دار ہو جاتا ہوں ، پہلے بیگم کا زیور ، پھر پلاٹ ، آخر میں گھر اور گاڑی بھی بک گئی اور ہم ڈھائی سو گز سے 64 گز کے معمولی سے کرائے کے گھر میں آ گئے ہیں ، ہزار ہا کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتا ، بہت عمدہ پلاننگ ہوتی ہے جو دوسروں کو بتاتا ہوں وہ ہٹ ہو جاتا ہے جو خود کرتا ہوں پٹ جاتا ہے ، کوئی کہتا ہے جادو ہے تعویز ہے ، کیا کروں ۔ آپ کے متعلق بہت سنا ہے ، اللہ کے واسطے میرا مسئلہ حل کر دیجئے ۔ دعا گو رہوں گا ۔ نصیر احمد ۔ کراچی

☆ بھیا ! دو باتیں ہیں آپ بہت اچھے منتظم اور اچھے پلانر ہیں لیکن آپ کا جو اسکل ہے وہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ہے ۔ آپ اپنے کاروبار کی بجائے کسی بڑے ادارے میں جاب کے لئے اپلائی کیجئے ، دوسرے آپ کی ناکامی کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ۷ا برس پہلے بیمار ہوئے تھے ۔ اس کا جسمانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کا روحانی علاج ہوا تھا لیکن اس کے بعد آپ جسمانی طور پر تو صحت مند ہو گئے لیکن بد اثرات کے دائرے سے نہیں نکل پائے ۔ آپ "سورۃ یٰسین" سات مبین والی بعد نماز عشاء پڑھنی شروع کر دیں معاملات اچھے ہو جائیں گے ۔ آپ کی خصوصی فرمائش پر لوح مشتری برائے کامیابی

اور روپے پیسے میں برکت کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

حالات اچھے تھے۔ تو بھول گیا

○ میں آپ کا ایک مرید ہوں اور معافی کا خواہش گار ہوں کہ جب حالات اچھے تھے تو بھول گیا اب برے ہوئے ہیں تو پھر آپ کے پاس حاضر ہوں، میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ کاروبار شروع کیا۔ اس نے سارا لین دین عملاً اپنے ہاتھ میں رکھا مگر ساری بینک ٹرانزیکشن میں کرتا تھا۔ چار سال کاروبار بہت اچھا چلا ہم لوگوں نے خوب پیسے کمائے۔ ہمارے کاروبار کی بہتری کو دیکھ کر میرے پارٹنر نے مجھے کچھ لوگوں سے ملوایا کہ یہ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک کام کے لئے چودہ لاکھ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہم سے معاہدہ کر کے ہمیں 20 لاکھ ادا کر دیئے جو میں نے بینک میں جمع کروا دیئے، چند دنوں میں کام کی پے منٹس کے سلسلے میں پارٹنر نے تمام رقم نکال لی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا اس میں 6-6 ماہ کے 8 لاکھ کے بارہ تیرہ چیک بھی تھے۔ پھر اچانک۔ تھوڑے ہی عرصے میں جن لوگوں نے رقم دی تھی انہوں نے تقاضا شروع کر دیا اور جنہوں نے مال ہمیں بھیجا تھا ان کے چیکس واپس ہونا شروع ہو گئے، گھر بار ہر چیز بک گئی مگر میرے اوپر قرض کا پہاڑ کھڑا ہے۔ کبھی ایک چیک کی ضمانت کرواتا ہوں، کبھی حوالات کی سیر کرتا ہوں۔ عزیز رشتے دار منہ موڑ چکے ہیں بیوی ساتھ دیتی ہے۔ بچے بری طرح سہم گئے ہیں کیا کروں سمجھ نہیں آتا۔ وہ پارٹنر ایسا غائب ہوا ہے کہ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ کیا کروں کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔ کیا ایک بار پھر نظرِ کرم نہیں کریں گے۔ دعا کا طالب۔ محمد طالب حسین۔ حیدرآباد

☆ اچھے میاں! ہمارا ناراضگی یا غصے سے کیا علاقہ، محبت اور مروت ہمارا مشرب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کو بہتر کرنے والا ہے۔ میرے رب کی رحمت سے پہاڑ جیسا قرض بھی ہو تو ادا ہو جائے گا۔ ''سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم'' کثرت سے پڑھا کرو۔ بروز جمعرات ایک روٹی کا صدقہ کیا کرو اور اتوار کے دن ٹھیک 2 بجے تا 4 بجے گھر والوں کے ساتھ درود شریف پڑھا کرو اور پیر خانے کی دعا جو پونے چار بجے شروع ہوتی ہے اس وقت دعا شروع کرو پیر خانے میں بھی دعا ہو گی۔ تمام بہن بھائی جو کسی وجہ نا آسکیں یا بیرون ملک اشہر ہوں ان کو بھی تاکید ہے کہ 2 بجے تا 4 بجے محفل درود شریف منعقد کیا کریں۔ تمہارے کاروباری مسائل کو دیکھتے ہوئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

معاملہ ختم۔ صحت بحال

○ میری بیٹی ماشاء اللہ خوبصورت قد بُت کی ہے، ماسٹرز کیا ہے۔ مگر جب بھی اس کے رشتے کی بات فائنل ہونے لگتی ہے وہ بیمار پڑ جاتی ہے۔ چہرے کی رنگت نچڑ جاتی ہے سانس پھولنے لگتا ہے، ہاتھ پیروں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ چہرے پر پانی والے دانے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسکن اسپیشلسٹ، ماہر نفسیات سب کو دکھایا، لیکن افاقہ نہیں ہوتا۔ مگر جونہی شادی کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے صحت بحال ہونا شروع ہو جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں جادو تعویز کا اثر ہے۔ اگر ایسا ہے تو علاج عنایت کیجئے تاکہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بہن دعا گو

☆ اچھی بہن! معاملہ تو واقعی تشویشناک ہے۔ آپ کی صاحبزادی آسیبی کیفیت کا شکار ہیں۔ شریعت قطعی برہنہ ہو کر نہانے سے منع کرتی ہے۔ اسی لئے شریعت نے قضائے حاجات کے لئے مسنون دعائیں تلقین کی ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم احتیاط نہیں کرتے، جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ کو نظر بد، جن اور آسیبی معاملات کے لئے ایک ورد، پینے کے، غسل کے، جلانے کے تعویز بذریعہ ڈاک بھیجے جا رہے ہیں۔ اس پر پابندی سے عمل کیجئے۔ انشاءاللہ بچی کے معاملات 90 روز میں بہتر ہو جائیں گے۔

مطلبی مرید۔ نامیاں نا

○ بیرونِ ملک جانے کی بڑی خواہش ہے مگر کئی برسوں کی کوشش کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہزاروں روپے ایجنٹوں کے چکر میں برباد کر چکا ہوں، ایک بار بڑی مشکل سے یونان پہنچا مگر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ والد صاحب کا کہنا ہے کہ یہیں کوئی کام کرلو مگر میری بھی یہی ضد ہے کہ کام باہر ہی کروں گا۔ اس وجہ سے ابا بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیا اس کا کوئی حل ہے آپ کے روحانی اور قرآنی اعمال کا بہت سنا ہے آپ میرا کام کر دیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔ رضوان محمود۔ نواب شاہ

☆ نامیاں نا! ہمیں مطلبی مریدوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ پاک آپ کے معاملات حل فرمائے۔ ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔ ایجنٹوں کا چکر چھوڑیں جو ابا کہتے ہیں مان لیں اور کاروبار شروع کر دیں جب ابا خوش ہو جائیں تو ان کی مرضی سے بیرونِ ملک کے لئے اپلائی کر دیں، کامیاب ہو جائیں گے، یاد رکھیں والد کا غضب اللہ کا غضب اور والد کی اطاعت اللہ کی خوشنودی ہے۔ آپ کی بے حد فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

شادی۔ ورنہ خودکشی

○ کئی دنوں سے ایک ایسی پریشانی میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا بیٹا میری بہو کی بہن کو پسند کرتا ہے مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے آپس میں رشتے داری کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ شادی طے ہے۔ مگر میرے بیٹے کی ضد یہی ہے کہ وہ روزینہ ہی سے شادی کرے گا۔ دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کی مگر اللہ کے فضل نے اسے بچا لیا۔ میرے دو بیٹے اور ایک ہی بیٹی ہے بہو اور بیٹے کا رویہ بدل گیا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں علیحدہ

ہو جاؤں، دوسری طرف وہ لوگ بھی ہم سے ناراض ہو رہے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے نہیں ہیں مگر ہم کیا کریں، سچی بات تو یہ ہے بھائی صاحب کہ اگر میرے بیٹے کو محبت کا حق حاصل ہے تو ان دونوں کو بھی یہی حق حاصل ہے پھر یکطرفہ محبت سے فائدہ کیا؟ اذیت کے علاوہ کیا ملتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کے لئے کوئی ایسا روحانی حل تجویز کریں کہ یہ سب خوش رہیں۔ سلمیٰ پروین۔ راولپنڈی

☆ عزیز بہن اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اولاد کے دکھ سے محفوظ و مامون رکھے۔ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا کریم یا سلام یا ھادی یا مانع" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ بیٹے کی اصلاح کے لئے لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ بیٹی کے امتحانات میں کامیابی کے لئے لوح عطارد ارسال ہے۔

آیا امتحان۔ ہوگئی چڑچڑاہٹ

O میری بیٹی اور بیٹا نویں، دسویں کے طالب علم ہیں ٹیسٹ میں ان کے نمبر بہت اچھے آتے ہیں مگر امتحان کے دنوں میں طبیعت سست، بے چین ہو جاتی ہے چڑچڑے ہو جاتے ہیں نیند بہت آنے لگتی ہے جو یاد کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پتا نہیں کہ بچوں کو نظر لگ گئی ہے یا کوئی جادو ہے۔ آپ کوئی روحانی علاج تجویز کر دیجئے۔ عذرا آفتاب۔ فیصل آباد

☆ بہن! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۃ الم نشرح" پانی پر دم کر کے پلائیں، بے وجہ نصیحتوں اور دباؤ سے گریز کریں۔ دونوں کو 7 باداموں پر "یا علیم یا قوی" 100 مرتبہ دم کر کے دے دیا کریں آپ کی فرمائش پر لوح عطارد ارسال کی جا رہی ہے۔ گیارہویں شریف کے لئے آپ کے ہدیے کا شکریہ

میاں۔ اڑیل مزاج

O میری شادی کو 9 برس ہو گئے ہیں مگر کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ میاں عجیب سے اڑیل مزاج ہیں جو بات منہ سے نکل جائے بس وہی ہوتا ہے۔ چاہے غلط ہو یا سہی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پہلے رشتے دار ناراض تھے اب سگے بہن بھائی بھی ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو ٹوکنا لازمی سمجھتے ہیں سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنے میاں کو، مگر میری کوئی اوقات ہو تو میں سمجھاؤں، بس ایک نوکرانی ہی ہوں، ضرورت کے تحت میرے پاس آتے ہیں اور اس میں بھی رویہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن اور بدن احساسِ ذلت سے سلگ جاتا ہے، نہ نماز نہ روزہ اوپر سے۔ دین کی من مانی تشریح جو صرف اپنے مفاد کے مطابق ہو۔ جاہل نہیں ہیں اپنے مضمون کے پی ایچ ڈی ہیں دنیا ان کے علم و فضل کی دیوانی اور گھریلو معاملات میں صفر، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں میرے بچوں کا کیا قصور اگر باپ کی شفقت نہیں ملتی تو ماں کی ممتا سے کیوں محروم کروں۔ کیا اس کا علاج ہے آپ کے پاس میں تو دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں ایک بزرگ کی طرح میری مدد فرمائیں۔ شاہین اسلم۔ کراچی

☆ بیٹی جیتی رہو! تم جیسی بچیوں سے معاشرہ سلامت ہے تمہارے میاں اصل میں احساسِ کمتری کے مریض ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ تعلیم اور نوکری سے نواز دیا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص خصوصاً خاندان والے چونکہ ان کی خامیاں کمزوریاں ان کے علم میں ہیں لہٰذا ان کا فائدہ اٹھا کر تضحیک کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ ہرگز خودکشی کی نہ سوچنا اللہ میاں بہت غفور الرحیم ہے۔ ہر نماز کے بعد صرف 14 مرتبہ "درود شریف تاج" پڑھ کر ان کا تصور کر کے دم کر دیا کرو خصوصاً جب "دافع البلاء والوباء والقحط والمرض والالم" تک پہنچو تو تین بار تکرار کرو اصلاح کے لئے لوحِ تسخیر خاص اور نقوشِ زعفران ارسال کئے جا رہے ہیں۔ یقین رکھو اللہ پاک اچھا اجر دیں گے۔

اسکول کی لڑکی۔ خواب میں آئے

O میرے ساتھ کچھ عرصے سے عجیب سا واقعہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا سکھ چین غارت ہو گیا ہے، میں اپنے گھر، بیوی، بچوں سے بے حد خوش ہوں، مگر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے میرا ہر پل عذاب ہو گیا ہے ہم میرپور خاص میں رہتے تھے، پھر والد صاحب کے تبادلے کے ساتھ یہاں آ گئے، تعلیم وغیرہ سب یہیں حاصل کی، شادی ہو گئی۔ ایک دن اچانک بازار میں پرانے شہر کے ایک واقف مل گئے بچپن میں ہم سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے، وہ میرے گھر آئے میں ان کے گھر گیا تو معلوم ہوا ان کی شادی ہماری ہی ایک سکول فیلو سے ہو گئی تھی، سچی بات تو یہ کہ مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں تھی، مگر جب انہوں نے ملوایا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یاد آیا کہ وہ کالی سی سوکھی سی مریل سی لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اب وہ ایک بھرپور خاتون تھی، ملاقات چائے، کھانے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے مگر وہ میرے ذہن سے چپک

گئی، اب ہر رات خوابوں میں آتی ہے، میں اندر ہی اندر گھلتا جارہا ہوں وہ میرے دوست کی بیوی ہے، پھر میرا اس کا تعلق ہی کیا مگر جس قدر بھی نظر انداز کروں اس کے خیال کو کچلوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہے، خدا کے لئے میرا گھر تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ محمد جنید۔ کراچی

☆ عزیزم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ایک ذہنی صدمے کا رد عمل ہے بقول آپ کے وہ کالی سوکھی مریل سی لڑکی کو آپ اس روپ میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر جب آپ نے اس کو اچانک دیکھا اس کی جاذبیت نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا یہ تو ہے آپ کے مسئلے کی توجیح روحانی حل یہ ہے آپ رات سونے سے قبل بکثرت "ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم" پڑھا کریں۔ آپ کے لئے لوح زہرہ ارسال ہے۔

ٹیچر کی محبت۔ گرفتار

بات اچھی تو نہیں ہے مگر جب مشورہ لیا جائے تو سچ کہے بغیر چارہ نہیں اور آپ سے تو ویسے بھی میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں، آپ کی فیس بک اور ویب سائٹ بہت پسند ہے میں غائبانہ آپ کی مرید ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہوگئی ہے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے، وہ پانچ مرلے کے کرائے کے پورشن میں رہتے ہیں اور ہمارا گھر دو کنال پر ہے، اس سے آپ اندازہ لگالیں، مگر دل کا کیا کروں کہ وہ میرے قابو میں نہیں ہے، ان کی نرمی، محبت اور توجہ نے مجھے ان کی محبت میں گرفتار کرلیا ہے۔ مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں دیتے، ایک بار میں نے ان سے کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ جو چیز میں افورڈ نہیں کرسکتا اس پر نا توجہ دیتا ہوں اور نا ہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کی اس بے نیازی نے مجھے اور بھی ان پر مائل کردیا ہے، میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ دن رات ان کے فراق میں تڑپتی رہتی ہوں، آپ مدد کردیں۔ نوشابہ۔ شہر نامعلوم

☆ کریم آقا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے، آدمی کے تین باپ ہیں، ایک وہ جس کے صلب سے وہ پیدا ہوتا ہے ایک وہ جو اسے تعلیم دیتا ہے اور ایک وہ جو اس کو بیٹی دیتا ہے، آپ کی محبت درست ہے مگر زاویہ درست نہیں، اپنا نقطہ نظر بدل لیجئے، زندگی آسان ہوجائے گی، آپ کے لئے لوح زحل ارسال کی جارہی ہے، آپ ہماری بیٹی ہیں اور بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے، مرید ہونے کے لئے اپنے والدین کے ہمراہ آئیں۔